رجسٹرڈ نمبران ۲۸۸ ۷۸۶ جلد(۹) شمارہ(۱)

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

فہرست مضامین جنوری سنہ ۲۶ء

(جعفری اٹاوی کاتب تحریر نمود)

قیمت سالانہ پانچ روپیہ　　　　قیمت ششماہی تین روپیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

تاریخ اشاعت ہر ماہ کی پندرہ　　　　اڈیٹر : نیاز فتحپوری

شمار (۱)	جنوری سنہ ۱۹۲۶ء	جلد (۹)

ملاحظات

جرائد و رسائل کا یہ قاعدہ ہے کہ آغاز سال میں، جب کہ ایک سنہ ختم اور دوسرا شروع ہوتا ہے، خیر مقدم اور وداع کے مخلوط جذبات کو کسی نہ کسی پیرایہ سے ضرور ظاہر کرتے ہیں اور ایک حد تک یہ رسم بُری بھی نہیں ہے کہ یوں بھی سالگرہ کی تقریب میں کچھ نہ کچھ چہل پہل کے اسباب پیدا کرنا متمدن دنیا کا دستور ہے، لیکن میں کہ میرے لیئے ہر دن قطع منزل ہے اگر کوئی کام کر سکوں اور ہر روز رجعت قہقری اگر بیکار صرف ہو جائے، اس رسم کے ادا کرنے کے لیئے طیار نہیں، کیونکہ میرے لیئے گزر جانے والے سال کی ناکامی یا آنے والے سال کی کامیابی کا خیال نتیجہ کے لحاظ سے ایک ہی حکم رکھتا ہے، للہِ درّ ما قال ؎

بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا
ناہید بغمزہ کشت و مریخ بہ قہر

میں دیکھتا ہوں کہ جو دن گزرتا ہے، میرے اندر بجائے تفاؤل کے تشاؤم (Pessimism) کی کیفیت بڑھتی جاتی ہے اور دنیا کی کسی کامیابی کا خیال میرے اندر کوئی ولولہ مسرت پیدا نہیں کرتا۔ پھر یہ بات بھی نہیں ہے کہ میں جس کام کو اختیار کرتا ہوں اسمیں کامیابی نہ ہوتی ہو، بلکہ خدا کا احسان ہے کہ میں

اس کے تمام ضروری شرائط کو ترک کردیا، یہ ضروری شرائط کیا ہیں؟ ان کو میں بتانے کے بجائے دکھانا چاہتا ہوں اور اسلیئے فی الحال صراحت بیکار ہے۔

اول دن سے میرا یہی خیال تھا کہ نگار ٹائپ میں طبع ہو، لیکن جب اسمیں کامیابی نہیں ہوئی تو پھر اقل درجہ یہ کوشش کی گئی کہ فی الحال لیتھو پریس ہی نگار کا ہوجائے، اور اسمیں کامیابی ہر وقت ممکن ہے لیکن ایک پریس قائم کرنے کے بعد جن اُلجھنوں میں انسان مبتلا ہوجاتا ہے، ان کا مقابلہ کرنے کے لیئے میں اسلیئے طیار نہیں کہ میرے پاس وقت بالکل نہیں ہو اور اسوقت تک کوئی ایسا معاون مجھے نہیں ملسکا جو صحیح معنی میں میری مرضی کے مطابق کام کرسکے۔

دوسرے پریس میں چھپنے سے جو تکلیف سب سے زیادہ دلخراش ہے، وہ یہ کہ دو مہینے پہلے پرچہ مرتب کرنا پڑتا ہو اور میں واقعات حاضرہ پر کسی طرح بحث نہیں کرسکتا۔ ہرچند ملاحظات کی کاپی سب سے اخیر میں لکھی جاتی ہو لیکن پھر بھی یہ تاخیر جتنی ہوسکتی ہے اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہو کہ جنوری کے یہ ملاحظات میں ۲۲ر نومبر کو سپرد قلم کررہا ہوں۔

کسقدر جی چاہتا تھا کہ جنوری کے رسالہ میں مسلم یونیورسٹی جوبلی اور کانگریس کے حالات درج کرتا، جنمیں مجھے شریک ہونا ہو لیکن ایسا نہیں کرسکتا کیونکہ پریس اپنا نہیں ہے، اور پریس کیا نہیں ہے۔ کوئی کام کرنے والا نہیں ہے اور نہ باوجود کوشش کے ملتا ہے

میں اس فکر میں بھی ہوں کہ نگار کو کسی ایسی جگہ منتقل کردوں جہاں کتابت و طباعت کی آسانیاں ہوں اور ان مقامی سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر موجودہ مشکلات کو دور کرسکوں، لیکن نگار کا منتقل ہونا میرا منتقل ہونا ہے، اور اسکے لیئے ابھی کم از کم ایک سال اور چاہیئے۔

بہرحال اس گفتگو سے مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ نگار کو ترقی دینے کی فکر سے میں غافل نہیں ہوں اور انشاء اللہ جلد یا بدیر وہ وقت آنے والا ہے جب آپ اسکو واقعی اسکی اصلی شان میں دیکھیں گے۔

سید وصی احمد صاحب بلگرامی کے مضمون "ملک خطا کے شہزادے" کے متعلق مخالفین نے اظہار برہمی تو بہت کچھ کیا۔ لیکن عملاً کوئی حصہ نہیں لیا، اور باوجود مکرر اعلانات کے اسوقت تک کوئی مضمون ان کے خیالات کی تردید میں موصول نہیں ہوا۔

میں نے ایک ماہ کی مہلت دی تھی، وہ ختم ہو گئی ہے، اسلیئے انشاء اللہ ماہ فروری میں اسکے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرونگا، اور دیکھونگا کہ جناب ومنی محمد صاحب کس حد تک اپنے خیالات کے اظہار میں جادۂ اعتدال سے متجاوز ہو گئے ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ میں اُن کی موافقت کرونگا کیونکہ اس مضمون کا شائع کر دینا ہی میرے موافق ہونے کا ثبوت ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط استدلال ہے، ایک رسالہ یا اخبار پبلک کے خیالات کا آئینہ اسی لیئے کہلاتا ہے کہ اسمیں مخالف و موافق ہر قسم کی رائیں درج ہو سکتی ہیں اسلیئے اگر میں نے اس مضمون کو شائع کر دیا تو اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ میں اس کا موافق ہوں، بلکہ اس سے مدعا یہ تھا کہ ایک شخص اپنے شبہات پیش کرتا ہے، اور اگر وہ غلط ہیں تو ان کی تردید ہونی چاہیئے میں بحمد اللہ مذہبی مسائل میں تنگ خیال نہیں ہوں اور اسکو خلاف انسانیت سمجھتا ہوں کہ اپنے معتقدات کے خلاف کوئی بات سنکر برہم ہو جاؤں۔

میرے ایک عزیز دوست سید مقبول حسین صاحب وصل بلگرامی نے "مقبول المطابع" کے نام سے ایک پریس لکھنؤ میں قائم کیا ہے، اور ارادہ ہے کہ جنوری کی کاپیاں وہیں بھیجوں۔ اگر معاملہ طے ہو گیا تو یہ رسالہ اسی مطبع میں طبع ہوگا اور سرورق بھی بدلا ہوا ہوگا، امید ہے کہ حضرت وصل نگار کی طباعت میں حسن پیدا کرنے کی پوری سعی فرمائیں گے اور آئندہ رسالہ بہتر طباعت کے ساتھ آپ کی نگاہ سے گزریگا،

جناب وصل نے ایک ماہوار رسالہ بھی "مرقع" کے نام سے جاری کیا ہے، جو ابھی تک میری نگاہ سے نہیں گزرا۔

حضرت مجنوں گورکھپوری نے جن کی منظومات آپ وقتاً فوقتاً نگار میں دیکھتے رہتے ہیں، اور جن کا ایک افسانہ زیدی کے عنوان سے نگار میں شائع ہوا ہے، آسکر وائلڈ کے مشہور ڈراما سالومی کا اردو ترجمہ کرکے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ آسکر وائلڈ جس مرتبہ کا لکھنے والا تھا وہ کسی سے مخفی نہیں، لیکن سالومی جس رتبہ کا ڈراما ہے اسکے متعلق صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ جب یہ شائع ہوا تو برلن میں مسلسل ۲۰۰ راتوں تک کھیلا گیا اور لوگوں کا شوق بدستور قائم رہا، سالومی کا ترجمہ یورپ کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے، اُردو میں اسکو حضرت مجنوں نے پورا کرکے حقیقتاً زبان پر احسان کیا ہے۔

میں نے ترجمہ دیکھا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اسی حد تک سلیس ہے جس حد تک اسے ہونا چاہیئے، کوشش کی گئی ہے کہ آسکر وائلڈ کا زور بیان ترجمہ میں بھی ظاہر ہو جائے اور اسمیں حضرت مجنوں کو بڑی کامیابی ہوئی ہے، جن حضرات کو اسکے مطالعہ کا شوق ہو وہ براہ راست منیجر نگار سے خط و کتابت کریں، قیمت شاید ایک روپیہ یا اس سے کچھ کم ہے۔

جس وقت یہ رسالہ شائع ہوگا، نگار کے نمائندے سید محمد اسحاق صاحب مارہروی غالباً اضلاع یو پی میں دورہ کر رہے ہوں گے۔ اب تک اُن کے وقت کا زیادہ حصہ یو پی اور صوبہ بہار میں صرف ہوا ہے، لیکن ہنوز وہ اپنی خدمات کو تکمیل کی حد تک نہیں پہونچا سکے، جس کا بڑا سبب اُن کی علالت اور کچھ خانگی معروفیت تھی، لیکن دسمبر اور جنوری کے دو مہینے پھر انہوں نے نکالے ہیں اور یو پی میں صرف کر رہے ہیں، امید ہے کہ وہ حضرات جنہوں نے نگار کو شرف حاضری سے ممتاز فرمایا ہے، اسکی توسیع اشاعت میں توجہ فرمائیں گے اور اپنے حلقۂ احباب میں اسکو قبول بنانے میں دریغ نہ کرینگے۔

اس دور ان میں بعض کتابیں ہمیں اسوقت موصول ہوئیں جب آخری کاپی لکھی جا چکی تھی اسلئے ہم ملاحظات کے سلسلہ میں مختصراً ان کا ذکر دینا مناسب سمجھتے ہیں، کیونکہ پھر ریویو میں ایک ماہ کی تعویق ہو جائیگی اور مصنفین کو انتظار کی تکلیف برداشت کرنی پڑیگی۔

روح تنقید تمام موصولہ کتابوں میں سب سے بہتر تالیف ابو الحسنات سید غلام محی الدین صاحب قادری زور بی اے کی ہے جسے روح تنقید کے نام سے انہوں نے شائع کی ہے اس کتاب میں فن تنقید پر بحث کی گئی ہے اور ابتدا مولوی عمر و یافعی صاحب کے تعارف سے کی گئی ہے تعارف کے سلسلہ میں مختصراً فن تنقید کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے جناب زور کے تعلیمی اکتسابات کا حال بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد کتاب کا دیباچہ شروع ہوتا ہے جسمیں اصل کتاب کی ترتیب پر روشنی ڈالی ہے

اس تالیف کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ مبادی تنقید سے متعلق ہے اور اسمیں مختلف و متعدد ابواب کے ماتحت، تنقید کی تعریف، ادب کی تعریف، ادب کی پیدائش ادب کی تقسیم، ادب کا مقصد، تنقید سے بحث کرکے میر حسن کی مثنوی سحر البیان پر تنقید کرکے گویا اس کا صحیح نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

ان تمام عنوانات کے تحت میں فاضل مولف نے اسقدر اچھا، مفید اور پُر از معلومات مواد پیش کیا ہو کہ بے اختیار جامع کی محنت وکاوش کی داد دینی پڑتی ہے۔

اس کا دوسرا حصہ "ارتقائے تنقید" سے بحث کرتا ہے اور اسمیں روما و یونان کے متقدمین تنقید گار اور ازمنۂ متوسطہ کے مشہور نقاد ان فن کے حالات سے بحث کرکے اُس عہد کے فن تنقید کو نہایت خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے، اسی سلسلہ میں فرانس اور انگلستان کی تنقید پر اختصار سے بحث کی، اٹھارویں صدی کے بعد کی تنقید کی ترقی کا ذکر کرکے وہاں کے تین مشہور نقادوں کا حال بیان کیا ہو نویں باب میں مروجہ تنقید کا ذکر ہے اور پھر ہند کے تنقیدی کارنامے بیان کرکے کتاب کو ختم کر دیا گیا ہے۔

کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۰۵ صفحات کو محیط ہے اور ایک فہرست اسماء رجال کی بھی جدید اصول کے لحاظ سے شامل کر دی گئی ہے۔ جناب زور بی اے کا اُردو پر احسان عظیم ہے کہ انہوں نے اس فن کے متعلق ایسی بیش بہا تصنیف پیش کی ہو اور ملک کو قدر کرنی چاہیئے تاکہ وہ اپنے سلسلۂ تصانیف کو جاری رکھ سکیں یہ کتاب عہ میں مصنف سے نظامت منزل کنگ کوٹھی روڈ حیدر آباد کے پتہ سے مل سکتی ہو۔

شاہان مالوہ | یہ کتاب مولوی امیر احمد صاحب علوی بی اے کی تالیف ہے جسمیں ہوشنگ غوری سے لیکر باز بہادر اور رانی روپ متی تک کی تاریخ مالوہ بیان کی گئی ہے۔

اُردو میں ایسی کتابوں کی شدید ضرورت ہے جو ہندوستان کی تاریخ کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے پیش کریں اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہو کہ ہر صوبہ کی مفصل تاریخ کا علم ہوجاتا ہے بلکہ اسکے مطالعہ میں بھی سہولت و آسانی ہوتی ہے۔

اسوقت صوبۂ مالوہ ہندوستان کا کوئی اہم جزو نہ قرار دیا جاتا ہو، لیکن اس پر ایسے دور بھی گزر چکے ہیں جب واقعات تاریخ کے لحاظ سے اسکو ہندوستان کی اہم ترین صوبوں میں شمار کیا جاتا تھا اور جس پر قابض ہونے کے لیئے سبھی نے کوششیں کیں۔ کتاب کی عبارت نہایت سادہ و سلیس ہے اور قابل مولف نے پوری کاوش وکوشش سے کام لیکر صحیح ترین ماخذ سے استفادہ کیا ہے، امید ہے کہ تاریخ سے دلچسپی لینے والے حضرات ضرور اس کا مطالعہ کرینگے۔ کتابت وطباعت بھی نہایت پاکیزہ ہے، قیمت عہ ہے اور مولف سے نیچ چھاؤنی کے پتہ پر مل سکتی ہو۔

تاریخ اندور اس کتاب میں خاندان ہلکر کے فرمانرواؤں کے حالات اورنگ زیب کے آخری زمانہ سے لیکر سنہ ۱۹۲۴ء تک کے درج کیے گئے ہیں اور شاہان مالوہ تاریخ کے سلسلہ میں اس کا مطالعہ بھی ازبس ضروری ہے اسکے مولف نے اس کتاب کو ایک فرضی نام حافی خان کی طرف سے شائع کیا ہے، لیکن اسکے ملنے کا پتہ: یہی ہے جہاں سے شاہان مالوہ دستیاب ہو سکتی ہے اسکی قیمت ۱۲ ہے تقطیع بڑی اور حجم ۸۸ صفحات۔

تربیت ۱۷۵ صفحات کا رسالہ ہے جسے انجمن ہلال اتحاد خسرو پور (پٹنہ) نے سید شاہ محمد طہٰ صاحب سے تصنیف کراکے شائع کیا ہے کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے، اسمیں تربیت اطفال کے متعلق مختلف درس تحریر ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ اگر والدین ان پر عمل کریں تو بچوں کی اخلاقی حالت پر نہایت اچھا اثر پڑ سکتا ہے، ہندوستان میں تعلیم کی اسقدر کمی نہیں ہے جتنی تربیت مفقود ہے اور اسوجہ سے ہمارے ہاں کے تعلیم یافتہ حضرات بھی اخلاق کے لحاظ سے بہت پست نظر آتے ہیں اور عملی دنیا میں سخت ناکام۔

ضرورت ہے کہ اس قسم کی کتابیں عام طور پر رائج کی جائیں اور نہ صرف بچوں بلکہ بڑوں کے مطالعہ سے بھی گزریں، امید ہے کہ ملک انجمن ہلال اتحاد خسرو پور کی اس کوشش کو نگاہ تحسین سے دیکھے گا انجمن ہلال اتحاد نے اس سلسلہ میں یہ تیسری کتاب شائع کی ہے۔ اس سے پہلے کی دو کتابیں ہماری نگاہ سے نہیں گزریں طباعت و کتابت اچھی ہے اور قیمت علاوہ محصول ۸ ملنے کا پتہ:۔ خادر ایجنسی خسرو پور (پٹنہ)

اسلامی اٹلس ماسٹر محمد اسحاق صاحب سیتاپوری نے اس نام سے ایک اٹلس ۲۶ نقشوں کا شائع کیا ہے اور مقصود یہ ہے کہ جغرافی حیثیت سے اسلامی ترقی و تنزل کا حال جسقدر معلوم ہونا چاہیئے وہ اس سے ظاہر کر دیا جائے، اسمیں عہد سعادت، خلفاء، عہد اموی و عباسیہ، سلطنت عثمانیہ، مصر، مراکش وغیرہ کے تمام نقشے دیئے ہیں جن کے دیکھنے سے ایک شخص نہایت آسانی سے معلوم کر سکتا ہے کہ اسلامی فتوحات نے کب کسقدر ترقی کی اور اس کا زوال کیونکر ہوا۔ نقشے نہایت صاف و روشن چھپے ہیں قیمت بھی زیادہ نہیں ہے، صرف ہے میں منیجر اسلامی اٹلس مرو ہی ٹولہ سیتاپور سے مل سکتا ہے۔

ضرورت ہے کہ یہ اٹلس ہر پڑھے لکھے مسلمان کے گھر میں موجود رہے۔

خط و کتابت میں نمبر خریداری ضرور لکھنا چاہیئے۔

ہندوستان کی زراعت پر نظر

جب ہم زراعت کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حیات انسانی کے لیئے یہ کسقدر ضروری چیز ہے کیونکہ اسی پر انسانی زندگی کا انحصار ہے اور یہی انسانی غذا کے جزو اعظم کو فراہم کرتی ہے، یہ صحیح ہے کہ بغیر زراعتی اشیاء کے بھی انسان جنگلی پھلوں اور جانوروں کے گوشت پر زندگی بسر کرسکتا ہے، جسطرح عہد وحشت میں رہتا تھا، لیکن اب جبکہ دنیا کی آبادی اسقدر بڑھ گئی ہو، یہ جنگلی پھل اور گوشت کسی طرح کافی نہیں ہوسکتے، علاوہ اسکے دوسرے جانوروں کی ترقی بھی بڑی حد تک زراعت پر منحصر ہے کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی کاشت ہوتی ہیں جن کا غلہ نکال لینے کے بعد، جانوروں کے چارے کے کام آتی ہیں، اور بعض خاص فصلیں تو محض چارہ حاصل کرنے کی غرض سے کاشت کی جاتی ہیں، پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر زراعت ترقی نہ کرتی تو انسان وحشی تھا، اور زراعتی و صنعتی ترقی کے باعث دنیا آج جس تمدن اور ترقی پر پہونچی ہے وہ مفقود رہتی، الغرض انسان کو وحشت سے نجات دلانے کا بڑا ذریعہ زراعت اور زراعت کی ترقی ہے، گو آجکل مصنوعات کی ترقی کا دور ہے اور صنائع کے تنوع نے دنیا کی ترقی میں عجیب انقلابات پیدا کردیئے ہیں، مگر دیکھنا یہ ہے کہ مصنوعات کی ترقی کس چیز کی منت کش ہے، ظاہر ہے کہ جب تک عمدہ اور خام پیداوار نہ ہو صنعت کوئی ترقی نہیں کرسکتی آج کل ترقی یافتہ ممالک کا رجحان صنعت و حرفت کی طرف زیادہ ہے، مگر جیسا کہ اوپر بیان کردیا گیا کوئی صنعت بغیر پیداوار خام کے ترقی نہیں کرسکتی، اس موقع پر انگلستان کی مثال پیش کی جاسکتی ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تو زرعی ملک نہیں اور وہاں کے باشندوں کی زندگی اور مصنوعات کی ترقی باوجود خام پیداوار کی قلت کے ترقی کے اسقدر اعلیٰ مدارج پر پہونچی ہوئی ہے، لیکن کیا یہ حقیقت کسی سے مخفی ہے کہ اسنے دوسرے ممالک سے خام پیداوار حاصل کرنے کا کسقدر زبردست انتظام کر رکھا ہے اسنے اپنے بیڑے اور ہوائی قوت کو کسقدر ترقی دی ہے۔ اگر کوئی ایسی قوت پیدا ہوجائے جو انگلستان کی بحری اور ہوائی قوت کو توڑ دے تو اسوقت انگلستان کی حالت دیکھنے کے قابل ہوگی، لاکھوں آدمی بھوکوں مرجائیں گے اور ملک تباہ ہوجائیگا، انگلستان اسکو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہے اسی لیئے یہ اُن ممالک کو جہاں سے غذا اور پیداوار خام حاصل کرتا ہے اچھی طرح اپنے قبضہ میں لیئے ہوئے ہے، جب تک انسان معاش کی طرف سے بے فکر نہ ہو، وہ پوری ترقی نہیں کرسکتا، چنانچہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ

جب آریہ قوم وسط ایشیا سے منتقل ہوکر ہندوستان میں آئی اور معاش کی طرف سے بے فکر ہوئی، تو اسنے علوم و فنون میں کسقدر ترقی کی الغرض کسی ملک کی حقیقی آزادی اس ملک کی معاشی آزادی پر منحصر ہے بلکہ بڑی حد تک سیاسی آزادی بھی اسی کے تابع ہے۔

اوپر کے بیان سے زراعت کی اہمیت اچھی طرح واضح ہوگئی ہوگی اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں زراعت کی موجودہ حالت کیسی ہے، جب ہم اسکی حالت پر غور کرتے ہیں تو ہم کو نہایت افسوس اور صدمہ ہوتا ہے۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

گو ہندوستان زرعی ملک کہلاتا ہے اور جسقدر معاشی وسائل حاصل ہیں اتنے دنیا کے کسی ملک کو حاصل نہیں لیکن جب ہم اسکی اور دوسرے ممالک کی پیداوار کا مقابلہ کرتے ہیں تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ بعض چیزوں کی مقدار جو یہاں تین اور چار ایکڑ میں پیدا ہوتی ہے وہ دوسری جگہ ایک یا دو میں ہوتی ہے، چنانچہ اسکی مثال ذیل کے ایک نقشہ سے جسکی تحقیق سنہ ۱۹۰۰ء میں کی گئی تھی پیش کی جاتی ہے، یہ نقشہ گیہوں کی کاشت کا ہے۔

ملک	گیہوں فی ایکڑ
ریاستہائے متحدہ امریکہ	گیارہ من سے کم
فرانس	سولہ من کے قریب
جرمنی	بیس من سے کچھ کم
سلطنت متحدہ انگلستان و آئرلینڈ	پچیس من کے قریب
غریب ہندوستان	نو من سے کچھ زیادہ

ہندوستان میں صرف ۶۳ فیصدی رقبہ ایسا ہے جسپر باضابطہ کاشت ہوتی ہے ۸۰ فی صدی ایسا ہی جسپر کاشت نہیں ہوتی مگر وہ زمینیں قابل کاشت ہیں اس حساب سے معلوم ہوا کہ قابل کاشت زمین کا صرف ⅘ حصہ کاشت ہوتا ہے۔

زراعتی پستی کے اسباب

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس پستی کے کیا اسباب ہیں اور انکی اصلاح ممکن بھی ہے یا نہیں۔ یہاں کی زراعتی پستی کے اسباب بہت اور مختلف ہیں، لیکن سب سے پہلی اور بڑی خرابی یہ ہے کہ زمین کم ہے اور اسپر محنت کرنے والے بہت ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنی پوری طاقت صرف نہیں کر سکتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کاشتکاروں کے

پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ وہ وقت پر حسب منشا اور وقت ضرورت صرف کرسکیں۔ تیسرے تنظیم کی کمی ہے، کاشتکار جہل کی وجہ سے دنیا کی پیداواروں اور بازاروں سے واقف نہیں ہوتے اسلئے اپنے کھیت کی پیداوار قریب ہی کی منڈی میں فروخت کردیتے ہیں۔ چوتھا سبب یہ ہے کہ یہاں کے کھیت اسقدر چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہوتے ہیں کہ ان پر جدید قسم کے آلات سے کام لینے میں بجائے فائدہ کے نقصان ہوگا۔ کھیتوں کی تنگی کی وجہ سے تقسیم عمل کا رواج نہیں ہوسکتا۔ کھیتوں کے چھوٹے ٹکڑوں کے علاوہ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ گو بعض لوگوں کے پاس زمین کی مجموعی مقدار کافی ہوتی ہے مگر وہ سب ایک ہی جگہ نہیں ہوتی، کچھ کسی علاقہ میں تو کچھ کسی میں، جس کی وجہ سے پورا انتظام اور نگرانی نہیں ہوسکتی اور کاشت کرنے میں خرچ بھی نسبتاً پاس کے کھیتوں سے زیادہ ہوتا ہے

قانون وراثت

ان کھیتوں کا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ہونا یہاں کے قانون وراثت کی خرابی بتائی جاتی ہے اسمیں شک نہیں کہ اس بیان میں کچھ اصلیت ضرور ہے مگر کھیتوں کی تنگی اور پیداوار کی کمی کا اصلی باعث باہر کے مصنوعات کی درآمد ہے اگر ہم ہندوستان کی پچاس ساٹھ سال قبل کی حالت پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ پہلے زراعت کی اسقدر ردی حالت نہیں تھی، اور نہ لوگ زراعت پر اسطرح ٹوٹے پڑتے تھے، جب باہر کی مصنوعات ملک میں ارزاں سستی ہو ہوکر اور عمدہ بن بن کر آنے لگیں دوسرے اسی کے ساتھ یہاں کی صنعت کو ہر جائز و ناجائز طریقوں سے تباہ کیا گیا تو مجبوراً صناعوں نے زراعت کی طرف رخ کیا کیونکہ اور کوئی پیشہ ایسا نہیں تھا جسکو وہ آسانی سے اختیار کرسکتے، جب ملکی مصنوعات اسطرح تباہ کی جانے لگیں تو زراعت میں لوگوں کی کثرت ہونے لگی نتیجہ یہ ہوا کہ جسطرح بھی ممکن ہوا لوگ کچھ نہ کچھ زمین حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے، قانون وراثت تو پہلے سے موجود ہی تھا اسنے بھی کھیتوں کی تقسیم میں مدد دی۔ اور اسطرح کھیتوں کے حصے بخرے ہوکر مختلف چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئے۔

زرعی پستی کو دور کرنے کی تدبیر

واضح ہو کہ یہاں کے معاشیین کے دو گروہ ہیں ایک مشرقی، دوسرا مغربی اور دونوں اپنے اصول پر زور دیتے ہیں مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مغربی اصول اور قوانین اکثر و بیشتر یورپ کے حالات کے لحاظ سے مقرر کئے گئے ہیں جو ہندوستان پر پوری طرح منطبق نہیں ہوسکتے۔ پروفیسر جونس ([illegible]) نے یہ اسکیم پیش کی ہے کہ پہلے لوگوں کو اس بات پر رضامند کیا جائے کہ کل زمیندار اپنی زمینوں کو سرکار کے حوالے کرکے از سر نو اسکی تقسیم کرائیں جب اکثر لوگ اسپر رضامند ہوجائیں تو بقیہ سے زبردستی یہ اصول منوایا جائے اور پھر زمین کو تقسیم کیا جائے جس کا کوئی ٹکڑا ایک مقدار معین سے کم نہ ہو اسکے بعد بہترین کاشتکار

کے سپرد کر دی جائے۔ اس تقسیم کے بعد جو لوگ بچ جائیں ان کو اس ۱۰ فیصدی زمین میں جو قابل کاشت ہے مگر اسپر کاشت نہیں ہوتی جگہ دی جائے اور آباد کیا جائے۔ قانون شفعہ جو مسلمانوں میں رائج ہے اسپر سختی سے پابندی کیجائے۔ یہ تجویز مغربی ہے کیونکہ ایسی اسکیم کا یورپ کے بعض حصہ ملک پر عمل ہوا ہے اور وہاں بہت کچھ کامیاب بھی ثابت ہوئی ہے۔ مگر ہندوستان کے لوگ کسقدر قدامت پسند ہیں کہ اسپر عمل نہیں کر سکتے۔

مشرقی گروہ جو تجویز پیش کرتا ہے وہ یہاں کے حالات کے لحاظ سے ٹھیک ہو سکتی ہے وہ کہتا ہے کہ پہلے ملک میں معاشی توازن پیدا کیا جائے۔ زراعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کو ترقی دیجائے کیونکہ معاشی اصلاحیں ایسی نہیں ہوتیں کہ پہلے کسی ایک پر عمل ہو اور پھر دوسرے کی اصلاح کا خیال ہو، معاشی اصلاحات کا پہلو بہ پہلو چلنا ضروری ہے، تیسرے یہ کہ ہندوستان کی مالی حالت کو درست کیا جائے اور زرعی قرض کا طریقہ پوری طرح رائج کیا جائے۔

ضروریات زراعت کی کمی

یہاں کی زراعتی پستی کے چند اور اسباب ہیں، اور ان اسباب کی خرابی بجائے خود بہت اہم ہے اور زراعت پر گہرا اثر ڈالتی ہے، مثلاً مختلف ضروریات زراعت (کھاد - قوت محرکہ، آلات کشاورزی) کی کمی پہلے یہاں کے کھاد کو لیجئے اور دیکھئے کہ کونسی خاص چیزیں یہاں کی عام کھادیں ہیں اور وہ اسوقت کس حالت میں ہیں۔ یہاں کی سب سے بڑی کھاد مویشیوں کا گوبر بکریوں کی مینگنیاں ہیں، یا پھر مویشیوں کی ہڈیاں اور روغن دار تخم کی کھلی مگر یہ تمام چیزیں کاشتکار کو جسقدر کم مقدار میں حاصل ہو رہی ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔

کھاد میں کمی کے اسباب

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہی کھاد جو کچھ عرصہ قبل آسانی سے ملتی تھی اب کیوں نہیں ملتی، کیا یہاں کے مویشی اب غلیظ نہیں کرتے، لوگوں نے گوشت کھانا چھوڑ دیا جو ہڈی نہیں ملتی، روغن دار تخم کی کاشت ملتوی ہو گئی، جو کھلی نہیں نکلتی، نہیں یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن اسکی کمی کے اسباب کچھ اور ہیں۔ مثلاً گوبر کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ پہلے محکمہ جنگل قائم نہیں تھے جسکی وجہ سے کاشتکاروں اور دیہاتیوں کو آسانی سے ایندھن یا کسی غریب کے مل جاتا تھا اب قانون جنگل کی سختی کی وجہ سے کاشتکاروں اور دوسرے غریبوں کو ایندھن مفت نہیں ملتا اسلئے وہ گوبر سے ایندھن کا کام لیتے ہیں جب گوبر ایندھن بن جائے تو کھاد کہاں سے آئے، ہڈی کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ قریب قریب تمام ہڈی برآمد کر دی جاتی ہے، روغن دار تخم اور کھلی کی کمی کے [illegible] یہ اسباب ہیں کہ روغن دار تخم بھی بڑی مقدار میں برآمد کر دیئے جاتے ہیں دوسرے خود ہندوستان میں تیل نکالنے کے باضابطہ قسم کے کارخانے بہت کم ہیں اسلیے کھلی بھی بہت کم ملتی ہے۔

اس کمی کو پورا کرنے کے ذرائع

جب کھاد میں اسقدر کمی واقع ہو رہی ہے اور [illegible] جسکی وجہ سے پیداوار میں اسقدر نقصان ہو رہا ہے تو کھاد

حاصل کرنے کی تدابیر اختیار کرنی چاہیئے۔ اسکے حاصل کرنے کی آسان ترکیب یہ ہو سکتی ہے کہ سرکار قانون جنگل میں حمایت کرے تاکہ کاشتکاروں اور دیہاتی غربا کو ایندھن آسانی سے مل سکے اس صورت میں گوبر بیکار رہیگا اور کھاد کے کام آئیگا۔ دوسرے نئے نئے جنگل لگائے جائیں تاکہ جب ایک طرف سے لکڑی کٹتی جائے تو دوسری طرف سے بیدا بھی ہوتی جائے۔ اس صورت میں لکڑی برابر ملتی رہیگی اور اسمیں کمی نہیں ہوگی، تیسرے ہر گاؤں کے اطراف میں مفت چراگاہیں چھوڑی جائیں تاکہ مویشی چر سکیں اور کاشتکار جو روپیہ انکی غذا میں صرف کرتا ہے، کھاد ڈالنے میں صرف کرے۔

اب ہم کو ہندوستانی زراعت میں جس قوت محرکہ سے کام لیا پڑتا ہے اسکی حالت پر نظر ڈالنا چاہیئے، ہندوستان کی زراعت میں بیل سب سے زیادہ کام آتا ہے اور کاشتکاری کے بیشتر کام یہی انجام دیتا ہے گو ہندوستان زرعی ملک کہلاتا ہے پھر بھی اسکی زرعی حالت دوسری جگہ کے لحاظ سے صد درجہ گری ہوئی ہے۔ جب ہم ہندوستان کی مویشیوں کا دوسری جگہ کے لحاظ مقابلہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے سنہ ۱۹۲۰ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ہر سو ایکڑ زیر کاشت رقبہ کے لیے صرف ۶۶ مویشی پڑتے ہیں اور آبادی کے لحاظ سے ہر سو آدمیوں کے لیے صرف ۶۰ برخلاف اسکے دوسرے ممالک کی حالت پر نظر ڈالیئے تو معلوم ہوگا کہ وہ مویشی میں بھی ہندوستان سے کسقدر بڑھے ہوئے ہیں ذیل کے نقشہ سے اسکا فرق بخوبی واضح ہو جائیگا۔

ممالک	مویشی ہر سو آدمیوں پر
ڈنمارک	۷۴
امریکہ	۷۹
کناڈا	۸۰
کیپ کولونی	۱۲۰
نیوزیلینڈ	۱۵۰
آسٹریلیا	۲۵۹
ارجنٹائن ریپبلک	۳۲۲

ان اعداد کے دیکھنے سے پتہ چل سکتا ہو کہ ہندوستان میں مویشیوں کی حالت کسقدر خراب ہے، ہندوستان اور دیگر ممالک کی قوت محرکہ میں صرف اسی قدر فرق نہیں بلکہ وہاں عموماً بجائے بیل کے گھوڑے استعمال ہوتے ہیں اب

آپ گھوڑے اور بیل کی مناسبت کو خود سمجھ سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ آجکل تو یورپ گھوڑوں سے بھی بڑھکر انجنوں اور کلوں سے کام لے رہا ہے مگر غریب ہندوستان اپنی پرانی حالت پر ہے اور اسمیں بھی رو بہ تنزل ہے۔

کمی کے اسباب

یہ قابل خیال بات ہے کہ یہاں کے مویشیوں کی اسقدر خراب حالت کیوں ہے۔ ان کی کمی کے اسباب یہ ہیں کہ پہلے ہر گاؤں کے اطراف میں مفت چراگاہیں ہوتی ہیں جنمیں کاشتکاروں کے جانور آزادی سے چرا کرتے تھے اب سرکار جو افتادہ زمین دیکھتی ہے تو اسپر قبضہ کرکے جنگل میں داخل کرلیتی ہے اسطرح مفت چراگاہیں اسقدر کم ہوگئیں، کہ جانوروں کو مفت چارہ ملنا مشکل ہوگیا دوسرے قانون جنگل میں اسقدر سختی کردی گئی کہ بالخصوص سنٹرل انڈیا اور قانوں کی پابندی کے سوکھی گھاس تک نہیں ملتی اسطرح چارے میں کمی کا لازمی نتیجہ جانوروں پر پڑا۔ انکی تعداد گھٹی صحت خراب ہوئی قوت کم ہوئی اب وہ پورا کام کریں تو کہاں سے۔ ایک دوسری بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ پہلے ہر گاؤں اپنے مویشیوں کی غذا کے لیئے کچھ نہ کچھ ایسی فصل جو چارے کے لیے مخصوص تھی پیدا کرتا تھا مگر اب ضروریات سے مجبور ہو کر چارے کی کاشت ملتوی کر کے کپاس اور روغن دار تخم کی کپیا نے کی وجہ سے چارے میں بہت کمی ہوگئی۔ پھر یہاں سے مویشی برآمد بھی کیئے جاتے ہیں اور یہ لازم ہے کہ اچھے ہی مویشی ملک سے باہر جائینگے۔ اسلیئے اس برآمد کی وجہ سے نسلوں پر بھی خراب اثر پڑا۔

علاج اور افزائش نسل کی تدابیر

ان خرابیوں کو دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ حکومت کاشتکاروں کی مدد کرے، مفت چراگاہیں چھوڑے تاکہ جانور پھر آزادی سے جسطرح پہلے چرتے تھے چر سکیں۔ دوسرے چارے کی کاشت میں سختی کی جائے، اور دیہات میں ضرورت کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ کھیت چارے کی کاشت کے لیئے لازمی قرار دے دیئے جائیں۔ تیسرے چارے کو ایک فصل سے دوسری فصل تک محفوظ رکھنے کا بندوبست کیا جائے۔ چوتھے مویشیوں کی صحت برقرار رکھنے کی تدابیر اختیار کی جائیں اور وہ کاشتکاروں کو سمجھائی جائیں، اسکے بعد افزائش نسل کا باضابطہ انتظام کیا جائے، اگرچہ افزائش نسل کے محکمے اور چوپایوں کے شفاخانے قائم ہو رہے ہیں مگر ان سے جو فائدہ پہونچنا چاہیئے وہ نہیں پہونچ رہا ہے جسکی وجہ یہ ہے کہ یہ محکمے عموماً قصبوں اور بڑے دیہاتوں میں قائم ہوئے ہیں حالانکہ انکو ہر دیہات میں قائم ہونا چاہیئے کیونکہ بڑی مقدار میں زراعت دیہاتوں ہی میں ہوتی ہے اسلیئے کاشتکار کے لیئے یہ امر بہت دقت طلب ہے کہ وہ اپنے مویشیوں کو قصبوں کے شفاخانوں میں لاکر رکھیں اور نسل کے لیئے اپنے جانور دوسرے مقامات سے لائیں۔

زرعی تعلیم

ہندوستان کی زراعتی پستی کی جسقدر وجوہ ابھی تک بیان ہوئے ہیں وہ بجائے خود کچھ کم افسوسناک

نہیں ہیں، مگر ان کے علاوہ ایک بڑی وجہ ذرائع آبپاشی کی کمی ہے، زراعت کے لیے پانی جسقدر اہم ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ضرورت کن کن صورتوں سے پوری ہوتی ہے۔ اسکی چار صورتیں ہیں اوّل بارش جو سب سے بڑی ہے، دوم نہریں، سوم تالاب، اور چہارم کنوئیں۔ ہندوستان کی زراعت کا دارومدار بڑی حد تک بارش پر ہے اگر ہوئی تو کھیت سرسبز ہوگئے اور اگر نہیں تو جھڑ گئے اور قحط نمودار ہو گیا زراعت کے لیے صرف یہی نہیں کہ بارش ہو بلکہ اس کا بقدر ضرورت اور بروقت پر ہونا لازم ہے، اگر بارش وقت پر نہ ہو تو اسکا ہونا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے

جس طرح اسکے وقت پر نہ ہونے سے نقصان ہوتا ہے اسی طرح اسکی کمی اور زیادتی سے بھی نقصان اٹھانا پڑتا ہے ہم اکثر سنتے رہتے ہیں اور ہندوستان میں تو کوئی سال ایسا نہیں گزرتا کہ بعض علاقوں کی کھیتی کثرت یا قلت باراں سے تباہ نہ ہوتی ہو، مگر بارش کچھ انسان کے بس کی بات نہیں کہ جب چاہا اور جتنا چاہا برسا لیا، جب بارش ہمارے اختیار سے باہر ہے تو چاہیئے کہ دیگر ذرائع آبپاشی سے مدد لی جائے اور جہاں تک ہو سکے انکو ترقی دینے کی کوشش کی جائے تاکہ بارش کی کمی اور اسکے وقت پر نہ ہونے سے ملک میں بالکل قحط نہ پڑ جائے، اگر ہم دوسرے ممالک کی حالت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہاں مصنوعی ذرائع آبپاشی کو کسقدر ترقی دیجا رہی ہے اور اس سے کسقدر فائدہ حاصل کیا جا رہا ہے مگر ہندوستان کی حالت اُن سے بالکل جدا گانہ ہے گو حکومت یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ ذرائع آبپاشی میں بہت ترقی ہوئی ہے اور ترقی دی جا رہی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ پہلے سے بھی رو بہ تنزل ہے۔

(ہندوستان کی بارش)

اب ہندوستان کے ذرائع آبپاشی پر نظر ڈالیئے۔ پہلے بارش کو لیجیئے اور اسکی حالت پر غور کیجیئے، تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں بارش کی تقسیم ازحد غیر مساوی ہے۔ کسی صوبہ میں تو اسقدر برسات کہ بس بس کی صدا بلند ہو جاتی ہے، اور کہیں سے العطش العطش کی آواز سنائی دیتی ہے، چنانچہ ہندوستان میں چراپونجی اور مہابلیشور کثرت باراں کے لیے مشہور ہیں ان کا سالانہ اوسط ساڑھے چار سو اور چھ سو انچ ہے، چوبیس گھنٹہ میں پندرہ انچ بارش ہونا تو عام بات ہے بلکہ کبھی کبھی پچیس انچ کی بھی نوبت آجاتی ہے، پروفیسر الیاس برنی اپنی کتاب معیشت الہند میں تحریر فرماتے ہیں کہ "۱۳ ستمبر ۱۸۸۰ کو بہار میں بمقام پورنیا قابل یادگار موسلا دھار مینہ برسا ہم ۲ گھنٹے کے اندر بارش بتیس انچ سے بھی بڑھ گئی، ایسی شدید بارش کو طوفان کہیں تو بجا ہے اسکے برخلاف سندھ، راجپوتانہ اور پنجاب میں بارش بہت کم ہوتی ہے، چنانچہ شمالی سندھ میں بارش

کاسالانہ اوسط تین چار انچ سے زیادہ نہیں ہوتا اور کسی سال تو ایک قطرہ بھی نہیں گرتا، بہار اور شمالی برما میں بارش ٹھیک ہوتی ہے یہاں دوسرے مصنوعی ذرائع آبپاشی کی چنداں ضرورت نہیں، ہندوستان میں صرف چند صوبے ایسے ہیں جنہیں بارش بقدر ضرورت اور بعض میں ضرورت سے کچھ ہی کم ہوتی ہے مگر بقیہ ایسے ہیں جنہیں ضرورت سے بہت کم ہوتی ہے، اور بعض میں گویا ہوتی ہی نہیں، اب ایسی جگہ جہاں بہت کم ہوتی ہے اور ہوتی ہی نہیں وہاں سوائے مصنوعی آبپاشی کے کوئی چارہ نہیں اسلیئے ایسی جگہ ان ذرائع کو جہاں تک ممکن ہو ترقی دیجائے۔ ان کو جسقدر رواج دیا جائیگا اسی قدر قحط کا خدشہ کم رہے گا کیونکہ نہروں اور تالابوں سے بڑی حد تک زراعت ہوسکتی ہے، انسداد قحط کی سب سے بڑی اور اچھی یہی صورت ہے کہ نہروں اور تالابوں کو ترقی دیجائے۔

ہندوستان کی زمینیں دو قسم کی ہیں ایک تری کی، دوسری خشکی کی، تری کی زمین وہ ہے جہاں بارش کافی ہوتی ہے اور خشکی کی وہ جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے، ہندوستان کی زراعت کو درست رکھنے کے لیئے اوسطاً ہر سال ستر انچ پانی کی ضرورت ہے اور ہندوستان کا چوتھائی رقبہ بھی ایسا نہیں جہاں ستر انچ بارش ہوتی ہو، جب بارش کی یہ حالت ہو تو ظاہر ہے کہ دیگر ذرائع آبپاشی کی کہاں تک ضرورت ہے اور زراعتی ترقی کا دارومدار کس حد تک ان پر منحصر ہے، ان کی ترقی صرف انہیں مقامات کے لیے جہاں بارش کم ہوتی ہے ضروری نہیں ہے، بلکہ نہروں اور تالابوں کے لیئے بھی ضروری ہے کہ ضرورت کے وقت یہ تالاب اور نہریں کھیتی کو سنبھال لیں۔

(باقی)

ابوالمنصور حمید

دارالاقامہ کلیہ جامعہ عثمانیہ

دماغی ارتقاء

یہ امر تو طے شدہ ہے کہ آدمی باعتبار اپنی ساخت کے دوسرے جانوروں سے بہت مشابہ ہے لیکن اگر آدمی کے اور دوسرے جانوروں کے دماغی قویٰ پر غور کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے، اگر ہم وحشی سے وحشی انسان اور اعلیٰ سے اعلیٰ بندر کے دماغوں کا مقابلہ کریں، تو بہت بڑا فرق معلوم ہوتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے جانوروں میں سب سے کم درجہ مچھلیوں کا ہے اور سب سے اعلیٰ اور کئی منازل طے کرنے کے بعد بندر کا اور پھر اس سے ایک درجہ بلند خود انسان کا جیسا اس نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے۔
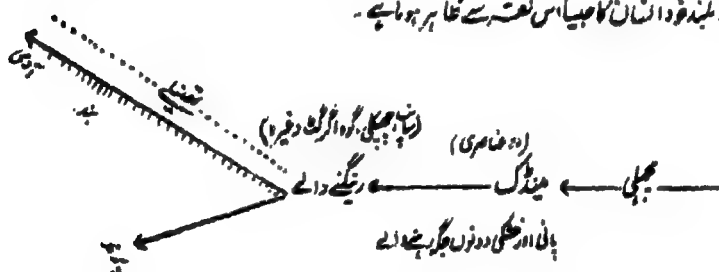
اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہو کہ بندر اور آدمی کے دماغی فرق کے مقابلہ میں مچھلی اور بندر کا دماغی فرق کہیں زیادہ ہونا چاہئے لیکن ایسا نہیں ہے، دماغی نقطۂ خیال سے انسان بندر سے اس سے بھی زیادہ اونچے درجہ پر ہے جتنا بندر مچھلی سے، یہاں ایک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان عقلی خوبیوں کا خود انسان ہی کے اندر آغاز ہوا ہے یا اس نے انکو ورثہ میں پاکر ترقی دی ہے۔ موخر الذکر خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ انسانی دماغ اور نیچے جانوروں کے دماغ میں کوئی اصول فرق نہیں ہے، بلکہ درجہ کا فرق ہے اور نوعیت وہی ہے، جو ہم بندر وغیرہ میں پاتے ہیں

قدرت کے تھیٹر میں جتنی زیادہ دیر ہم ٹھیرتے ہیں ہمارے سامنے نئے نئے پردوں کا ظہور ہوتا ہے، مادے کے بعد حیات۔ حیات کے بعد احساسات، اور احساسات کا دماغ کی صورت میں تبدیل ہونا ایسے سوال ہیں کہ حیاتیات کے طالب علم کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہتے۔ صحبت حاضرہ میں ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ انسان کی یہ بیش قیمت اور خداداد قوت دوسرے حیوانات میں کس طرح پائی جاتی ہے۔

دماغ کی سرگزشت ہم کو چار ذرائع سے معلوم ہوتی ہے۔ اول۔ وہ دماغی قوئی جو ہم نیچے درجہ کے جانوروں میں پاتے ہیں دوم آدمی کے بچہ کے دماغ کا نشوونما۔ سوم۔ اوزار اور ظروف جو قدیم انسان بناتے تھے۔ چہارم ایک وحشی کا دماغ۔ ذیل میں ہم انکو علیحدہ علیحدہ اجمالاً بیان کرتے ہیں۔

یہ ایک پرانا خیال ہے کہ آدمی کی بہ نسبت جانوروں میں ذکا کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ اور جانور جو کام کرتے ہیں وہ اس مادے پر مبنی ہوتے ہیں انکو برے بھلے کی تمیز اور آرام اور تکلیف کی حس خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور کسی عقل و دانش کے اصول پر نہیں ہوتی۔ مثلاً جزائر ملایا کا جانور اورنگ (orang) اور افریقہ کا چمپانزی (chimpanzee) اور دوسرے جانور وہاں کے زہریلے پھلوں کو خوب پہچانتے ہیں اور اُن سے گریز کرتے ہیں حالانکہ ان کے زہریلے ہونے کا علم انسان کو نہیں ہے۔ یہ بات انکی ذکا کی طرف منسوب کی جاسکتی ہے۔ ان کا نقصان کرنے والی چیزوں سے بچنا صرف اسلیئے ہے کہ ان کے دل میں یہ بات جگہ پکڑ گئی ہے کہ ان خاص چیزوں سے بچنا چاہیئے۔ نہ اسوجہ سے کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ نقصان کرنے والی ہیں لیکن دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ اگر یہاں کے جانور لیجاکر غیر ممالک میں چھوڑ دیئے جائیں تو وہ یقیناً ان زہریلے پھلوں کو کھائینگے اور رفتہ رفتہ تجربہ کے بعد جب وہ واقف ہو جائیں گے تو ان سے پرہیز کرنے لگیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ جانوروں کے تمام کام ذکا پر نہیں ہوتے بلکہ ان کے اندر بھی مثل آدمی کے عقل و دانش اور نفع نقصان میں تمیز کرنے کی قوت موجود ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جانوروں کے تمام کام عقل اور دلیل ہی پر مبنی ہوتے ہیں۔ مثلاً بندر کو سانپ سے قدرتاً خوف ہوتا ہے۔ اس کا مقتضائے طبیعت ہی یہ ہے کہ وہ سانپ سے ڈرے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اکثر ایسے کام جو عقل اور دلیل کی بنا پر کیئے جاتے ہیں ایک عرصہ تک دوہرانے سے اور مدت تک ان کو اسی طرح کرتے رہنے سے عادت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ انکی وجوہ کو پیش نظر رکھیں۔ متعدد نسلوں کے بعد یہ عادت موروثی اور آبائی ہو جاتی ہے اور اولاد کے لیئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس کام کی وجوہ سے واقف ہوں۔ اسطرح جانوروں کے اندر ذکا کا مزاج بھی ان کے آباؤ اجداد کی عقل و دانش کے اندر پوشیدہ ہے، جانوروں میں ایک کام کو مشین کی طرح کرنے اور ایک خاص مشق کو ورثہ میں حاصل کرنے کی قوت بہ نسبت آدمی کے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ آدمی جب ایک کام کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ دوسروں کی نقل کرتا ہے اور نقل کے ساتھ اپنے دماغ کو بھی کام میں لاتا رہتا ہے۔ اسکو ہنر سیکھنے کے لیئے مشق کی ضرورت ہے، لیکن ایک پرندکو دیکھیئے

کہ پہلی ہی مرتبہ گھونسلا بنانے میں کہنہ مشقوں کی برابری کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح مکڑی جو پہلی دفعہ جالا بناتی ہے، اتنا ہی باریک کام کرتی ہے جتنا کہ وہ مکڑی جو ہزار مرتبہ جالا تن چکی ہے۔ ان واقعات سے ہم دعویٰ کر سکتے ہیں کہ جانوروں میں بہ نسبت انسان کے ذکا کا مادہ زیادہ ہے۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ تمام جانور انہی جذبات سے متاثر ہوتے ہیں جن سے آدمی، خوف اُن پر اسی طرح طاری ہوتا ہے جسطرح انسان پر۔ شک و شبہ کا جذبہ بھی ان میں موجود ہے۔ مثلاً ہاتھی یا گھوڑے پر چور چوری کی غرض سے نکلتا ہے تو جانور اپنے مالک کے بیٹے کو پہچان کر اسکو مشکوک ہرگز نہیں لیجاتا۔ جانوروں کے اندر غصہ اور غصہ ظاہر کرنے کا مادہ بڑے اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہے۔ وہ انتقام بھی لیتے ہیں اور انتقام لیکر خوش بھی ہوتے ہیں ڈارون ایک چشمدید روایت یوں بیان کرتا ہے کہ "اسس گڈ ہوپ (Cape of Good Hope) (افریقہ) میں ایک فوجی افسر ایک لنگور کو اکثر دق کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اتوار کے روز جب وہ قواعد کرنے کے لیے جا رہا تھا۔ لنگور نے ایک سوراخ میں بہت سا پانی ڈالا۔ اور جلدی سے تھوڑی سی کیچڑ بنائی۔ اور جب وہ افسر نزدیک آیا تو اس نے نہایت ہوشیاری سے وہ ساری کیچڑ اسپر ڈالدی۔ اسکے تمام کپڑے لت پت ہو گئے تمام تماشائیوں نے مذاق بنایا۔ مدت تک وہ لنگور اس افسر کو دیکھ کر اپنی فتح پر خوش ہوتا رہا۔" تمام جانور اپنے بچوں کی جس خوبی سے حفاظت کرتے ہیں وہ سب کو معلوم ہے۔ بندروں کے ایسے بچے جنکے ماں باپ مر جاتے ہیں دوسرے بندروں کے یہاں پرورش پاتے ہیں۔ جسطرح آدمی اپنا دل بہلانے کے لیے کتے بلیاں، طوطے وغیرہ پالتا ہے، اسیطرح ڈارون نے ایک لنگور کا قصہ لکھا ہے کہ اس نے کتے بلی کے بہت سے بچے پالے تھے اور کھانے میں ان کو اپنے بچوں کی طرح برابر حصہ دیتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک بلی کے بچہ نے اپنے ناخن سے اسس لنگور کی کھال کو نوچا لنگور کو سخت تعجب ہوا اس نے بلی کے بچہ کے پاؤں کو اچھی طرح دیکھا اور ناخن نکال کر پھینک دیئے۔

نقل کا مادہ انسان اور خصوصاً وحشی انسان کے اندر بہت بڑھا ہوا ہے اور جسوقت دماغ میں کوئی خلل واقع ہوتا ہے تو یہ مادہ بہت ترقی کر جاتا ہے۔ آدمی اس حالت میں ہر لفظ اور ہر کام کی خواہ لغو ہو یا بامعنی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بندر، آدمی کی نقل اتارنے کے لیے خاص طور پر مشہور ہے دوسرے جانور آپس میں ایک دوسرے کی نقل نہایت آسانی سے کر سکتے ہیں۔ بھیڑیے کے دو بچے جنہوں نے کتوں کے درمیان پرورش پائی تھی، بالکل کتوں ہی کی طرح بھونکتے تھے، طوطے ہر ایک آواز کو جسکو وہ سنتے ہیں ہو بہو دوہرانے میں

کامیاب ہو جاتے ہیں۔

حیوانوں میں قوت ادراک کی بابت اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ علاوہ انسان کے دوسرے جانوروں میں یہ قوت موجود نہیں ہے، لیکن تحقیقات سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ کم و بیش مقدار میں یہ قوت دوسرے جانوروں کے حصہ میں بھی آئی ہے، اسمیں شک نہیں کہ ذکا اور ادراک کے درمیان بے زبان جانوروں کی حالت میں کوئی عملی فرق کرنا نہایت دشوار ہے۔ تاہم جانوروں کو اکثر مرتبہ ہم کام شروع کرنے سے پہلے ٹھیرتے ہوئے، سوچتے ہوئے اور پھر فیصلہ پر پہونچتے ہوئے دیکھتے ہیں جس سے ہم کو ان کی قوت ادراک کا پتہ چلتا ہے، کسی ریگستان میں ایک سیاح سفر کر رہا تھا اور اس کے پاس دو کتے تھے، وہ اسقدر پیاسے تھے کہ ہر مرتبہ جب وہ کوئی گہری خندق دیکھتے تو اسکے اندر بے تحاشا پانی کی تلاش میں جاتے تھے، گویا وہ اپنی قوت ادراک سے یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ صرف کسی غار ہی کے اندر پانی ملنے کا زیادہ موقع ہے، لیکن آدمی کی ادراک اور ان حیوانات کے ادراک میں یہ فرق ہے کہ آدمی چھوٹی چھوٹی باتوں سے نتائج در نتائج نکال سکتا ہے، وہ واقعات کو یکجائی طور پر جمع کرکے ایک کو دوسرے سے متعلق کرکے اور ایک کا دوسرے پر اثر دریافت کرنے کے بعد قطعی فیصلہ پر پہونچتا ہے اور یقیناً اس قسم کا فیصلہ دوسرے جانوروں کے فیصلہ سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے،

ڈارون ایک ہاتھی کی مثال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر کوئی چیز ہاتھی کی پہونچ سے باہر زمین پر ڈالی جائے تو وہ اپنی سونڈ سے اس چیز کے دوسری طرف پھونک مارتا ہے، تاکہ پھونک سے وہ چیز اس سے نزدیک ہو جائے اسیطرح ایک ریچھ نے جو ایک تالاب کے کنارے تھا ایک روٹی پانی میں تیرتی ہوئی دیکھی، نہایت ہوشیاری سے اسنے پانی میں اپنے پنجے سے لہریں پیدا کرنی شروع کیں یہاں تک کہ وہ روٹی نزدیک آئی اور اس نے اٹھالی ایک شخص نے (Paraguay) میں تجربہ کرکے دکھایا ہے کہ بندر تھوڑے تجربہ کے بعد ہی ہر ایک کام کی تہ کو پہونچ جاتے ہیں۔ اور ایک مرتبہ دھوکا کھاکر دوسری مرتبہ اسکو نہایت خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ ایک بندر کو ایک مرتبہ کچھ انڈے دیئے گئے۔ بندر نے جب پہلا انڈا توڑا تو تمام سفیدی اور زردی زمین پر بہ گئی، دوسرے انڈے کو اس نے بہت آہستہ آہستہ ایک پتھر مارا اور پھر انگلیوں سے اس کا چھلکا بڑی صفائی سے علیحدہ کیا اور اس مرتبہ ذرا سی سفیدی یا زردی بھی ضائع نہ ہوئی۔ وہی شخص اس بندر کو شکر کی ڈلی کاغذ میں لپیٹ کر دیا کرتا تھا ایک مرتبہ اس نے شرارت سے زندہ بھڑ کاغذ میں لپیٹ کر دی۔ بندر کو اس مرتبہ پڑیا کھولنے کا بڑا تلخ تجربہ ہوا۔ اور آیندہ کے لئے اسنے یہ احتیاط کی کہ کھولنے سے پہلے تمام پڑیوں کو پہلے کان کے پاس لاتا تھا معلوم

کرنے کو کہ اس کے اندر حرکت کرتی ہوئی کوئی زندہ چیز تو موجود نہیں ہے۔ اس قسم کے کاموں کو ہم جانوروں کی ذکاوت پر مبنی نہیں کر سکتے کیونکہ یہ کام ان کی روزمرہ زندگی کے لیے کچھ زیادہ مفید نہیں اور نہ ان کاموں کی ان کے آباؤ اجداد میں سے کسی نے مشق کی ہے کہ نسلاً بعد نسل میں ذکاوتی صورت میں ظاہر ہوتی۔ جب تک کہ جانوروں کے اندر ادراک کا جزو نہ مانا جائے ان کاموں کے ٹھیک ٹھیک حل کو پہونچنا مشکل ہوگا۔

زبان ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے حصہ میں بلا شرکت غیرے آئی ہے، اس سے انسان اور حیوان مطلق میں امتیاز کیا جاتا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انسان نے بطور نشانی کے "حیوانیت مطلق" کا حصہ دوسرے جانوروں سے ورثہ میں حاصل کیا ہے۔ اسکو اکثر اوقات وہ "غوغا" مچانے کی اسیقدر ضرورت پڑتی ہے جتنی بندر کو "چیں چیں" کرنے کی۔ بھیڑیے کو غرانے کی اور بلی کو میاؤں میاؤں کرنے کی۔ انسان جسوقت اپنا دکھ درد، خوف، حیرت و غصہ ظاہر کرتا ہے تو وہ طرح طرح کی آوازیں نکالنے کے علاوہ قسم قسم کی حرکات اور سکنات سے بھی کام لیتا ہے زبان کے آغاز اور اسکے مفہوم اور تاریخ پر تو لسانیات کا طالبعلم ہی بہتر بحث کرسکتا ہے لیکن ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہماری زبان جو خیالات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے دوسرے جانوروں میں کسی اور شکل میں موجود ہے جس کو ہم نہیں سمجھ سکتے، جسطرح ضرب لتقسیم کے سوال کے طویل ہو جانے سے ضرورت ہوتی ہے کہ ان کو اعداد کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے، اسیطرح دماغ کی ترقی سے اور خیالات کے زیادہ پیچدار اور وسیع ہونے سے ضرورت محسوس ہوئی کہ خیالات دماغ کے باہر لائے جائیں، اور انکو کوئی خاص شکل دیجائے تاکہ وہ محفوظ رہیں اور ان کا سلسلہ قائم رہے۔

دوسرے جانوروں کے اکثر احساسات اور جذبات وہی ہیں جو انسان کے ہیں۔ ان کے اندر فہم و ادراک موجود ہے، وہ نئے نئے طریقے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ایجاد کرسکتے ہیں، وہ تجربے سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ ان کا دماغ کامل نہیں ہے، لیکن دماغ کا وجود ضرور ہے خواہ کسی نوعیت میں اور کسی مقدار میں ہو اس باب میں ہم Mr. Romanoh کے خاص طور سے مرہون منت ہیں کہ انہوں نے کمال محنت کے ساتھ آدمی کے دماغ کا دوسرے جانوروں کے دماغ سے مقابلہ کیا۔ وہ جس نتیجہ پر پہونچے ہیں اس سے حیرت ہوتی ہے کہ جانوروں میں ایک دوسرے کے دماغ کو کسقدر قرب ہے وہ تمام انسانی جذبات جو جانوروں کے اندر پائے جاتے ہیں۔ حسب ذیل ہیں:-

۱- خوف ۲- تعجب ۳- شفقت و محبت

۴- لڑائی جھگڑا
۵- شوق و جستجو
۶- حسد
۷- غصہ
۸- ہمدردی
۹- مقابلہ
۱۰- نخوت
۱۱- کینہ
۱۲- رنج
۱۳- نفرت
۱۴- ظلم
۱۵- مہربانی
۱۶- انتقام
۱۷- غصہ و غضب
۱۸- شرم و حیا
۱۹- افسوس
۲۰- مکاری

سب سے زیادہ قابل غور امر یہ ہے کہ یہ فہرست اس ترتیب میں رکھی گئی ہے جس ترتیب سے ان جذبات کا جانوروں کے اندر آغاز ہوا ہے کیونکہ مسئلہ ارتقاء میں قدرتی ترتیب کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے Mr. Romen نے کیچوے کے اندر بھی جو شجرۂ ارتقاء میں بہت نیچے پایا جاتا ہے خوف کا جذبہ پایا ہے۔ اسکے بعد زیادہ ترقی یافتہ کیڑوں کے اندر محنت، لڑائی جھگڑا، شوق و جستجو کے جذبات دریافت ہوئے ہیں۔ حسد کا آغاز مچھلیوں کے ہاتھ ہوا ہے۔ ہمدردی پرندوں کے ساتھ شروع ہوئی ہے۔ ظلم و نفرت اور رنج کے ذمہ دار گوشت خور جانور ہیں۔ بندروں کے ساتھ افسوس۔ شرم اور دھوکہ شروع ہوتا ہے۔

دماغی ارتقاء کی دوسری شہادت ہم کو انسان کے بچہ کے دماغ سے ملتی ہے۔ دماغی قوت بچہ کے پیدا ہونے کے بعد شروع ہوتی ہے، وہ بڑھتی ہے، پختہ ہوتی ہے، اور تنزل پذیر ہوتی ہے بالکل یہی طریقہ ہم جسم میں بھی پاتے ہیں۔ جسطرح جنین اپنی مختلف منازل میں حیوانی ارتقاء کی کم و بیش پوری تاریخ بتاتا ہے اسیطرح پیدا ہونے کے بعد اس کا دماغی جنین بھی ترقی کرتا ہے اور اسکی تمام قوتیں اسی ترتیب سے نمودار ہوتی ہیں جس ترتیب میں وہ یکے بعد دیگرے انسان سے پہلے اور حیوانات میں ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ اسطرح دماغی ارتقاء کی پوری تاریخ اور کیفیت انسان کے ترقی کرتے ہوئے دماغی جنین کے مطالعہ سے اخذ کیجا سکتی ہے۔ جب ہم جانوروں کے اندر جذبات کی مندرجۂ بالا فہرست انسان کے ترقی کرتے ہوئے دماغی جنین سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہم دونوں کے اندر ایک ترتیب پاتے ہیں، پیدائش سے تین ہفتے بعد انسان کے بچہ میں خوف کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ سات ہفتے بعد محبت۔ بارہ ہفتے کے عرصہ میں حسد اور غصہ۔ پانچ ماہ بعد ہمدردی۔ آٹھ ماہ کے بعد نخوت اور کینہ، اور پندرہ ماہ کے بعد ندامت اور افسوس کا آغاز ہوتا ہے ان واقعات کو اور حیوانات میں جذبات کے آغاز کو ساتھ رکھکر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جذبات والے جانوروں میں سب سے پہلے جانور میں خوف کا جذبہ پایا

جاتا ہے۔ بعد میں زیادہ ترقی یافتہ جانوروں نے اسپر محبت، حسد، غصہ وغیرہ کا اضافہ کیا یہاں تک کہ مندرجہ بالا فہرست مکمل ہوگئی اور خود انسان نے اس فہرست میں مذہبی احساس اور اخلاق کا اضافہ کیا۔ یہ دونوں جذبات حیوانوں کے اندر نہیں پائے جاتے۔

دوسری طرف جب ہم تنزل کرتے ہوئے دماغ کو دیکھتے ہیں خواہ وہ کسی سبب سے ہو، تو بھی دماغی ارتقا میں اسی ترتیب کی تائید ہوتی ہے، یعنی پورا دماغ ایک دم ضائع نہیں ہو جاتا، بلکہ دیوار میں سے ایک ایک اینٹ کی مانند رفتہ رفتہ تمام جذبات اور احساسات زائل ہو جاتے ہیں، تنزل کی ترتیب ترقی کی ترتیب کے برعکس ہوتی ہے۔ جب آدمی پاگل ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ قوت ضائع ہوتی ہے جو سب سے بعد پیدا ہوئی تھی، اور اس کے بعد اس سے پہلے پیدا ہونے والی قوت ضائع ہوتی ہے جسکو ہم ذیل کی صورت سے ظاہر کر سکتے ہیں۔

(۴) ←··········→ (۴)
(۳) ←··········→ (۳)
(۲) ←··········→ (۲)
(۱) ←··········→ (۱)
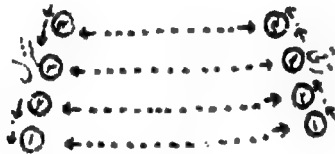
فرض کیجیے کہ بچہ کے اندر سب سے پہلے قوت نمبر (۱) پیدا ہوئی۔ اسکے بعد (۲) پھر (۳) اور آخر میں (۴)۔ بوڑھے آدمی یا ایسے شخص میں جسکو دماغی بیماری ہو پہلے قوت (۴) ضائع ہوگی پھر (۳) پھر (۲) اور سب سے آخر میں (۱)۔ یہاں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پرانی ضرب المثل کہ بوڑھے آدمی کی طبیعت بالکل بچے کی طبیعت کے مانند ہوتی ہے کسقدر رسا ہے۔ آدمی جتنا کم بوڑھا ہوگا اتنے ہی بڑے بچے کی مانند ہوگا اور جتنا زیادہ بوڑھا ہوگا اتنے ہی چھوٹے بچے کی سی اسکی طبیعت ہوگی۔ پہلے درجہ کا بوڑھا یعنی جسمیں صرف (۴) ضائع ہوا ہے اور باقی تین قوتیں رہ گئی ہیں ایسے بچہ کے مشابہ ہوگا جسمیں (۴) پیدا نہیں ہوئی ہے اور صرف تین قوتیں موجود ہیں۔ اسیطرح (۳) اور (۲) کا حال ہے یعنی ایسا شخص جس میں صرف (۱) باقی رہ گئی ہے ایسے بچے کی مانند ہوگا جسمیں صرف (۱) ہی پیدا ہوئی ہے۔ (ہمارا یہ مطلب نہیں کہ قوتیں صرف چار ہیں بلکہ نقشہ کو زیادہ طول نہ دینے کی وجہ سے صرف ۴ تک کے اعداد رکھے ہیں) سب سے آخر میں پیدا ہونے والی قوت مغز میں اچھی طرح جگہ نہیں پکڑ سکتی کیونکہ اسکا مقابلہ دوسری قوتوں سے بہت سخت ہوتا ہے، اس کا وجود وہاں ہر وقت معرض خطر میں رہتا ہے اور ذرا سی بیماری اور خلل کے واقع ہونے سے اُسی سبب سے آخری قوت کو فوت ہونا پڑتا ہے، ہم ایسی مثالوں

سے بخوبی واقف ہیں کہ بڑے بڑے ذہین ہشیار اور سمجھدار لوگ ذرا سی بیماری میں اپنا سارا ذہن، ہشیاری اور فہم کھو بیٹھتے ہیں اور بالکل بیوقوف اور پاگلوں کی مانند بدحواس ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے پارسا بزرگ جو اخلاق کے جوہر میں سراپا مرصع ہوتے ہیں ذرا سے خلل دماغ پر وہ اخلاقی جرم کرنے لگتے ہیں کہ سننے سے نفرت ہوتی ہے۔ اسکی وجہ سوائے اسکے اور کیا ہو سکتی ہے کہ ذہنی پارسائی اخلاق وغیرہ ایسے جوہر ہیں کہ خود انسان کے حاصل کئے ہوئے ہیں اور جو دوسرے جانوروں میں نہیں پائے جاتے، اسلئے تمام جذبات، تمام احساسات اور تمام قوتوں کے بعد آدمی میں یہ قوتیں پیدا ہوتی ہیں اور چونکہ سب سے بعد میں پیدا ہوتی ہیں لہٰذا جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں انسان کے نظام میں کوئی مستحکم جگہ نہیں اور تھوڑی سی خرابی کے سبب برباد ہونے پر مجبور ہوتی ہیں۔

اب ہم دماغی ارتقا کی تیسری شہادت کو لیتے ہیں۔ خود تاریخ انسانی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ کے انسان کا دماغ ہمارے دماغ سے بہت کمتر درجہ پر تھا، اسوقت سے اسوقت تک برابر انسان کا دماغ ترقی کرتا رہا ہے، ہتھیار اور اوزار زمین کے نیچے ایسے پائے گئے ہیں جنکا تاریخی پتہ لگانے کے بعد مختلف زمانہ میں انسان کے دماغ کی کیفیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض مقامات پر ہم جتنا تاریخ میں اوپر جاتے ہیں تنزل کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، لیکن ان واقعات سے اس مسئلہ میں مجموعی طور پر کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ ارتقا میں متعدد مثالیں ایسی موجود ہیں کہ ایک زمانہ میں ایک خاص حیوانی جنس نہایت شاندار پیرایہ پر زندگی بسر کرتی ہے اور زمانہ مابعد میں اسکی حالت نہایت ابتر ہو جاتی ہے، یہ واقعات مسئلہ ارتقا کو ثابت کرنے کے لیے کسی قسم کی سد راہ نہیں ہوتے، بلکہ ارتقا کا مزید ثبوت پیش کرتے ہیں۔ غیر موزوں کا تنزل اور رفتہ رفتہ ہلاک ہو جانا ارتقا کا ایسا ہی جزو لاینفک ہے جیسا کہ موزوں کا عروج۔ اسیطرح انسانی تاریخ میں اگر کسی زمانہ میں ایک بہت بڑی قوم زوال پذیر ہے، تو یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ کل بنی نوع انسانی تنزل پر ہیں بلکہ صحیح خیال یہ ہوگا کہ وہ خاص قوم زمانہ کے لحاظ سے غیر موزوں ثابت ہوئی، اور ترقی کا اقتضا یہ ہے کہ وہ صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو جائے اور اسکی جگہ نئی قوم آباد ہو، اہرام مصر کو اور دنیا کے کھنڈروں کو دیکھکر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ انسان کے اندرونی دماغی ترقی کے بجائے تنزل ہی کا قاعدہ ہے۔ لیکن تنزل سے پہلے انکی ترقی کا سوال ہے کہ آیا انہوں نے پستی سے بلندی پائی تھی اور اسطرح ارتقا کلی طور پر ثابت ہوتا ہے، پتنگ کو کٹنے کے بعد نیچے گرتا ہوا دیکھکر

کوئی بھی یہ خیال نہیں کرتا کہ وہ آسمان سے یا بادلوں سے پیدا ہو کر نیچے آرہا ہے۔ اسی طرح ایک پتنگ کو نیچے آتا ہوا دیکھ کر پتنگوں کے اونچا اڑانے کی طاقت میں ذرا بھی شک نہیں ہوتا اسی طرح ایک قوم کو یا ایک حیوانی جنس کو زوال میں دیکھ کر مسئلہ ارتقا میں ہرگز جنبش نہیں ہوسکتی۔

انسان کی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا تھا کہ انسان اپنے ہاتھ پاؤں کے علاوہ صرف پتھروں کے ٹکڑوں اور جنگلوں کی لکڑیوں کو حوائج کے رفع کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا، اگر فی الواقع اس زمانہ کے آدمی نے حیوانوں پر کچھ ترقی کی تھی، تو وہ بس اتنی ہی تھی جتنی ان بھونڈے بھدے ہتھیاروں سے ظاہر ہوتی ہے، جو تمام یورپ کے طول و عرض میں، مغربی ایشیا میں اور ہمالہ کے شمال میں اور جزائر ملایا میں کثرت سے دستیاب ہوتے ہیں۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، چین و جاپان، امریکہ میکسیکو، پیرو اور بحر الکاہل کے مونگے کے جزیروں میں بھی ہتھیار زمین کے نیچے بیٹھا گڑے ہوئے موجود ہیں، بچہ کا لکڑی اور چینی کے کھلونوں سے کھیلنا اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ ابھی بچہ ہے اور اس کے اندر پورے آدمی کے برابر سمجھ نہیں ہے۔ جب ہم کل بنی آدم کو پتھروں اور لکڑیوں سے کام لیتا ہوا دیکھتے ہیں تو ہم اپنے نتیجہ میں بالکل حق بجانب ہیں کہ اس زمانہ میں ان کے اندر پوری سمجھ نہیں اور ان کی عقل کامل ہونے سے اتنی ہی دور تھی جتنی ایک بچہ کی، رفتہ رفتہ جب انہوں نے سمندر کے کنارے اور پہاڑوں میں صاف اور چکنے پتھر کے ٹکڑے دیکھے تو ان کو بھی اپنے اوزار صاف اور ستھرے بنانے کا خیال ہوا۔ پتھر کے زمانہ کے بعد دھات کا زمانہ آتا ہے، اسکی تاریخی ہیئت سے بحث کرنا ہمارے موضوع کے خلاف ہے، صرف ہم یہاں سے انسانی دماغ کی بتدریج ترقی کا نتیجہ نکالتے ہوئے اسکے چوتھے ثبوت پر آتے ہیں۔

دنیا کی عمر زیادہ ہوتی جا رہی ہے، لیکن اب بھی ایک سیاح ابھی آثار قدیمہ کی زندہ مثالیں افریقہ، امریکہ آسٹریلیا اور دوسرے جزائر کے وحشی باشندوں میں پا سکتا ہے، کچھ تو شائستہ اور مہذب صحبت پاکر ترقی کر چکے ہیں۔ کچھ شائستگی اور تہذیب کا شکار ہو چکے ہیں، اور کچھ اپنی بدقسمتی سے آباؤ اجداد کی پست حالت کا ثبوت لیے ہوئے، بجنسہٖ اسی صورت میں موجود ہیں، کوئی بھی زندگی آجکل ایسی نہیں جس کا ان صحرائی وحشیوں کی طرز معاشرت سے مقابلہ کیا جا سکے، جزائر ملایا اور جنوبی بحر الکاہل کے جزیروں میں اب تک ایسے لوگ آباد ہیں جنہوں نے کبھی بھی مہذب دنیا کا نام نہ سنا ہوگا۔ ان کا درختوں کے سایہ میں پریشان پھرنا، کھانے کے لیے درختوں سے پھل توڑنا اور سنگلاخ پتھریلی زمین پر بالستر کے آسمان کے نیچے سونا ہمارے او

اور ان کے درمیان فرق کو اچھی طرح قائم کر دیتا ہے۔ آسٹریلیا کے براعظم اور آس پاس کے جزیروں کی سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ کل تک وہاں کے باشندوں نے سوائے درخت کے دوسری چیز نہ دیکھی تھی، سو برس کا عرصہ ہوا کہ کپتان کوک نے ان جزیروں کو دریافت کیا۔ اس نے وہاں کے لوگوں کو کچھ لوہے کی کیلیں دیں انہوں نے اس امید میں کہ وہ بڑی ہو جائینگی ان کو لیکر زمین میں گاڑ دیا، اور پانی دینا شروع کیا۔ ہمارے اور ان کے درمیان سمندر، بناکر قدرت نے ان کو تمام بیرونی مصائب سے بچایا ہے، وہ زندگی کے مقابلے سے دور پڑے ہوئے ہیں اور اسلیئے زندگی سے بھی دور ہیں، قدرت ان کے ساتھ بچوں کی طرح برتاؤ کرتی ہے، اور انکی قومیت اسوجہ سے عالم طفولیت ہی میں رہتی ہے۔

اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ کسطرح وہ صحرائی وحشی اپنے دماغ کو ترقی دیکر حقیقی معنوں میں آدمی ہوا جب ہم پہلی دفعہ اسکو دیکھتے ہیں تو وہ ہم کو آسمان کے نیچے جلتی ہوئی زمین پر دھوپ میں بیٹھا ہوا ملتا ہے وہ اسمیں اپنی انتہائی آسائش دیکھتا ہے۔ وہ بالکل خاموش ہے، اور اپنے لیئے کچھ نہیں کرنا چاہتا، لیکن قدرت اپنا کام کرنے کے لیئے بےچین ہے، وہ اس وحشی کو اس حالت میں نہیں رکھنا چاہتی، وہ اس بیٹھے ہوئے مطمئن جانور کو حرکت دینا چاہتی ہے، کیونکہ حرکت سے اسکا مطلب کثرت جسمانی اور ورزش اعضا ہے اور بلا ورزش کے ترقی ناممکن۔ اس جانور کو حرکت دینے کی سہل ترکیب یہ ہے کہ قدرت خود حرکت کرے۔ سورج مغرب کی طرف جاتا ہے اور خنکی آتی جاتی ہے۔ اندھیرا بڑھتا جاتا ہے، سردی سے اور اندھیرے میں جانوروں کے خوف سے اور بھوک سے وحشی اپنی سلامتی کی تدبیر کرتا ہے، کھانا تلاش کرتا ہے، اور اس قسم کی تلاش اسکے جسم کو اور رگ پٹھوں کو مضبوط بناتی ہے، اور اسکی عقل کو تیز کرتی ہے، اور وہ اپنی عادت بدلتا ہے، سردی میں برف پڑتی ہے اور اب ان کو مجبوراً کوئی سمور والے جانور کا شکار کرنا پڑتا ہے۔ ضرورت اور احتیاج وہ کام کراتی ہے جو اس نے کبھی نہیں کیا اور نہ کبھی کرنے کی خواہش کی۔ اسکو دو خطروں کا سامنا ہے، یعنی اگر ایک طرف طبعی حالات سے مقابلہ ہے تو دوسری طرف مردم خور جانوروں سے۔

ہم ایک مرتبہ پھر اس زمانہ کی یاد کرتے ہیں جبکہ آدمی حیوانیت سے سر اٹھا رہا تھا اور ابھی درختوں پر ہی زندگی بسر کرتا تھا، یہ آدمی جسمانی لحاظ سے کوئی مضبوط اور طاقتور نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو کبھی ترقی نہ کر سکتا۔ اپنے بچاؤ کے لیئے اسکو دماغی تدبیروں پر اعتماد کرنا پڑتا تھا جب اسکو غنیم سے خطرہ ہوتا تھا تو وہ

بجائے اپنے تیز دانتوں اور پنجوں سے کام لینے کے درختوں کی شاخوں کو اپنی مدافعت میں استعمال کرتا تھا۔ یہاں ہم لاٹھی کا آغاز کرتے ہیں۔ لاٹھی کو ٹھیک استعمال کرنے کے لیئے اور دشمن پر اچھی طرح نگاہ رکھنے کے لیئے ضروری ہوا کہ وہ دو پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو۔ اول تو وہ اگلے ہاتھوں میں درخت کا کٹا ہوا گدّھا سنبھال کر کھڑا ہوا لیکن رفتہ رفتہ یہ انکی عادت کے اندر شامل ہو گیا اور وقت گزرنے پر اعضا کی ساخت نے بھی عادت سے مطابقت کی۔ سیدھا کھڑا ہونے کی عادت کو مقابلتہً اتنا تھوڑا عرصہ ہوا کہ ابھی تک آدمی زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہ سکتا۔ جب اسکو بیٹھنے کا موقع ملتا ہے فوراً بیٹھ جاتا ہے۔ خفیف بیماری اور کمزوری کی حالت میں تو کھڑا رہنا اسکے لیئے محال ہے۔ (مہذب دنیا میں چھڑی ہاتھ میں لیکر چلنے کا رواج ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب بھی آدمی اپنی پرانی عادت پر کاربند ہے)

اس قدیم آدمی کو ایک درخت سے دوسرے درخت پر جانے کی ضرورت پڑتی تھی، اپنی حفاظت کے لیئے درخت کی چھال کی ڈھال ایجاد کی، اور جہاں درختوں پر چھال نہ ہوتی تو گھاس سے یا پتوں کے ڈنٹھل سے ایک اچھی خاصی چوڑی ڈھال بُن لیتے تھے۔ اور فرصت کے وقت یہ ڈال لکڑی اور کشتی کا کام بھی دیتی تھی۔ زمین میں گڈھے کھود کر اور اسکو پتوں سے ڈھک کر اس نے اپنی خوراک اور پوشاک کے لیئے بڑے بڑے جانوروں کو اپنی قید میں لانا شروع کیا۔ نوکیلی لکڑی سے جڑوں کو اکھاڑتے ہوئے اسکی سمجھ میں آیا کہ قدرت نے کسطرح درختوں کو زمین کے اندر مستحکم کر کے انکی بالائی شاخوں کو فروغ دیتی ہے۔ چنانچہ اس طریقہ پر اسے بونا شروع کیا۔ اور اچھا خاصا کسان بن گیا۔ آس پاس کی زمین کو اپنے قبضہ میں کر کے ایک معقول جائداد کا مالک بن بیٹھا۔ اور ایک جگہ سکونت اختیار کی۔ اب اس نے دودھ اور گوشت حاصل کرنے کے لیئے جنگلی جانوروں کو پکڑنا اور پالنا شروع کیا۔ جو اسکے شکار میں بھی کام آتے تھے۔ اسطرح اسکا دماغ قوی اور روشن ہوتا گیا اور وہ وحشیانہ زندگی سے انسانی زندگی کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

ان کے علاوہ اور بہت سے ایسے آثار پائے جاتے ہیں جن سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ کسطرح انسان نے اپنا وجود اپنے کم درجہ کے جانوروں سے پایا۔ اسی طرح اپنے جسم میں بھی کچھ تھوڑی بہت ترقی کی۔

شمعون احمد۔ الہ آباد یونیورسٹی

حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ

نام کلیم اللہ۔ مرز بوم دہلی۔ وطن اصلی خجند۔ سلسلۂ نسب سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے ملتا ہے۔ والد کا نام حاجی نور اللہ تھا، وہ شیخ احمد بن شیخ حامد کے بیٹے تھے، جو خجند کے ایک رئیس تھے۔[1]

حاجی نور اللہ ریاضیات کے ماہر تھے، خصوصاً فن ہندسہ و معماری میں کمال رکھتے تھے[2] زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہوکر وطن سے نکلے، اور معاش کی طلب میں در در کی خاک چھانی، اور چاہا کہ وطن سے قریب ہی کسی جگہ قدم جمالیں، لیکن ہر کوشش میں ناکام رہے[3] کہ چارہ ساز حقیقی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان مسلمانوں کے عروج و اقبال کا گہوارہ تھا، فاتحانہ جلال و جبروت کے شادیانے بج رہے تھے، فیروزمندانہ شان و شوکت کی شمعیں بزم نواز تھیں، گوشہ گوشہ تہذیب و مدنیت کی روشنیوں سے بقعۂ نور تھا، ہر علم و فن کے استادوں کی نظریں اسی طرف اٹھتی تھیں، اور کامیابی کے پھولوں سے دامن مراد بھرتی تھیں۔

حاجی پھرتے پھرتے تنگ آگئے تھے، قرب وطن کا خیال چھوڑ کر تیموریوں کی حکومت میں بخت خفتہ کو جگانے آئے، اور پنجاب کے مختلف شہروں میں پھر باعزت معاش کو ڈھونڈا، لیکن قسمت کا آفتاب ابھی گہنا رہا تھا، کسی جگہ کامیابی کا چہرہ نہ دیکھا، مجبور و مایوس ہوکر رونے لگے، کہ جیب میں ایک پیسہ بھی نہ تھا جو کہیں اور جا سکیں خدا کو رحم آگیا، اس نے اسی وقت کسی کے دل میں غم خواری اور مسافر نوازی کا جذبہ پیدا کرکے بھیجا کہ حاجی کے ٹوٹے ہوئے دل کو امید کی آب و گل سے جوڑ دے۔ اسنے حاجی کے آگے دیناروں کی ایک تھیلی[4] ڈالی اور کہا:- اے عزیز مسافر! اٹھ، کمر ہمت باندھ، اور اپنے کاشانۂ مراد کی راہ لے" یہ آواز حاجی کی امید خزاں دیدہ کے لیئے نوید بہار تھی، جس نے اسکے تمام رنج و غم کو دل سے دھو دیا۔

یہ شخص ایک رئیس کا میر منشی تھا، اور ایک انجینر کی تلاش میں نکلا تھا۔ حاجی اسکے ساتھ لاہور آگئے

---

[1] معین الاولیاء [2] سلسلۂ نظامیہ [3] سیر السالکین

اور جو کام تھا اسے بحسن و خوبی انجام کو پہونچایا[1]۔ اس سے سارے شہر میں انکی شہرت ہو گئی، تقدیر نے کروٹ لی امرا و وزرا سے ملاقاتیں ہوئیں، حاکم لاہور کو خبر ملی تو اس نے بھی مشورہ طلب بھیجا، اور سرکاری ہندسوں میں نام لکھ کر روزینہ مقرر کر دیا[2] لیکن حاجی کی قسمت کا ستارہ اس سے بھی بلند مطلع پر چمکنے والا تھا۔

شاہجہاں نے شاہجہاں آباد کی بنیاد رکھی، تو اس کے قلعہ و ایوان سرا کی تعمیر کے لیے باکمال مہندسوں کو جمع کرنا چاہا، گو دار السلطنت ایسے باکمالوں سے خالی نہ تھا، مگر ظل سبحانی کی خواہش تھی کہ اپنی قلمرو کے تمام ماہرین فن سے مشورہ کر کے نقشے تیار کرائیں، اور جو جس میں زیادہ ماہر ہو وہ کام اس کے تفویض کیا جائے، اس غرض سے ہر صوبے کے عاملوں کو احکام بھیجے گئے، عاملوں نے اپنی سرخروئی کے لیے بہت جانچ پڑتال، اور بڑی چھان بین کی، اور ہر اہل فن کو اپنی قابلیت کے بڑے بڑے امتحان دینے پڑے، لیکن پنجاب میں کوئی امتحان گاہ نہ تھی، یہاں سب کی مہندسانہ قابلیتیں حاجی کے آگے ماند پڑ گئی تھیں، حاکم لاہور نے ان کو حکم سنایا، اور شاہی کروسامان سے دہلی روانہ کر دیا[2]

قسمت کی نیرنگیاں دیکھو: یہی غریب الوطن مسافر جو خجند سے بالکل بے خانماں لاہور آیا تھا، نہایت تزک و احتشام سے دہلی کے دربار شاہی میں جا رہا تھا۔ گلزار السالکین میں لکھا ہے:۔

"والد ماجد او بشان و شوکت در دہلی رونق افروز شد، جمعے از خادمان شاہی استقبالش کردند"

دربار میں حاضری دی کر احکام حاصل کئے، مشورے کے جلسوں میں شرکت کی، اور ہر جلسے خراج تحسین لیکر اٹھے، اپنا متعلقہ کام سنبھالا، تعمیر کا سلسلہ جاری ہو کر ختم ہوا، اور حسن خدمات کے صلہ میں دربار نے وظیفہ مقرر کیا، جو تا حیات جاری رہا اور حاجی ہمیشہ کے لیے دہلی میں مقیم ہو گئے۔

حاجی حسن کمال کے ساتھ حسن اخلاق کی خداداد دولت بھی رکھتے تھے، حفظ مراتب آداب مجلس، اور ہر موقع و محل کی گفتگو سے اچھی طرح واقف تھے، زبان اتنی شیریں اور انداز بیان اتنا دلنشیں پایا تھا کہ بہت لوگ اسی پر گرویدہ تھے، اس پر خاندانی شرافت کی آمیزش نے تو اس رشتہ کو ہر دل کے لیے زنجیر بنا دیا تھا، حاجی اپنی اسی تیر و کمان سے جسکو چاہتے اپنا بنا لیتے، اور جس سے چاہتے عزیزانہ راہ و رسم پیدا کر لیتے تھے[3]

متوسلین دربار میں ایک صاحب مولوی احمد علی نامی سے تو اتنی راہ و رسم بڑھی کہ انہوں نے اپنی لڑکی سے حاجی

---

[1] سیر السالکین۔ [2] سلسلۂ نظامیہ [3] سیر السالکین

کا نکاح بھی کر دیا، اسی نیک بی بی سے وہ فرزند سعید پیدا ہوا[1] جسکی روحانی جہاں ستانی نے اپنے گمنام خاندان کو زندگی جاوید بخشی - والدین نے ان کا نام کلیم اللہ رکھا اور اس نام کی تاثیر نے اسکو ایسا ہی بنا دیا -

فتشبہوا ان لم تکونوا مثلہم ان التشبہ بالکرام کرام

فرزند کی ولادت نعمت کہولت کا بالکل آخری میوہ تھا، اسلیئے حاجی کو بچہ سے محبت تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اپنی زندگی ہی میں اسکو تعلیم علم و دانش کا تاجدار بنا دیں، اسی غرض سے انہوں نے مختلف اساتذہ مقرر کیئے اور ایک صالح اتالیق کی خدمات بھی حاصل کیں جو کھانے پینے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھائے۔ تعلیم کا ایک تدریجی نقشہ بنایا، اور شاہی عملوں سے بھی پڑھنے کا انتظام کیا، اسی اصول اور اعلیٰ تعلیم نے کلیم اللہ کو اٹھارہ برس کی عمر میں فاضل یگانہ بنا دیا، مناقب الاولیا میں لکھا ہے:-

"در سن شانزدہ سالگی فنون کثیرہ تحصیل نمودہ استعداد عالی بہم رسانیدہ، رایت فوقیت در مستعدان زمان برافراشت شد"[1]

صاحب معین الاولیا بھی اس کے ہم نوا ہیں -

"در علوم دینی شہرۂ آفاق ودر ریاضت و مجاہدہ طاق بود"[2]

اسی محضر پر آزاد کی مہر تصدیق یہ ہے -

"در علوم عقلی و نقلی پایۂ بلند، و در حقائق و معارف رتبۂ ارجمند داشت"[3]

فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہر کام کے لیئے راستہ صاف تھا، خواہ درس و تدریس شروع کریں یا مطالعہ و تصنیف کلیم اللہ نے تصنیف و مطالعہ کو پسند کیا، اور پورے ذوق و شوق کے ساتھ اسمیں منہمک ہوگئے۔ سب سے پہلے تاریخ منطق لکھی[4]، منطق و فلسفہ کے بعض مباحث پر کم و بیش ۲۲ رسالے تحریر کیئے، جن میں بعض سات سات جزو سے متجاوز تھے ان ہی میں صدر اللہ کی شرح اور شرح ملا کا حاشیہ بھی تھا، اسکے بعد فقہ اور علم کلام پر قلم اٹھایا[5]۔ لیکن افسوس ہے کہ آج اس نادر ذخیرہ کا ایک صفحہ بھی باقی نہیں۔ بعد کو جو کتابیں لکھیں ان کا موضوع تحریر تصوف تھا، مگر ان کا بھی بڑا حصہ ضائع ہوگیا، جو بچ رہا اسمیں سے کچھ چھپ چکا ہے، اور عام طور سے کتب فروشوں کے ہاں ملتا ہے۔

لیکن حاجی چاہتے تھے کہ آپ گوشہ تحریر و مطالعہ سے نکل کر مسند درس آراستہ کریں۔ انہوں نے کئی دفعہ

---

[1] ص۵۵ [2] ص۲۲۴ [3] ص۲۳ حصہ اول ص۲۷ تذکرۃ الفضلا [5] سیر السالکین -

کہا مگر یہ باتوں باتوں میں ٹال گئے، آخر ان سے نہ رہا گیا، اور ایک بلیغ انداز میں پوچھا: "بہنے والا چشمہ بہتر ہے یا ساکن کنواں؟ کہا:- بہنے والا چشمہ، وہ بولے:- تو تم اپنے لیے کونسی چیز پسند کرتے ہو؟ کلیم اللہ خاموش ہوگئے، انہوں نے کہا:- فارغ التحصیل ہوچکے، مطالعہ میں بھی تین چار برس گزار دیئے، اور اللہ کے فضل و کرم سے فہم و توسم، دانش و بصیرت بھی رکھتے ہو۔ میدان میں کیوں نہیں آتے، اور اپنے معارف سے دوسروں کو فائدہ پہونچانے میں کیوں بخل کرتے ہو، کیا تم نے دوسروں کی قابلیت سے استفادہ نہیں کیا؟" کلیم اللہ نے کچھ دیر تامل کیا، پھر بولے:- جی مرضی ہے تو میں تعمیل کے لیئے طیار ہوں، اور آخرکار وہ دریا جو حجرہ کے اندر سکون کے ساتھ بہہ رہا تھا، زینت المساجد کے دالانوں میں آکر شور و ہنگامہ سے جاری ہوگیا۔ سیرالساکین میں لکھا ہے:-

"بحکم والد ماجد سجادۂ تدریس و تعلیم آراستہ ساخت"[1]

اور میر محمد ابراہیم نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے:-

"در زینت المساجد بر چار بالش افادہ بنشست، و شش جہت را منور ساخت"

اسلاف آتے ہی رنگ بالکل بدل گیا، درس و خطابت کی مسند آرائی سے خاص و عام میں اسقدر مقبول ہوئے کہ گوشہ نشینی سے نفرت کرنے لگے، درس و تدریس کی سلطانی پر فریفتہ ہوگئے، وعظ و خطابت کی سجادہ آرائی دل کو بھاگئی، اور کلیم اللہ عہد شیر شاہی کے ملا عبدالنبی بن گئے۔

یہ سلسلہ کم و بیش آٹھ برس جاری رہا، اس آٹھ برس میں دنیا پرستی کی جتنی چالیں ہیں ایک ایک کرکے سب اختیار کیں، جس رنگ میں گئے سب سے بڑھ جانے کی کوشش کی، اور اس کے لیئے جن باتوں کی ضرورت ہوئی سب پیدا کیں، سجادۂ زہد بھی بچھایا، مسند سالوس بھی آراستہ کی، وعظ و خطابت کے تیر بھی چلائے، تحریر و تصنیف کا افسوں بھی استعمال کیا، اور ان سب کے ساتھ ساتھ عوام فریبی کے لیئے زہد و تقوی کی جادوگری بھی کرتے رہے، اور اپنے مقصد میں کامیاب رہے، امرا اور روسا حلقہ بگوش تھے، علما آستانہ فضل و تقوی پر جبیں سائی کرتے تھے عوام ایک نظر دیکھ لینا اپنے لیئے باعث فخر و نجات سمجھتے تھے، حاجی یہ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے اور شکر ادا کرتے کہ اللہ نے صاحب نصیب بنا دیا اور ان کی مصیبتوں کی تلافی کردی[2]

ایک روز مسجد میں بیٹھے درس دے رہے تھے، ایک بزرگ نے کہا:- ان کاموں سے کچھ حاصل نہیں

---

[1] سیرالساکین [2] سلسلہ نظامیہ

وہ کرو جو تمہارا کام ہے، بولے۔ اس سے زیادہ اور میرا کام کیا ہے؟ فرائض پنجگانہ ادا کرتا ہوں، ہر روز قرآن کی تلاوت کرتا ہوں، رمضان کے روزے کبھی فوت نہیں ہوتے، فقراء و مساکین کے ساتھ جو کچھ ہو سکتا ہے سلوک کرتا ہوں، احکام الٰہی کی تعمیل میں رات دن سرگرم رہتا ہوں، ہدایت و رہنمائی کے لیے تعلیم و تدریس اور وعظ و خطبہ کا سلسلہ شروع کیا ہے، غالب وقت اسی میں گزارتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ "مگر تمہارا کام صرف یہی نہیں ہے۔ یہ سب اوپری اور ظاہری باتیں ہیں، تم حقیقت سے دور اور ہوش و خرد سے بیگانہ ہو، تمہاری زندگی بالکل بے کیف ہے، نشر و تبلیغ ایک اچھا کام ہے، مگر اس سے زیادہ اچھا کام خود اپنے نفس میں حق و حقیقت کو پھیلانا ہے، دوسروں کو ہدایت دینے سے پہلے خود اپنے آپ کو ہدایت دینی چاہیئے، تمہارا کام ان دکھاوے کی باتوں کے زندان خانہ میں مقید نہیں ہے، تم اس سے بلند تر کام کے لیے آئے ہو، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، وعظ و خطبہ سب بے حاصلی اور وجود آرائی کے کرشمے ہیں، تمہیں اس ناپاک دلدل سے نکلنا چاہیئے اور محرم اسرار بننا چاہیئے، منطق و فلسفہ میں کچھ نہیں دھرا، یہ سب گمراہی کے مختلف نام ہیں"

از منطق و حکمت نہ کشاید در محبوب　　　ایں ہا ہمہ آرائش افسانہ خویش است[۱]

لیکن اس زمانہ میں رُت دوسری تھی، جاہ پرستیوں کا جوش تھا، ہوسناکیاں شباب پر تھیں، وجود آرائی اور خود پرستی کے عاشق تھے، دربار کے توسل، اور امراء و سلاطین حکومت کے تعلق نے اس گرفتاری کو اور مضبوط کر دیا تھا، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔ لوگ مجھ سے کہتے ہیں یہ مشغولیاں چھوڑ کر فقر و طریقت اختیار کر، پھر کیا واقعی مجھے ایسا ہی کرنا چاہیئے؟ مگر اس قسم کی آوازوں کو تو میں شور رنگس سمجھتا ہوں، مجھے جو کچھ کرنا ہے کسی سے کہہ سن کر نہیں کرتا۔ میں جس راہ چلو نگا اپنے دل کی امنگوں اور اپنے جذبات کے دونوں سے چلونگا، میں اپنے مستقبل کی نسبت پوری طرح غور کر لیا ہے، اور جو راہ اختیار کی ہے بے سمجھے نہیں کی۔ پھر وہ لوگ کیسی حماقت میں مبتلا ہیں جو اپنی زندگیاں برباد کر چکے ہیں اور مجھے بھی مشورہ دیتے ہیں کہ ان ہی کی طرح دامن دریدہ اور وحشت زدہ بن جاؤں۔ میں ان لوگوں کی طرح نہیں ہوں جو زندگی کو ذلت اور نامرادی کے کانٹوں میں الجھا دیتے ہیں، بلکہ میں ان لوگوں میں ہوں جو زندگی کو با کار بناتے ہیں، جو تمام جائز عیش و آرام، عزت و آبرو حاصل کرتے ہیں اور اختیار کے دونوں میں مسلمانوں کی دھاک جماتے ہیں،

---

[۱] واقعات کلیمی و سیر السالکین۔

...نیا میں رہکر دنیا کو چھوڑتے ہیں وہ نادان ہیں یا خودکش ہیں، اپنے آپ ہی زندہ درگور ہوتے ہیں میں
...سا کہ دریا میں رہ کر مگر سے بیر نہیں کیا جا سکتا، اسطرح مقصد حیات تک پہونچنا خیال خام ہے، میں تو
...ں کو کافر نعمت سمجھتا ہوں۔ اللہ نے مجھے عقل و بصیرت دی ہے، نیک و بد میں تمیز عطا فرمائی ہے، میں
...سے بچتا ہوں، معاصی سے دور رہتا ہوں، اور اس کے لطف و عنایت کو جہاں بھی وہ ملتا ہے سمیٹ لیتا
...کی ہر بخشش کا اپنے تئیں مستحق بنا تا ہوں، اور ایسا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں، اہل سلوک و طریقت
...کیا خدا اسکو اپنے رحم و کرم کی چادر میں ڈھانک لے، لیکن مسلمانوں کی تباہی و بربادی ناقابل عفو
...گزشتہ صدیوں کے تجربات نے یہ بات آفتاب کی طرح روشن کردی ہے، اور اب تو اسمیں ذرا
...نہیں، ان لوگوں نے اپنے ظاہر فریب زہد و تقوی اور قناعت و پارسائی سے گمراہی کو پھیلایا ہے
...بیعت کو تہ و بالا کیا ہے، مفلسی و درماندگی، فلاکت، بے تدبیری اور ترک دنیا کے فسادی بیج بوئے
...ر مسلمانوں کو دین و دنیا سے کھو دیا ہے، پس ہر درد مند ملت اور غمخوار اسلام کا فرض ہے کہ اس
...کرے، اس طوفان کو بڑھنے سے روکے، ان دشمنان دین و ملت کے خلاف زبان و قلم سے
...جہاد کرے، اور ان کی تعلیمات کے دفتر ہلاکت کو آتش کدوں میں ڈالدے، میری دلی تمنا ہے کہ
...کو دنیا کی اقبالمند قوم دیکھوں، میں چاہتا ہوں کہ یہ اگلا سا عروج پھر حاصل کرلیں، میری آرزو
...پھر سچے مسلمان بن جائیں اور دنیا کے تاج و نگیں کے مالک ہوں۔ اسلیئے جو تدبیریں مجھ سے بن پڑتی
...تا ہوں، اسلیئے تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کیا ہے، ہر جمعہ کو خطبہ دیتا ہوں، قرآن کی تفسیر بھی پڑھاتی
...کردی ہے اور دعاۃ و مبلغین کی جماعت بھی طیار کر رہا ہوں جو ملک میں چاروں طرف پھیل کر اپنا مقدس
...ی کرے گی"[۱]

...لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ خیالات اور یہ معروفیتیں محض عارضی ہیں، اس پردہ سے آفتاب طلوع ہونے
...اور فراق کے بعد وصال کی مسرور و خوش کام ساعتیں آنے والی ہیں، فطرت نے ازل سے اسکو اپنے
...کے لیئے چن لیا تھا اور ان ہی کے لیئے اسکو وہ طیار کر رہی تھی، یہ ابتلا پختہ کاری کا مدرسہ تھا، جب
...آخری امتحان سے کامیاب گزر گئے، اور دنیا پرستی کے طوفان بلا خیز سے اچھی طرح منجھ گئے، تو مشیت

---

[۱] مقامات کلیمی میں پورا اصل خط تو بہت طویل ہے میں نے صرف اس کا اقتباس کیا ہے

پوری ہوئی، علم کا خمار بدمستی اتر گیا، دنیا پرستیاں حنیف پرستیوں سے بدل گئیں، اور یکایک صاحب کچھ ہو گیا جس کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا، کل دیکھا تھا کہ حریری جامہ پہنے، زرکار عمامہ باندھے بیٹھے خطبہ پڑھ رہے تھے، آج جو دیکھتے ہیں تو ایک پھٹی کملی سر سے پیر تک لپٹی ہوئی ہے، اور کسی دھیان میں چپ چاپ بیٹھے ہیں اب مجلس آرائی کی جگہ خلوت گزینی کا عشق ہے، ہنگامہ بازی کی جگہ سوز و گداز کی چاہ ہے، بد عملی کی جگہ خوش عملی پر فریفتگی ہے۔ خطیبانہ بلند آہنگیوں کی جگہ آہ و نالہ ہے، اور حلقۂ تصنیف کی شمع کافوری کی بجائے عشق کا فانوس آتشیں۔

اخبار الاولیا میں لکھا ہے کہ ایک صاحب طریقت نے زمانۂ طالب علمی میں کہہ دیا تھا کہ خدا نے چاہا تو یہ صاحب زادے میدانی ہوں گے۔ خدا نے ایسا ہی کیا، یہ صاف زادے میدانی بنے بغیر نہ رہے، جن کاموں میں مشغول تھے مشیت نے ان ہی میں اپنا کام کر لیا، درس و تدریس کی مسند میں، وعظ و خطبہ کے منبر میں قلم و کاغذ کے دامن میں عشق حق کے شعلے طیار ہوئے، اور چشم زدن میں خرمن عقل و دانش کو خود فروشیوں کا تودۂ خاک بنا دیا۔

می گزشتم ز غم آسودہ کہ ناگہ ز کمیں عالم آشوب نگاہے سر راہم بگرفت

یعنی جب تک علم کی نیند میں سوتے تھے، جب تک فلسفہ کے نشہ میں مخمور تھے، جب تک کسی پنجۂ ابرو سے زخمی نہیں ہوئے تھے، آنکھیں بند تھیں، اندھیرا چھایا ہوا تھا، عمل و اعتقاد کی گمراہیوں میں ڈوبے ہوئے تھے، لیکن جب دل پر چوٹ لگی، سینہ کے کلیسا میں آگ بھڑکی، عشق کے درد نے رگ رگ میں ٹیس پیدا کی، تو وہ زمین و آسمان ہی نہ رہا، گویا اک چراغ تھا جو رات کے اندھیرے تک تو جلتا رہا، اور صبح ہوتے ہی بجھ گیا، یا اک نمود سراب تھی جو جب تک تشنگی رہی لہریں مارتی رہی، اور پیاس بجھتے ہی ریت کا فرش خاک بن گئی۔

اب تک تو فخر کرتے تھے کہ ہم ہی راہ راست پر ہیں، حقیقت کی بات ہمارے سوا کوئی نہیں جانتا، اور فقر و طریقت محض جہالت کا طلسم ہے، لیکن آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ وہ محض نادانی تھی، حقیقت تو آگے ہے۔ اسکے بعد روز بروز حالت بدلتی گئی، محبوبات و مالوفات کی تمام رہی سہی زنجیریں کٹ گئیں اور کلیم اللہ کی زندگی کچھ نہ رہی مگر عجز و انکسار، صدق و خلوص، طلب و استغراق، مگر یہ کس نے کیا؟ ہم مٹی کا ستش فتیلہ کیسے بن گئی۔؟

شاہ برکت اللہ مارہروی ایک جید عالم، اور صاحب طریقت بزرگ تھے، وہ زیارتوں کی غرض سے

دہلی آئے تھے، یہاں اُن کے علم و فضل، سلوک و عرفان کی دھوم مچ گئی، بڑے بڑے لوگوں نے حلقۂ ارادت گلے میں ڈال لیا، اور چند ہی روز میں اتنا عروج حاصل ہو گیا کہ کلیم اللہ کی عزت و شہرت ماند ہو گئی، انہیں یہ دیکھ کر بہت طیش آیا، ایک پیش خدمت کو حکم دیا کہ برکت اللہ کو بلا لائے، وہ بے کشف سے حقیقت حال سے باخبر ہو چکے تھے، سنکر بولے۔ "خادم حاضر ہونے کے لیے سر و چشم طیار ہے، مگر حضور تو برہنہ ہیں، اور سارا جسم نجاستوں میں لتھڑا ہوا ہے، خلوت خانہ میں کیسے حاضر ہو سکتا ہوں۔ غسل فرما کر دیوان خانہ میں تشریف لائیے بندہ حاضر ہوتا ہے" کلیم اللہ یہ جواب سنتے ہی چراغ پا ہو گئے، اور سیدھے ان کی قیام گاہ پر پہونچے، لیکن ان کو دیکھتے ہی سارا غصہ اتر گیا۔

جو کچھ سوچ کر آئے تھے اس سے توبہ کی اور قدموں پر گر گئے، چاہا کہ اسوقت اپنے تئیں ان کے حوالے کر دیں اور ساری زندگی ان ہی کی خدمت میں رہیں، اگر یہ خیال ابھی دل سے زبان تک نہ آیا تھا کہ انہوں نے کہا تمہارا حصہ میرے پاس نہیں ہے، جب لینے کے لیے تیار ہو جاؤ گے تو دینے والا بھی مل جائیگا۔[1]

اللہ اللہ! بخشش و عنایت کی کیا بے پایانی ہے کہ دوست دشمن کوئی محروم نہیں رکھا جاتا۔ کلیم اللہ کی ناحق کوشی کسقدر بڑھی ہوئی تھی، وہ عاشقان حق کے لیے ہمیشہ شمشیر بکف رہتے تھے، اور اب بھی ان کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، ان کے خیالات بالکل وہی تھے، وہ اسی طرح باطل پر جمے ہوئے تھے اور ایک عاشق حق کو ذلیل کرنے آئے تھے کہ اس نے ان کے در دولت کو بوسہ نہیں دیا مگر اس غرور و خود پرستی کا کیا صلہ دیا گیا؟ وہی جو دوستوں کو دیا جاتا ہے، بخشش و عنایت کا ایک پیالہ پلایا، اور لطف و کرم کی نظروں سے گھائل کر لیا۔

اب کلیم اللہ صرف کلیم اللہ نہ تھے، بلکہ شاہ کلیم اللہ تھے، اس واقعہ کے بعد سے شاہ صاحب بالکل تارک دنیا ہو گئے تھے، کسی سے کچھ واسطہ نہ تھا، نہ گھر رکھا نہ در، نہ ناموس کا خیال کیا، نہ پاس وضع کا، عشق الٰہی میں سب کچھ تج دیا۔ اور مستانہ وار پھرنے لگے ؎

دو عالم از اثر شعلۂ جانش سوخت　　بجز متاع محبت کہ در پناہ من است

کسی نے ملاقات کا واقعہ پوچھا، بولے:۔ یہ کیفیت اسی روز سے ہے کہ اس سے تا ایں دم ہی کوئی چیز نہیں جو حقیقت

---

[1] یہ واقعات ملفوظات کلیمی، سلسلۂ نظامیہ اور سیر السالکین سے ماخوذ ہیں۔

کی پردہ دری نہ کرتی ہو، طیور کی بولیاں، تاروں کی چمک، ہواؤں کا تموج، دن رات کا الٹ پھیر، شمس و قمر کا طلوع و غروب، پانی کا بہنا، اور سبزہ گیاہ کا لہلہانا، سب سے یہی پکاریں آتی ہیں، کاش مجھے پہلے سے یہ خبر ہوتی، اور اتنی زندگی برباد نہ جاتی۔

یہ جذب و سرمستی، اور نو آموزی کا زمانہ تھا، اور چونکہ کوئی تربیت دینے والا نہ تھا، ایک حال پر قائم نہیں رہتے تھے، کبھی سخت سخت مجاہدے کرتے [۱]

کبھی مہینوں اعتکاف میں بیٹھ جاتے، اور مسلسل روزہ رکھتے، کبھی ایک ایک دن میں دو دو قرآن ختم کر ڈالتے، درود شریف پڑھنے بیٹھ جاتے تو تین تین لاکھ پڑھ لیتے، اسم ذات کا ورد ہوتا تو برابر اسمیں ڈوبے رہتے [۲]۔ یہاں تک کہ جسم سے پسینہ جاری ہو جاتا اور جب ان باتوں سے گھبرا جاتے تو سب کچھ چھوڑ دیتے، صحرا کی طرف نکل جاتے، جہاں جی میں آتا بیٹھ جاتے، اسی جوش میں کچھ دن ہندو جوگیوں کے طریقہ پر بھی چلے [۳] (باقی)

ناظر دہلوی

[۱] سیر السالکین [۲] سلسلۂ نظامیہ [۳] سیر السالکین

فلسفۂ محبت

(مسلسل)

جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ذوقیات محبت کی حقیقت کو ایک بڑی حد تک بے نقاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

عشق محبت سرمدی ہے جسے خدا کی مہربانیاں ہر جاندار کو عطا کیا کرتی ہیں

سید الطائفہ کے نزدیک محبت ایک جذبۂ روحانی کا نام ہے۔

بقول "کشف" جنید بغدادی نے محبت کی ایک دوسری تعریف بھی کی ہے یعنی (المحبۃ محبۃ المحبۃ) محبت محبت سے محبت کرنے کا نام ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہم اسے تعریف تو کسی طرح کہنے کی جرأت کر ہی نہیں سکتے، لیکن ممکن ہو کہ اسے حالت سے تعبیر کریں۔ یہ ہے کیا؟

داؤد انطاکی ثمامہ کی ایک ایسی تعریف نقل کرتے ہوئے جس پر ہارون رشید جیسے دقیقہ سنج نے فقیہ اکثم کے مقابلہ پر پندرہ ہزار روپیہ انعام میں پیش کیے تھے لکھتے ہیں۔

اور ایک روایت میں ہو کہ ثمامہ نے ہارون رشید سے کہا کہ جب جواہر نفس میں باہم گرمشاکلت کی وجہ سے اختلاط پیدا ہوتا ہو تو اس اختلاط سے ایک شفاف روشنی پیدا ہوتی ہو جس سے عقل تک کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور اس شعاع کے توصل سے ایک نور روح کے ساتھ چپاں اور حسن میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے جسے عشق کے نام سے یاد کیا کرتے ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ یہ محبت کے دقائق اور اسکے ذاتیات کی تعریف ہو مگر پہلا قول عوارض، [illegible] اور منافع کی حقیقت کو بیان کر رہا تھا اور اسی لیے یہ دوسری تعریف فلسفہ سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

اور اسکی تشریح یہ ہے کہ آنکھ جس چیز کو دیکھتی ہے اُسے حس مشترک کی طرف روانہ کرتی ہو اور وہ حس مشترک قوت واہمہ کے پاس یہاں تک کہ عقل (جسے نفس ناطقہ کہتے ہیں) میں تصویر اتر آتی ہیں۔

تو اب ہم شکل ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ جو نگاہ ایک گہری نظر رکھنے والا تناسب اور ناز و انداز کی باریکیوں پر ڈالتا ہے وہ حسن کی ایسی لطیف شعاعوں کا روح میں فوٹو کھینچ دیا کرتی ہے جنہیں مادیات سے تزوانی

نہ ہونے والے جوہر کے ہم شکل ہی کہا جاسکتا ہے اور چونکہ یہ شعاعیں لطافت، شفافی میں روح کے برابر ہوتی ہیں اسلئے ایک دوسرے سے طبعی مناسبت کی بنا پر گھل مل جاتی ہیں۔

اس نظریہ پر غور کرتے ہوئے مجھے چند باتوں کو صاف کرنا ہوگا۔

(۱) جوہر (۲) نفس (۳) مشاکلت (۴) نور (۵) عقل

(۱) جواہر سے یہاں یقیناً حسن ہی مراد ہوگا اور ہونا چاہیئے اسلئے کہ اگر جواہر نفسانیہ مقصود ہوتے تو دو مختلف لفظ جواہر اور نفس لکھنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ امتزجت النفس النفس ہی لکھنا چاہیئے تھا، دوسرے یہ کہ عشق حسن سے ہوا کرتا ہے نہ کہ نفس سے حتی کہ مادیات سے مجردات تک ترقی کرکے نفس کی محبت تک پہونچ کر بھی محبت حسن ہی سے رہتی ہے نفس سے نہ آج تک کبھی محبت ہوئی نہ ہو، مگر ہاں حکماء کے مذہب کا لحاظ رکھتے ہوئے حسن میں جوہریت (یعنی تجرد عن المادہ ہونا) نفس میں مرتسم ہونے کے بعد پیدا ہوجانا ضروری ہے، لہٰذا اس حسن ظاہری کے مجرد شبیہ ارتسامی کو جواہر کہا جاسکتا ہے۔ یہاں پر ابھی ایک سوال رہ جاتا ہے کہ حسن کو جوہر کہہ دینا کافی تھا، جواہر کہنے کی ضرورت نہ تھی، لیکن ممکن ہے کہ اس نے حسن کے ساتھ اسکے شمائل کو بھی شامل کرلیا ہو۔

(۲) نفس کے بارے میں آج کل لوگوں کو بہت کچھ غلطیاں پیدا ہورہی ہیں چنانچہ یورپ کے علماء نفس کی تحقیقات دیکھنے پر آپ کو میرے اس خیال کی تائید کرنی پڑیگی کیونکہ وہ خیالات، جذبات، احساسات ادراکات اور تاثرات کو نفس کے اجزاء ماہیت سمجھا کرتے ہیں، حالانکہ نفس کا ان چیزوں سے محض ایک تعلق ہے اور کچھ نہیں، اسلیئے میں اس مسئلہ کی اہمیت کا لحاظ رکھکر کارآمد تحقیقات کو "کشف اصطلاحات الفنون، معرفۃ النفس والروح (جسمیں ابن قیم نے ارواح کے ذوات قائمہ ہونے پر سو دلائل پیش کیئے ہیں) نقد النصوص فی شرح الفصوص، الملل والنحل شہرستانی، حجۃ اللہ البالغہ، تفسیر کبیر، تہافۃ الفلاسفہ (بحث روح) اور یہ قلبیہ اور اردو میں ابن رشد مولفہ مولانا محمد یونس فرنگی محلی وغیرہ جیسی

---

[1] یہ مولانا محمد علی بن علی [illegible] کی [illegible] کتاب ہے جسے [illegible] سوسائٹی نے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا [2] مولینا جامی علیہ الرحمۃ کی تصنیف اور تقریباً نایاب کتابوں میں سے ہے اسکے اندر آپ کو علاوہ روح کے روحانیت کی فلسفیانہ تحقیقات بھی [illegible] پیارے انداز میں نظر آئیں گی کہ اس سے محبت کی لطافت کا خاکہ [illegible] جاسکتا ہے [illegible] اس کا دیکھنا ضروری خیال کرتا ہوں [3] تہافۃ تین شخصوں نے لکھی ہے امام غزالی، ابن رشد اور [illegible] میرے نزدیک تینوں کو دیکھنا چاہیئے تھا، تاکہ فلسفیوں کا [illegible] بھی معلوم ہوجائے

اتا ہوں کے سیر دکرتا ہوا مختصراً کچھ عرض کردینا چاہتا ہوں۔
میرے نزدیک نفس کی تعریف شاہ ولی اللہ صاحب سے بہتر شاید آج تک کسی نے نہیں کی، اسلئے اسی کو درست سمجھتے ہوئے نقل کرتا ہوں

> روح اپنی ماہیت کے اعتبار سے ایک حقیقت نورانیہ ہے اور ایک ایسا نورانی نقطہ ہے جو ان روزانہ رنگ بدلنے والی چیزوں میں سے نہیں جنمیں کچھ جواہر ہیں اور کچھ اعراض، وہ سب سے پہلے نفس ارضی (نسمہ) سے ایک خاص تعلق رکھتی ہے اور پھر جسمانیات سے۔

علاوہ اس تعریف کے صرف اتنا اور بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک ابن حزم ظاہری کا خیال روح کے جسمانی ہونے کے متعلق درست نہیں، دوسرے وہ تعلق بدن سے پہلے اور بعد کو اپنے خاص خاص صفات کے لحاظ سے پہچانی جا سکتی ہے تشکل کی قطعاً ضرورت نہیں جیسے کہ آجکل یورپ میں کسی شخص کے صرف رسم خط سے اس کی قومیت، طرز معاشرت اور اخلاقیات وغیرہ بتا دیا کرتے ہیں اور اگر تشکل معرفت کے لئے ضروری بھی ٹھہرا دیا جائے تو ہم تشکل مثالی کو روح کے واسطے تسلیم کرنا کسی طرح خلاف عقل نہیں سمجھتے۔

(۳) مشاکلت بھی چونکہ فلسفۂ لطیف کے اہم مسائل میں سے ایک ہے اسلئے اسپر بھی مختصراً کچھ جدید تفصیل کے ساتھ عرض کرنا مناسب ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ مشاکلت کا وجود دو چیزوں سے ہے ترکیب اور بساطت، پھر ترکیب بھی جوہریت، تشخص خارجی اور ثقالت کے لحاظ سے بساطت خلقیت (یعنی تشخص نفسی) اور لطافت کے لحاظ سے مختلف رنگ کی ہوا کرتی ہے انمیں سے ہر ایک کو آپ حسب ذیل مثالوں سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

ترکیب

(۱) جوہریت کی مثال فلزات (اجسام سبعہ) ہیں جو ایک دوسرے سے مشاکلت رکھنے کی بنا پر متجاذب ہوا کرتے ہیں۔

(۲) تشخص خارجی سے پیدا ہونے والی مشاکلت کی مثال ستاروں اور سیاروں کی گردیت سمجھ لیجئے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ تمام نظامات شمسیہ اور ہماری زمین میں جو تجاذب پایا جاتا ہے وہ اسی تشخص خارجی کی بنا پر ہو گو ہم اسپر پورا یقین رکھ سکنے کے مجاز نہیں اسلئے کہ ہم دیکھتے ہیں[1] کہ مقناطیس کو کیہ جدی (جو قطب ستارے کے قریب ہے) کی طرف کشش رکھتا ہے اور بظاہر اسکو اس سے کوئی نسبت نہیں وہ

---

[1] نشوۃ السکران

نورانی ہے یا ظلمانی وہ کرہی ہے یا غیر کروی تو اس کرویت کے علاوہ ممکن ہے کہ یہ تجاذب کسی اور نا معلوم مناسبت مزاجی یا خاصیت طبعی کی وجہ سے ہو جیسے کہ مقناطیس اور کوکب جدی میں ہے

(۳) ثقالت (جسے کثافت جنسی بھی کہہ سکتے ہیں) کی مثال ارضیات کا کشش ثقل کی بناپر زمین پر گرنا ہے مگر یہاں اتنا اور یاد رکھنا چاہیئے کہ ثقالت اور کثافت جنسی میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ ثقالت کا لفظ استعمال کرتے ہوئے کشش کو ثقل ہی کی ایک صفت کہنا پڑیگا اور کثافت جنسی میں کشش کی نسبت جنسیت کی طرف کی جائیگی۔

بساطت بساطت کی دو قسمیں ہیں، مادی اور روحانی، مادی پر غور کرنا ضرورت سے زائد اور طوالت کا باعث ہوگا پھر بھی مقصد طلب۔ اسلیئے بساطت روحانیہ ہی کے متعلق جسکو صاف کرنے کی غرض سے اسقدر تفصیل کی گئی ہے ہم اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں

محققین اس مسئلہ میں کہ ایک روح کو دوسری روح سے جاذبیت کس مشاکلۃ کی بناء پر پیدا ہوتی ہے، دو مختلف رائیں رکھتے ہیں۔

(۱) تشاکل خلق، البقراط کا خیال اور صحیح خیال ہے کہ محبت ایک کو دوسرے کے ساتھ کسی نہ کسی عادت اور خلق میں متحد ہونے کی بناپر ہوتی ہے۔

یہاں پر آپ کو دو باتیں خاص طور پر یاد رکھنی ضروری ہیں۔ اول یہ کہ خلق کس چیز کا نام ہے؟ اور دوسرے یہ کہ تشاکلِ خلقی کیوں محبت کا باعث ہوتا ہے؟

خلق اصل میں اُس ملکہ یا کیفیت نفسانیہ کو کہا جاتا ہے، جس سے حرکات اور افعال بغیر کسی قسم کی کوشش کے صادر ہو سکیں۔ لیکن دوسرے سوال کا جواب جہاں تک ہم خیال کرتے ہیں آج تک کسی نے نہیں دیا، ہاں اصول ضرور مدون کر دیئے ہیں جن سے اہل نظر کو کسی حد تک آسانی ہو گئی ہے۔

بات یہ ہے کہ خلق پیدا ہوتا ہے نفس ناطقہ کے قوائے احتیاجیہ میں سے کسی ایک قوت کے احوال متضادہ میں اعتدال پیدا ہو جانے کے بعد اور یہ محققین کے ہاں بالکل تسلیم کر لیا گیا ہے، کہ وحدت، اعتدال مشاکلۃ اور مساوات جہاں بھی پائے جائینگے ان میں کشش کی خاص طبعی ضرور ہوگی مگر اس کشش سے بھی وہی چیز متاثر ہو سکتی ہے، جسمیں خود اسی قسم کا اعتدال پایا جاتا ہو۔ یعنی اعتدال سے تاثر کے واسطے بھی وحدت اعتدالی کی ضرورت ہے کیونکہ اثر پذیر ہونے کے واسطے اعتدال ہر حالت میں اور

ہر جگہ ضروری ہے خواہ خود اعتدال ہی کا تاثر سیلی کیوں نہ ہو۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ جب ایک شخص میں کوئی خلق ہو تو دوسرا اس سے کیوں اور کب متاثر ہوتا ہے؟ اب اگر کہیں دو شخصوں میں محبت ہو تو آپ سمجھ لینگے کہ یہ دونوں اعتدال خلقی کے مرہون منت ہیں اور یقیناً ہیں۔ اور اگر صرف ایک کو کسی سے واقعی روحانی محبت ہے مگر دوسرے کو نہیں تو ہمیں یقینی طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ دوسرے میں اعتدال ہی نہیں، اور اگر ہے تو اس قسم کا نہیں جس سے کہ دوسرا شخص متصف ہے، اور نیز وہ جاذبیت (مثلاً ماحول داخلی اور طبیعت کی یکرنگی) بالکل یا بڑی حد تک موجود نہیں۔ یہاں ہی سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ خلق مذموم میں اتحاد غرضی، دلی محبت اور روحانی تعلق کا باعث نہیں ہو سکتا، کیونکہ خلق مذموم کی تخلیق اور تکوین اعتدال نہیں بلکہ بے اعتدالی سے ہوا کرتی ہے جسمیں کسی قسم کی ذاتی کشمکش نہیں۔

شاید اتنا اور کہنا زیادہ کار آمد ثابت ہوگا کہ یہاں پر خلق سے ہمارا مقصد عام دنیائے اخلاقیات نہیں بلکہ محض جذبۂ محبت، وفا اور لطیف کیفیت انفعالیہ ہے۔

(۲) تشاکل لطافتی۔ یہاں پر خیال کے معنی اُس شفافیت اور اثر پذیری کے لینا چاہیئے جس کے افراد کامل بسائط روحانیہ کو کہا جا سکتا ہے

شاید یہاں یہ خیال پیدا ہو کہ بسائط روحانیہ میں تو صرف بساطت ہی کا تشاکل کافی تھا کیونکہ وہ اپنے تجرد کی بنا پر متضاد چیزوں سے بالکل خالی ہیں اور جب ایک چیز میں اضداد ہیں ہی نہیں تو لامحالہ وحدت ہی وحدت رہیگی اور یہی ایک ایسی چیز تھی جو تشاکل پر اتحاد روحانی کی علت تامہ کہی جا سکتی ہے، چنانچہ محقق دوانی نے اس پر اکتفا کیا ہے اسلیئے ہم یہ عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ محض بساطت کی وحدت تشاکلی تجاذب کو کافی نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ جس طرح مقناطیس باوجود جاذبیت طبعی رکھنے کے سیر کردہ وغیرہ سے بقول ذکریا قزوینی جاذبیت پر پردہ ڈال کر اُسے ظاہری نظر میں فنا کر دیتا ہے اسی طرح روح پر جب لذائذ جسمانیہ اور مادی لطف اندوزیوں کا باریک نہیں بلکہ بھاری پردہ اور تمام اثرات سفلیہ کے ذریعہ سے پڑ جاتا ہے تو اسکی جاذبیت ختم ہو جاتی ہے، چنانچہ خود محقق دوانی بھی اس کا اقرار کیئے بغیر نہ رہ سکے، تو جب تک معشوق کی روح بھی عاشق کی طرح کدورات جسمانیہ سے پاک ہوتے ہی لطیف و شفاف نہ ہوگی اُسوقت تک وہ معشوق نہ جاذبیت کا اثر قبول کر سکتا ہے اور نہ اپنی جاذبیت

کو کام میں لا سکتا ہو، ہاں اگر عاشق کی روح شفاف ہونے کے لحاظ سے اسقدر قوی ہو کر معشوق کی بجھا ما لمحہ روح کو بھی روشن کر سکے، تو اسوقت دونوں تجاذب کی خوش نصیبی سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔

نور — سے وہ ہمیشہ رہنے والی کیفیت روحانی مقصود ہے جو عقل عاملہ کی تمام تاریکیوں اور نقوش کہنہ دور کر کے قوت عاملہ کو اپنی ترقیات علویہ کی طرف منجذب ہونے کی ترغیب دیا کرتی ہو۔

عقل — نفس ناطقہ میں دو قوتیں ہیں ایک قوت عملی، دوسری قوت نظری جنمیں سے ہر ایک کو عقل کہا جاتا ہے یہاں عقل سے مراد نفس کی خالص قوت عاملہ ہے نہ کہ قوت عاملہ جو اس سے نچلے درجہ میں شمار کی جاتی چاہیئے۔ داؤد انطاکی "عقل" کی کچھ تفصیل کرتے ہوئے اسکو مطلقاً نفس ناطقہ کے معنی میں لینا چاہتے ہیں جو اگرچہ اصطلاحاً غلط نہیں مگر طرز ادا صاف طور پر وہی بات کہہ رہا ہے جو ہم اپنے خیال کے ضمن میں عرض کر چکے اس لمبی چوڑی تشریح سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ ثامر نا کیا مقصد ہے؟ اور وہ کیا بتانا چاہتا ہے؟ مگر باوجود اس کے ہم مختصر طور پر نظریہ کا اعادہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں

ثامر کہتا ہے کہ جب نفس انسانی حسن کو حواس ظاہری کے ذریعہ سے دیکھتا ہے تو اس حسن کا چہرہ نفس ناطقہ سے ممتزج ہو جاتا ہے، پھر اس امتزاج سے نفس انسانی میں ایک کیفیت نورانی پیدا ہوتی ہو جس سے قوت عاملہ کا ذرہ ذرہ روشن ہو کر قوت عاملہ کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہو، اسی کیفیت نورانیہ کا نام عشق ہے، اگر پھر بھی اس نظریہ میں ایک نقص ضرور رہ گیا اور وہ یہ ہیں یہ نہیں بتایا کہ حسن و نفس کا ایسا امتزاج کیوں ہوتا ہے، لیکن اگر یوں کہا جائے کہ محبت بھی ایک حاسہ ہے تو اسکی تکمیل ہو سکتی ہے

یہیں سے آپ کو "المحبۃ محبۃ المحبۃ" کے معنی بھی معلوم ہو گئے ہونگے، کیونکہ جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ حسن حاسہ محبت میں اسقدر سرایت کر جاتا ہے کہ عناصر کی سی امتزاجی اور نورانی شکل حاصل ہو جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ ایک مدت تک اسی ماحول میں رہنے کی وجہ سے جمال ہم نشیں اسمیں اسقدر سرایت کر سکتا ہے، کہ اسکی بنا پر ہم محبت ہی کو حسین کہہ سکیں اور جب محبت خود حسین ہو گئی تو اسے کسی خارجی حسن کی ضرورت باقی نہیں رہ سکتی۔ بلکہ وہ خود عاشق اور خود معشوق ہو جائیگی اور اسی کا نام محبت المحبۃ ہے۔

علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب "شعر العجم" میں لکھتے ہیں:۔

عشق ایک فطری کشش ہے جو انسان میں پایا جاتا ہے وہ آکر دل میں ایک خاص ذوق اور شورش

پیدا کرتا ہو دل میں گدگدی اور تڑپ پیدا ہو جاتی ہے، زبان سے خود بخود پرجوش الفاظ نکلتے ہیں۔

عشق شورے در نہاد ما نہاد جان ما در بوتۂ سودا نہاد

گفتگوئے در زبان ما فگن جستجوئے در درون ما نہاد

شبلی نے عشق کو ایک فطری کشش تسلیم کیا ہو جو آگر (ظاہر ہوکر) ایک خاص قسم کا ذوق اور خاص ہی قسم کی شورش پیدا کرتا ہے اس ذوق و شورش سے پہلے گدگدی اور پھر تڑپ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جو ایک بڑی حد تک سچائی اور حقیقت کو پہلو میں لیئے ہوئے ہے، کیونکہ "ذوق کشش" کی اصطلاح اپنے اندر پاکیزہ اور لطیف حیات رکھتی ہے۔ جسے ہم سچی محبت اور "معصوم شیفتگی" کی جان سمجھتے ہیں۔

کسی کو شبلی کی طرف سے یہ بدگمانی نہ ہونی چاہیئے کہ انہوں نے عشق کی تعریف "کشش" سے کی ہے جسے عربی میں میل کہتے ہیں کیونکہ محققین اسے صرف پہلے درجہ سے نامزد کیا کرتے ہیں اور پہلے درجہ کو عشق کہنا علت تدبر سے خالی نہیں، کیونکہ شبلی نے مطلق کشش لکھ کر "انتہائی کشش" کا نام عشق رکھا ہے جو تمام مراتب ختم ہونے کے بعد کہیں آخر میں پیدا ہوا کرتی ہے، شبلی نے "آگر" کہتے ہوئے ایک اہم نظریہ کی چیستان کو حل کر دیا ہو

بعض حضرات کا خیال ہے کہ حسن بھی محبت کی طرح کشش ہی کو کہتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ کشش میں صرف اپنی طرف کھینچنے کی طاقت ہوتی ہے، تموج کی نہیں ہوتی اور حسن تموج پیدا کرتا ہے، لہٰذا حسن میں جیسا کہ ظاہر ہے کشش نہیں بلکہ چاند کی طرح ایک قوت "اور تموج" کہنا ہے، جو عشق کے سمندر کو زیر و زبر کیا کرتی ہے جسے ہم لفظ کشش سے کسی طرح تعبیر نہیں کر سکتے بلکہ کشش کی ایک قسم کہنا چاہیئے اور اسی وجہ سے شبلی نے "آگر" لکھا ہے یعنی حسن کا تقابل اسی کشش کو جو فطرت کی گود میں میٹھی نیند سو رہی تھی چٹکی لیکر جگا دیتا ہے، اور اٹھا کر اپنی قوت ہیجی و تموجی سے مد و جزر میں لاتا رہتا ہے اور جب اس قوت ہیجی و تموجی میں کمی آنے لگتی ہے۔ تو عشق کے زیر و زبر ہونے سے بھی وہ جوش باقی نہیں رہتا اور نہ رہ سکتا ہے۔

علامہ شبلی نے ایک دوسری جگہ دریائے محبت کے "جوار بھاٹے، اتار چڑھاؤ، ترقی و تنزل کا ایک اصول اور بہترین اصول بھی قائم کیا ہے، اگرچہ ہم اس "اصول کلی" کی بابت یہ دعوی تو نہیں کر سکتے کہ اس میں کوئی مستثنیٰ ہی نہیں ہو سکتا مگر اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہونگے تو بہت ہی کم ہونگے۔

شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ:-

کشش یعنی عشق کا مبدء حسن ہے یعنی جہاں حسن پایا گیا کشش بھی ہوگی اور جسقدر حسن کامل تر ہوگا اسی قدر کشش بھی زیادہ قوی اور سخت ہوگی۔

اس سے اگرچہ صرف اصول ترقی ہی نکلتا ہے مگر چونکہ مشاہدات اسی اصول کو تنزل میں بھی کارگر بتلاتے ہیں اسلیئے ہم یہ کہنے کے مجاز ہیں کہ "حسن جسقدر ناقص تر ہوتا جائیگا اتنی ہی جوش محبت میں بھی کمی آتی جائیگی"۔

ہمارے نزدیک محبت نہ کشش کا نام ہے نہ لذت کا نہ آگ کا نہ خواہش کا اور نہ اُن تمام تعریفوں کو جو یہاں تک بیان کی جا چکی ہیں، بلکہ "محبت ایک مستقل اور روحانی حاسہ لطیف ہے، جس سے کوئی انسانی خمیر خالی نہیں اس کا اصل مرکز روح نفسانی نہیں بلکہ روح انسانی ہے، جسے مولانائے رومی "پرتو الہی" اور امام غزالی "جوہر مجرد لطیف" سے تعبیر کیا کرتے ہیں مگر یہ حاسہ اپنی لطافت روحانیہ کی وجہ سے درک و فہم سے باہر اور بالکل باہر ہے، ہاں اُس کا انکشاف ہمیں ایک دوسرے حاسہ کے ذریعہ سے ہوا کرتا ہے جسے ہم "حاسہ لذت" سے تعبیر کرتے ہیں

ارواح تین قسم کی ہیں حیوانی، نفسانی، انسانی اور بقول بطرس البستانی ان کی کوئی سو تعریفیں کی گئی ہیں

(الف) (۱) روح حیوانی جسم لطیف کا نام ہے۔

(۲) روح نفسانی بھی ایک جسم لطیف ہی کا نام ہے مگر روح حیوانی اور اسمیں تین قسم کے فروق ہیں۔

(۱) روح حیوانی لطیف ہوتی ہے اور روح نفسانی بہ نسبت روح حیوانی کے زیادہ الطف جیسے وہ سالمات جو شعاعوں کو بقول اہل سائنس کے اثیر (ایتھر) تک پہونچاتے ہیں یا انہیں پہونچانا چاہیئے اور اشعہ شمسیہ۔

(۲) روح حیوانی عروق و شرائین میں نفوذ کرتی ہو اور روح نفسانی اعصاب میں۔

(۳) روح حیوانی قوائے حیوانیہ، حیات، حرارت غریزیہ کی حامل ہوتی ہے اور روح انسانی ذہن حس اور حرکت کی۔

(۳) روح انسانی ایک مجرد نور سرمدی ہے جسے روح الٰہی کا عکس یا اُسکی ایک جھلک اور میرے نزدیک روح نفسانی کا حامل بھی کہنا چاہیئے۔

(ب) امام فخر الدین رازی لذت کی کسی تعریف کو درست نہ خیال کرتے ہوئے خود بھی خاموش رہنا چاہتے ہیں اور ذکریا رازی لذت کو وجودعدمی خیال کرتے ہیں جو دلائل سے رد کر دیا گیا ہے۔ خیر جو کچھ بھی ہو ہمارے نزدیک لذت ایک مستقل قوت اور ایک خاص ذوقی حاسہ سرمدی ہے جو اگرچہ دراصل تو روح انسانی میں پایا جاتا ہے مگر ادراک، ارادہ وغیرہ کی طرح روح انسانی سے نظام جسم انسانی کا شیرازہ باندھنے کے واسطے روح نفسانی میں بھی آگیا ہے، مگر اس "مادۂ لذت" میں شیرینی ادراک ہی سے ظاہر ہوتی ہے اسی لحاظ سے امام غزالی نے احیاء العلوم کی کتاب الوجد والسماع میں لذت کو "نوع من الادراک" لکھا ہے اور واقعۃً لذت خود اپنے لطیف "سالمات نفسانی" اور ادراک ہی سے مل کر بنتی اور لذت کہلائی جاتی ہے بالفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ محبت ایک کہربائی قوت ہے اور اس کا مخزن روح انسانی ہے لیکن اس سے روح حیوانی و نفسانی بھی متاثر ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ محبت حیوانی کا منشا مادہ ہوتا ہے اور خود بھی مادی ہوتی ہے، اور محبت نفسانی کا منشا تو مادی ہی ہوتا ہے مگر خود مجرد ہوتی ہے (جیسے قوت متخیلہ کہ خود تو مجرد ہے لیکن پیدا ہوئی ہے مادیات سے) اور محبت روحانی حقیقی محبت کا نام ہے جو آثاریات سے خارج اور جدا سے ہوا کرتی ہے، اس کا منشا بھی مجرد ہوتا ہے اور خود بھی مجرد ہوتی ہے خود مادی یا مجرد ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اگر اس کا مطمح نظر آب و رنگ ہیں تب تو وہ محبت حیوانی (مادی) ہے اور اگر آب رنگ صرف ایک تار برقی ہے

اور اگر محبت ذات سے ہے خواہ آب و رنگ میں کتنا ہی فرق کیوں نہ آجائے اور محبت کم نہ ہو تو اُسے محبت نفسانی کہتے ہیں۔ گو محبت نفسانی کی ابتدا میں ذرا آب و رنگ کا لحاظ زیادہ ہوتا ہے یعنی باوجود پاک جذبات ہونے کے آب و رنگ کے فرق سے کچھ نہ کچھ فرق ضرور آجاتا ہے چنانچہ محی الدین ابن علی الطائی (باطنی)[1] اپنی تفسیر القرآن میں لکھتے ہیں۔

---

[1] دائرۃ المعارف میں بطرس البستانی نے تصریح کر دی ہے، کہ یہ مشہور "شیخ اکبر نہیں" بلکہ کوئی باطنی فرقہ کا ہے، چنانچہ میرے نزدیک تو خود طرز تفسیر ہی اس خیال کی صاف طور پر تائید کر رہا ہے۔

اور ایک درجہ محبت نفسانی میں ایسا بھی آتا ہو کہ اب وہ رنگ بیکار ہوجاتا ہو۔ اسوقت عاشق واقعۃً کسی خاص ہیئت کذائی رکھنے والے معشوق کا عاشق نہیں رہتا بلکہ صرف روح معشوقی کا چاہنے والا رہ جاتا ہے چنانچہ اسی درجہ کو بیان کرتے ہوئے بقول کشف "مولف" "انسان کامل" نے لکھا ہے

یہی وہ درجہ ہے جہاں پہونچ کر مجنون از خود رفتگی سے "انا لیلیٰ" اور منصور تنگ ظرفی سے "انا الحق" لکھ اٹھا تھا۔ اسی درجہ کو غالب مرحوم نے ادا کرتے ہوئے خوب کہا ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

مگر کمال ضبط اور سلوک یہی ہو کہ اس پر بھی جامہ سے باہر نہ ہو۔
غالب کہتا ہے:-

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنک ظرفی منصور نہیں

اور اس درجہ میں ادراک کی کل طاقت صرف لذت کی آفرینش میں صرف ہوتی رہتی ہے اسی وجہ سے عاشق تمام دنیاوی معاملات میں عقل و ادراک سے کام نہیں لے سکتا، ہاں فقط حسن و عشق کے معاملات میں خوب جوہر دکھلاتا ہے، "دیوانہ بکار خویش ہوشیار"۔ اکبر الہ آبادی نے بھی اسی حقیقت کو خوب بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں

چشم خرد سے عار تھا حسن جنوں پسند کو
عقل کنے آنکھ بند کی اُس نے حجاب اٹھا دیا

اور محبت روحانی چونکہ روح انسانی کی ایک صفت ہو اور اسکو سطح نظر بھی ایک مجرد المجردات، اسلیئے وہ خود بھی مجرد ہے، اور یہ ابھی مجرد ہی سے ہوتی ہے، باقی کیفیات روحانی بعینہ محبت نفسانی کی کیفیات ہوا کرتی ہیں، فرق صرف قوت و ضعف کا ہوتا ہے اور کچھ نہیں، لہٰذا ان پر کچھ اور لکھنا تکرار سے خالی نہیں کہا جا سکتا۔

ابوالنظر رضوی

لارڈ رپن کا عہد حکومت

میں نے اس کتاب کا ترجمہ ایسے زمانہ میں کیا تھا جبکہ تحریک عدم تعاون زوروں پر تھی۔ بعض وجوہ سے جو اختیار سے باہر تھے، میں اب تک اسکی اشاعت کرنے سے قاصر رہا۔ اب جبکہ ملک کی فضا میں ایک گونہ سکون پیدا ہوگیا ہے میرا خیال ہے کہ اس کتاب کی اشاعت جو اپنی وضع میں عجیب و غریب ہے، بہت مفید ثابت ہوگی۔ اسمیں بہت سے ایسے امور سے بحث کی گئی ہے جو آج بھی ویسے ہی صحیح ہیں جیسے کہ سنہ ۱۸۸۳ء میں تھے جبکہ مصنف نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ بعض بعض جگہ مصنف کی غیر معمولی فہم و فراست اور دماغی قابلیت خراج تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہ سکتی کیونکہ (میرے علم میں) یہی پہلا انگریز ہے جس نے تحریک عدم تعاون کے شروع ہونے سے کہیں پیشتر یہ پیشگوئی کردی تھی کہ ایک زمانہ ایسا آئیگا جبکہ ہندوستانی نان کوآپریشن کرنے پر مجبور ہونگے۔ بہرحال نہیں کہا جاسکتا کہ وہ نان کوآپریشن جس کا خواب مصنف نے دیکھا تھا، پورا ہوچکا ہے یا ابھی اسکی تعبیر باقی ہے۔ بہرحال تحقیق والے شخص کے لیے غور و فکر کے واسطے اس کتاب میں بہت کچھ مفید مواد ملیگا۔

اس کتاب کی اشاعت ایک اور لحاظ سے بھی مفید ہے یعنی یہ کہ ہمارے ملک کے سیاحوں کو سفر کی صحیح یادداشتیں رکھنے کا طریقہ معلوم ہوجائیگا اور یہ کہ کسطرح سے ایک معمولی سے واقعہ کو پڑھنے والے کے لیئے زیادہ دلچسپ بنایا جاسکتا ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ میں اپنی ترجمہ کی محنت کو ناظرین "نگار" کے روبرو پیش کرتا ہوں۔

(ص - ا ب)

(۱)

مجھے اس کتاب کا نام "بیداری ہند" رکھنا چاہیئے تھا، اس لیئے کہ اسمیں لارڈ رپن کے عہد حکومت کے واقعات سے بحث کی گئی ہے جو درحقیقت ہندوستان میں آزادی کی جدید تحریک کا ابتدائی زمانہ تھا، بالفاظ دیگر وہ بےچینی اور کشمکش کا ابتدائی دور تھا جسے ہر محکوم سرزمین میں کامل ترقی کی ضروری تمہید سمجھنا چاہیئے۔

جس سفر کا مرقع اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ غیر معمولی زمانہ میں اور غیر معمولی دلچسپ حالات میں اختیار کیا گیا تھا۔ اسمیں ان واقعات کی پیشگوئی درج ہے جو آج ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں اور اسمیں ان

مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے، جسے بے انتہا انتظار اور بزدلانہ دلیری کے اظہار کے بعد بتدریج سرکاری طور پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔

لارڈ رپن کے زمانہ میں سیاسی صورت حالات حسب ذیل تھی، ۱۸۸۰ء میں جب مسٹر گلیڈسٹون دار العوام میں میجارٹی (اکثریت) کے لیڈر قرار پائے تو انہوں نے مشرق میں تحریک آزادی کو ترقی دینے کا وعدہ کیا جس کی وہ روح رواں سمجھے جانے لگے تھے، ہندوستان کے متعلق اُن کا فیاضانہ طرز عمل اس ایک فقرہ میں مضمر تھا کہ "ہندوستان میں ہماری موجودگی کا حق اس پہلی شرط پر منحصر ہے کہ ہماری موجودگی ہندوستانی اقوام کے لئے باعث فائدہ ہو اور نیز اس دوسری شرط پر کہ ہم ہندوستانیوں کو سمجھا دیں کہ درحقیقت وہ فائدہ مند ہے" ان کے پیشرو کی پالیسی ناکام ہو چکی تھی۔ وہ پالیسی ملکی مقبوضات کو وسعت دینے، اندھا دھند روپیہ خرچ کرنے اور انتظام سلطنت میں تشدد برتنے کی حامی تھی، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ایک طرف تو تباہ کن سرحدی جنگ چھڑ گئی اور دوسری طرف گورنمنٹ کو مالی زیر باری اٹھانی پڑ گئی، تعلیم یافتہ ہندوستانی جماعت مروجہ پالیسی سے بیحد پریشان و ناامید تھی، اسی طرح پر ہوا کہ ملک میں شدید قحط رونما ہو گیا اور غالباً یہ سخت ترین قحط تھا، لاکھوں کسان یا تو مر گئے یا نیم فاقہ کی حالت کو پہنچ گئے، قوانین جنگلات نمک کے محصول اور مالگزاری وصول کرنے والے افسروں کے روز افزوں تشدد کی وجہ سے بعض اضلاع میں بغاوت کے لگ بھگ حالت پیدا ہو چکی تھی، ملکی اخبارات کا جو یقیناً حکومت کو اُن تمام خرابیوں کا باعث قرار دیتے تھے، گلا دبا دیا گیا تھا، اور بےچینی اگرچہ ظاہراً موجود نہ تھی تاہم ہر جگہ پائی جاتی تھی، انگلستان کے ارباب حکومت کا اُسوقت یہ خیال تھا کہ یہ شورش خطرناک ہے، انہی خرابیوں کو دور کرنے اور ہندوستانی حکومت کو زیادہ کفایت شعار بنانے یعنی جنگجویانہ پالیسی کو خیرباد کہنے اور حکام و رعایا کے درمیان زیادہ اعتماد پیدا کرنے کی غرض سے لارڈ رپن کو ۱۸۸۰ء کے موسم گرما میں ہندوستان بھیجا گیا۔

میرا اپنا خیال ہے کہ ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے نمائندے اور وائسرائے کی حیثیت سے لارڈ رپن کا انتخاب زیادہ تر خود ہر مجسٹی نے کیا تھا۔ اگرچہ انہیں مسٹر گلیڈسٹون سے بہت کم ہمدردی تھی تاہم جدید پروگرام سے انہیں اس حد تک اتفاق تھا کہ انہیں اپنی ہندوستانی رعایا کی بےچینی سے سخت تشویش رہتی تھی، اور اُس نخوت و حقارت کا انہیں بہت صدمہ تھا جس کا اظہار انگریز بہادر ہندوستانیوں سے کیا کرتے تھے، غدر کے بعد باشندگان ہندوستان کے نام جو اعلان شائع ہوا تھا۔ اسمیں ملکہ معظمہ کی جانب سے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مابین کامل مساوات کا یقین دلایا گیا تھا اور ملکہ معظمہ کو یہ دیکھ کر دلی صدمہ ہوتا تھا کہ اس وعدہ پر بالکل عملدرآمد نہیں ہوا، علاوہ ازیں وہ لارڈ رپن کو ان کی اعلیٰ صیانت رائے کے باعث بہت چاہتی تھیں، اور اُن کا خیال تھا کہ وہی سب سے زیادہ قابل اعتماد شخص ہیں جو قیصر ہند کی

طرف سے باشندگان ہندوستان کے نام عہد و پیغام ادا کرنے کی اہمیت رکھتے ہیں۔

لارڈ رپن مسٹر گلیڈسٹون کی فتح والے سال کے موسم گرما کے آخری حصہ میں ہندوستان آئے۔ وہ اپنے ساتھ امن اور امید کا پیغام لائے تھے جس کی وجہ سے ہندوستانیوں کی توقعات بہت کچھ بڑھ گئیں۔ جو لوگ انگریزی سیاسیات سے واقف تھے۔ ان کے نزدیک مسٹر گلیڈسٹون کا نام اصلاحات کی کافی ضمانت خیال کیا جاتا تھا۔ ہندوستان کے متعلق ان کی رائے کو بہت زیادہ شہرت دی گئی اور چونکہ یہ بات معلوم تھی کہ اعلان مذکور میں خود ملکہ معظمہ کی ذاتی رائے کو بھی دخل ہے اس لئے اس سے عام رائے کو مزید تقویت حاصل ہو گئی۔ جو لوگ لارڈ رپن سے ملے انہیں ان کے انفرادانہ طرز عمل سے کسی ناامیدی پیدا نہیں ہوئی اگرچہ وہ بہت زیادہ اعلیٰ صفات سے متصف نہ تھے تاہم وہ نہایت ایماندار شخص تھے اور خیال تھا کہ جہاں تک وائسرائے کے اختیار میں صورت حالات کو متاثر کرنے کا امکان ہوگا وہاں تک انہیں ہندوستان کا بہی خواہ اور دوست تصور کیا جا سکتا ہے۔ شروع ہی سے انہوں نے سنجیدگی برتی لیکن ایسی خشک سنجیدگی نہیں جو انگریزوں اور مشرقیوں کے درمیان بالعموم سد راہ ہوا کرتی ہے۔ ان کے طرز عمل میں محبت کی بو پائی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے انہیں بہت جلد ہندوستانیوں کا کامل اعتماد حاصل ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ انہیں اس بات سے فائدہ پہونچا کہ وہ انگریزی گرجا سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ غیر معمولی طور پر راسخ العقیدہ رومن کیتھولک تھے۔ بہرحال ابھی ہندوستانی زمانہ کی ابتدا میں لوگوں کے عام خیالات ان کے متعلق اچھے ہی تھے جب وہ بمبئی میں اترے تو لوگوں کو دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ اترتے ہی وہ سیدھے رومن کیتھولک گرجا میں گئے اور کچھ دنوں بعد وہ کلکتہ میں لوگوں کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پائے گئے، حالانکہ پہلے وائسرایوں کا یہ دستور نہ تھا۔ ان کی ابتدائی کارروائیاں ان کے پروگرام کے عین مطابق تھیں۔ انہوں نے آتے ہی مشرقی ہمسایوں اور ہندوستانی ریاستوں کو نقصان پہونچا کر برطانوی ہندوستان کی حدود کو وسعت دینے کی پالیسی کا یکقلم خاتمہ کر دیا۔ مالیات میں کفایت شعاری برتی اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی رائے کے ایسے اتحاد کرنے کی غرض سے پریس کی قیود کو اٹھا دیا اور یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح کر دی گئی کہ عہد جدید میں کسی ہندوستانی کو نفس اپنی سیاسی رائے کے اظہار کے باعث تکلیف نہیں دی جائیگی مگر

گو تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہوگا کہ (خواہ لارڈ رپن اصلاحی اصول کے کتنے ہی وفادار رہے ہوں) یہ بات منکشف ہو گئی کہ انگلستان والوں کے رجحان میں (اور یہ وہ لوگ تھے جن کے ہاتھ میں ہندوستانی اصلاحات کی باگ تھی) تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ ۱۸۸۲ء کے ابتدائی موسم گرما میں مسٹر گلیڈسٹون نے مصر میں قوم پرستوں کے خلاف سخت کارروائی کی (جس سے تمام مشرقی دنیا میں وہ بدنام ہو گئے) اور وہ اصول خاک میں مل گئے جن کا اظہار انہوں نے دو سال قبل اس وقت کیا تھا جبکہ وہ برسر حکومت نہ تھے) اور اسکندریہ پر گولہ باری کرنے کے بعد وہاں ۳۰ ہزار فوج اس غرض سے بھیجی تاکہ جو آئینی حکومت

وہاں قائم ہو رہی تھی، اس کا استیصال کر دیں۔ اور بغاوت فرو کرنے کی آڑ میں خدیو کی سلب شدہ حکومت کو دوبارہ بحال کر دیں، یہ وحشیانہ اور احمقانہ دست درازی یہ جنگ اور سازش جو صرف مختلف اقوام کے مالی مفاد کی خاطر برپا کی گئی تھی، شائستہ قانون اور اصول کے خلاف تھی اور جس بات نے ہندوستانی معاملات کو اور زیادہ درہم برہم کر دیا وہ یہ تھی کہ جنگ کے بار اور اخراجات کا بڑا حصہ ہندوستان کے خزانۂ عامرہ اور غربا پر ڈال دیا گیا، اس کارروائی کی صریح بے انصافی کے خلاف لارڈ رپن کی صدائے احتجاج بالکل رائیگاں گئی، وہ ہوم گورنمنٹ کے اصرار کی مخالفت کرنے کی تاب طاقت نہ رکھتے تھے، اور اسلیئے مالی ظلم کی کارروائی پایۂ تکمیل کو پہونچگئی۔ اسوقت والسرائے پر یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہو گئی کہ اصلاحات ہند کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑیگا، اور بالآخر یہ سچ سچ ثابت بھی ہوگیا، مصر میں خلاف اصول کارروائی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اور بہت سی بے ضابطگیاں عمل میں آئیں اور ہندوستان اور بلاشبہ تمام ایشیا میں اصلاحات اور سلف گورنمنٹ کی تحریک ایک نسل پیچھے ہٹ گئی، مشرق میں غاصبانہ شہنشاہیت کی اسپرٹ کو جسکے خلاف مڈلوتھین کی مہم انتخاب میں صدائے ناراضگی بلند کی گئی تھی، خود مسٹر گلیڈ اسٹون کے ہاتھوں دوبارہ زندگی اور تقویت نصیب ہوئی۔ ہندوستانی کفایت شعاری کا دعوا اور غیر ضروری ہندوستانی لڑائیوں کے خلاف امن کا جذبۂ حقارت سب غائب ہوگیا، اور جن لوگوں نے انہیں مشرقی آزادیوں کا پیغمبر سمجھکر ان کی پیروی کی تھی، وہ سب کے سب ان کے دشمنوں سے جا ملے جب لارڈ رپن اینگلو انڈین حکام کو ملکۂ معظمہ کے اعلان کے ماتحت کسی حد تک عملی کارروائی کرنے کی غرض سے اپنا ہم خیال بنانے میں دو سال کی مساعی جمیلہ کے باوجود ناکام رہے تو انہوں نے ۱۸۸۳ء کے موسم بہار میں ارادہ کیا کہ البرٹ بل پر جم کر لڑائی کریں حالانکہ وہ اپنے تئیں شکست خوردہ سمجھ چکے تھے اور انہیں اچھی طرح یقین ہوگیا تھا کہ جس مقصد کے حصول کے لیئے وہ اپنی کوششیں صرف کر رہے ہیں، وہ سراسر ناکام ہو چکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ البرٹ بل بجائے خود موعودہ مساوات کی بہت ہی معمولی قسط تھی جسے دینے کے لیئے انہیں بھیجا گیا تھا۔ اس بل کا مقصد یہ تھا کہ غیر سرکاری انگریزوں (اور بالخصوص کاشتکار جماعت) کو جو اپنے ہندوستانی ملازمین سے بری طرح پیش آتے تھے اور بعض اوقات ان کی موت کا باعث ہوئے تھے، بدسلوکی کرنے سے روکا جائے اسکی رو سے پہلی مرتبہ ہندوستانی ججوں کو فوجداری مقدمات میں انگریزوں کی سماعت کرنے کے اختیارات دیئے جانے کی تجویز کی گئی تھی بجائے اسکے کہ اُن کے مقدمات اُن کے ہم ملکی ججوں اور جیوری کے سامنے پیش ہوں اگرچہ یہ بہت ہی حقیر رعایت تھی تاہم جو جماعت اسکی زد میں آنے والی تھی، وہ سخت برہم ہوگئی اور اس نے اینگلو انڈین

اخبارات میں غیر معمولی شدت کے ساتھ لارڈ رپن کی مخالفت شروع کر دی۔ البرٹ بل کے بارے میں یہ مشہور کیا گیا کہ وہ باغیانہ قانون ہے اور اس کی رو سے ہر انگریز ہندوستانی سازش اور تعصب کی بھینٹ چڑھ جائیگا، لارڈ رپن کے خلاف جو جو حملے ہوئے، ان میں یقیناً اینگلو انڈین حکام کا ہاتھ کام کر رہا تھا، تھوڑے ہی دنوں بعد انگلستان کے اخبارات میں بھی وہ اعتراضات شائع ہونے شروع ہو گئے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس بل پر ہندوستان کے تمام مستقبل کا دارومدار ہے۔ "ٹائمز" بھی اس مہم میں شریک ہو گیا، اور وزارت اس کی ہر دلعزیزی سے خوفزدہ ہو گئی تھی کیونکہ ملکہ معظمہ کو وائسرائے کی صیانت رائے پر جو اعتماد تھا اسمیں تنزلزل پیدا ہو گیا، اسطرح سے لارڈ رپن عملاً اسس جنگ میں بالکل یکہ و تنہا رہ گئے۔

جن لوگوں نے میری کتاب انگریزی قبضۂ مصر کی خفیہ تاریخ[1] کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکیں گے کہ جس مقصد کی حمایت لارڈ رپن اب تک کر رہے تھے، اس کا میری ذات پر کہاں تک اثر پڑا تھا۔ میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے ان سے پیشتر لارڈ لٹن کے زمانہ میں سرسری طور پر ہندوستان کی سیاحت کی تھی اور اسوقت شملہ میں دو مہینہ تک وائسرائے کی میزبانی سے متمتع ہو۔ تھا، یہ سیاحت محض دوستانہ تعلقات کی بنا پر اور عرب، ٹرکی اور ایران میں عرصۂ دراز تک سفر کرنے کے بعد اختیار کی گئی تھی، اور باوجود اس امر کے کہ میری تعلیم ٹوری فرقہ پالیسی کے مطابق ہوئی تھی اور اپنے اہل ملک کی حمایت مجھے منظور رہتی اور باوجود اسکے کہ دوران قیام میں مجھے روزانہ بڑے بڑے اینگلو انڈین افسر مثلاً سر جان اسٹریچی، مسٹر الفرڈ لائل اور خود لارڈ لٹن کی صحبت میسر آئی تھی جو اپنے نظام حکومت کے مختلف طریقوں کے متعلق مجھے تعلیم دینے کی سخت کوشش کرتے تھے، تاہم اس مسئلہ کے متعلق میں ہمیشہ مشکوک رہا کہ ہماری شہنشاہی حکومت ہندوستان کے لیئے فائدہ مند ہے، مالیات کے بارے میں اسٹریچی کی پالیسی ہندوستان کے لیئے ہمیشہ تباہ کن معلوم ہوئی اور وہ پالیسی یہ تھی کہ اخراجات میں اضافہ ہو، قرض عامہ میں بیشی ہو اور ٹیکس میں زیادتی ہو، نہ تو وہ خود اور نہ لارڈ لٹن مجھے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوئے، کہ کسانوں اور غریب رعایا کی حیرت انگیز غربت کا تعلق ہمارے طریقۂ حکومت کی فضول خرچی سے نہیں ہے۔

لیکن اسپر بھی مجھے ہندوستان کی اصلی حالت کے متعلق زیادہ بھی واقفیت حاصل نہ ہوئی، شملہ میں جب تک رہا مجھے ہندوستان کے کسی نمایندے سے سرکاری خیالات کی مخالفت میں گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملا، اور نہ میں کسانوں کے لاغر دردِ نحیف جسموں کی معمولی جھلک سے زیادہ کبھی کچھ دیکھ سکا، جب چار سال کے بعد میں نے دوبارہ ہندوستان

---

[1] Secret History of the English occupation of Egypt

کی سیاحت کرنے کا خیال کیا تو جو واحد فائدہ میں نے اٹھایا وہ یہ تھا کہ اس اثنا میں مشرق و مغرب کے متعلق میری سیاسی تعلیم ترقی پا چکی تھی اور میں نے ذاتی تجربات و مشاہدات کی درسگاہ میں بی اے کی ڈگری حاصل کر لی تھی، مصری کسان کی حالت ہندوستان کی حالت سے مختلف نہیں ہے اور دونوں کی اقتصادی ضروریات ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ میں بچشم خود اور نہایت قریب سے مصری انقلاب کا مشاہدہ کر چکا تھا جو درحقیقت قرض کے خلاف کسانوں کی بغاوت تھی اور یوروپین سازش سے جو مقابلہ درپیش تھا اس کا نظارہ میں پس پردہ بیٹھ کر کر رہا تھا، اور مجھے یہ حقیقت جلدی ہی معلوم ہو گئی کہ مصری مصلحین راستی پر ہیں اور ہمارے ہندی حکام غلطی پر۔ اسوجہ سے میں نے ارادہ کر لیا کہ اگلی مرتبہ میری سیاحت ہندوستان سرکاری سرپرستی میں نہ ہوگی بلکہ ملک کے جن باشندوں سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوگا ان سے حتی الامکان آزادانہ ملونگا، مشرق میں حکومت خود اختیاری کا حامی ہونے کی حیثیت سے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ انگریزی حکومت کی جانب اہل ملک کے اصلی خیالات کیا ہیں اور یہ کہ بالآخر ان کے آزادی حاصل کرنے کے امکانات کسقدر ہیں۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے بلاشبہ اس امر سے بے انتہا مدد ملی کہ انقلاب مصر میں میں نے مصریوں کی حمایت کی تھی اور اخبارات کے ذریعہ میں نے ان کے اغراض و مقاصد کی تائید کی تھی، اسکی وجہ سے تحریک اتحاد اسلام کے روشن خیال لیڈروں سے میری ملاقات ہو گئی اور انہی حضرات کے باعث مجھے ان کے ہندوستانی ہم مذہبوں کا دلی اعتماد حاصل ہوا، ہندوؤں کے لیئے میرے پاس کوئی تعارفی سفارش نہ تھی، لیکن اس بارے میں حالات نے شروع ہی سے میری مساعدت کرنی شروع کر دی، مصر میں میرا بدترین دشمن وہاں کی مالیات کا اینگلو انڈین کنٹرولر سر آکلینڈ کالون تھا، اور جب اُسے میرے ارادہ کی بھنک لگ گئی تو اس نے لارڈ رپن سے یہ کہکر رخنہ ڈالنے کی کوشش کی کہ یہ خوفناک آدمی ہے اور اسکو ہندوستان آنے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے اور اگر دی بھی جائے، تو اسپر سرکاری عتاب نازل رہنا چاہیئے۔ کالون کی خاص ملازمت کی مدت میعاد حال ہی میں ختم ہوئی تھی اور وہ پھر ہندوستان میں واپس آ گیا تھا، اور اسکی رائے کو بہت اہمیت دیجاتی تھی۔ جب ہیڈکوارٹرز میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو پھر اس نے اینگلو انڈین اخبارات بالخصوص "پانیر" کے ذریعہ جسکے ساتھ اس کا دیرینہ تعلق تھا، مجھے مطعون اور بدنام کرنے کی کوشش کی، اسکی یہ کارروائی خواہ خلاف مصلحت ہو، لیکن اسنے اعلیٰ تعارفی خط سے بڑھکر مجھے ہندوؤں کے تپاک آمیز استقبال کا یقین دلا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں میں گیا مجھے شورش پسندوں کی جماعت نے دل خوش کن تعجب کے ساتھ دیکھا گویا کہ جو شخص اینگلو انڈین

حضرات کے غصہ کا شکار ہو جاتا ہے وہ اُن کا دوست بن جاتا ہے۔ اگر انجام کار میرا سفر کامیاب رہا تو بلا شبہ اس کا
سبب "پائنیر" اور اس قسم کے دیگر مخالفانہ سرکاری اخبارات کی حمایات تھیں۔

لندن سے روانہ ہوتے وقت مجھے ڈاؤننگ اسٹریٹ[1] سے ایک خط ملا جس میں مجھ سے ملنے کے لیے بلایا گیا تھا،
میری ڈائری کا پہلا اندراج اس واقعہ سے ہوتا ہے۔ دوسرے واقعہ کا تعلق مصر سے ہے جہاں مجھے چند روز
ٹھہرنے اور سر ایولین بیرنگ[2] سے ملاقات کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا، جو نئے نئے اپنی اسامی پر مقرر ہوئے تھے
اور جس پر وہ بعد میں اسقدر عرصہ تک فائز رہے تاکہ قومی پارٹی کو برسرِ حکومت لانے کے بارے میں کوئی تجویز نکالی
جائے۔ یہ خیال مسٹر گلیڈ اسٹون کا تھا، اور جب میں مصری معاملات پر بحث کرونگا تو اسوقت اس پر پوری روشنی
ڈالونگا، یہاں میں صرف اسیقدر بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ میری ملاقات کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا اور یہ کہ
بعد میں اُسے بہانہ قرار دے لیا گیا تھا، تاکہ مجھے مصر سے خارج کر دیا جائے۔ اس اخراج کا ذکر میری ڈائری میں
ملیگا۔ پہلے اندراج میں میرے اور لارڈ رینڈولف چرچل کے سیاسی تعلقات کا حال ہے کیونکہ میرا سفر انہی کے مشورے
سے عمل میں آیا تھا۔ ڈائری میں جس ہملٹن کی جانب اشارہ ہے ان سے مراد مسٹر گلیڈ اسٹون کے چیف پرائیویٹ
سکرٹری سر ایڈورڈ ہملٹن ہے۔ پرم روز سے مراد سر ہنری پرم روز ہے، جو لارڈ رپن کے پرائیویٹ
سکرٹری تھے، میں نے اس کتاب میں سے وہ حصے نکال دیئے ہیں جن کا تعلق معاملات مصر سے ہے انہیں کسی دوسرے
موقع پر پیش کرونگا۔ لارڈ رینڈولف کے متعلق یہ کہنا غالباً غیر ضروری نہ ہوگا کہ جس جنگ میں مصر کے متعلق میں گزشتہ سال
سے مصروف ہوں، اس میں خاص پارلیمنٹ کے اندر میرے سب سے زیادہ موثر رفیق وہی تھے۔ چرچل اگرچہ شہنشاہیت
میں ڈزرائیلی کے ہم خیال تھے، تاہم وہ نوجوان تھے اور بہت خوبیوں کے آدمی تھے۔ ان کے خیالات فیاضانہ تھے اور
کمزوروں اور مظلوموں کے خاص ہمدرد تھے، میری اور اُن کی دوستی بہت گہری تھی، اور اسکی وجہ سے انہیں مشرقی
خیالات سے اس درجہ دلچسپی ہو گئی کہ مصری قومیت کی حمایت کرنے میں، علاوہ انہوں نے اس کا اقرار کیا کہ میں
لارڈ رپن کی پالیسی کا ہم خیال ہوں، اس معاملہ کو اور وزیر ہند کی حیثیت سے ان کی مختصر زندگی کو میں نے ایک مختصر
باب کی صورت میں کتاب ہذا میں شامل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اُسے کسی اور موقع کے

---

[1] Downing street (انگلستان کے وزیر خارجہ سے مراد ہے جو اس بازار میں ایک عمارت میں واقع ہے)
[2] Sir Evlyne Baring یعنی لارڈ کرومر

کے لیئے رہنے دیا جائے۔ جو جلد اپنے عہدہ پر عہدہ اراددوں اور جذبات کے ساتھ متمکن ہوئے تھے اور اب بھی میرا یہ خیال ہے کہ اگر وہ اور چند سال تک انڈیا آفس میں رہ جاتے تو وہ اصلاحات کو بہت جلد نافذ کر دیتے۔

ان تمہیدی الفاظ کے ساتھ میں اپنی ڈائری کو باقی داستان بیان کرنے کے لیئے پیش کرتا ہوں۔

(۲)

بلنٹ

"۱۲- ستمبر ۱۸۸۳ء

"۱ بجے کی ٹرین سے میں گھر سے روانہ ہوا اور تمام دن لندن میں رہا۔ لیڈی ہیلن کے پاس سے آج صبح ایک خط موصول ہوا ہے جسمیں لکھا ہے کہ روانگی سے پیشتر مجھ سے مل جاؤ۔ چنانچہ میں ایک بجے ڈاؤننگ اسٹریٹ گیا۔ مسٹر گلیڈسٹون کشتی کی سیر کے لیئے گئے ہوئے ہیں اور لیڈی اُن کی قائمقامی کر رہی ہیں۔ لیڈی اس مرتبہ نہایت اخلاق سے ملے اور مجھ سے پوچھا کہ مشرق میں کیا کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ میں نے اپنی تمام تجاویز بیان کر دیں، یعنی یہ کہ پہلے مصر جاؤنگا اور وہاں بیرنگ سے ملاقات کرونگا اور اگر میں نے دیکھا کہ وہ کسی قدر ہمدردی سے گفتگو کرتے ہیں تو میں یہ تجویز پیش کرونگا، کہ قومی جماعت کو بحال کر دیا جائے۔ لیکن اگر انہوں نے بے رخی برتی تو اس صورت میں میں سیلون اور ہندوستان جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں بیرنگ کی اجازت کے بغیر مصر میں کوئی کام نہیں کر سکتا اسلیئے کہ لوگ مجھ سے ملاقات کرنے کی جرأت نہ کرینگے۔ لیکن اگر بیرنگ نے میری مدد کی تو میں آیندہ انتخابات کے موقع پر قوم پرست لیڈروں کا انتخاب کرا سکونگا۔ ان تمام تجاویز کا دارومدار ہمارے اعلیٰ افسروں کے طرز عمل پر ہے۔ ہندوستان کے متعلق یہ ہے کہ میں وہاں بغاوت برپا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میں سب سے پہلے لارڈ رپن سے ملونگا۔ پھر لائل سے اور اسکے بعد مختلف صوبجات کا دورہ کرونگا۔ میں ملک کی مالی حالت کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں یعنی یہ کہ آیا ہمارا نظام حکومت ہندوستان کو تباہ کرنے والا ہے یا نہیں اور یہ کہ ہوم رول (حکومت خود اختیاری) کے متعلق وہاں کے باشندوں کے خیالات کیا ہیں۔ بظاہر لیڈی نے ان دونوں تجاویز کو پسند کیا اور کہا کہ بیرنگ بالضرور آپ کے خیالات معلوم کرنے کے شائق ہونگے۔ ہندوستان کے متعلق کہا کہ میں لارڈ رپن کے پرائیوٹ سکرٹری کے نام چٹھی لکھے دیتا ہوں تاکہ آپ کی ہر قسم کی امداد کی جائے۔ لیڈی سے رینڈولف چرچل کے متعلق بھی گفتگو ہوئی میرا خیال ہے کہ وہ نہایت اچھے آدمی ہیں۔

اسلیئے کہ ان کی بیوی امریکہ کی رہنے والی ہے اور اہل امریکہ نے وہاں کی تحریک آزادی سے ہمیشہ ہمدردی کا اظہار کیا

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ہر عمل کو اچھی نظر سے دیکھتا ہوں "

دوسرے دن میں اپنی بیوی کے ساتھ پیرس روانہ ہو گیا جہاں ہمارا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ مصری جلاوطنوں سے ملاقات کریں۔

"۱۳ - ستمبر -

رات کو پیرس پہونچے اور ہوٹل الیس روسین میں فروکش ہوئے۔ یہ خاموش مقام ہے اور ہم یہاں اپنے احباب سے بآسانی مل سکتے ہیں۔ سابو بھی شیخ جمال الدین کو ساتھ لیکر آئے۔ جب لندن میں موسم بہار میں میں نے شیخ سے ملاقات کی تھی تو وہ مولویانہ لباس پہنے ہوئے تھے اب وہ استانبولی وضع کا لباس پہنتے ہیں جو انہیں خاصا زیب دیتا ہے انہوں نے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی بھی سیکھ لی ہے۔ ہم نے ہندوستان کے متعلق گفتگو کی اور نیز اس امر کے متعلق کہ وہاں کے مسلمانوں کا حقیقی اعتماد کس طرح سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے انگریز ہونے کے باعث یہ کام بہت مشکل ہو گیا ہے، کیونکہ جو لوگ کچھ بھی حیثیت رکھتے ہیں وہ گورنمنٹ سے خائف ہیں جبکے جاسوس ہر جگہ چھوٹے ہوئے ہیں۔ میں خود سیاسی قیدی کی حیثیت سے وہاں رہ چکا ہوں اور ہندوستان سے اسلئے چلا آیا، کہ کہیں میری مصائب میں اضافہ نہ ہو جائے۔ جو مولوی ہندوستان میں کسی قدر شہرت حاصل کر لیتا ہے تو اسکی نگرانی کیجاتی ہے، اور پھر اُسے ہر طریقہ سے دق کیا جاتا ہے اور اگر وہ اپنے طرز عمل پر برابر قائم رہتا ہے تو کسی نہ کسی بہانہ سے اسے انڈمان (کالے پانی) بھیج دیا جاتا ہے، وہاں کے لوگ ہرگز ہرگز یہ تسلیم نہ کرینگے۔ کہ آپ اُن کے بہی خواہ ہیں، علما اور رؤسا تو آپ سے ملاقات نہیں کر سکیں گے، البتہ غربا آپ سے بالضرور ملینگے انہوں نے کہا کہ حیدرآباد آپ کے لیئے بہترین مقام ہوگا اسلیئے کہ وہاں ہندوستان کے مختلف حصص سے پناہ گزین آئے ہوئے ہیں اور وہ مقابلۃً گورنمنٹ سے کم خائف ہیں، انہوں نے مجھے چند اسلامی اخبارات کے ایڈیٹروں کے نام تعارفی چھٹیاں دینے کا وعدہ کیا ہے میں نے انہیں سیاسی صورت حالات سمجھائی اور کہا کہ یہ امر نہایت ضروری ہے کہ مسلمان لارڈ رپن کی پالیسی کی تائید کرنے میں ہندوں کا ساتھ دیں، انہوں نے کہا کہ جب مسلمانوں کو یہ بات معلوم ہو جائیگی کہ انگلستان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو اُن کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں، تو پھر ان کی ہمت بندھ جائیگی۔ فی الحال تو ان کا سابقہ ایسے افسروں سے ہے جو شائستہ گفتگو میں کبھی خندہ پیشانی سے پیش نہیں آتے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ سلطان المعظم کے متعلق کس انداز سے ذکر کیا جائے اور انہوں نے مجھے یہ صلاح دی کہ سلطان المعظم کے خلاف یا عربی خلافت کی تائید میں آپ کچھ نہ کہیں۔ یہ افواہ اڑ رہی ہے کہ انگریز عرب میں کسی بچہ کو تخت خلافت پر متمکن کرنا چاہتے ہیں تاکہ اسکی آڑ میں وہ مقامات

مقدسہ پر قابض ہو جائیں سلطان ابن السعود کے نام کی اب جسقدر عزت و حرمت کی جاتی ہے، اتنی تک دیکھنے میں نہیں آئی۔

"۳۰ ستمبر - جمال الدین اور سالم نجی نے میرے ساتھ کھانا کھایا اور دن بھر باتیں کرتے رہے۔ شیخ حسب وعدہ تعارفی خطوط لے آئے، جو نواب عبد اللطیف (کلکتہ) اور نواب رسول یار خاں (حیدر آباد) کے نام لکھے گئے تھے، ان خطوط سے مجھے بیحد مدد ملی۔ انہوں نے اپنے خاندان کے متعلق بہت سی دلچسپ باتیں بیان کیں اور کہا کہ میرا خاندان خاص عرب سے آیا تھا اور اب تک ہمارے گھرانے میں عربی زبان کی تحصیل نمایاں خصوصیت رہی ہے میں نے انہیں اپنا پروگرام پڑھ کر سنایا جسے میں نے مصر میں قومی پارٹی کو بحال کرنے کی غرض سے مرتب کیا تھا، اسکے بعد شیخ سے اس مسئلہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہی کہ جامع ازہر کو تمام دنیائے اسلام کے لئے حقیقی یونیورسٹی کس طرح سے بنایا جا سکتا ہے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ قدیم زمانہ میں اسکی یہی شان تھی۔"

اسی شام کو ہم مارسیلز روانہ ہوگئے اور وہاں سے مصر جہاں ہم ۱۰ دن تک مقیم رہے، جہاں تک سیاسی صورت حالات کا تعلق ہے بجز ناکامی ہیں اور کچھ حاصل ہوا، میں نے سر اوین بیرج سے گفتگو کی لیکن نصف گھنٹہ کی بات چیت نے مجھے یقین دلا دیا کہ اگرچہ مسٹر گلیڈ سٹون قومی جماعت کو برسر اقتدار آنے کا خواب دیکھ سکتے ہیں، تاہم اس قسم کا کوئی خیال سر اوین کے دل میں موجود نہیں ہے، وہ ذریو کی تائید کرنے کے سوائے اور کچھ ارادہ نہیں رکھتے اسلئے ہم ۹ اکتوبر کو "گورکھا" نامی جہاز میں سوار ہو کر عازم ہندوستان ہوگئے، راستہ میں ہم سیلون میں عرابی پاشا اور ان کے چاروں رفقاء سے ملنے کے خواہشمند تھے اور اسلئے ہم نے وہاں چند دن تک رہنے کا ارادہ کر لیا۔

لیکن وہاں ہم مقررہ دنوں سے زیادہ ٹھہرنے پر مجبور ہوگئے۔ جہاز میں سوار ہوتے ہی مجھے موسمی بخار نے آگھیرا، جہاز "گورکھا" نہایت نفرت انگیز تھا، نہ اسمیں کوئی ڈاکٹر تھا، اور نہ صفائی کا کوئی معقول انتظام تھا، مسافر ضرورت سے زیادہ تھے بیمار آدمی کے لیئے اسمیں کسی قسم کے آرام کا سامان موجود نہ تھا۔ ہمارے ہم سفر بالعموم نوآبادیوں کے انگریز یا اینگلو انڈین کاشتکار تھے۔

"۱۰ اکتوبر۔ جہاز میں جن اشخاص سے ملاقات ہوئی ان میں مسٹر پامر کا نوجوان بھائی بھی تھا جسے گورنمنٹ نے کلکتہ کی ٹکسال میں ۱۲ ہزار روپے سالانہ کے مشاہرہ پر ملازم رکھ لیا ہے، وہاں دو سال تک کام کرنے کے بعد لندن کی ٹکسال میں اس کا تبادلہ کر دیا جائیگا۔"

جس طریقہ سے ہندوستانی روپیہ انگلستان میں ملازمت کی دشواریوں کو رفع کرنے کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ اسکی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔ پروفیسر پامر کو لارڈ نارتھ بروک نے جنکا تعلق اسوقت وزارت

بحری سے تھا۔ مصر کے مجوزہ حملہ کے سلسلہ میں ایک خفیہ مشن پر بھیجا گیا تھا۔ پروفیسر مذکور کی جان اس مشن کی نذر ہوگئی اور اُن کی بیوہ نے لارڈ موصوف کی خدمت میں پنشن کی درخواست دی۔ چونکہ مشن خفیہ تھا اور انگریزی بحری محکمہ جات میں اسے نہیں دکھایا جاسکتا تھا۔ اسلئے پامر کے برادر نسبتی کو ہندوستان میں ملازمت دیدی گئی تاکہ پنشن کا بدل ہوسکے۔

"باقی مسافر جانے کے کاشتکار تھے۔ اور البرٹ بل سے سخت ناراض تھے۔ جہاز میں میں نے زیادہ تر اپنا وقت تلاوت قرآن مجید میں صرف کیا جس سے موجودہ حالت میں بہت کچھ تسکین مل سکتی ہے۔ جہاز پر بعض مواقع ایسے پیش آئے کہ میرا جی چاہا کہ میں جہاد کا اعلان کردوں۔"

"۱۱۔ اکتوبر جانے کے ایک نوجوان کاشتکار سے بھی میری کسیقدر گفتگو ہوئی۔ یہ شخص سرحد برما کے قریب سکونت رکھتا ہے۔ اس کے خیال میں ہندوستان میں نئی قسم کی بغاوت رونما ہو رہی ہے۔ البرٹ بل کے خلاف اسکے اعتراضات معمولی قسم کے تھے یعنی یہ کہ ہندوستانی مجسٹریٹ دشمنی سے پیش آتے ہیں اور یہ کہ ہندوستانیوں میں جھوٹے گواہوں کی بہت کثرت ہے۔ اس کا خیال تھا کہ مسودہ قانون نامنظور ہوگا۔ ایک سمجھدار معمر خاتون بھی جو ۲۸ سال تک برما میں رہ چکی ہے، نوجوان کے ہم خیال تھی، وہ افیون کی تجارت کے سختی سے مخالف تھی۔ برما کے بدھ مذہب کے پجاری شاکی ہیں کہ ہمارے عہد حکومت میں اُن کے ملک کی اخلاقی حالت بہت خراب ہوگئی ہے اور جہاں پہلے کسی قسم کی کوئی خرابی موجود نہ تھی۔ وہاں اب افیون اور شراب کثرت سے استعمال کیجاتی ہے۔ خاتون اس شکایت کو حق بجانب قرار دیتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ گورنمنٹ نے اپنی آمدنی کی خاطر لوگوں کو افیون کا عادی بنادیا ہے۔

"۱۲۔ اکتوبر۔ عید قرباں۔ خلاصیوں نے جن میں اکثر مسلمان ہیں، اپنے صافے بدل کر نماز ادا کی۔

"۱۳۔ اکتوبر۔ گزشتہ رات تیل کے ایک معمر کاشتکار نے البرٹ بل اور دیگر متعلقہ مسائل پر اپنے خیالات سے ہمیں محظوظ کیا۔ اس نے کہا کہ سلطنت کا دارومدار کاشتکاروں پر ہے انہوں نے غدر میں سلطنت کو بچایا تھا، اور آج کل بھی مالی معاملات میں سلطنت انہی پر انحصار رکھتی ہے۔ میں نے اسکی تشریح طلب کی۔ اس نے جواب دیا کہ ہم زمینداروں کو پیشگی روپیہ دیدیتے ہیں تاکہ وہ سرکاری مالگذاری ادا کرسکیں۔ ہم اپنے روپیہ پر سود نہیں لیتے بلکہ تبادلہ میں اُن کے گاؤں لے لیتے ہیں۔ ہمیں اتنا فائدہ ہوجاتا ہے کہ کسان ہمارے لیئے تیل کی کاشت کردیتے ہیں۔ اگر البرٹ بل پاس ہوگیا۔ تو تمام کاشتکار ہندوستان چھوڑ کر چلے جائینگے۔

"مسٹر ڈبلیو ..... ایک صاحب ہمارے ہمراہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں، ہندوستان ایک مفتوح ملک ہے اور

کالے آدمی سب کے سب بدمعاش ہیں۔ زخمی کاشتکار بھی اس حقہ میں مسٹر ڈوائی کا شریک تھا، اس نے ہمیں یقین دلایا کہ ہندوستان میں عیسائی بننے کے بعد بھی کوئی ترقی نہیں ہوگی۔ ہمارے بعض کاشتکاروں نے عیسائی قلیوں کو ملازم رکھا تھا لیکن وہ اور زیادہ خراب نکلے۔ کوئی شخص بغیر کسی ذاتی غرض کے عیسائی بننا نہیں چاہتا۔ اس نے ایک واقعہ کا ذکر کیا کہ کس طرح سے ایک انگریز کو جھوٹ موٹ کے اقدام قتل میں سال بھر کی سزا ملی حالانکہ مجروح شخص جون کا توں زندہ ہے۔ میرے ایک سوال کے جواب میں کاشتکار نے کہا کہ بہترین بات تو یہ ہے کہ ہندوستانیوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے تا وقتیکہ تمہارا مقصد فی الحقیقت سزا دینا ہو، اگر تم کسی کالے آدمی کو اسطرح مارو کہ وہ یہ سمجھ جائے، کہ تم اسے زور سے مارنے سے ڈرتے ہو تو وہ سیدھا مجسٹریٹ کی عدالت میں چلا جائیگا۔ لیکن اگر تم اسے اچھی طرح سے پیٹوگے تو وہ یہ سمجھیگا کہ وہ اسی سزا کا مستحق تھا، مگر تم کو محتاط رہنا چاہئے مبادا تمہاری ضرب زیادہ شدید ہو اسلیئے کہ وہ ذرا کمزور ہوتے ہیں اور ہر ۵ آدمیوں میں سے چار کی تلی بڑھی ہوئی ہوتی ہے، اور بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تم کو ستانے کی غرض سے اُن میں مرنے کی بھی قابلیت موجود ہے۔

"۱۴۔ اکتوبر۔ آج میری طبیعت نسبتاً خراب ہے۔ جہاز کے مسلمان ملازمین نے پہچان لیا ہے اُن کے ساتھ ہمارا برتاؤ دوسرے مسافروں کی طرح سے نہیں ہے اور اسلیئے وہ ہماری زیادہ خاطر مدارات کرتے ہیں مسٹر ہامر کا بھائی لینگا گزشتہ رات کو ہم سے ملنے کے لیئے آیا، اس نے کہا کہ میں حیران ہوں کہ ٹکسال کی ملازمت مجھے کیوں پیش کی گئی ہے، حالانکہ میں انگریز نہیں ہوں، اس کا باپ پولینڈ کا رہنے والا تھا، جہاز پر ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی دیکھکر اُسے بیحد غصہ آتا تھا۔

"۱۵ تا ۱۸ اکتوبر۔ گزشتہ رات ہمارا جہاز کولمبو میں لنگر انداز ہوا"

میں دو تین ہفتہ تک سخت بیمار رہا۔ ۱۹ کی صبح کو ہمارے دوست محمود سامی اور عرابی جہاز پر ہمیں لینے کے لیئے آئے۔ شہر کے مسلمانوں کا ایک وفد ہمارے استقبال کے لیئے موجود تھا، ہمارے ورود کے اعزاز میں تمام راستہ پھولوں سے سجایا گیا تھا، میں جلوس میں جا رہا تھا لیکن مجھے خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ تیسری نومبر سے میری ڈائری کا پھر آغاز ہوتا ہے

"۳۔ نومبر۔ ہماری قیام گاہ دریا کے کنارہ پر ہے جسے ماہی گیر کشتیاں بندرگاہ کے طور پر استعمال کرتی ہیں علی الصباح لڑکے بکریوں کو چرانے کے لیئے لے آتے ہیں اور اسکے بعد مرد بیلوں اور گھوڑوں کو دریا میں نہلاتے

کھیلنے لاتے ہیں۔ یہ لوگ تیرتے نہیں بلکہ پایاب پانی میں کھڑے رہتے ہیں اور کبھی کبھی غوطے لگاتے ہیں اور اپنے ساتھیوں پر پانی کے چھینٹے مارتے ہیں۔ ان کے لمبے لمبے بال بھیگنے کے بعد بالکل عورتوں کے سے معلوم ہوتے ہیں۔ زیادہ دن چڑھے باغ کے برآمدہ میں میرے لئے چارپائی بچھا دیجاتی ہے اور وہاں سے میں بالکل ہی مختلف نظارہ کا مشاہدہ کیا کرتا ہوں۔ قریب ہی کیلوں کے بہت سے درخت ہیں اور تمام دن چھوٹی چھوٹی گلہریاں ایک شاخ سے دوسری شاخ تک کودتی رہتی ہیں اور یہ دیکھتی جاتی ہیں کہ آیا کیلے کھانے کے قابل ہوگئے ہیں یا نہیں۔ دوپہر کے وقت تقریباً ہر روز رنگ برنگ کی تیتریاں اڑتی پھرتی نظر آتی ہیں بعض اوقات وہ برآمدہ میں آجاتی ہیں اور اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں وہ مکڑیوں کے جالے میں نہ پھنس جائیں۔ چار بجے کے قریب آسمان بیشمار کوؤں کی وجہ سے جو شہر سے جزیرہ کی جانب لوٹ کر آتے ہیں، سیاہ ہو جاتا ہے، وہ کائیں کائیں کر کے ایک شور مچا دیتے ہیں اور آسمان کا جو حصہ مجھے دکھائی دیتا ہے وہاں غالباً دو، ہزار کی تعداد میں موجود ہوتے ہیں۔ اڑتے اڑتے وہ کبھی کبھی بڑ اور تاڑ کے درختوں پر بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ دوسرے پرندے ان سے خائف رہتے ہیں، آخرکار اندھیرا ہوتے ہی وہ سب نظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ جب ذرا زیادہ اندھیرا ہو جاتا ہے، تو جگنو اپنی بہار دکھاتے ہیں، میرے لئے چراغ روشن کر دیا جاتا ہے۔ اور کاوڈی[1] چار لاتی ہے، پھر مجھے بستر پر لٹانے کے لئے لیجاتے ہیں۔ الغرض ان بیس دنوں میں میری زندگی بعینہ اسی طریقہ سے بسر ہوتی رہی ہے"

ان تین ہفتوں میں، جو بعض لحاظ سے میری زندگی کے خوشترین ایام کہے جا سکتے ہیں، میرے دوست مصری جلاوطن اور کولمبو کے دیگر مسلمان مجھ سے ملنے کے لئے آتے رہے، بالخصوص عرابی روزانہ آتے تھے، اور اپنے بیماری کے کمرے میں میں نے انہیں شرافت اور مہربانی کا سراپا مجسمہ پایا۔ وہ میری ہر قسم کی مدد کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے اور میرے لئے انہوں نے وہ ادویہ بھی تجویز کیں جو مصری فلاحین استعمال کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنا تعویذ بھی جسے وہ ہمیشہ پہنے رہتے تھے، اتار کر مجھے پہنا دیا۔ وہ میری صحت یابی کو اسی تعویذ کا سبب قرار دیتے تھے عرابی اور دوسرے جلاوطنوں کے ساتھ قدرتی طور پر مصر کے گزشتہ واقعات پر بہت کچھ گفتگو ہوئی لیکن اس مقام پر اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی اسلئے کہ مصری معاملات کے سلسلہ میں میں نے ان خیالات کو پیش کر دیا ہے۔

---

[1] Cowrie

مجھے ۱۰ نومبر کی ڈائری میں یہ لکھا ہوا ملتا ہے کہ میں پہلی مرتبہ گاڑی میں بیٹھ کر میوا فوری کو نکلا، عرابی بھی میرے ہمراہ تھے اور یہ کہ ہم گرگیوری کا مقبرہ دیکھنے کے لیے سینیں باغ میں گئے جہاں تین دن بعد مجھے ایک ڈنر کے موقع پر بھی جانا پڑا جسے مقامی مسلمانوں نے میرے اعزاز میں دیا تھا۔ یہاں میں نے تقریر بھی کی تھی اور عرابی نے زبان عربی میں ملکہ معظمہ کا جام صحت تجویز کیا تھا۔ کولمبو میں گورنر نے ہمیشہ جلاوطن لوگوں کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا برتاؤ روا رکھا۔ وہ گورنمنٹ ہاؤس میں ہر تقریب کے موقع پر بلائے جاتے تھے، خود ان کے ہم مذہبوں میں ان کی بہت توقیر کی جاتی تھی، عرابی جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھا کرتے تھے۔

سیلون کے مسلمان بالعموم "مور" کہلاتے ہیں اور اسی نام سے جنوب مغربی ساحل کے مسلمان بالعموم مشہور رہے۔ یہ شمال کے مغلوں سے پہلے یہاں آکر آباد ہوگئے تھے اور اُن عرب تاجروں کی اولاد ہیں جو اسلام کے ابتدائی صدیوں میں عمان اور یمن سے تجارت کے سلسلہ میں آئے تھے، شمالی ہند کے مسلمانوں کے برخلاف یہ بہت خوشحال ہیں اور جواہرات کی تجارت کا اکثر حصہ ان کے ہاتھ میں ہے، یہاں کے ہندو جو دراوڑ نسل سے ہیں اور جنکی تعداد ۱/۲ کروڑ سے زیادہ ہے۔ شمالی ہند کے ہندوؤں کے مقابلہ میں زیادہ مذہبی ہیں اور اپنی مذہبی رسوم کے زیادہ پابند ہیں، ان کی جماعت کے سر دار رام ناتھ نے مجھ سے کہا کہ تمام مشرقی اقوام کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار ہیں۔ لیکن بعض عیسائی فرقے ان سے اچھے تعلقات نہیں رکھتے، ۹ تاریخ کو تامل باشندوں نے مجھے ضیافت دی جس میں مصری پاشا اور چند یورپین بھی بلائے گئے تھے، یہ تامل مسلمان تھے اگرچہ میری صحت ابھی نہ تھی، تاہم میں نے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں صلاح کرنے کے مسئلہ پر طول طویل تقریر کی، میں نے یہ تقریر انگریزی میں کی تھی جسے بلاشبہ وہاں سب سمجھتے تھے۔

کولمبو کے زمانۂ قیام میں وہاں کے گورنر سر آرتھر گارڈن سے بھی مراسم پیدا ہوگئے۔ یہ نہایت اچھے آدمی ہیں اور دیسی باشندوں سے خوب ربط و ضبط رکھتے ہیں۔ سیلون میں دیسی باشندوں کے حقوق کم و بیش یورپین باشندوں جیسے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ پبلک میں کم سے کم دونوں کے درمیان بہتر تعلقات دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں وہ انتہائی اور کھلم کھلا نفرت و حقارت نہیں پائی جاتی جو شمالی ہند میں موجود ہے، اور نہ مقامی باشندوں میں نسلی تلخی و حقارت کے جذبات دکھائی دیتے ہیں، جو ہندوستان میں عام طور سے پائے جاتے ہیں

"۱۱- نومبر- اپنے دوستوں سے رخصت ہو کر ہم بذریعہ جہاز ٹیوٹیکورن روانہ ہوئے، سب

پاشا پہنچانے کے لیے جہاز پر آئے تھے۔ میں نے ہر ایک سے مصافحہ کیا اور سب سے آخر میں عولی سے جن کے لیے میرے دل میں بھی محبت ہے، باوجود ان کی کمزوریوں اور خامیوں کے انکی عظمت مسلّم ہے اور یہی وہ شے ہے جو ہر ایک سے خراج تحسین وصول کرتی ہے۔ رہیں ان کی برائیاں تو وہ بیں جو ان کی قوم میں بالعموم پائی جاتی ہیں، لیکن ان کی اچھائیاں خالصۃً انہی کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔

"جب میں گزشتہ تین ہفتہ کے قیام سیلون پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میری زندگی کے بہترین ایام ہیں، جب میں یہاں آیا تھا تو سخت کمزور اور نحیف تھا کہ میں بخوشی مرنے کے لیے تیار تھا، لیکن اگرچہ میرا انتقال نہیں ہوا، تاہم مجھے وہ اطمینان قلب حاصل ہے جو شاذ و نادر ہی دنیا میں نصیب ہو سکتا ہے یعنی یہ کہ جو نیکی میں نے اپنی زندگی میں کی تھی اس کا اجر اسوقت مجھے مل رہا ہے، اور یہ احساس کرنے کی طاقت بالآخر غالب رہتی ہے۔ انسان کی خواہشات سے کہیں زیادہ ہے، یہی سچی مسرت اور یہی سچی خوشی ہے مجھے محمود سامی کے مکان پر خاموش زندگی بسر کرنے کا افسوس ہے، لیکن مجھے شبہ ہے کہ آیا مجھے آیندہ کبھی خوشی کے ویسے لمحے مل سکیں گے جو مجھے وہاں میسر آئے"

(ض - ا - ب)

اجمیر سے بمبئی تک

اجمیر سے روانگی کے وقت احباب اجمیر نے از راہ مسافر نوازی مجھکو الوداع کہنے کی زحمت اسٹیشن تک گوارا
کی ، معین والیاس کے اس خلوص کو میں ہمیشہ یاد رکھونگا ، میل ٹرین بھرا ہوا تھا ، لیکن احباب کی جستجو نے ایک
سیٹ کو خالی دیکھکر میرا سامان وہیں رکھدیا ، ریل کی روانگی کے بعد ان لوگوں کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا
جو میرے ہمسفر تھے ، لیکن باوجود کوشش کے میں نے ان میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جو میرے لیئے باعث دلچسپی
ہوسکتی ، اسلیئے اپنے آپ کو بیگانہ بناکر ایک طرف خاموش بیٹھ گیا اور احمد آباد تک اسی طرح بیٹھا رہا ، احمد آباد میں
اترکر گجرات میل میں سوار ہوا اور چونکہ جگہ کافی تھی اسلیئے پوری ایک سیٹ مجھے مل گئی اور کپڑے اتار کر لیٹ گیا ،
احمد آباد ڈیڑھ سو برس تک سلاطین گجرات کا پایۂ تخت رہا ہے ، گیارھویں صدی میں اسکی بنیاد ڈالی گئی تھی -
سبرمتی ندی جس کا طول دو سو میل ہے اسپر احمد آباد واقع ہے ، اس کا رقبہ گریٹ برٹن کے برابر ہے ، یہ ہمیشہ
سے صنعت و حرفت اور علم و ادب کے لیئے مشہور رہا ہے ، یہاں صدیوں سے پہلے عرب اور مصر سے تجارت
ہوا کرتی تھی ، ۱۳۹۱ء میں ایک ہندو راجپوت جس نے اسلام قبول کیا تھا ، اور مظفر کے نام سے مشہور ہوا اُسکے
پوتے سلطان احمد نے ۱۳۱۲ء میں احمد آباد کو اپنے نام کا آخری جزو دیکر احمد دار الحکومت بنایا - پرانی جینی عمارتیں
مسجدیں بن گئیں اور جو نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں وہ بھی جینی طرز کو لیئے ہوئے - اگر احمد آباد کی عمارتوں سے مینارے محرابیں
اور عربی کتبے نکال دیئے جائیں تو اتنے سے تغیر میں یہ عمارتیں ہندو طرز تعمیر کی صحیح نمونہ ہو جائینگی -

۱۵۷۲ء میں اکبر نے احمد آباد کو فتح کیا ، اُسوقت سے یہ سلطنت مغلیہ کا ایک جزو بن گیا ، ڈیڑھ سو برس
تک دار الحکومت دہلی سے اسکے والی مقرر ہوا کئے ، ان میں شاہجہاں اور عالمگیر بھی اپنی اپنی شاہزادگی کے
زمانہ میں اس صوبہ کے والی کی حیثیت سے حکمرانی کرتے رہے ہیں ، مغلیہ زمانہ میں احمد آباد ترقی کے آخری زینہ پر
پہونچ گیا تھا ، اس کا شمار ہندوستان کے نہایت پرشان و پررونق شہروں میں ہوتا تھا ، بلکہ اُسوقت یہ کہا جاتا
تھا کہ اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے اسکی نظیر دنیا میں نہ تھی ، اُس وقت کی مردم شماری کے لحاظ سے بھی جو
۲۰ لاکھ تھی اسوقت کے بڑے بڑے شہروں کے مردم شماری سے بڑھا ہوا تھا - یہاں کے تاجر اور سیاح

عرب، افریقہ اور ہند کے تمام ملکوں سے تعلقات رکھتے تھے، یہاں کی صنعتیں (زربفت، مخمل، ساٹن، ریشمین کپڑا، اور کاغذ وغیرہ) ہر جگہ مشہور تھیں، احمد آبادی سفید چکنا کاغذ اب بھی ہندوستان میں مروج ہے، اور ساہوکاروں کے بہی کھاتے اسی کے بنتے ہیں، دکن میں بھی اس کا بازار کھلا ہوا ہے، یہاں کے صناع لکڑی، سونا، اور ہاتھی دانت کے کام میں کمال رکھتے تھے اسوقت بھی صندل کی صندوقیاں جنپر منبّت کاری اچھی ہوتی ہے، اور جو بمبئی کی صنعت سے مشہور ہیں۔

احمد آباد کی اسلامی عمارتوں میں ہندو طرز غالب ہونے کی وجہ سے ایک ایسی خصوصیت پیدا ہوگئی ہے جو دوسری جگہ مطلق نظر نہیں آتی، یہاں کی مسجدوں کا نقشہ بالکل وہی ہے جو عام اسلامی مساجد کا ہوا کرتا ہے، یعنی ایک بہت بڑا مستطیل صحن جسکے گرد بنی ہوئی غلام گردش ہے، اس مستطیل صحن کے مغرب جانب "سجدہ گاہ" ہے۔ اور اسپر عموماً تین گنبد ہیں جنمیں سے ہر ایک جینی عمارتوں کی طرح بارہ ستونوں پر قائم ہے بیچ کا گنبد زیادہ بلند ہے، یہ بلندی اسطرح حاصل کیگئی ہے کہ جن ستونوں پر یہ قائم ہے وہ دوسرے گنبدوں کے ستونوں سے دو چند بلند ہیں، اس درمیانی گنبد کے تین جانب چھت پر گنبد قائم کئے گئے ہیں اور ان کے دونوں گنبد دائیں اور بائیں قائم ہیں۔ یہ جینی عمارتوں کا طرز احمد آباد کے سوا کہیں پایا نہیں جاتا اور اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ عمارتوں کے اندر روشنی کثرت سے آتی ہے جب کبھی مسجد کے اندرونی رقبہ کو بڑھانے کی ضرورت ہوئی، گنبدوں کی تعداد بڑھا دیگئی۔ مثلاً احمد آباد کی بڑی مسجد میں بجائے تین گنبدوں کے پانچ گنبد ہیں جن میں سے ہر ایک بارہ ستونوں پر قائم ہے، انہیں پانچ گنبدوں کو عمق میں سہ چند بڑھا دیا گیا ہے، اور اسطرح پندرہ گنبد بن گئے ہیں جنکی وجہ سے عمارت کی وسعت بے انتہا بڑھ گئی ہے، ان مسجدوں میں جسقدر طاقچے ہیں اُن کے اندر اقلیدس کی شکل کی سنگ تراشیاں کی گئی ہیں، اُن اصلی مندروں میں جن کو بدل کر یہ مسجدیں تعمیر کی گئی ہیں، یہ سب طاقچے سنگی مورتوں سے بھرے ہوئے "خدائی" کا دعوےٰ کر رہے تھے، چونکہ انکی خدائی اسلام کے خدا نے بشادی تھی اور اُن طاقچوں سے ان مورتوں کو علیحدہ کر دیا تھا، اسلیئے ان طاقچوں کا خلو اقلیدسی شکلوں میں بھرد یا گیا۔

احمد آباد کی تاراجی میں مرہٹوں نے بھی کافی دلچسپی لی تھی۔ شاہجہاں کے مقید عہد میں عالمگیر کے بھائی عالمگیر کی سختیوں سے جان چرائے ہوئے یہاں سانس لیا کرتے تھے، اور فوجوں کی تیاری میں مصروف رہتے تھے، اب ہندوستان کے قائد اعظم مہاتما گاندھی کا مرکز ہے، جہاں گاندھی آشرم ہے اور جہاں سے ینگ انڈیا انگریزی زبان

ہیں اور تیز چیون گہرائی پر نکلتے ہیں، اب یہاں کھدر کی کاشت کی جاتی ہے پہلے "بیگر" (جولاہے) اِسی کاشتکاری کے لیے قدرت کی طرف سے پیدا ہوتے تھے اب اس نے ہندوستان کے ہر طبقہ کو زبردستی چرخے کی موسیقیت کا متوالا بنادیا ہے اور اِسی "بنجر زمین" کو تعلیم یافتہ ہاتھوں سے بھی ہموار کرانے کی کوشش کی جاتی ہے، احمد آباد اپنے روایات کو اب بھی لیئے ہوئے ہے اور اپنی وضعداری پر نازاں۔

دس بجے رات کو "گجرات میل" احمد آباد سے چھوٹا اور بمبئی کے راستہ پر اپنی لرزاں رفتار کے ساتھ روانہ ہوگیا، تقریباً ایک گھنٹہ تک تو میں جاگتا رہا، آخر آنکھیں تھکیں اور بند ہوئیں اور بغیر صبح کے پھر نہ کھلنا تھیں نہ کھلیں، جسوقت میری آنکھیں کھلی ہیں تو بمبئی کے جوار غربی مناظر میری خواب آلود آنکھوں میں سمائے جارہے تھے۔

۲۴ ستمبر ۱۹۳۲ء کو آٹھ بجے بمبئی کے گرانٹ روڈ اسٹیشن پر گجرات میل پہونچا، گو میرا ٹکٹ کلابہ تک تھا مگر وارڈن روڈ کے قربت کی وجہ سے یہیں اتر گیا۔ دروازہ پر ٹکٹ دیکر باہر آیا، جہاں وکٹوریہ گاڑیاں کثرت سے باقاعدہ صف میں کھڑی ہوئی تھیں، ایک پر اسباب رکھوادیا اور بیٹھ گیا۔ کوچبان کو وارڈن روڈ چلنے کی ہدایت کی جہاں ہمارے خداوند نعمت "سرکار رامپور" چند دنوں سے "سمرسٹ پیلس" میں فروکش ہیں بمبئی کے بلند و پست راستے گھوڑوں کو موت کا پیام دیتے رہتے ہیں، جس وقت یہ بے زبان جانور چڑھائی پر چڑھتا ہے تو اسکے جسم کا رونگٹا رونگٹا پسینہ میں ڈوب جاتا ہے مگر جب زبان والوں کی زحمت کا احساس واقعی نہیں ہوسکتا تو بے زبانوں کی حقیقی تکلیف کا احساس تو ناممکنات سے ہے، غریب گھوڑے نے کچھ راستہ تو مدھم ڈلکی سے طے کیا اور کچھ لمبی ڈلکی سے، غرضکہ گھنٹہ بھر میں اُسی نے منزل مقصود پر پہنچکر دم لیا جانوروں کی علو ہمتی ہم انسانوں کے لیئے سبق آموز ہے۔ ارادہ کی پختگی اور ہمت کی بلندی مستحکم قلعے فتح کرلیتی ہے، نئی نئی غیر معروف زمینوں کا پتہ لگالیتی ہے، جرمنی کو نیچا دکھادیتی ہے، ہندوستان پر اپنا تسلط جمالیتی ہے، فرانس و ہسپانیہ کو ناک چنے چبوادیتی ہے، اسلام کی اشاعت اور ملکوں کی تسخیر اسی ارادہ کی پختگی اور ہمت کی بلندی کی روشن مثالیں ہیں۔ عرب میں پیغمبر اسلام، کربلا کے بیابان میں حسینؑ، اجمیر کے کفرستان میں خواجہ چشتیؒ اور آج کل ریف کے پہاڑوں میں امیر المجاہدین کو دیکھیئے، کلمبس، نپولین اور فرہاد کے ہمت و ارادہ سے سبق لیجیئے، یہ وہ تاریخی افسانے ہیں جو ہمارے ارادہ کی کمزوری اور ہمت کی پستی کا موازنہ نہ کرسکیں گے۔

سنہ عیسوی سے پہلے اس جزیرہ (بمبئی) کے باشندے زراعت پیشہ اور ماہی گیر تھے جنہوں نے اس کا نام اپنی دیوی "کالس" کے کسی مجسمہ پر "ممبا" رکھا تھا، قصبہ کی صورت میں اس جزیرہ کی پہلی آبادی راجہ بھیم (۱۲۹۴ء) کے عہد کی ممنون ہے، اسلئے جزیرہ (ممبا) کے تالاب کو بدلا اور نام کو تبدیل کرکے "مہیم"[1] رکھا۔ ۱۳۴۸ء تک اس پر ہندو راج رہا۔ بعد کو شاہان گجرات نے قبضہ کر کے جاہ و جلال کا پھریرا اڑایا اور ۱۵۳۴ء (۱۸۶ برس) تک یہاں "اللہ اکبر" کی تکبیروں کے موثر نعرے بلند ہوتے رہے۔
پرتگیز سب سے اجنبی قوم ہے، جس نے ہندوستان کا راستہ تلاش کیا۔ ان کے نقش قدم پر برطانیہ نے بھی سمندر کو عبور کرکے ہندوستان کے زرخیز ساحل پر اپنی دوکان لگا دی، ان کی حریص نگاہیں اس قصبہ پر پڑ رہی تھیں، اور اسکی زرخیزی انکی مستقل دولتمندی کا یقین دلا رہی تھی، ۱۵-۱۶۱۴ء میں اسکو قبضہ میں لانے کے لیے لڑائی لڑی گئی۔ جب فتح و نصرت کی صورت میں جنگ کا خاتمہ نہ ہوا تو ۱۶۲۶ء میں "سورت کاؤنسل" نے پرتگیزوں کو فروخت کرنے کا پیغام دیا۔ ۱۶۵۲ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں نے سرکرام ویل کی عنان توجہ اس طرف موڑی اور اسکو بندرگاہ کی خوبیاں اور اسکو ہر ممکن تدبیر سے مغلوب کرنے کے پہلو دکھلائے اس کامیابی کے اسباب خلوت کے راز و نیاز سے پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۶۶۱ء میں شاہ چارلس ثانی (انگلستان) کا عقد "شاہزادی" انفنٹا کیتھرائن" سے ہوتا ہے، پرتگیز یہ جزیرہ مع دوسرے ملحق جزیروں بھی شاہزادی کے جہیز میں شاہ برطانیہ کو لطف مسرت سے مغلوب ہو کر دے ڈالتے ہیں اس وقت اسکی آبادی صرف دس ہزار تھی۔ اب دس بارہ لاکھ ہے، سات ہی برس کے بعد ۱۶۶۸ء میں شاہ چارلس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہ جزیرہ عطا فرما دیا۔
بمبئی کا رقبہ ۲۴ مربع میل ہے، تقسیم ملکی کے لحاظ سے بمبئی، مغربی ہند کے ایک ممتاز حصہ سمجھا جاتا ہے اس کا وقوع ایسی مناسب جگہ پر ہوا ہے کہ یورپ کے لیئے اس سے قریب ترین ساحل کوئی ہو ہی نہیں سکتا اور نہ تجارتی منڈی اس سے بہتر ہو سکتی ہے، اس مغربی ساحل پر مسافروں اور مال کے اترنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لنگرگاہ تو نہایت عمدہ اور موزوں ہے مگر مال کے اترنے کے پشتے کم ہیں، کئی سال سے ساحل پر "انڈین گیٹ" (ہندوستانی دروازہ) تاج اور گرین ہوٹل کے سامنے بن رہا ہے اجو اپنی بناوٹ کے لحاظ سے ہند کا دروازہ کہا جا سکتا ہے

---

[1] بمبئی میں اس نام کا محلہ اب تک باقی ہے۔

میں اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے بمبئی کی جادہ پیمائی کرنے پر دن بھر مجبور رہتا، البتہ رات کو آزاد ہوتا تھا اور اسوقت سیر چلتا پھرتا یعنی خوشی پر ہوتا تھا فلک نما عمارتوں سے بجلی کی تیز شعاعوں کو میں نے سمندر میں غوطے لگاتے دیکھا ہے اور یہ ایسا پر لطف منظر ہوتا ہے کہ اگر نظام کائنات کو بدلنے کی میں قدرت رکھتا تو سب سے پہلے حسین تبدیلی کے لیئے اپنا طبیعت کو متوجہ کرتا وہ بمبئی میں آفتاب کی حکومت کا زوال ہوتا۔

بمبئی کو حسن آباد سے تعبیر کرنا ایک واقعہ کا اظہار ہے، وہاں قوموں کا مجموعہ ہے، عرب بھی ہیں اور عجم بھی چینی بھی ہیں اور جاپانی بھی، انگلش بھی ہیں اور جرمنی بھی، فرنچ بھی ہیں، اور یہودی بھی، کاٹھیاواری بھی ہیں اور ہندوستانی بھی غرض وہ حسن جہاں پر تگیزوں نے اپنا پہلا ڈیرہ (گوا) ڈالا تھا، جاذب نظر ہی نہیں بلکہ قدرت کے ناقابل برداشت جلوے رکھتا ہے اور اسمیں شک نہیں کہ انسان کے لیئے یہ شہر مصیبتوں کا مرکز ہے۔

وارڈن روڈ کا کنارہ سمندر کو اپنے آغوش میں لیئے ہوئے ہے۔ "سمرسٹ ہوس" کی وہ منزل جہاں ہمارے تاجدار رامپور کی خوابگاہ تھی، وہاں سے سمندر کی لہروں اور بیقرار موجوں کی اٹھکیلیاں دیکھنے کے قابل تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان اپنی پیاس بجھانے کے لیئے بھرنے (ظرف (سمندر) میں بیقراری سے منہ ڈال رہا ہے۔

"سمرسٹ پیلس" کا گلی میں واقع ہونا ناموزوں ہی نہیں ہے بلکہ حقیقتاً حسن کی اہانت ہے، پیلس میں پہونچکر پہلے صاحب چیف سکرٹری بہادر سے ملا، پھر سیڑھیوں کے سہارے سے اس منزل پر پہونچا جو میری اقامتگاہ تجویز ہو چکی تھی، سفر کی تھکان سے پریشان تھا اور گرمی کی شدت سے بے چین۔ سب سے پہلے غسل خانہ میں گیا اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ ان کے ساتھ ناشتہ کیا اور پھر پرائیوٹ سکرٹری بہادر کی معیت میں کوٹھی پسند کرنے کے لیئے روانہ ہوا، جہاں ہز اکسلینسی سر مہاراجہ بہادر بالقابہ اقامت گزین ہونگے "الکیمسٹر" پر ایک سہ منزلہ کوٹھی تین ہزار روپیہ ماہانہ پر طے کر لی گئی۔

جس وقت قیامگاہ پر واپس آیا ہوں، تین بج چکے ہیں اور شہریار رامپور خواب راحت سے بیدار ہو چکے تھے قصر عالی کا سکوت چہل پہل سے بدلا ہوا تھا، چوبدار نے حضرت پیر و مرشد کی یاد فرمائی کا حکم سنایا، قدموں کو آہستہ اٹھاتا ہوا، "باب عالی" تک پہنچا۔ "آداب گاہ" پر جھکا اور تسلیمیں بجا لایا۔ بیٹھنے کی اجازت ملی تو سلام کر کے فرش پر دو زانو بیٹھ گیا۔ اعلیحضرت اپنی وضع و معاشرت کی سادگی میں ایشیائی بادشاہوں

سکے سچے جانشین ہیں۔ ڈیڑھ سو ہزار کا وزیر اور پچیس روپیہ کا اہلمد ظل سبحانی کے شاہانہ دربار میں مساوات کا مرتبہ رکھتا ہے بندگان عالی کے اسلامی اخلاق اور شاہانہ سادگی ہر انسان کو مساوات کی نگاہ سے دیکھتی ہے، بے تکلف باتیں کرتے اور برادرانہ طریقہ سے تخاطب فرماتے ہیں، اپنی خداداد ذہانت اور قوی حافظہ کی وجہ سے بڑے بڑے علماء کو حیران کر دیتے ہیں، تاریخ ہو یا فلسفہ، فقہ ہو یا حدیث، پالیٹکس ہو یا سائنس، مذہب ہو یا مناظرہ علیحضرت کے معلومات کی وسعت، سمندر کی وسعت و گہرائی کا یقین دلائی ہے، جس نے ایک مرتبہ گفتگو کی اُسکو اپنے حافظہ و ذہانت کے شکست کا اعتراف ہی کرنا پڑا۔

بڑی دیر تک حضور پر نور، مہاراجہ بہادر کے تذکرہ اور اُنکی آمد کی خبر سنکر حقیقی مسرت کا اظہار فرماتے رہے، عصر کی نماز کا وقت چونکہ ختم ہو جاتا تھا اسلیئے بندگان عالی نے اُس معبود حقیقی کے حضور میں گردن جھکا دی جو مغرب کا بھی مالک ہے اور مشرق کا بھی، جنوب میں بھی اُسکی خدائی ہے اور شمال میں بھی، پانی پر بھی قابض ہے اور ہوا پر بھی، اُسی کے اشارہ سے سورج گرمی پہونچاتا ہے اور اُسی کے کنایہ سے چاند ٹھنڈک۔ میں اُسی روز مہاراجہ بہادر کا خیر مقدم کرنے کے لیئے احمدآباد واپس جانے کے لیئے تیار تھا، بندگانعالی سے جب اجازت ملی تو سلام کرکے باہر آیا، اور گرانٹ روڈ اسٹیشن کا راستہ لیا اُسوقت میری معیت میں ایک نوجوان رامپوری حکیم بھی تھے اسوقت ترشح ہو رہا تھا اور سڑکوں پر دو طرفہ بجلی کی روشنی چاندنی کا دھوکا دے رہی تھی، سڑکوں اور چوراہوں پر پولیس کا انتظام مستعدی کا ثبوت دے رہا تھا۔ یہاں کے پولیس کی وردی ہندوستان کے دوسرے ملکوں سے بالکل علیحدہ ہے خصوصاً ٹوپیوں (پگڑی) سے پُرانے زمانے کے برہمنوں کی وضع آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، اس پگڑی میں صرف اتنی مغربیت ہے کہ انگریزی ٹوپیوں کی طرح ایک چمڑہ کا تسمہ نیچے لٹکا رہتا ہے ہر چوراہے پر ایک ایک گورا بھی اپنی ڈیوٹی کے ثبوت میں کھڑا بھیگ رہا تھا مگر فرض کی بجا آوری میں بارش اُن کے لیئے زندگی کا فرحت بخش غسل تھی، گورے افسر اور پولیس کے کالے جوانوں کے ہاتھوں کی بلندی ہر موٹر کو اپنی جگہ پر کھڑا کر دیتی تھی اور ہر دکٹوریہ کو روک دیتی تھی۔ اگر اس احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو ہر سڑک انسانی جانوں کی قربان گاہ بن جائے۔

دس بجے گجرات میل پھر اُسی طرف لیئے جا رہا ہے۔ جدھر سے کھینچ لایا تھا، دوسرے روز دس بجے احمدآباد کے اسٹیشن پر اترا، جہاں مہاراجہ شاد باقتدار اپنی امیرانہ سادگی کو لیئے ہوئے، اپنے پیارے و مہذب بچوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے، فرسٹ اور سکنڈ کلاس گاڑیوں کا ملاحظہ ہو چکا تھا، اسباب منتقل

ہو رہا تھا۔ مہاراجہ صاحب اور بیگمات چھوٹی لائن کی گاڑیوں سے اتر کر ان پر سوار ہو چکی تھیں، راجہ پلٹن کے مسلح سپاہیوں، چوبداروں، خدمتگاروں، حقہ برداروں، فروش، پہرے والے اور ماماؤں سے پلیٹ فارم پر خاص چہل پہل تھی، جس سے دکن کے وزیر اعظم کے امیرانہ کروفر کا یقین ہو رہا تھا۔ میں نے موقع پا کر راجہ اقبال سند بہادر کے ساتھ احمد آباد کے ریفرشمنٹ روم میں کاٹھیاواری ذائقہ کا پرتکلف کھانا کھایا۔ کھانے والوں کی بدسلیقگی اور اُبلے ہوئے کھانوں کی لذت میرے حافظہ و ذہن کو ہمیشہ یاد رہے گی۔ مگر وہ غریب اپنے ملکی ذوق سے مجبور تھے۔ خیر دو بجے ٹرین نے پلیٹ فارم کو چھوڑا۔ ہز اکسیلینسی کی امیرانہ فیاضی کی عالمگیر شہرت نے اسٹیشن پر مہذب فقیروں کی بھیڑ لگا دی تھی، اور ہر ایک کی اسکی حیثیت کے مطابق تواضع کی گئی۔

راستہ میں بعض نئے واقعات پیش آئے، اگر اُن کو بھی لکھوں تو مضمون بہت طویل ہو جائے، چڑھتے اُترتے، سوتے جاگتے کلابہ اسٹیشن پر میری منزل ختم ہو گئی، اُس وقت ۶ بجے صبح کا وقت تھا، بوندیں پڑ رہی تھیں، رام پور کے پرائیوٹ سکرٹری بہادر جو خاندان شاہی سے منسلک ہونے کے علاوہ ایک مغرب تعلیم یافتہ اور خوش خلق و مہذب انسان ہیں مع ایڈی کانگ کے موٹروں، گاڑیوں اور خمار شب اتارنے والی چیز (چا) لیے ہوئے ہز اکسیلینسی کا خیر مقدم بارش کے ساتھ کر رہے تھے۔ نواب لیاقت جنگ بہادر جو ہز اکسیلینسی کے سمدھی اور حکومت آصفیہ کے بیشتر تعلقہ دار ہیں اپنی صورت شکل کے لحاظ سے اگر خالص یورپین نہیں تو سرد ملک کی پیدائش کا ضرور یقین دلاتے ہیں، گو وضع و معاشرت کے لحاظ سے انگریز نما ہیں باطنی فضائل کے لحاظ سے اسلام کی پیروی کے دلدادہ ہیں۔ یہ بھی ہز اکسیلینسی کو "خوش آمدید" کہنے کے لیے کلابہ پر موجود تھے، ہز اکسیلینسی اور اُن کے محلات نے وہیں چاء پی۔

اسلامی پردہ نے اسٹیشن کو رامپوری قناتوں سے چھپا دیا تھا، مہاراجہ صاحب اور بیگمات اُتریں، موٹروں پر سوار ہوئیں۔ میری حیثیت اُس وقت "خضر طریقت" کی تھی، آگے آگے میرا موٹر راستہ صاف کرتا ہوا رہبری کا کام لے رہا تھا، اور میرے موٹر سے ملے ہوئے کئی موٹروں کی قطار جن پر ہز اکسیلینسی محلات کے ساتھ بمبئی کے مسنون مناظر دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ ہز اکسیلینسی مع تمام اپنے شان کے ہمارے آقائے ولی نعمت تاجدار رامپور کے مہمان عزیز ہوئے۔ ہز اکسیلینسی اور ہز ہائینس کی روزانہ ملاقاتیں جس محبت و خلوص سے ہوا کرتی تھیں اُس کا اظہار میرے قلم سے ناممکن ہے۔ خدا کرے کہ مشتاق آنکھیں اُس منظر کو دوبارہ دیکھ سکیں۔

[illegible]

ابراہیم الموصلی

ابراہیم الموصلی، فن موسیقی کا مشہور استاد تھا، اور خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں خدمت مغنی پر دس ہزار درہم (ڈھائی ہزار روپیہ) ماہوار پر ملازم تھا، آباو اجداد "موصل" کے رہنے والے تھے، مگر خاندان وغیرہ کا پتہ نہیں چلتا خلیفہ ہارون اسکی بہت عزت کرتا تھا، ابن جامع سہمی، زلزل، عمرو بن بانہ، غزال، علویہ، وغیرہ اسکے ہم عصر تھے، مگر ان ماہران فن کی اسکے آگے کچھ پیش نہ چلتی تھی، برتوما، فن موسیقی کا بڑا ماہر تھا، وہ کہتا ہے کہ "ابراہیم ایک ایسا باغ ہے جسمیں ہر قسم کے پھول اور پھل ہیں" ابراہیم نے صرف اکتساب فن تک ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ خود ہزاروں راگنیوں کا موجد ہے، اسکو علاوہ موسیقی کے دیگر علوم میں بھی کافی دستگاہ حاصل تھی اپنے بیٹے اسحٰق کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر دلوائی ہارون الرشید بہت چاہتا تھا اور خاندان برامکہ کی بھی نظر عنایت تھی کروڑہا روپیہ پیدا کیا، قاصی جائداد پیدا کرلی مگر طبیعت میں بخل بے حد تھا۔

ابراہیم کے مشہور شاگرد مخارق، سے عقدالفرید نے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ مخارق ابراہیم کے مکان پر گیا۔ جب اندر داخل ہوا تو دیکھتا کیا ہے کہ ابراہیم تنہا بیٹھا ہے جام و صراحی سامنے رکھی ہے مگر چہرے سے پریشانی کے آثار ظاہر ہیں، مکان میں سناٹا چھایا ہوا ہے، مخارق نے پریشان ہو کر پوچھا۔

مخارق۔ اُستاد مزاج اچھا ہے آج آپ پریشان معلوم ہوتے ہیں؟۔

ابراہیم۔ آج صبح سے بہت پریشان ہوں کیونکہ مکان کے قریب ہی ایک زمین فروخت ہو رہی ہے مگر قیمت ایک لاکھ روپیہ ٹھیری ہے۔

مخارق۔ ایک لاکھ درہم کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ خدا نے آپ کو اس سے کہیں زیادہ دیا ہے پریشانی کی کونسی بات ہے؟

ابراہیم: ہاں سچ کہتے ہو مگر دل نہیں چاہتا کہ اپنی گرہ سے ایک لاکھ درہم دوں!

مخارق۔ پھر آپ نے خریداری کی کیا صورت نکالی ہے، امیرالمومنین سے تو اتنی بڑی رقم وصول ہونے کی امید نہیں ہے اور وں کا تذکرہ فضول ہے!

ابراہیم: تم اسکی فکر نہ کرو۔ میں ایک راگنی سکھا کر تمہیں یحییٰ برمکی کے پاس بھیجتا ہوں ابھی دربار عام شروع نہ ہوا ہوگا تم سب سے پہلے پہنچ کر اپنی اطلاع کراؤ اور میرا حال کہکر یہ راگنی کسی کنیز کو سکھا دو۔

ابراہیم نے چند شعر یحییٰ کی مدح میں مخارق کو یاد کرا دیئے اسنے جا کر حسب قرارداد یحییٰ کی کنیز کو راگنی سکھائی، یحییٰ نے بھی بہت پسند کیا اور دس ہزار درہم مخارق کو ایک لاکھ درہم ابراہیم کو عنایت کیا۔ مخارق انعام لے کر چلا آیا تھا دوسرے دن صبح ابراہیم کے گھر پر گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہی کل کا حال ہے۔

مخارق: وزیر کا عطیہ پہونچا

ابراہیم: ہاں مگر میرا مطلب پورا نہ ہوا وہ روپیہ بھی داخل خزانہ ہوگیا۔ آج تمہیں ایک اور راگنی سکھاتا ہوں اسے یاد کرکے فضل بن یحییٰ کے پاس جاؤ۔ ولادت فرزند کی خوشی میں اسنے آج مجلس عیش منعقد کی ہے، تم میرا حال اور یحییٰ کی فیاضی کا تذکرہ کرکے راگنی سنا دینا۔

مخارق نے جب فضل کو راگنی سنائی تو بہت پسند کیا اور ابراہیم کی بخل پر افسوس کرکے بیس ہزار درہم مخارق کو اور دو لاکھ درہم ابراہیم کو مرحمت کیا۔ مخارق انعام لیکر چلا گیا اور دوسرے دن صبح ابراہیم کے پاس گیا تو اسکو اسی حال میں پایا۔

مخارق: جس شخص کو اتنی دولت بلا مشقت ملے اور وہ پھر بھی اپنے نفس پر جبر کرے تو اس سے بڑھ کر کون بدنصیب ہوگا۔

ابراہیم نے جواب دینے کے بجائے ایک اور راگنی سکھائی اور مخارق کو جعفر برمکی کے پاس جانے کے لیئے کہا، جب مخارق نے جعفر کو راگنی سنائی تو وہ پھڑک اٹھا اور تیس ہزار درہم مخارق کو اور تین لاکھ درہم ابراہیم کو عنایت کیا، دوسرے دن مخارق ابراہیم کے پاس پہونچا تو دیکھتا کیا ہے کہ ابراہیم خوش خوش بیٹھا ہوا ہے مخارق کو دیکھتے ہی تکیہ کے نیچے سے ایک کاغذ نکال کر دیا۔ یہ اسی زمین کا دستاویز تھا اسکا بائع ایک بغدادی اور مشتری جعفر برمکی تھا، اس دستاویز کے ساتھ ایک رقعہ بھی تھا جس کا مضمون یہ تھا کہ مجھے یقین ہے کہ اگر ابراہیم کو تمام دنیا کی دولت بھی مل جائے تو وہ زمین نہ خرید یگا، اسلیئے میں نے خرید کر قبالہ روانہ کیا ہے مخارق رقعہ پڑھ چکا تو ابراہیم نے کہا۔

ابراہیم: مخارق! دنیا میں ایسے ہی لوگوں سے ملنا چاہیئے۔ دیکھو ساٹھ ہزار درہم تجھے ملے اور چھ لاکھ نقد اور بیس لاکھ کی جائداد مجھے ملی، حالانکہ میں نے گھر سے باہر قدم بھی نہیں رکھا۔

وضع داری اس کا نام ہے کہ ابراہیم نے مرنے تک بخل کو ہاتھ سے جانے نہ دیا ایک مرتبہ بہت ہی مفلس ہو گیا مگر خزانہ کو ہاتھ نہ لگایا بلکہ ایک کنیز فروخت کرنے کا ارادہ کیا اتفاق سے کوئی خریدار بھی نہ ملا مجبوراً یحییٰ برمکی کے پاس جاکر اپنی عسرت کا حال کہا، یحییٰ نے کہا میرے پاس اسوقت کچھ بھی نہیں ہے، مگر تمہیں روپیہ دلوا دیتا ہوں، خلیفہ مصر کا وکیل مجھے تحفہ دینا چاہتا ہے، تم اس سے اپنی کنیز کا تذکرہ کرو اور جب وہ خریدنے تیار ہو جائے تو کم از کم تیس ہزار درہم کو فروخت کرو جب وکیل کنیز مجھے دیدے گا تو میں پھر تمہارے پاس واپس کردونگا ابراہیم نے وکیل سے معاملہ کیا مگر ابھی گفتگو بیس ہزار تک ہی ہوئی تھی کہ ابراہیم کے منہ میں پانی بھر آیا، اور فوراً کنیز فروخت کردی اور وکیل نے وہ کنیز یحییٰ کے پاس بھیجوادی۔ دوسرے دن ابراہیم یحییٰ کے پاس گیا اور بیس ہزار پر فروخت کرنے کا تذکرہ کیا تو یحییٰ نے بہت افسوس کیا اور کنیز کے ساتھ کردیا۔

ابراہیم کے بخل کے اسی طرح بہت سے افسانے ہیں، اسکا افلاس مرنے تک کم نہ ہوا، اگر کوئی شخص اُن انعامات کی تفصیل لکھے جو خلیفہ یا خاندان برمک سے ابراہیم کو ملے ہیں تو ایک مبسوط کتاب ہو جائے؛ سیوطی نے "صولی" (مورخ) سے روایت کی ہے کہ جب ہارون الرشید نے تخت خلافت کو زینت دی اور یحییٰ کو خلعت وزارت مرحمت ہوا تو ابراہیم نے تہنیت میں یہ اشعار پڑھے۔

الم تر ان الشمس کانت مریضۃ فلما اتی ہرون اشرق نورہا تلبست الدنیا جمالا بملکہ فہرون والیہا ویحییٰ وزیرہا۔	تم نے نہیں دیکھا آفتاب بیمار تھا، جب ہارون آیا تو وہ چمکنے لگا، دنیا نے خوبصورتی اختیار کی ہے اسکی سلطنت سے کیونکہ اسوقت ہارون بادشاہ اور یحییٰ وزیر ہے

اس تہنیت کے صلے میں ہارون نے ایک لاکھ اور یحییٰ نے پچاس ہزار درہم دیئے۔

ایک دفعہ ابراہیم نے جلسہ مینوشی میں شرکت کی مگر جب طبیعت بہت بدمزہ ہو گئی تو باہر نکل کر ٹہلنا شروع کیا تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک مکان سے بگھار کی خوشبو آئی اور ابراہیم کو بھوک بھی محسوس ہونے لگی، ابراہیم نے مکان کے دروازے پر جاکر کنڈی کھٹکھٹائی، ایک کنیز نے آکر دروازہ کھولا اور پوچھنے لگی کہ کیا چاہتے ہو ابراہیم نے کہا مجھے بھوک لگ رہی ہے تمہارے پاس جو کھانا پک رہا ہے اسمیں مجھے بھی شریک کرلو کنیز یہ سنکر اپنی مالکہ کے پاس گئی اور اُس سے اجازت لے کر ابراہیم کو اندر لے گئی، ایک جگہ بٹھا کر خود چولھے کے پاس چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد ایک قاب میں کھانا لاکر رکھ دیا، یہ کھانا نہایت ہی لذیذ اور بامزہ تھا ابراہیم نے خوب کھول کر کھایا اور فارغ ہونے کے بعد واپسی کی اجازت چاہی، مالکہ مکان نے اندر سے کہلا بھیجا کہ

کہ میرے خاندان موجود نہیں۔ اس نے کہا افسوس ہے اگر وہ یہاں ہوتے تو آپ کو زیادہ عرصہ تک مہمان رکھتے۔ ابراہیم
اس مکان سے نکلا ہی تھا کہ ایک شخص خچر پر سوار اسی مکان پر آیا اور اپنی کنیز سے تمام احوال سنکر
ابراہیم کو ڈھونڈتا ہوا چلا، اور راستہ ہی سے ابراہیم کو اپنے مکان پر واپس لایا۔ اور ایک روز مہمان
رکھا، دوسرے دن ابراہیم اس سے رخصت ہوکر خلیفہ کے پاس پہونچا تو خلیفہ نے غیر حاضری کی وجہ پوچھی۔
ابراہیم نے تمام حال کہہ سنایا اور وہاں کے کھانے کی بے انتہا تعریف کی، خلیفہ نے کہا کہ اگر تمہارا میزبان
تمہارا نام ونشان پوچھے بغیر دعوت کرسکے تو مجھے بھی وہاں لے چلو، ابراہیم نے دوسرے دن جاکر اپنے
میزبان سے کہا کہ میرا ایک دوست تمہارا مہمان ہونا چاہتا ہے مگر وہ بہت مقروض ہے قرض خواہوں کے
خوف سے دن کو نکل نہیں سکتا اگر تم اجازت دو تو رات کو میرے ساتھ آئے، اسنے بہ خندہ پیشانی اجازت دی
اور اسی دن رات کو ابراہیم اور خلیفہ دو خچروں پر سوار ہوکر اس شخص کے مکان پر پہونچے، اس نے نہایت
ہی احترام اور خاطر تواضع سے استقبال کیا اور ایک کمرہ میں لیجاکر بٹھایا۔ فواکہات وغیرہ سے تواضع کی اور
کھانا بھی پیش کیا خلیفہ نے کھانا کھاکر بہت تعریف کی کہ میں نے ایسا لذیذ کھانا آج تک نہیں کھایا تھا۔ تھوڑی دیر کے
بعد میزبان سے پوچھا کہ تمہاری گذر اوقات کی کیا صورت ہے، میزبان نے کہا کہ میرے والد نے ایک بڑی
جائداد چھوڑی تھی، میں نے اس جائداد کا ایک بڑا حصہ لہو ولعب میں تلف کردیا مگر پھر میں نے اپنا خرچ کم
کرنا شروع کردیا اور اب میری گذر بسر بہت اچھی طرح ہورہی ہے، اس کے بعد خلیفہ کے آگے شراب پیش کیگئی
اور راگ شروع ہوا، خلیفہ نے ابراہیم کو کہا کہ تم اسکو واقف کرادو کہ میں کون ہوں۔ ابراہیم نے فوراً
کہا کہ دیکھو تمہارا یہ مہمان خلیفۂ وقت ہے، میزبان یہ سنکر بہت ہنسا اور کہنے لگا "اے نادان!"
خلیفہ نے بھی اسکی غلط فہمی پر خوب قہقہے لگائے، اور میزبان نے اپنی بیوی کو بلاکر کہا ذرا دیکھنا ہمارے
مہمانوں نے زیادہ شراب پی لی ہے، اور ہنسی دل لگی سے مجھے خوش کر رہے ہیں چنانچہ یہ شخص کہتا ہے
کہ میں خلیفہ ہوں، اور اسنے ایک گلاس شراب سے بھر کر نہایت ہی ادب واحترام سے خلیفہ
کے آگے پیش کیا کہ امیر المومنین یہ نوش جان فرمائیے، اس بے ساختہ پن پر خلیفہ کو بھی ہنسی آگئی
اور ابراہیم نے دوبارہ سنجیدگی سے کہا کہ واقعی یہ امیر المومنین ہیں، میزبان نے ہنس کر کہا خدا کے
واسطے ایسا مذاق نہ کرو۔ ابھی صرف دو ہی گلاس میں یہ حال ہے کہ اپنے آپ کو خلیفہ کہہ رہے ہو
تھوڑی دیر بعد تو پیغمبر کہنے لگوگے۔ بہرحال اسی ہنسی دل لگی میں رات گزر گئی اور صبح خلیفہ اور ابراہیم

واپس ہوگئے۔ جب اس میزبان نے اپنے محلہ والوں سے اُن دونوں مہمانوں کا حلیہ بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ واقعی وہ خلیفہ اور ابراہیم موصلی تھے۔ دوسرے دن خلیفہ نے اپنے رات والے میزبان کو طلب فرمایا اور نام دریافت کیا تو اسنے اپنا نام "اشنو والا" بتایا۔ خلیفہ نے رات کے واقعات کی نقل کرنے کا حکم دیا اور اشنو والے کے حرکات سے بہت ہی مسرور ہوا۔

کہتے ہیں کہ ایک روز ابراہیم نے آرام لینا چاہا اور خلیفہ سے اجازت لینے کے بعد گھر پر آ کر دربانوں کو تاکید کردی کہ خواہ کوئی شخص گھر میں بیٹھا ہوا ہے، مگر ابراہیم نے اس مداخلت بیجا پر خفا ہونے کے بجائے بہت ہی خوش ہوا اور بزرگ صورت شیخ کی آؤ بھگت کی، شیخ نے بھی طلاقت لسان سے گفتگو شروع کی اور دیر تک دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے ابراہیم نے اسکو اپنے ساتھ کھانا کھلایا، شراب پلائی اور دونوں سے مل کر گانا شروع کیا، اسنے تین لہجوں میں گایا اور اس لہجہ سے ابراہیم کو بہت مسرت ہوئی۔ ابھی گانا ختم ہی ہوا تھا کہ وہ شخص ایک پر اسرار طریقہ سے غائب ہو گیا اسکے جاتے ہی ابراہیم نے تلوار لیکر اپنے دربانوں کو ڈرانا شروع کیا کہ تم نے کیوں کسی کو اندر آنے دیا اور اس شیخ کو گھر سے نکلنے کیوں دیا، دربانوں نے اس شیخ کے آنے جانے سے بالکل لاعلمی ظاہر کی ابھی ابراہیم دربانوں سے گفتگو کر ہی رہا تھا کہ اسی مہمان شیخ نے آواز دی۔ ابراہیم! تو فکر نہ کر آج تیرے پاس ابومرہ (ہمدائی مجسم) تھا اور میں نے ہی آج تیرے ساتھ کھانا کھایا ہے۔ ابراہیم کو بہت تعجب ہوا وہ راگنیاں اور تینوں لہجے جن میں ابومرہ نے گایا تھا ابراہیم کو یاد تھے اسنے اور بھی مشق کرلی، اور دوسرے دن اسی لہجہ میں خلیفہ کو راگ سنایا جسے سنکر خلیفہ بہت مسرور ہوا۔

چاہیے یہ حکایت صحیح ہو یا غلط مگر ابراہیم نے تین نئے راگ ضرور سیکھ لیئے تھے خواہ وہ نشۂ شراب میں وہ خود اسی نے ایجاد کیئے ہوں یا ابومرہ سے سکھائے ہوں ابراہیم کا حال بھی صرف اسی قدر ملا جتنا کہ لکھا گیا ہے، البتہ بعض کتب میں اور بھی حکایتیں ایسی ہی موجود ہیں جیسی کہ ابومرہ کی تھی، اور خلیفہ اور برامکہ کی اُن نوازشات کی تفصیل بھی ملتی ہے جو ابراہیم کے حال پر مبذول تھیں، اور بس، ۔ تو اسکا سنہ تولد معلوم ہوا اور نہ سنہ وفات، ابراہیم ایک مغنی کی حیثیت سے بھی مشہور نہیں بلکہ اسکی شہرت اسحق جیسے ہر فن مولا اور کامل اکمل بیٹے کا باپ ہونے کی وجہ سے بھی ہے اگر ابراہیم کی حشمت ضرب المثل قرار دیجائے تو چنداں بیجا نہ ہوگا۔ ابراہیم نے کوڑی کوڑی کر کے جمع کیا خود نہیں کھایا اپنے بیٹے کو نہیں کھلایا مگر جمع کرتا رہا، معلوم نہیں اسکے مرنے کے بعد اسکی دولت کیا ہوئی اسکا خزانہ کہاں چلا گیا کہ پتہ ہی نہ چلا، اسحق موصلی مفلس کا مفلس ہی رہا، مگر اسنے بعد میں

بہت دولت پیدا کر لی۔ برامکہ اور ہارون الرشید کی نوازشات اسکے حال پر مبنی مبذول رہیں اتنی اور کسی پر نہ تھیں اور جتنا کرامے برامکہ نے دیا کسی اور نے نہیں دیا۔

آہ وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ ایک مغنی ایک گانے والے کو محض اسکے فن کی خاطر ہزار ہا روپیہ دیا جاتا تھا مگر اب اس شریف فن کو کوئی پوچھتا ہی نہیں، آہ نہ تو وہ ہارون الرشید ہی رہا نہ خاندان برامکہ ہی اور نہ وہ ابراہیم الموصلی ہی۔ ع

ہمیشہ رہے نام : اللہ کا

"تمکین کاظمی"

ترجمان حقیقت ڈاکٹر سر محمد اقبال کے اُردو کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا

بانگِ درا

جناب علامہ ممدوح کی تقریباً ڈیڑھ سو عالی پایہ، حیات افروز اور جذبہ انگیز نظموں کا مجموعہ ہے، جسمیں ممدوح نے اپنی شائع شدہ نظموں کو بعد اصلاح و انتخاب مرتب فرمایا ہے اور بہت سی غیر مطبوعہ نظمیں بھی شامل کی ہیں جناب علامہ کا تخیل بلند، آپ کی ترجمانی فطرت، آپکے رشحات خیال کا جوش و خروش ہماری تعریف سے مستغنی ہے، ہم اقبال کے بادۂ تخیل کے سرشاروں کو صلائے عام دیتے ہیں کہ جہاں تک جلد ہو سکے وہ اس بیبہا مجموعہ کو خرید لیں، پہلا ایڈیشن ختم ہونے والا ہے اور دوسرے ایڈیشن کا انتظار جیسا کچھ سوہان روح ہوا کرتا ہے اسے ارباب ذوق خوب جانتے ہیں، قیمت فی جلد للعہ مجلد عہ کتابت و طباعت نہایت نظر فریب، کاغذ نفیس، ضخامت سارھے تین سو صفحات۔

شیخ ممتاز علی اینڈ سنز دار الاشاعت پنجاب ۱۹ ریلوے روڈ لاہور

قلم

(مرسلہ سید محمد عطاء الرحمن نیو کالج پٹنہ)

صورت گر لیلائے سخن ہے قلم اپنا　　ہے قوت بازو یہی معنی رقم اپنا
اس سخت مراحل میں رہا ہم قدم اپنا　　اک عمر سے ہمدم ہے یہ والا ہمم اپنا

پیری میں بھی چھوڑا نہ کبھی ساتھ ہمارا
لغزش میں پکڑتا ہے یہی ہاتھ ہمارا

اک عمر سے ہے حامل الفاظ و معانی　　ظاہر خط تقدیر کی ہے اس سے نشانی
پیری میں لہو ہوتا ہے جوں جوں مرا پانی　　بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور اسکی جوانی

ہمت بھی اسی نے مجھے طاقت سے سوا دی
بجھنے لگی جب شمع تو لو اور بڑھا دی

شان اسکی جدا سب سے ہے انداز نرالے　　اکثر یہی لکھ دیتا ہے جنت کے قبالے
ہمراز نہ جسوقت تلک اپنا بنالے　　کیا منہ ہے زباں سے جو کوئی حرف نکالے

طینت کو جو پوچھو تو عجب نیک ہے اسکی
دوہری تو زبانیں ہیں پہ بات ایک ہے اسکی

سرمایۂ عزت اسی ساتھی کی ہے محنت　　سرمایۂ شوکت اسی منعم کی ہے نعمت
قائم کیئے رکھتا ہے یہی شان شرافت　　ارذل ہے وہی جسکو نہ بخشے یہ نجابت

بے بس ہے وہی اس سے جو منہ موڑکے بیٹھا
رو دیگا لکھے کو جو اسے چھوڑ کے بیٹھا

تابع اسی ذی قدر کے سب غرب تا شرق　　تیزی ہے وہ اسمیں کہ سر افگندہ ہے برق
تہ کی خبر لاتا ہے جسوقت ہوا غرق　　سرگرد و قلم بات میں لائے نہ کبھی فرق

دنیا میں کسی کار نمایاں کو نہ چھوڑے
کٹ جائے پہ جیتے جی نہ میداں کو نہ چھوڑے

بے بس ہوں ضعف اے قلم اک تو ہے مددگار ۔ زانو پہ جگر دوں تجھے آ اے مرے غم خوار
اپنا جنہیں سمجھا تھا نظر آتے ہیں اغیار ۔ دل جن سے شگفتہ تھا وہ سب ہیں جگر خوار

بے راہ ہیں رستے سے بھٹک جائینگے وہ بھی
منزل پہ نہ پہونچیں گے تو پچھتائینگے وہ بھی

پروا مجھے کیا اے قلم اے یار موافق ۔ دشمن ہو کوئی تو تو مرا دوست ہے صادق
خالق نے بنایا ہے تجھے لائق و فائق ۔ تو چاہے تو سب ترک ہوں دنیا کے علائق

کھٹکا ہے مدادت کا نہ وسواس ہے تجھ سے
ہم گوشہ نشینوں کو بڑی آس ہے تجھ سے

جب تک کہ ہو عمر کا انجام لکھے جا ۔ تا خاتمۂ دفتر ایام لکھے جا
حرفوں کا ہے جب وقت تلک نام لکھے جا ۔ لکھنے کے صلے سے تجھے کیا کام لکھے جا

منہ پھیر کے بیٹھے یہ تری شان نہیں ہے
شادؔ ترے لکھنے کا کچھ آسان نہیں ہے

اب عمر بھی آخر مرا لکھنا بھی ہے آخر ۔ دل میں نہ رہا جوش طبیعت ہوئی قاصر
مہماں ہیں اے کہنہ سرا تیرے مسافر ۔ کیا اس کا گلا کی جو نہ دل کھول کے خاطر

تڑپینگے نہ روئیں گے نہ فریاد کرینگے
ہاں جاکے وہاں تجھکو بہت یاد کرینگے

شادؔ عظیم آبادی

بوئے گل

(اس نظم میں علامہ سر اقبال کے ایک لطیف خیال کو اردو کا جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے)

اک حورِ ذی شعور تھی جنت میں غرقِ فکر — آخر جہانِ آدم و حوا ہے کیا بلا؟
ہیں رازسے یہ رات یہ دن اور یہ صبح و شام — پیدا ہوا ادھر تو اُدھر کوئی چل بسا!

جنت سے لائی یوں خلشِ جستجو اُسے — گویا وہ اک لطیف سی موجِ خرام تھی
آتے ہی شاخِ گل کے شکم میں ہوئی اسیر — آزادیٔ بہشت بریں یاں حرام تھی

کونپل سے غنچہ، غنچہ سے گل، گل سے برگ برگ — یوں جاں صبح و شام نے اس کو بنا دیا
اک نقشِ خندہ تھا جسے نقاشِ دہر نے — خود ہی بنا کے شوق سے خود ہی مٹا دیا

جو آہ ہے امیں اسی جویائے راز کی
اک یادگار ہے یہ اسی پاکباز کی

امین حزیں

رباعی

ایں ضیت ارم کہ بہرِ سیر آمدئی — از کتمِ عدم برائے خیر آمدئی
اے مستِ شرابِ خود پرستی! ہشدار — در کعبہ نہ در کنشت و دیر آمدئی

دیگر

کارے بکن اے جواں! جوانی اینست — دل رنجہ مکن کہ شادمانی اینست
چوں نوبتِ رفتنِ تو آید ز جہاں — آزاد برو کہ کامرانی اینست

آزاد انصاری

کبھی مہرباں ہو کے دل شاد فرما   کبھی قدر خدمات آزاد فرما
یہ خاموشی حیرت افزا کہاں تک   کچھ احباب کے حق میں ارشاد فرما
اسیرانِ الفت تنگ آ چکے ہیں   جو خوف خدا ہے تو آزاد فرما
کچھ احساس تکلیف شوق نہاں کر   کچھ اظہار دردِ خدا داد فرما
پھر امیدواروں کی امید بر لا   پھر امداد خواہوں کی امداد فرما
ترے لطف بے انتہا ہیں تو ہونگے   کبھی کوئی تشریح اعداد فرما
جہاں تک ہو پامال جور و جفا کر   جہاں تک ہو تکمیل بیداد فرما
کہاں تک جنون تغافل کہاں تک   کچھ اصلاح طبع خدا داد فرما
کبھی شرط منصف مزاجی بجا لا   کبھی حق رسیہائے آزاد فرما

اثر لکھنوی

قسمت پر اپنی نازاں اے جانِ آرزو ہوں   جس کے قریب تو ہے میں وہ رگِ گلو ہوں
اپنی ہی جستجو میں آوارہ چار سو ہوں   جو مٹ گیا ابھر کر وہ نقشِ آرزو ہوں
ہر اشک میں ہے پنہاں اک محشر تمنا   یارب میں کس کے دل کی خوں گشتہ آرزو ہوں
میرا ہی دور دورہ ہے گلشنِ جہاں میں   برقِ سر نشیمن، آشوب رنگ و بو ہوں
رنگینی چمن ہے مرہون بے ثباتی   مجھکو جنوں نہیں جو شیدائے رنگ و بو ہوں
آئینہ ساز! حیرت اسوقت دیدنی ہے   تو میرے روبرو ہو میں تیرے روبرو ہوں
شوخی ہے اس کا کہنا حیرت فروش ہو کر   کچھ حال دل اثر کہہ مشتاق گفتگو ہوں

سعید رزمی

سلب اک نگہ میں بس طاقت تماشا تھی   آتشیں نظر اسکی برق صد تمنا تھی
شورشِ جنوں میری نازشِ خرد ٹھہری   ہر ادائے بدمستی عشرتِ تمنا تھی
میکدہ ترا ساقی کعبۂ پرستش تھا   ذرہ ذرہ سے پیدا اک جبینِ سجدہ تھی
تابشِ تجلی کی دوڑتی تھیں رگ رگ میں   وسعتِ حریمِ دل محشرِ تجلا تھی

نوبہت سحر میں بھی یقیں اُداسیاں پنہاں قلب جو فسردہ تھا صبح بھی فسردہ تھا

تھی ازل سے مستولی بیخودی و سرشاری
طبع مست اے رزمی بے نیاز صہبا تھی

صادق ایولی

وہ اپنے حسن کی تاثیر آکے دیکھ تو لیں
ہمارے گھر کو گلستاں بنا کے دیکھ تو لیں

یہ مانا منظر ہستی ہے یاس خیز تمام
حباب وار ذرا سر اٹھا کے دیکھ تو لیں

ہو التفات ابھی سے یہ کیا قیامت ہے
وہ خاک میں ہمیں پہلے ملا کے دیکھ تو لیں

یہ غم کدہ نہیں قصر جناں سے بڑھکر ہے
دل شکستہ کو صادق وہ آکے دیکھ تو لیں

مجنوں گورکھپوری

جنوں کے جوش میں دیوانے کیا سمجھینگے زنداں کو
لیئے پھرتے ہیں اپنے ساتھ جو اپنے بیاباں کو

یہ کیسی بے نیازی، نازکس پر رنگ و بو والو؟
عنادل کے ترانے پھونک ڈالیں گے گلستاں کو

ارے محو خرام ناز کیا غیرت نہیں آتی؟
قیامت نے اُڑا کر رکھدیا خاک شہیداں کو

مرے زخموں کی شورش بھی نرالی ہو زمانے میں
اٹھا کر لا اُرکھ لوں اپنے سینہ میں نمکداں کو

گلوں کی تابناکی یا عنادل کی جگر چاکی
نہ جانے رنگ میں نہلا دیا کس نے گلستاں کو

مری دیوانگی پر مسکراتے ہو۔ جزاک اللہ!
جگر تک اب بڑھا لیجاؤں گا چاک گریباں کو

رگیں کھنچنے لگیں اب کوئی دم میں دم اللہ ہو
سر بالیں لیئے بیٹھے رہو زلف پریشاں کو

چھڑی ہے بیش داور آج مجنوں داستاں دل کی
قیامت میں ملا لیجیئے ذرا شبہائے ہجراں کو

نگار کی توسیع اشاعت میں حصہ لینا آپ کا فرض ہے

استفسارات

مونٹ کارلو

(جناب سید جنید عالم صاحب - آرہ)

یورپ میں قمارخانہ مونٹ کارلو بہت مشہور چیز ہے۔ براہ کرم مطلع فرمائیے کہ اسکی بنیاد کب اور کیونکر قائم ہوئی اور اسکا منتظم کون ہے۔

(نگار) آپ مونٹ کارلو کو قمارخانہ کہتے ہیں حالانکہ اسے "بلدۂ قمار" کہنا چاہیئے، جہاں سوائے قماربازی کے اور کچھ نہیں ہوتا اور جہاں رات دن یہی شغل رہتا ہے، کازینو جہاں مونٹ کارلو میں قماربازی ہوتی ہے کیونکر قائم ہوا؟ اسکی داستان عجیب و غریب ہے۔

پیرس میں ایک شخص (فرانسوا بلان) قہوہ خانہ کا ملازم تھا۔ ایک مرتبہ اسپر جعلی نوٹوں کے بنانے کا الزام قائم ہوا اور جیل بھیج دیا گیا۔ جب وہاں سے رہا ہوکر واپس آیا تو اسنے ایک قمارخانہ جاری کر دیا جس سے اس کو خاصہ نفع ہوا۔ وہ سنا کرتا تھا کہ مونٹ کارلو نہایت اچھی جگہ ہے اور امرا و سیاح دور دور سے وہاں آتے ہیں اسلیئے وہ وہاں پہونچا اور وہاں کے امیر کے سامنے تجویز پیش کی کہ یہاں ایک قمارخانہ قائم کرنا چاہیئے، امیر نے اسکو پسند کیا کیونکہ یہ امرا کے لیئے اور زیادہ باعث کشش بات تھی، چونکہ یہ شخص بہت ذہین تھا اسلیئے اسنے سوچا کہ جب تک مونٹ کارلو کے رہنے والے رضامندی ظاہر نہ کریں کامیابی نہیں ہو سکتی، اور وہ اسپر راضی نہ ہو سکتے تھے کہ وہاں جائیں اور اپنا مال ضائع کریں۔ اسلیئے اسنے وہاں کے کاہنوں کو ملایا، اور ان کے ذریعے ترغیب دلائی اور ان کو روپیہ دیا تاکہ وہ اس واجب کو ترک نہ کریں، اسی طرح رفتہ رفتہ مونٹ کارلو دنیا کا سب سے بڑا قمارخانہ بن گیا،

یہاں کے حوادث عجیب و غریب ہیں۔ ایک مرتبہ کوئی اسپینی یہاں آیا جس کے پاس صرف ۳ فرانک تھے لیکن جس وقت یہاں سے نکلا تو وہ ۰۰۰۰۰ ۱۲ گنی کا مالک تھا، اس نے قسم کھائی کہ اب جوا نہ کھیلونگا لیکن ایک دن اسے کوئی ڈیوک ملا اور اس سے پوچھا کہ اتنا مال کیسے جمع کر لیا، اسنے بتایا کہ صورت یہ ہوئی اور اب میں نے قسم کھائی ہے کہ وہاں نہ جاؤنگا، ڈیوک نے کہا کہ تھوڑی سی میری طرف سے لیکر جاؤ اور کھیلو۔ یہ اسپر راضی ہوگیا اور وہاں پہونچا بدقسمتی سے ڈیوک کی دی ہوئی ساری رقم ہار گیا اور چونکہ جوے کا جن سر پر سوار تھا اسلیئے

اس کے ساتھ اپنا مال بھی سب کا سب کھو بیٹھا۔ اسکاٹلینڈ کے ایک شخص نے یہاں ۔۔۔۔ ۱۱ گنی ہار دیں اور جب اپنے وطن جانے کی ہمت اسمیں نہ رہی تو ۔۰ ہم فرانک روز فراستوا یہاں نے اسکے مقرر کر دیئے اور آخر وقت اسکو دیا گیا جب مرا تو اسکی تجہیز و تکفین بھی اسی نے اپنے صرف سے کی۔ یہاں کا قاعدہ ہے کہ جو شخص سارا مال ہار جاتا ہے اور اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں خودکشی نہ کرے تو اسکے وطن پہونچانے کے مصارف قمارخانہ ادا کرتا ہے۔

حالی کا ایک شعر

(جناب محمد اسماعیل صاحب لکشٹی پیٹ)

مولانا حالی مرحوم کا یہ شعر سمجھ میں نہیں آیا ہے براہ کرم اسکی شرح لکھ بھیجئے تو باعث کرم ہو۔

آدمی ہو تو کبھی پاس محبت کے نہ جائے
اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصان میں نہیں

(نگار) اردو کا محاورہ ہے کہ "ہم فلاں شخص کے نقصان میں نہیں" یعنے ہم اس کا نقصان نہیں چاہتے، اسلیئے شعر کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم غیر کے متعلق چاہتے ہیں کہ وہ محبت نہ کرے، تو یہ ہمارا اخلاق ہے کہ ہم اس کا برا نہیں چاہتے ورنہ ہمیں کیا غرض تھی، محبت کرتا، آپ تباہ ہوتا، گویا ہمارا یہ چاہنا کہ غیر، محبوب سے نہ ملے، حقیقتاً اسی کی خیرخواہی ہے خودغرضی نہیں، لیکن اصل لطف اس شعر میں یہی ہے کہ خودغرضی کو اس انداز سے ظاہر کیا گیا ہے جسمیں اس کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا، یہ قاعدہ ہے کہ جب ہم کسی سے کوئی بات چاہتے ہیں تو ہماری خواہش یہی ہوتی ہے کہ اسکو ایسے انداز سے ظاہر کریں، کہ اپنی غرض ظاہر نہ ہو بلکہ اُسی کے نفع کی بات بتلا کر مائل کریں تاکہ اسکو کوئی شبہ پیدا نہ ہو اور اسپر عمل کرنے لگے۔

غیر کا محبوب سے ملنا حقیقتاً عاشق کو ناگوار ہے اور وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ محبت کرنا ترک کر دے لیکن وہ یہ کیوں ماننے لگا ہے اسلیئے یہ انداز اختیار کیا گیا تاکہ وہ اپنا ہی نفع سمجھکر وہاں کی آمد و رفت ترک کر دے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

نظریۂ تجرب

(جناب سید جمال الدین صاحب شاہ آباد)

ہومیوپیتھک طریق علاج میں سب سے زیادہ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ وہ دواؤں کے بہت زیادہ اجزاء کر دینے

جاتے ہیں، زیادہ قوی الاثر سمجھی جاتی ہیں، ہر چند بظاہر اسکی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ دوا کا ایک قطرہ جسمیں ہزار ہزار دس دس ہزار قطرے پانی کے ہوں کیونکر فائدہ پہونچا سکتا ہے، لیکن چونکہ اس سے فائدہ ہوتا ہوا دیکھئے اسکے اثر سے انکار بھی نہیں ہوسکتا، براہ کرم اسکی کوئی علمی توجیہ فرمایئے۔

(نگار) ہومیوپیتھک طریق علاج حقیقتاً نظریہ تکہرب (Theory of Dynamisation) پر قائم ہے جسپر سب سے پہلے ڈاکٹر ہنمن نے توجہ کی۔

متقدمین کا خیال تھا کہ مادہ کی وہ انتہائی تقسیم کہ اسکی کیمیائی خصوصیت (Chemical Identity) زائل نہ ہونے پائے، صرف دقیقہ (Mole-cule) کی حد تک ممکن ہے اور جوہر فرد (atom) اس مادہ کا وہ جزو ہے کہ پھر اسکی کوئی تقسیم نہیں ہوسکتی، اسکے بعد اس خیال میں اور ترقی ہوئی اور مادہ کا ثبات تنظیمی (Constitution) جوہر فرد نہیں بلکہ قوت (Force) تسلیم کیا گیا، پہلے مادہ کی تین حالتیں تسلیم کی گئی تھیں، منجمد، سیال، اور گیسی یا دخانی۔ لیکن سر ولیم کروکس نے ایک چوتھی حالت اور ثابت کی جسکو لاسع (Radiant) کہتے ہیں۔

۱۸۹۶ء میں پروفیسر لیبان نے ثابت کیا کہ جوہر فرد میں ایک فطری قوت (Intra-atomic energy) موجود ہے جو اس کی نشو و نما کا باعث ہوتی ہے اور دوسری یہ کہ مادہ اور قوت دو مختلف حالتیں ایک ہی چیز کی ہیں، جب کسی بڑی مادی چیز کے ٹکڑے کئے جاتے ہیں اور جب اسمیں روشنی، حرارت یا بجلی پیدا ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مادہ نے یہ مختلف حالتیں توازن قوت فطریہ (Equilibrium of Intra automatic energy) سے اختیار کر لیں، گویا مادہ اجتماع مراکز قوائے اثیریہ ہے (Conglomeration of Centres of Ethereal energy) اور جب اس اجتماع میں اختلال پیدا ہوتا ہے تو وہ قوت ظاہر ہوتی ہے جیسے ریڈیم کی شعاعیں۔

سب سے پہلے مادہ، عناصر کا پابند سمجھا جاتا تھا، اسکے بعد دقائق، اور جواہر فردہ کا زمانہ آیا اور اب اسمیں بھی ترقی ہوئی اور اب کہربان یا برقپارہ (Electron) پر انحصار ٹھہرا، یعنی مادہ کے تمام اجزاء صرف برقپارے ہیں جن کی رفتار فی سکنڈ لاکھوں میل ہے اور جن سے ہر وقت کہربائی قوت پیدا ہوتی رہتی ہے پھر مادی چیز کے جتنے دقیق اجزاء کئے جائیں گے اسی قدر زیادہ برقپارے انھیں پیدا ہونگے اور یہی وہ

اصول یا نظریہ ہے جس پر ہومیوپیتھک طریق علاج کی بنیاد قائم ہے، اور یہی سبب ہے کہ ایک دوا جس قدر زیادہ تحلیل کی جاتی ہے، اتنا ہی اس کا اثر قوی ہو جاتا ہے۔

＊ ＊ ＊ ＊ ＊ ＊ ＊

اصلاح شعر

(جناب سعید رزمی صاحب بھوپال)

ساغر صاحب و سیماب صاحب جس زمانہ میں بھوپال تشریف لائے تھے، اسی زمانہ میں میری چند غزلیں "پیمانہ" میں شائع کرنے کی غرض سے با صرار لے گئے تھے، چنانچہ وعدہ کے بعد ان میں سے دو غزلیں پیمانہ کی اشاعت جدید میں نظر سے گزریں، لیکن ایک غزل میں جسے جناب ساغر نے سوز و ساز کے عنوان سے شائع فرمایا ہے کچھ تصرف کیا گیا ہے، اگر تصرف صحیح ہوتا تو جناب سیماب کا میں یقیناً شکر گزار ہوتا لیکن افسوس تصرف جو کیا گیا ہے وہ غلط ہے۔ میری غزل کا مطلع تھا۔

چاک ہو وے کہیں نہ پردۂ راز دل سے آتی ہے غم بھری آواز

جناب سیماب نے تصرف فرمایا ہے۔

منکشف ہو کہیں نہ پردۂ راز دل سے آتی ہے غم بھری آواز

پردۂ راز کے منکشف ہونے کی ترکیب غلط ہے۔ حقیقت بے نقاب ہوئی، حقیقت بے پردہ ہو گئی، راز کھل گیا راز بے نقاب ہو گیا، راز بے پردہ ہو گیا صحیح ہے، پردہ راز منکشف ہو گیا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

دوسرا شعر غزل کا یہ تھا۔

ولولہ خیز رنگ گل ہی نہیں کیا چمن میں ہوں زمزمہ پرواز

جناب سیماب نے تصرف فرمایا ہے۔

ولولہ خیز رنگ گل بھی نہیں کیا چمن میں ہوں زمزمہ پرواز

میری رائے میں "بھی" کا استعمال شعر کے مفہوم کے اعتبار سے بے محل ہے، شعر کا زور گھٹ جاتا ہے

غزل کا تیسرا شعر یہ تھا۔

ذرہ ذرہ کو کر دیا پر نور تیرے صدقے میں ذوق جلوہ طراز

یہ تصرف البتہ کسی حد تک درست ہے۔ لیکن "قربان" اور "صدقے" میں اسی جگہ ذوق سلیم جو فرق محسوس

کرتا ہوں اس کے اعتبار سے میں اس تصرف کو بھی چنداں قابلِ قبول نہیں سمجھتا، براہِ مہربانی آپ اپنی رائے سے مطلع فرمائیے۔

(نگار) آپ کے پہلے شعر میں جناب سیاب کا تصرف شائد اسلئے ہے کہ وہ "چاک ہووے" کو خلافِ فصاحت سمجھتے ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ اگر "ہووے" دور ہوجائے تو بہتر ہے لیکن پردہ کو منکشف کہنا یقیناً غلط ہے اور آپ کا اختلاف بالکل درست ہے کیونکہ پردہ پر انکشاف کا اطلاق صرف اسوقت ہوسکتا ہے جب اُسکے اوپر کسی اور پردہ کا ہونا پہلے ثابت کیا جائے، علاوہ اس کے آپ کا جو مدعا ہے وہ صرف چاک یا شق کے الفاظ سے ظاہر ہوسکتا ہے اسلئے اگر "ہووے" کو دور ہی کرنا تھا تو یوں ہوسکتا تھا۔

کہیں ہوجائے شق نہ پردۂ راز

دوسرے شعر میں جو تبدیلی پیدا کی گئی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، یقیناً ہی، بھی سے زیادہ لطف پیدا کرتا ہے، لفظ ہی سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ جب رنگِ گل ہی میں کوئی ولولہ خیزی باقی نہیں رہی تو میں اب کیا زمزمہ پرداز ہوسکتا ہوں۔ یعنی شاعر کی زمزمہ پردازی منحصر ہے رنگِ گل کی ولولہ خیزی پر، لیکن بھی سے مفہوم بدل جاتا ہے، یعنی ہماری زمزمہ پردازی کے لیے ادنیٰ درجہ کی شرط یہ تھی کہ رنگِ گل ولولہ خیز ہوتا لیکن وہ بھی اب نہیں ہے، یعنی شاعر کی زمزمہ پردازی کے بہت سے اسباب ہوسکتے تھے مگر اُن میں کوئی سبب نہیں پایا جاتا، حتیٰ کہ رنگِ گل بھی ولولہ خیز نہیں ہے جو ضعیف ترین سبب تھا،

اسلئے لفظ ہی شعر کو اور زیادہ بلند کردیتا ہے اور بھی اسی قدر پست

تیسرے شعر میں جو اصلاح دی گئی ہے وہ بیشک اچھی ہے، کیونکہ دوسرے مصرع میں لفظ "میں" بیکار سا تھا اور وہ قربان کہدینے سے نکل گیا

✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤

انسولین

(جناب سید کریم الدین صاحب کراچی)

مرضِ ذیابیطس کے لئے انسولین کی پچکاری بہت مفید بتائی جاتی ہے لیکن میں نے یہاں اکثر ڈاکٹروں سے دریافت کیا کہ انسولین کیا چیز ہے اور کب اور کس نے ایجاد کی ہے لیکن کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملا۔ اسلئے آپ کو

تکلیف دیتا ہوں۔ براہ کرم مختصراً اسکی تفصیل سے آگاہ فرمایئے۔

(نگار) اسمیں شک نہیں کہ ذیابیطس کے لیے بہترین علاج، انسولین کا پچکاری کے ذریعہ خون میں پہونچانا ہے اور جسوقت تک اس کا اثر قائم رہتا ہے، شکر آنی بند ہو جاتی ہے، لیکن اس سے شفاء کلی حاصل نہیں ہوتی جب تک انسولین کا استعمال جاری رہتا ہے، شکر بند رہتی ہے، اور جب اسکو ترک کر دیا جاتا ہے، پھر آنے لگتی ہے تاہم انسولین سے جسقدر فائدہ پہونچتا ہے (خواہ وہ عارضی کیوں نہ ہو) اتنا بھی کسی اور دوا سے حاصل نہیں ہوتا اور اسلیئے ذیابیطس کے مریضوں کے لیے یقیناً اسکے انکشاف نے یاس کو امیدوں میں تبدیل کر دیا ہے

انسان کے جسم میں متعدد غدود ہیں جن سے سیال مادہ نکل کر خون میں ملتا رہتا ہے اور اسی پر انسانی صحت و حیات کا انحصار ہے۔ چنانچہ انسولین بھی انہیں غدود سے ایک کا جوہر ہے، جس غدود کا یہ جوہر ہے اس کا نام تکریاس (Pancreas) ہے اور طویل تجربوں کے بعد یہ امر ثابت ہوا ہے کہ جب اسمیں کوئی نقص پیدا ہو جاتا ہے تو ذیابیطس کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جانوروں پر اس کا تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کا یہ غدود جس وقت نکال لیا جاتا ہے بلا استثنا سب اسی مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اسکے انکشاف کا سہرا ڈاکٹر بنٹنگ کے سر ہے جو ٹارنٹو کا رہنے والا ہے، اور قبل جنگ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرتا تھا، جب جنگ شروع ہوئی تو یہ بھی اسمیں شریک ہوا، لیکن زخمی ہو کر واپس آگیا۔ صحت کے بعد اس نے اپنی تعلیم ختم کی، اور پیشہ طبابت شروع کیا۔ چونکہ آدمی بہت ذہین اور محنتی تھا اسلیئے چند دن میں کافی مشہور ہو لیا اور اس کا مطب خوب چل نکلا۔ اسی دوران میں اسنے محسوس کیا کہ لوگ ذیابیطس کے مرض میں کثرت سے مبتلا نظر آتے ہیں اور اس کا کوئی علاج قابل اطمینان اسوقت تک دریافت نہیں ہوا، چونکہ کاوش و جستجو اسکی فطرت تھی اسلیئے وہ اسطرف متوجہ ہوا اور متعدد تجربات کے بعد اسنے معلوم کیا کہ غدۂ تکریاس کی خرابی اس مرض کا باعث ہوا کرتی ہے، چنانچہ اسنے اس کا جوہر نکال کر پہلے جانوروں پر تجربہ کیا اور جب اسمیں کامیابی حاصل ہوئی تو پھر آدمیوں پر اس کا عمل کیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ساری دنیا نے اسکی اہمیت کو تسلیم کر کے انسولین کے ذریعہ ذیابیطس کا علاج شروع کر دیا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

حضرت ریاض از مولینا عبدالسلام ندوی

جناب مولوی عبدالحئی صدیقی بی اے (علیگ)

"دارالمصنفین سے حال میں ایک کتاب "شعر الہند" شعر العجم کے طرز پر مولینا عبدالسلام صاحب ندوی کی شائع ہوئی ہے، کتاب تو خیر ایک مفصل تبصرہ کی محتاج ہے۔ لیکن سردست مولانا عبدالسلام ندوی کی اس رائے پر کچھ لکھنا ہے جو فاضل مصنف نے لسان الملک حضرت ریاض کے متعلق ظاہر فرمائی ہے، مولانا ممدوح "شعر الہند" کے صفحہ ۲۴۲ و ۲۴۳ پر رقمطراز ہیں۔

"ان کے (حضرت ریاض کے) خمریات "بہت مشہور ہیں تاہم جوش و سرمستی کے بجائے ان میں بھی زیادہ تر اسی قسم کی بے اعتدالی پائی جاتی ہے مثلاً:-

دامن پر بتکدہ میں مجھکو چڑھایا اے شیخ — پھر بھی اونچے تری مسجد کے منارے نکلے

بیچی داڑھی نے آبرو رکھ لی — قرض پی آئے اک دکاں سے آج

اک دھپ ماری زور سے زاہد کے اے ریاض — اب ہاتھ مل رہے ہیں کہ ابھی پڑی نہیں
بوتل کا کاگ زور میں توبہ کو لے اڑا — ہم منچلوں کے ہاتھ کی گولی رکی نہیں

خم مسجد میں مے ناب بھرے جاؤں میں — ٹھنڈے پانی سے وضو کرکے ٹھٹھرنے والے

فاضل مصنف سے یہ عرض کرنا ہے کہ ان اشعار میں جو "جوش و خروش سرمستی کے بجائے بے اعتدالی پائی جاتی ہے اسکی ذرا تشریح فرما دیجئے۔ اگر آپ ان اشعار کو مذہبی نقطۂ نظر سے "بے اعتدال" بتلاتے ہیں تو آپ کے اس فتوی کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ شاعر کی گرفت مذہبی نقطۂ نظر سے کرنا بالکل بیکار ہے اگر آپ حضرت ریاض کے ان اشعار کی گرفت مذہبی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں تو "خیام" "حافظ" اور ہندوستان کے قریب تمام شعرا کے متعلق آپ کیا فتوی صادر کرینگے۔؟

لسان الملک حضرت ریاض کے کلام خصوصیات میں سے سب سے بڑی خصوصیت انکی شوخی ہے، کسی شاعر کے

کلام کی مذہبی نقطۂ نظر سے گرفت کرنا میں نہیں سمجھ سکتا، کہ کتنی اچھی بات ہے؟ اور اگر آپ نے حضرت ریاض کے کلام کی گرفت مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں فرماتی ہے تو پھر مذکورۂ بالا اشعار میں جوش و سرمستی کے بجائے بے اعتدالی" کا رنگ ثابت کیجیے۔

مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کی انشاپردازی کو میں مانتا ہوں کہ مسلم ہے، انکا طرز تحریر بھی علامۂ شبلی مرحوم کے ادیبانہ طرز سے ملتا جلتا ہی، مگر اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ مولنا عبدالسلام صاحب ندوی علامہ کی طرح ہمہ گیر ہیں اور یہ بھی علامہ ممدوح کی طرح ہر میدان کے مرد ہیں۔

اس سے قبل مولنا عبدالسلام صاحب ندوی جناب فانی کے متعلق بھی اپنی رائے ظاہر کرچکے ہیں، مگر وہ بھی اسی قسم کی غیر معقول رائے تھی۔

اخیر میں مجھے مولانا عبدالسلام صاحب ندوی سے صرف یہ عرض کرنا ہو کہ آپ اگر شاعری کے میدان میں نہ اترتے تو اچھا تھا، آپ کے لیے سب سے عمدہ بات یہی ہے کہ آپ اپنے مذاق کے موافق علمی اور مذہبی کتابیں لکھیں تاکہ افراد ملک ان سے فائدہ اندوز ہوں اور وہی میدان آپ کے لیے بہت وسیع ہے مگر شاعری کا میدان آپ کے لیے بہت تنگ ہے اسمیں اترنے کی اگر آپ تکلیف نہ فرمائیں تو غالباً آپکے لیے بہت مفید ہوگا۔

(نگار) آپ نے دو اعتراض کیے ہیں ایک تو یہ کہ جو اشعار مصنف شعرالہند نے حضرت ریاض کی بے اعتدالی ظاہر کرنے کے لیے تحریر کیے ہیں ان سے بے اعتدالی پیدا نہیں ہوتی اور دوسرے یہ کہ شاعر کی گرفت مذہبی نقطۂ نظر سے کرنا مناسب نہیں۔

ضرورت تھی کہ آپ اس مسئلہ پر زیادہ مشرح و بسط سے کام لے کر اپنے خیالات ظاہر فرماتے اور اگر اسی سلسلہ میں تنقید کرتے ہوئے، کلام ریاض کے محاسن کو بھی رونما کر سکتے تو اور زیادہ بہتر ہوتا۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اور ذرا غیر پسندیدہ جارحانہ طریقہ اختیار کرکے کچھ عصبیت کا رنگ پیدا کر دیا۔ جو مناسب نہ تھا۔

مولانا عبدالسلام صاحب کو آپ کا یہ مشورہ دینا کہ "وہ شاعری کے میدان میں اتریں" یا یہ ظاہر کرنا کہ وہ اسکے اہل نہیں ہیں۔ کوئی اچھی مثال مدافعت کی نہیں

پھر چونکہ آپ کی تحریر اس لحاظ سے کہ .. بالکل نتیجہ خیز نہ تھی، مضامین کے سلسلہ میں درج نہ ہو سکتی تھی اسلیے ہم نے

اس کو قصداً سلسلۂ استفسارات میں جگہ دی تاکہ جو لوگ اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کا موقع مل سکے۔
میں [illegible] آئندہ اشاعت میں ایک مستقل مضمون شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن جب تک روحانی کا الہام سامنے نہ ہو اس موضوع پر کچھ نہیں لکھ سکتا، اور اسی کو میں فراہم کر رہا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ سیاق بہ ظاہر تجربات کے لحاظ سے بہت مشتبہ ہیں اور اس رنگ میں اسقدر ناکامیاں حاصل کر چکے ہیں کہ شاید کوئی دور نظیر ویسی پیش نہیں کی جا سکتی، لیکن ضرورت ہے کہ اس کو ختم کر کے پیش کیا جائے، کیونکہ اب وہ حد گزر چکا ہے جو پبلک کے ذہن نشین اس مسئلہ میں بہت کم تحقیق کر چکے ہیں، بہرحال میں اس سلسلہ میں ذرا وضاحت سے لکھنے کی کوشش کروں گا۔

اس سلسلہ میں آپ کی ایک غلطی کو بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں [illegible]

ارتقائے انسانی کی دوسری منزل

(جناب احتشام علی صاحب ایم ایس سی فیض آباد)

ماہ ستمبر [illegible] کے نگار میں "مستقبل کے انسان" کے متعلق چند دلچسپ معلومات شائع ہوئی ہیں۔ اس مضمون میں چند غلطیاں ایسی ہیں جنکی تردید نہایت ضروری ہے۔

. . . .

اس مضمون میں لکھا گیا ہے کہ مستقبل کے انسان کی "ناک بہت چھوٹی ہو جائیگی اور صرف دو چھوٹے سوراخوں میں تبدیل ہو جائیگی۔ کیونکہ قوت شامہ سے بہت کم کام لیا جائیگا"۔ ماہران سائنس کے نزدیک اسکے بالکل برعکس تبدیلی ظہور میں آئیگی، یہ امر مسلم ہے کہ جیسے جیسے سیارے زیادہ پرانے ہوتے جاتے ہیں ہوا بھی کم ہوتی جاتی ہے اور یہ اغلب ہے کہ دو لاکھ سال کے بعد روئے زمین پر اتنی ہی قلیل مقدار ہوا کی رہ جائے جتنی کہ اب ہمالیہ کی چوٹی پر ہے جہاں کہ انسان صرف آکسیجن (oxygen) کی مدد سے سانس لے سکتا ہے اسلئے اس زمانہ میں قلت ہوا کی وجہ سے کسی شے کو سونگھنا زیادہ مشکل ہو جائیگا ایک خلا (Vacuum) کے اندر (جسمیں سے ہوا بالکل نکال دی گئی ہو) کسی چیز کو سونگھنا بالکل ناممکن ہے، لہٰذا کئی لاکھ برس کے بعد انسانوں کی ناکیں بہت لمبی ہو جائینگی جیسی کہ ہاتھی کی سونڈ۔ بقول مسٹر گرنیبک ایڈیٹر Science and invention

Invention) کے "ہماری ناکیں اس وضع کی ہو جائینگی کہ وہ خود بو تک پہونچ سکیں بجائے اس کے کہ بو اُن تک پہونچے" اس سے ظاہر ہے کہ حضرت انسان اُس زمانہ میں بھی بڑی بڑی ناکوں والے ہونگے اور دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں اشرف المخلوقات کی ناک نیچی نہ ہوگی۔ ہوا کی کمی کی وجہ سے جو دقت قوت شامہ کو ہوگی وہی قوت سامعہ کو بھی درپیش ہوگی۔ چونکہ رقیق کرۂ باد میں آواز بہت دھیمی ہو جاتی ہے اسلیئے ماہران سائنس کہتے ہیں کہ آئندہ زمانہ کے انسانوں کے کان بہت چوڑے چکلے ہو جائینگے تاکہ آواز کی لہروں کو بآسانی جمع کرکے سن سکیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ہمارے کانوں کی وضع ہاتھی کے کانوں جیسی ہو جائیگی۔

مضمون مذکورۂ بالا میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ "سینہ بہت کشادہ ہو جائیگا تاکہ ہوا کی بہت مقدار حاصل کر سکیں" لیکن ہوا کی زیادہ مقدار حاصل کرنے کی ضرورت کے متعلق کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسلیئے اس کا اظہار بھی ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ قلت ہوا ہی کی وجہ سے انسانوں کے پھیپھڑوں کو ہوا کی کافی مقدار حاصل کرنے کی ضرورت پڑیگی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سینے بہت کشادہ ہوں گے۔ اس قسم کی مثال موجودہ زمانہ میں بھی موجود ہے۔ اکولس انڈین ایک قوم ہے جو پیرو (Peru) میں آباد ہے اور جو سطح سمندر کے بارہ ہزار فیٹ اوپر سے نیچے نہیں اترتی۔ اور اسلیئے ہمیشہ ایک بازیادہ رقیق کرۂ باد میں اپنی زندگی بسر کرتی ہے۔ رقیق کرہ باد میں رہنے کے سبب سے ان لوگوں کا سینہ دوسرے انسانوں کے سینہ کے اوسط سے ۱۲ سنٹی میٹر زیادہ چوڑا ہوتا ہے۔

یہ خیال کہ "مردوں کی ڈاڑھی مونچھ نکلنی بند ہو جائینگی" یہ بھی قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ موجودہ نسل ڈاڑھی مونچھیں صاف رکھنے کے لیئے استرہ وغیرہ کے ذریعہ سے بالوں کو کاٹتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جتنے بال کاٹے جائینگے اتنے ہی وہ زیادہ گھنے اور سخت نکلیں گے جس طرح کہ درختوں کی قلم کرنے سے انکی بالیدگی میں زیادہ ترقی ہو جاتی ہے۔ علاوہ اس کے چہرہ کو صاف رکھنا ایک "حاصل کردہ خصوصیت" (Acquire character) ہے جس کے اولاد میں منتقل (transmission) ہونے کے متعلق اب تک سائنس داں متفق نہیں ہے۔

مزید برآں زمین رفتہ رفتہ زیادہ سرد ہوتی جاتی ہے اسلیئے کئی لاکھ برس کے بعد وہ بالکل برف سے ڈھک جائیگی، اسلیئے ہماری نسل بالوں یا پروں کی ایک موٹی جلد سے آراستہ ہو جائیگی تاکہ وہ اپنے جسم کو گرم رکھ سکے لہٰذا مونچھوں اور ڈاڑھی کا معدوم ہونا تو درکنار ہمارے چہرہ کا ہر حصہ یعنی ناک کان اور ماتھے وغیرہ بھی بالوں

اور سبز ہو جائیں گے
میرے خیال میں قیاس زمانہ کی حد تک بھی درست ہے کہ سونگھنے جیسی نعمت سے محروم نہ رہیگی۔ واللہ اعلم بالصواب

(نگار) آپ نے کمال کیا کہ ایک علمی لطیفہ قیاس کو اسقدر اہمیت دی اور اس کے خلاف جانے کی ضرورت کو محسوس کیا، لیکن جسطرح میں اُسکو لائق اعتبار نہیں سمجھتا، اسی طرح مسٹر گرمینیک کے قیاس کو بھی قابل وثوق قرار نہیں دے سکتا۔

اگر سیاروں کی کیفیت کے ساتھ ساتھ مستقبل بعید میں ہوا کی قلت کو تسلیم کر لیا جائے، تو بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُسوقت انسان کی ناک اسقدر لمبی ہو جائیگی وہ خود منہ تک پہونچ سکے گی۔ کیونکہ اول تو ہمیں یہی سمجھنا چاہیئے کہ اُسوقت انسان یا کسی اور جاندار کا وجود باقی نہ رہے گا اور اگر رہے بھی تو ممکن ہے کہ فطرت اسکے وظائف اعضاء میں اسقدر تبدیلی پیدا کر دے کہ وہ ہوا کا زیادہ محتاج نہ رہے، پھر جسطرح ناک کی درازی کی پیشگوئی کی جاسکتی ہے، اسی طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ناک کی ضرورت ہی نہ رہے گی یا اسقدر کم ہو گی کہ صرف ذرا سا نشان اس کا لاقی سمجھا جائیگا۔

آپ نے آخر میں یہ بھی لکھا ہے کہ کرۂ ارض میں سردی کی زیادتی سے تمام جسم پر بالوں کی کثرت ہو جائیگی یعنی ماحول اور فضا میں جو تغیرات ہونگے اسی کی مطابقت سے جسم انسانی اور وظائف اعضاء میں بھی تبدیلیاں پیدا ہو جائیں گی۔ لیکن کیا اس وقت منطقہ باردہ کے باشندوں میں سے کوئی انسان ایسا بتایا سکتا ہے جس کا چہرہ ناک پیشانی اور سارا جسم جانور کی طرح بالوں سے ڈھکا ہوا ہے، جو آئندہ کے متعلق ایک عام پیشین گوئی کی جاسکے۔

چونکہ فطرت نے انسان کو عقل دے کر اپنی ذمہ داریوں کو بہت کم کر لیا ہے۔ اسلیئے مستقبل بعید میں خواہ ہوا کی زیادتی ہو یا کمی، سردی بڑھے یا کم ہو جائے، ساخت انسانی میں تغیر پیدا کرنے کی باعث نہیں ہو سکتی، کیونکہ تمام شدائد کا مقابلہ کرنے کے لیئے انسان اپنی عقل سے کام لیکر دوسرے ایسے وسائل اختیار کر لیتا ہے کہ اس کے ساخت میں کسی تغیر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

میرا مدعا صرف یہ ہے کہ جس طرح وہ معلومات زیادہ قابل اعتماد نہیں، اسطرح یہ بھی صرف قیاس ہی قیاس ہے اور یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ انسانی ساخت میں کوئی تبدیلی پیدا ہو گی یا نہیں۔ بظاہر

اقتباسات و معلومات

سائنس اکاڈیمی کے ایک پروفیسر نے حال ہی میں بجلی کا ایک ایکیو میولیٹر (Accumulator) ایسا ایجاد کیا ہے جو واسکٹ کی جیب میں آسکتا ہے لیکن اسمیں اتنی برقی قوت پنہاں ہے جو بڑی سی بڑی گاڑی کو دس دن رات تک برابر چلا سکتا ہے۔

سائنس داں اور طبقہ صناعین میں اس ایجاد سے بہت امیدیں پیدا ہو گئی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ ہوائی جہاز رانوں کے لیئے یہ ایجاد بہت مفید ثابت ہوگی پروفیسر موصوف اس ایجاد کو زیادہ وسیع پیمانہ پر لاکر عام کرنا چاہتے ہیں۔

روس کی سوویٹ جمہوریت کے پاس اسوقت ۵۶۲۰۰۰ فوج ہے، حالانکہ زار کے زمانہ میں ۱۴۰۰۰۰ تھی۔ سوویٹ جمہوریت کی آبادی ۱۳۰۰۰۰۰۰ سے زیادہ ہے اور فرانس کی آبادی ۳۹۰۰۰۰۰۰، تاہم سوویٹ فوج فرانس کی فوج سے کم ہے۔

ضرورت سے زیادہ فربہ ہوجانا بھی ایک مرض ہے اور بہت سے لوگ اس بیماری میں مبتلا ہیں، لیکن اسوقت تک اس کا کوئی علاج سوائے ورزش اور فاقہ کرنے کے دریافت نہیں ہو سکا تھا۔ اب اس کا نہایت سہل علاج دریافت ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک دوا جس کا نام ہائپر تھرمن (Hyperthermen) ہے پچکاری کے ذریعے جسم کے اندر پہونچا دیجاتی ہے اور رفتہ رفتہ انسان کی فربہی دور ہو کر معتدل جسم رہ جاتا ہے

جرمنی کے ایک ڈاکٹر کارل میولر نے حال ہی میں فولاد کی ایسی باریک چادریں تیار کی ہیں جو شیشہ کی طرح شفاف ہیں اور جن کے اندر سے شعاعیں اسی طرح نفوذ کر جاتی ہیں جیسے باریک کانچ کے اندر سے لیکن

لیکن اسی کے ساتھ فولاد کی مضبوطی بھی ان میں پائی جاتی ہے۔

امریکہ نے حال ہی میں اپنا عظیم الشان ہوائی جہاز طیار کیا ہے، وہ ۸۸۰ فٹ لمبا ہے اور ۲۴۰۰۰ ٹن اس کا وزن ہے۔ اسمیں آٹھ انجن بجلی کے لگے ہوئے ہیں جن سے ایک لاکھ ۸۰ ہزار گھوڑوں کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اسمیں ۲۷ مشین گنیں رکھی جاسکتی ہیں۔

کلیفورنیا کے شرقی جنوب میں ایک وادی ہے جہاں ۱۸۴۹ء میں سب سے پہلے ایک جماعت مہاجرین کی داخل ہوئی تھی، لیکن گرمی کی شدت سے جانبر نہ ہوسکی اسوقت سے اس وادی کا نام "وادی موت" ہے، یہاں سایہ میں بھی درجۂ حرارت ۱۶۰ درجہ رہتا ہے اور ۱۳۴ درجے کبھی کم نہیں ہوتا۔ لیکن ۱۹۰۳ء میں جب اتفاق سے یہاں بورق کے معدنوں کا پایا جانا معلوم ہوا تو پھر ایک جماعت پہونچی اور قریب کے ایک چشمہ سے پانی کاٹ کر وہاں لے گئے، لیکن اکثر لوگ مرگئے۔
بعد کو پھر کوششیں کی گئیں، اور آخر کار یہاں باقاعدہ بورق نکالنے کا کام شروع کردیا گیا اور وادی کے قریب ہی ایک شہر آباد ہوگیا ہے جہاں تمام عمال رہتے ہیں۔ اسوقت یہاں سے سالانہ ۱۲۰۰۰ ٹن بورق نکلتا ہے، جسکی قیمت بلاد انگلستان وغیرہ میں ۶۶ لاکھ گنی ہوتی ہے۔
بورق کا استعمال اب بہت عام ہوگیا ہے اور شیشہ بنانے، صیقل کرنے، چکنا کاغذ طیار کرنے، دباغت کرنے، کپڑے رنگنے میں اس سے مدد لی جاتی ہے۔

امریکہ کی سنما کمپنیاں ماہوار ۱۵۰۰۰۰۰ فٹ فلم سالانہ طیار کرتی ہیں، ۱۸۹۵ء میں ۲۲ ہزار فٹ فلم طیار ہوا تھا، لیکن اب ۵۶ ہزار فٹ ماہوار کا اوسط ہوگیا ہے۔
وہاں روزانہ ۲۲ ملین آدمی سنما دیکھنے جاتے ہیں۔ جرمنی میں ۳۷۳۱ سنما (عکاس خانے) ہیں، روس میں ۳۵۰۰، بلاد انگلستان میں ۳۰۰۰، فرانس میں ۴۲۰۰، اٹلی میں ۲۲۰۰، بلجیم میں ۱۸۰۰، سویڈن ناروے ڈنمارک میں ۷۴۹، پولینڈ میں ۷۰۳، ہالینڈ میں ۲۲۷، ہنگری میں ۱۱۱۹، اسپین میں ۶۵۱ اور ترکی میں ۲۳ ہیں لیکن امریکہ میں ان کی تعداد ۱۸۰۰۰ ہے۔

گذشتہ جنگ کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ یورپ کا سونا اکثر مقدار میں امریکہ پہونچگیا، چنانچہ جنوری ۱۹۲۵ء میں امریکہ کے پاس جسقدر سونا تھا اسکی قیمت کا اندازہ ایک ہزار ملین گنی کیا جاتا ہے، یعنی جنوری ۱۹۱۳ء کی مقدار سے دوچند گذشتہ سال رصدگاہ جمیکا سے پروفیسر پکرنگ نے مریخ کا مطالعہ کر کے یہ نتیجہ پیش کیا ہے کہ وہاں کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے ایک درجہ اوپر ہے، اور وہاں کی ہوا زیادہ کثیف ہے، پروفیسر ڈگو رنے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہاں کے پہاڑ ۸۰۰ فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہیں اور وہاں نباتات وحیوانات کا وجود بھی پایا جاتا ہے۔

پیرس میں یہ امر محسوس کیا جارہا ہے کہ موٹروں کی وجہ سے وہاں کی ہوا خراب ہورہی ہے اندازہ کیا گیا ہے کہ وہاں روزانہ ہر موٹر سے ۵۰۰ لٹر آکسیڈ کاربن ہوا میں ملتا ہے، یعنی تمام موٹروں سے (جنکی تعداد ۴۰ ہزار ہے) ۱۰۰ ملین لٹر روزانہ یہ خراب گیس نکل کر ہوا کو خراب کرتی ہے، ہرچند ہوا میں منتشر ہوکر اس گیس کی خرابی بڑی حد تک دور ہوجاتی ہے، لیکن پھر بھی اتنا اثر ہوا میں باقی رہ جاتا ہے کہ متعدد واقعات ہلاکت کی مسموم ہوا سے ہوتے رہتے ہیں۔ پھر چونکہ موٹروں کی تعداد روزانہ بڑھتی جارہی ہے اسلیئے یقیناً ایک وقت وہ آنے والا ہے جب ہوا اس زہر سے لبریز ہوکر عام ہلاکت پیدا کرنے لگیگی اور اسوقت کوئی علاج ممکن نہ ہوگا۔ اس وقت تک اسکی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن وہاں کے علما اس طرف بہت متوجہ ہیں۔

بکٹیریا سے مراد وہ چھوٹی چھوٹی نباتات ہیں جو حیوانات پر زندگی بسر کرتے ہیں اور انسان وغیرہ میں مختلف قسم کے امراض پیدا کردیتی ہیں، یہ اسقدر چھوٹی ہیں کہ سوائے نہایت قوی خوردبینوں کے اور کسی ذریعہ سے نظر نہیں آتی، لیکن حال ہی میں فرانس کے کسی عالم نے ایک جاندار جرثومہ (نہایت ہی چھوٹا کیڑا) ایسا دریافت کیا ہے جو بکٹیریا کو کھاجاتا ہے اور شفاء امراض کا اصل باعث اسی کو بتایا ہے۔

گذشتہ جنگ میں ہوائی جہاز اسلیئے زیادہ مفید ثابت نہیں ہوئے کہ نیچے سے گولہ آکر ان کو گرادیتا تھا، اور اسطرح بہت سے حادثے وقوع میں آئے۔ لیکن اب اس خطرہ کو دور کردیا گیا ہے اور وہ اسطرح کہ ہوائی جہاز

اڑتے وقت غلیظ دھواں پیدا کرتا ہے جو اسکے چاروں طرف چھا جاتا ہے اور نیچے سے مطلق پتہ نہیں چل سکتا کہ جہاز کس جگہ ہے۔ اس ترکیب سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہوائی جہازوں کو نیچے سے نشانہ نہ بنایا جا سکیگا۔ اور جہاز اسی دھوئیں کی چادر رکھ کر دشمن پر گولے گرا سکیگا۔

اسوقت متمدن دنیا میں ایک جدید خیال پیدا ہوتا ہے کہ نیند فطری تقاضہ نہیں ہے بلکہ اکتسابی عادت ہے اور نہایت مضر صحت ہے۔ مسٹر اڈیسن (امریکہ کے مشہور مخترع) کا بھی یہی خیال ہے کہ رات دن میں صرف دو تین گھنٹے سونا کافی ہے، چنانچہ وہ خود اسی کا عامل ہے۔

جرمنی کے ایک پروفیسر نے ۹۰ گھنٹے تک مسلسل جاگ کر اپنا تجربہ بیان کیا ہے کہ بیس گھنٹے کے بعد خون کا دباؤ کم ہو جاتا ہے، اور خون کے سفید ذرات بڑھ جاتے ہیں۔ تکلیف کا احساس دماغ کو بہت کم ہوتا ہے لیکن جسم کو زیادہ ہونے لگتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نیند دماغ کے لیے مفید نہیں ہے۔

امریکہ میں ہر یونیورسٹی کے متعلق متعدد کالج ہوتے ہیں جن کے لیے ۳۰۰۲۵ عمارتوں کی ضرورت ہوتی ہے جہاں مختلف علوم و فنون کی تعلیم دیجاتی ہے اور تقریباً ۱۲۰ ایکڑ زمین کو محیط ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ طلبہ کی تعداد وہاں بڑھتی جا رہی ہے اور زمین کم ہے، اسلئے یہ تجویز کی گئی ہے کہ یونیورسٹی کی ایک ہی عمارت ہونی چاہیے جسمیں تمام کالج وغیرہ شامل ہوں، چنانچہ اس غرض کے لیے ایک عمارت ۴۲ درجہ کی تعمیر ہو رہی ہے جسمیں کالج ہیں۔ پروفیسروں کے مکان ہیں اور طلبہ کی اقامت گاہیں بھی۔

یہودی اور اسکاٹلینڈ کے باشندے طمع و حرص کے لحاظ سے بہت بدنام ہیں، چنانچہ ان کے بعض دلچسپ واقعات مشہور ہیں مثلاً:۔

ایک باشندۂ اسکاٹ لینڈ دہلی کی نمائش میں ۲۱ جون کو گیا محض اسلیے کہ یہ سال کا سب سے بڑا دن ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک یہودی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن صبح کو وہ بیدار ہوا تو اپنی بیوی کو مردہ پایا! اسنے دیکھ کر سب سے پہلے جو حرکت کی وہ یہ تھی کہ دوڑا ہوا گیا اور اپنے خانساماں کو حکم دیا کہ آج صرف ایک انڈا ابالا کرے

اگر پیالے میں مکھی نظر آجائے تو

اسپین کا باشندہ قیمت ادا کرکے چلا جاتا ہے۔

فرانس کا باشندہ ہاتھ سے نکال کر اسے پاؤں سے کچل دیتا ہے اور پھر قہوہ کو بڑا اچھا کہکر پی جاتا ہے۔

انگلستان کا رہنے والا زمین پر گلاس کو خالی کرکے، دوسرا گلاس طلب کرتا ہے

جرمنی کا باشندہ، مکھی نکال کر پھینک دیتا ہے اور باقی جو کچھ ہو پی لیتا ہے،

روسی کچھ پرواہ نہیں کرتا اور مع مکھی کے پی جاتا ہے، لیکن چینی اس مسئلہ میں بہت زیادہ مستعد ہے جو پہلے مکھی کو نکال کر منہ میں رکھ لیتا ہے اور چبا کر کھا جاتا ہے، پھر پیالہ کو خالی کر دیتا ہے۔

مسٹر ہیلی کمپل انگلستان کے ریاضی داں نے اتفاقات ہندسیہ کی عجیب و غریب مثال پیش کی ہے۔

۱ × ۹ + ۲ = ۱۱

۱۲ × ۹ + ۳ = ۱۱۱

۱۲۳ × ۹ + ۴ = ۱۱۱۱

۱۲۳۴ × ۹ + ۵ = ۱۱۱۱۱

۱۲۳۴۵ × ۹ + ۶ = ۱۱۱۱۱۱

۱۲۳۴۵۶ × ۹ + ۷ = ۱۱۱۱۱۱۱

۱۲۳۴۵۶۷ × ۹ + ۸ = ۱۱۱۱۱۱۱۱

۱۲۳۴۵۶۷۸ × ۹ + ۹ = ۱۱۱۱۱۱۱۱۱

امریکہ میں موٹروں کی زیادتی حیرتناک طریقہ سے ہو رہی ہے، سنہ ۱۹۲۲ء میں وہاں کے کارخانوں میں ۲۶۵۹۰۶۴ موٹریں طیار ہوئیں اور سنہ ۲۳ء میں ۴۰۶۹۹۰، گویا پہلے سال سے تقریباً دو چند۔ ان موٹروں میں سے صرف ۸ فیصدی باہر گئے ورنہ سب کی سب وہیں امریکہ میں کام آئیں۔

سنہ ۲۳ء میں وہاں ۱۲ ملین موٹریں درج رجسٹر ہوئیں اور سنہ ۱۹۲۴ء یہ تعداد ۱۵ ملین تک ہو گئی، اس وقت ساری دنیا میں ۱۸ ملین موٹر موجود ہیں جن میں ۱۵ ملین امریکہ کے پاس ہیں باقی ۳ ملین میں ساری دنیا ہے۔

اسی طرح ٹیلی فون کا استعمال وہاں کثرت سے رائج ہے اور کوئی [illegible]
اس سے کام لیتے ہیں۔ شہر سان فرانسسکو، نیویارک سے ۲۰۰۰ میل دور ہے، لیکن ان دونوں کے
درمیان سلسلہ ٹیلی فون جاری ہے اور ہر شخص ایک دوسرے سے بات کرسکتا ہے، صرف شہر نیویارک میں
جتنے ٹیلی فون قائم ہیں اتنے سارے برطانیہ میں نہیں ہیں۔ طبقہ مزارعین میں بھی ۸۶ فیصدی ایسے ہیں جو
ٹیلی فون رکھتے ہیں۔

علم جس قدر زیادہ ترقی کرتا جاتا ہے، مذہبی تعلیمات کی صحت اسی قدر زیادہ موثق ہوتی جاتی ہے، مذہب کی تعلیم
ہے کہ مادہ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اصل چیز روحانیت ہے، ایک زمانہ تک اسکی مخالفت کی گئی، لیکن اب جدید ترین
تحقیقات اس نتیجہ پر پہونچ رہی ہے کہ مادہ حقیقتاً غیر محسوس چیز ہے۔ جو چیز محسوس ہوتی ہے وہ صرف مادہ
کی حرکت ہے، اسلئے وہ زمانہ دور نہیں جب مادہ کی حقیقت کو روح غیر محسوس سے تعبیر کیا جائیگا۔

پیرس کی عورتیں اب بجلی کے چھوٹے چھوٹے قمقمے اپنے پاؤں میں باندھتی ہیں، کہ چلتے وقت راستہ
پوری طور پر نظر آئے اور موٹروں یا ٹراموے پر چڑھنے اترنے کے وقت آسانی ہو، ان قمقموں کا تعلق ایک
بیٹری سے ہوتا ہے، جو جیب میں رہتی ہے اور اس کا بٹن دبانے سے یہ قمقمے روشن ہوجاتے ہیں۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ:-
جزائر سینڈوچ میں عورت کے حسن کا اندازہ اسکی فربہی سے کیا جاتا ہے۔

مکھی ایک سکنڈ میں ۳۳۰ مرتبہ اپنے بازو کو حرکت دیتی ہے۔

دریائے نیل میں ۱۹۲ قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں اور اسوقت تک کل ۱۰۰۰۰ قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں

ہاتھی انسان کی خوشبو ایک ہزار گز کے فاصلے سے سونگھ لیتا ہے۔

نگار

ایک علمی و ادبی رسالہ

مدیر

نیاز فتحپوری

رجسٹرڈ نمبر ال ٢٨٨   ٧٨٦   جلد (٩) شمارہ (٣)

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

فہرست مضامین مارچ سنہ ٢٦ء

"تصویر رقاصہ"

تاریخ اشاعت — بسم اللہ — ہر ماہ کی پندرہ

نگار

ایڈیٹر نیاز فتحپوری

قیمت سالانہ ہندوستان مین پانچ روپیہ — ہندوستان سے باہر علاوہ محصول چھ روپیہ

جلد (۹)	مارچ سنہ ۱۹۲۶ء	شمار (۳)

ملاحظات

نوچیتن کلکتہ کا نہایت مشہور و مقبول گجراتی رسالہ ہے۔ گذشتہ دیوالی نمبر مین اسنے میرے ایک ادبی مضمون "رقاصہ" شائع کیا اور اسکے ساتھ نہ صرف میری اور مترجم کی تصویر بلکہ بنگال کے مشہور نقاش مزمدار سے ایک رنگین تصویر رقاصہ کی بھی طیار کرائی۔

مین نہین سمجھ سکتا کہ ترجمہ کیسا تھا، لیکن تصویر ضرور اچھی معلوم ہوئی اور یہی وہ تصویر ہے جو اس ماہ کے نگار مین آپ ملاحظہ

میرا مضمون "رقاصہ" وہی مضمون ہے جو سب سے پہلے نقاد مین شائع ہوا تھا اور پھر ملک کے مختلف رسائل مین نقل ہوا جن حضرات کی خواہش ہو وہ اس تصویر کے ساتھ اس مضمون کا بھی مطالعہ کرسکتے ہین۔

دستور رہا ہے کہ جب کسی رسالہ مین کوئی تصویر اس قسم کی شائع ہوتی ہے تو اسکے ساتھ کوئی نظم یا ادبی مضمون بھی ضرور ہوتا ہے، ... یہ امر دشوار نہ تھا، لیکن مین نے بجائے کسی ادبی مقالہ یا نظم کے یہ زیادہ مناسب سمجھا کہ کوئی تاریخی مضمون فن رقص پر پیش کیا جائے ... سب سے پہلا مضمون جو آپ کی نگاہ سے گزریگا وہ اسی موضوع پر ہوگا۔

خواہش یہی تھی کہ یہ مضمون ایک ہی نمبر مین شائع ہوجائے لیکن چونکہ طویل زیادہ تھا اس لئے اس کے دو حصے کر دینے پڑے

آپ ملاحظہ فرمائین گے کہ اس مہینے کا مسطر بجائے ۲۳ کے ۲۵ سطر کا ہے اور کتابت بھی نہایت گنجان ہے گویا اسطرح کم از کم ۱۲۵

صفحات کا سواد پیش کیا جاتا ہے، لیکن پھر بھی بہت سے اہم و دلچسپ مضامین کیلئے جگہ نہ نکل سکی۔ یہ معذرت ہے اُن احباب کی خدمت میں جنکے مضامین ابھی تک شائع نہیں ہوسکے۔ اور جو ابتک زحمت انتظار میں مبتلا ہیں۔ امید ہو کہ جنوری تک کے موصول شدہ تمام مضامین آئندہ مہینہ میں درج ہو جائینگے۔

جیسا کہ خیال تھا اس مہینے کا مسودہ مجھے کتابت کیلئے لکھنؤ بھیجنا نہیں پڑا کیونکہ فی الحال ایک کاتب کی خدمات حاصل ہوگئی ہیں۔ ہرچند موجودہ کاتب ابھی نو آموز ہیں لیکن ان میں یہ صلاحیت ضرور ہے کہ چند دن کی محنت کے بعد اصول کتابت سے واقف اور خط میں پختگی پیدا ہونے کے بعد اچھے کاتبوں میں انکا شمار ہونے لگے۔

"نگار" کا جدید سرورق ابھی تک شائع نہیں ہوسکا۔ لاہور، لکھنؤ اور کلکتہ کے بعض ماہرین فن سے ڈیزائن طیار کرائے جا رہے ہیں، امید ہے کہ مئی کے رسالہ کا سرورق جدید ڈیزائن کے بلاک سے چھاپا جائیگا۔ لفظ "نگار" کی نشست حروف فن کتابت کے لحاظ سے اس قدر مشکل ہے کہ کسی طرح خط نستعلیق میں حسن پیدا ہی نہیں ہوتا، نسخ میں البتہ کچھ عیب دور ہوجاتا ہے، اس لئے اب ارادہ یہی ہے کہ ڈیزائن میں لفظ "نگار" خط نسخ یا ثلث میں تحریر کرایا جائے۔

میرا ایک مسلسل افسانہ "فریب خیال" اس مہینے سے شائع ہوا ہے لیکن اسکے متعلق میں ظاہر کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسکو میں نے حضرت وصل کے اصرار پر مرقع کیلئے لکھا تھا اور نگار میں اس کی اشاعت گویا وہیں سے منقول سمجھی جائے گی۔ البتہ نظر ثانی کے بعد کہیں کہیں حذف و اضافہ ضرور ہوگیا ہے۔ مصلح سنگ کی غلطی سے "ماخوذ از مرقع" لکھا گیا۔

"لارڈ رپن کا عہد حکومت" اس مہینے میں دیگر اہم مضامین کیوجہ سے شائع نہیں ہوسکا، ماہ آئندہ سے پھر اسکا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

فروری کے رسالہ میں ایک جگہ صفحات کی سخت غلطی ہوگئی ہے اسکو اس طرح درست کرلیا جائے:-
صفحہ ۶۵ کے بعد صفحہ ۶۸ اور صفحہ ۶۰ کے بعد صفحہ ۶۶ کا، پھر ۶۷ اور اسکے بعد صفحہ ۶۹

رسالہ ہومیوپیتھک لیڈر (بھوپال) پر ریویو کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ یہ رسالہ اکتوبر ۳۵ء سے جاری ہے، حالانکہ اکتوبر میں صرف ایک نمبر بطور نمونہ شائع ہوا تھا۔ یہ رسالہ حقیقتاً جنوری ۳۶ء سے جاری ہوا ہے اور بعض خصوصیات کے ساتھ جنکا

ذکر اس سے قبل میں بہ سلسلۂ تبصرہ کر چکا ہوں۔

یہ خبر غالباً بہ رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ ۲۶ جنوری سنہ ۳۶ء کی صبح کو ابو البیان سید حامد حسین بسمل شاہجہانپوری دنیائے جیفہ کیلئے بے تعلق ہو گئے اور بھوپال کی سرزمین کو انہوں نے اپنی آرامگاہ بنانا پسند کیا۔ مرحوم تقریباً دو سال سے سل و دق کے عارضہ میں مبتلا تھے اور جولائی سنہ ۳۵ء سے بغرض علاج بھوپال میں مقیم تھے۔ ظاہر ہے کہ بھوپال میں ایسے مرض کا کیا علاج ہو سکتا تھا، لیکن وہ تو یہاں کی مٹی انھیں کھینچ لائی تھی اور باوجود اسکے کہ حالت روز بروز بدتر ہوتی جاتی تھی انھوں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ مجھے صحت اسی جگہ حاصل ہوگی اور آخر کار یہیں کی خاک میں سر چھپانا انھوں نے پسند کیا۔

مرحوم اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے اس قدر عجیب و غریب انسان تھے کہ کم از کم میرے حلقۂ احباب میں تو اب کوئی شخص انکی جگہ پر نہیں کر سکتا، اور وہ لطیف صحبتیں جن کی تکمیل کا انحصار صرف انھیں کی شرکت پر ہوا کرتا تھا یقیناً اب انھیں خواب و خیال ہو جاتی ہے۔

مرحوم کا حلقۂ احباب نہایت وسیع تھا اور ہندوستان کی شاید ہی کوئی اعلیٰ سوسائٹی ایسی ہو جس میں انھیں در خور حاصل نہ رہا ہو لیکن بایں ہمہ وہ بدقسمت بھی اسی درجہ کے تھے کہ ساری عمر پریشان روزگاری اور بے سر و سامانی میں بسر ہوئی اور استقلال کے ساتھ چند مہینے بھی وہ ایک جگہ اطمینان سے نہ رہ سکے

لاہور سے آنے کے بعد چند دن وہ کانپور میں رہے اور پھر اسکے بعد کلکتہ چلے گئے یہاں سے ایک ماہوار رسالہ جاری کرنیکا عزم تھا لیکن اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی اور بیمار ہو کر چند مہینے وہیں پڑے رہے۔ یہی وہ بیماری تھی جسنے بعد کو سل کی صورت اختیار کر لی اور آخر میں موت کی۔

ہر چند مرحوم کے اعزا میں سوائے ایک بڑی بہن کے (جو اپنے گھر کی ہیں) اور کوئی نہیں ہے لیکن کثیر الاحباب ہونے کی وجہ سے لوگ ایسے تھے جو انہیں عزیز رکھتے تھے اور جن کیلئے یہ سانحہ یقیناً "نقصان عظیم" ہوگا۔

بھوپال میں اُن کی زندگی کے جتنے دن گزرے وہ تمام حقیقتاً اپنے اندر ایک دفتر عبرت و داستان بصیرت پنہان رکھتے تھے اور میں کہ سکتا کہ انکی حالت ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد میری روح کتنے عرصہ تک کانپا کرتی تھی، لیکن جو نتیجہ اسباب کی کڑیوں سے ملکر پیدا ہوتا ہے، اسکا کوئی علاج ممکن نہیں اور اُن کی بے خانماں زندگی کی آخری ساعتوں کو قدرتاً حسرت ناک ہونا چاہئے تھا۔

مجھے افسوس ہے کہ اس زمانہ میں متواتر سفر کی وجہ سے میں اُن کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔ لیکن خدا کا انتظام دیکھئے کہ اسنے حکیم ضیاء الحسن صاحب (جو یہاں کے نہایت مشہور طبیب ہیں) کے دل میں درد پیدا کر دیا اور جس خلوص نیت کے ساتھ انھوں نے مرحوم کا معالجہ، تیمارداری اور دستگیری فرمائی، وہ اس دور مادیت میں شاید ہی کہیں نظر آ سکتی ہے، کثر اللہ امثالہٗ۔

فن رقص تاریخ اسلام کے نقطہ نظر سے

"یہان سے چلے جاؤ، اگر تم ہم آہنگی (Harmony) سے نا آشنا ہو"

(افلاطون)

تمہید اسوقت دنیا مین جتنے فنون رائج ہین اُن مین سے کوئی ایسا نہین ہے جس کا سراغ عہد قدیم تک نہ پہونچتا ہو، فرق یہ ہے کہ بعض فنون کی موجودہ ترقی یافتہ صورت اسقدر بدلگئی ہے کہ درمیان کی ارتقائی کڑیونکا علم نہ ہونے کیوجہ سے، انکا سلسلہ عہد قدیم تک ہماری سمجھ مین نہین آتا، اور بعض مین ایسا زیادہ تغیر نہین ہوا ہے اور ہم آسانی سے معلوم کرسکتے ہین کہ یہ اسلاف قدیم کی یادگار ہے۔

موسیقی، رقص، اور تعمیر و نقاشی ان ہی فنون مین سے ہین جن کا عہد قدیم سے بواسطہ ہم تک منتقل ہوکر آنا نہایت روشن طور پر واضح ہے اور اسکے لئے دلیل کی ضرورت نہین

موسیقی و رقص مین باعتبار زمانہ کس کو تفوق حاصل ہے، یہ بتانا مشکل ہے لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ رقص کی بنیاد موسیقی سے پہلے قائم ہوئی ہوگی، کیونکہ انسانی اعضا مین اس وقت بھی حرکت پائی جاتی تھی جب انسنے کوئی زبان ایجاد نہ کی تھی اور رقص نام ہے صرف اعضاء انسانی کی حرکت کا۔

رقص کی تاریخی قدامت قدیم ترین اقوام مین رقص کے رواج کا سبب کیا ہوا، اسکی تحقیق مشکل ہے لیکن بظاہر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اسکا تعلق صرف تفریح سے تھا اور دیوتاؤن کے سامنے رقص کرنا بھی اُن کے خوش کرنے کے لئے تھا، لیکن بعد کو جب عظمت و احترام کے حقیقی مفہوم سے انسان آشنا ہوا تو وہ رقص جو دیوتاؤن کے سامنے بھی محض تفریح کیلئے کیاجاتا تھا اس مین ایک دینی اہمیت پیدا ہوگئی اور تفریح کا خیال محو ہوکر عبادت کا جذبہ اس سے متعلق ہوگیا جس نے رقص کی دو قسمین (دینی و دنیاوی) علیحدہ علیحدہ کردین۔

امم قدیمہ مین بنو اسرائیل رقص مین بہت مشہور تھے جسکا سبب غالباً حمایت دینی تھا۔

ہیکل اور شلیم مین عبادت کے وقت رقص کے عادی تھے جیسا کہ کتب مقدس سے ثابت ہوتا ہے خود داؤد نبی کا رقص کرنا اور لوگونکو رقص کے ذریعہ سے خدا کی عبادت کرنے کی ہدایت کرنا بھی ان ہی مقدس کتابون سے پایا جاتا ہے

یونانیون کے ہان رقص کی دو قسمین تھین ایک دنیوی جو اُن کی گھر کی محفلون مین رائج تھا، دوسرا دینی جو جیوپیٹر کے مندرون مین کیاجاتا تھا۔ منروا دیوتا کے سامنے جو رقص ہوا کرتا تھا وہ مسلح ہوا کرتا تھا اور یہی بنیاد رقص عسکری کی تھی۔ زہرہ اور باخوس (شراب کا دیوتا) کے مندرون مین جو رقص ہوتا تھا اس کی شان دوسری تھی۔ اسپارٹا مین جو ایک اور قسم کا رقص رائج تھا جو کستور و بولکس کی ایجاد تھی۔ لیکرغوس نے

جو رقص ایجاد کیا تھا اس میں جوان مرد اور جوان عورتیں سب شریک ہوتی تھیں۔ یہ رقص دینی و اخلاقی فرائض میں شامل تھا اور قضاۃ و حکام بھی اس کی مشق کرتے تھے۔

ایتھنس اور اسپارٹا کے لشکر جب میدان جنگ میں جاتے تھے تو چنگ و رباب پر رقص کرتے تھے اور یہ رقص اسقدر معزز سمجھا جاتا تھا کہ انھوں نے ایلاقون (رقص عسکری کے موجد) کا مجسمہ قائم کیا تھا۔ اعیاد دلیوس کے موقعہ پر اور قربانگاہ اپلون کے گرد عربان رقص کیا جاتا تھا۔

روما میں بھی رقص کی دو قسمیں تھیں حربی و دینی، حربی رقص کا موجد رملوس تھا اور رقص دینی میں وہ رقص بہت مشہور تھا جسے بُت مریم کے پجاریوں نے ایجاد کیا تھا، چنانچہ قدیم عیسوی کلیسا ؤں میں اس رقص کا رواج کثرت سے تھا اور رومن کیتھولک ممالک میں اب بھی رائج ہے۔

مملکت اشور کے آثار سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ دینی رقص اُن کے ہاں پایا جاتا تھا اور ساز کے ساتھ رقص کرتے تھے۔ رہا ہندوستان سو یہ شعر و موسیقی کا ملک ہی تھا اور یہاں پرستش کا مفہوم ہی صرف رقص و موسیقی قرار دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے قدیم روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی کا موجد برہما تھا اور اسکی بیوی سرستی نے ساز ایجاد کیا تھا۔ اسکے علاوہ گندھرب وغیرہ دیوتاؤں کا گانا بجانا اور دعوتوں میں رقص کرنا بھی انکے مذہبی لٹریچر سے ثابت ہے۔

ہندوستان کے قدیم موسیقی دان، شاعر بھی ہوا کرتے تھے اور رقاص بھی کیونکہ آواز، ساز اور حرکت جسم کا ہم آہنگ ہونا مذہبی رسم کی جان سمجھی جاتی تھی۔ ان کے ہاں موسیقی کے سات حصے کئے ہیں جن میں چوتھا نمبر رقص کا ہے۔ الغرض دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں رقص کا رواج ازمنہ قدیم میں نہ رہا ہو اور جس کی یادگار اب بھی وحشی اور متمدن اقوام میں نہ پائی جاتی ہو۔ حبشیوں کا حلقہ بنا کر رقص کرنا، ہندوستان کے گونڈوں کا دو دو مل کر ناچنا، سنتال عورتوں کا دائرہ بنا کر رقص کرنا، اسیطرح تمام دیگر ممالک کے وحشی باشندوں میں رقص کا پایا جانا اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ عادت بیہودہ انسان کو اپنے اسلاف سے ملی ہے اور کبھی اسکو معیوب قرار نہیں دیا گیا۔

اسوقت دنیا میں ایک مسلمان ہی کی قوم ایسی ہے جو رقص کو معیوب سمجھتی ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو اس خیال میں مسلمان مذہبی قیود سے بھی بہت آگے بڑھ گئے ہیں اور اُنھوں نے اس فن جمیل کے محاسن کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

عبد الفتاح عبادہ نے عربی میں ایک نہایت دلچسپ مضمون "فن رقص اور عہد اسلام" کے موضوع پر لکھا ہے اور بہت محنت سے عرب و اسلام کی تاریخی و مذہبی روشنی میں اسپر غور کیا ہے، اس لئے ہم یہاں اسکا ملخص درج کرتے ہیں۔

فاضل مضمون نگار نے پہلے مصریوں کے فن رقص سے بحث کی ہے کہ اُن کے ہاں یہ کسقدر رائج تھا اور انھوں نے اس میں کسقدر ترقی کی، اس کے بعد اسنے عربوں کے رقص کو لیا ہے اور پھر عہد اسلام میں اسکی کسقدر ترقی ہوئی اسکا ذکر کر کے مضمون کو نہایت خوبی کے ساتھ ختم کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

رقص عرب جاہلیت میں

دوسری قدیم قوموں کی طرح عرب جاہلیت میں بھی رقص کا رواج پایا جاتا تھا، یہانتک کہ بعض علماء نے

اس قول کو ترجیح دی ہے کہ کعبہ کا طواف جو زمانۂ جاہلیت میں ہوتا تھا وہ بھی ایک قسم کا رقص تھا،

آیت ۔ "وما کان صلاتهم عند البیت الا مکاء و تصدیة" کی تفسیر میں زمخشری اور بیضاوی لکھتے ہیں کہ "عورتیں اور مرد ایک دوسرے کی انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر سیٹیاں اور تالیاں بجاتے ہوئے برہنہ طواف کرتے تھے"[1] ان کے علاوہ اور مفسرین نے اس سے بھی زیادہ لکھا ہے جو آپ کو مختلف تفاسیر میں ملیگا[2]، اور یہ عربوں ہی پر موقوف نہیں بلکہ تمام قدیم قومیں اپنے معابد و ہیاکل میں رقص کیا کرتی تھیں، ہیاکل منف، طیبہ، ہلیوپولیس، ہیاکل اورشلیم، نینوا، بابل، اور معابد بعل، عشتاروت، زردشت، جوپیٹر، زہرہ ([illegible]) وغیرہ رقص کا [illegible]، توریت میں آیا ہے کہ یہودی رقص کے ذریعہ سے عبادت کیا کرتے تھے، غرض اس میں شک نہیں کہ "مذہبی رقص" قدیم قوموں کا نہایت ترقی یافتہ اور مقدس رقص تھا۔

تمام قوموں میں رقص کا جو دو ایک ہی اسلوب پر ہوتا ہے یعنی رقص بطور ریاضت جسمانی اور مرد و عورت اس میں برابر حصہ لیتے تھے، وہ اقوام جو اپنی فطرت اولی پر باقی تھیں وہ سب رقاص تھیں مثلاً عرب ایام جاہلیت اور بدویت میں، رقص کرتے تھے، مرد حلقۂ رقص میں کھڑا ہو کر اچھلتا تھا، کودتا تھا، تلوار سے کھیلتا تھا، اور ایسی حرکات کرتا تھا، جو اس کی شجاعت، اور شدتِ قوت پر دلالت کرتی تھیں، اسی طرح عورت اسی حلقہ میں کھڑی ہو کر اپنی حرکات رقص سے اپنے اعضا کی رعنائی، جسم کی شادابی، قامت کا اعتدال، التفات و توجہ جسمانی لوچ کا حسن دوسروں پر ظاہر کرتی تھی،

عرب ایام جاہلیت میں اپنے تیوہاروں، اور بت پرستی کے مراسم میں، دوسری قوموں کی طرح رقص کیا کرتے تھے، اور شاید جاہلیت کا طواف کعبہ ان مذہبی مراسم میں سب سے مقدم تھا، جن میں رقص کیا جاتا تھا، تاریخ سے ثابت ہے کہ رقص ان قوموں کے نزدیک دینی مراسم کے ساتھ شریک تھا بلکہ بعض کے مذہبی فرائض اور عبادت میں داخل تھا، ان اقوام کے نظام زندگی پر غور کرنے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رقص ان کے ہاں جنگی مظاہروں میں داخل تھا، اور بحالت جنگ میں جذبات حماست کو برانگیختہ کرنے کے لئے اسی طرح کیا جاتا تھا جس طرح معابد و ہیاکل میں جذبات عبودیت کے اظہار کیلئے مستعمل تھا۔ جاہلیت کے شہسواروں کے جو قصے، منقول ہیں، اور ان کے اشعار جو لڑائیوں کے وقت گائے جاتے تھے، اس حقیقت کی پوری پوری تائید کرتے ہیں۔

عرب ایام جاہلیت اور عہد اسلام میں نغمات اشعار پر رقص کرتے تھے، اور سب سے پہلا لحن جو خاص طور پر اسکے لئے بنایا گیا تھا "ثقیل خفیف تھا" مرد اور عورت دف اور مزامیر کے ساتھ چلتے تھے، اور نغمات شعری سے پُرنشاط ہو کر ابن خلدون کی رائے کے مطابق رقص کرنے لگتے تھے[3]، اسکے بعد رقص کی مناسبت سے خاص قسم کے لحن اور بحروں کا اضافہ ہوا جن میں ہزج، رمل، اور خفیف الرمل داخل ہیں غرض رقص عربوں کے ہاں ایام جاہلیت اور اسلام دونوں میں پایا جاتا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ اسلامی دور میں جو رقص ہوتا تھا وہ باقتضائے

۱ے اغانی جلد ۱ صفحہ ۲۰۳ مطبوعہ بولاق ۱۲۸۵ھ بیضاوی جلد ۱ صفحہ ۲۳۹ مطبوعہ قسطنطنیہ ۱۳۰۳ء ۔ ۲ے تفسیر فخر الدین رازی جلد ۴ صفحہ ۲۰۹ مطبوعہ مطبعہ خیریہ ۱۳۰۸ھ ۳ے دائرۃ المعارف مادہ رقص

ترقی و تمدن زیادہ بہتر اور ترقی یافتہ تھا۔

رقص اور مذہب اس سے پہلے کہ ہم عہد اسلام کے رقص پر تاریخی روشنی ڈالیں یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ کے متعلق مذہبی نقطۂ نظر سے بحث کیجائے۔ اور دیکھا جائے کہ اسلام کا مذہب اسکے متعلق کیا حکم دیتا ہے۔

جب ہم اسلامی احکام پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو کوئی ایسا حکم نہیں ملتا جو رقص کی حرمت پر دلالت کرے سوائے اس صورت کے جب کہ رقص معیوب خلاف ادب اور نفسی خواہشوں کو برانگیختہ کرنے والا ہو۔ ابن حجر اور ان کے علاوہ دوسرے جلیل القدر مسلمان علماء نے تصریح کی ہے، کہ رقص اس صورت میں حرام ہے جبکہ اس میں لچک اور ٹھسک پائی جائے۔ اس لئے کہ لچک اور ٹھسک اس فعل کو نفسانی خواہش سے ملا دیتی ہیں لیکن مطلق رقص حرام نہیں ہے، کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ حبشیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں آنحضرت کے سامنے رقص کیا ہے اور آنحضرت نے بڑی دیر تک کھڑے ہو کر اس رقص کو دیکھا، اور حضرت نے عائشہ رض کو دکھایا۔

علما اور فقہا کے اقوال بالاتفاق اس حکم کو ثابت کرتے ہیں۔ امام نووی منہاج میں لکھتے ہیں کہ رقص مباح ہے بشرطیکہ اس میں لچک اور ٹھسک نہ ہو، امام الحرمین کہتے ہیں کہ رقص حرام نہیں، کیونکہ وہ چند سیدھی اور ٹیڑھی حرکتوں سے عبارت ہے البتہ اس کی کثرت شان کے منافی ہے، اسی طرح صاحب العمدہ نے جو شوافع میں سے ہیں، کہا ہے کہ اصل رقص مباح ہے العماد سہروردی، رافعی اور حلبی نے اپنی کتاب منہاج میں رقص کو مباح لکھا ہے بشرطیکہ اس میں ٹھسک نہ ہو لیکن شیخ الاسلام عزالدین عبدالسلام نے تو رقص کو علی الاطلاق جائز قرار دیا ہے، اور وہ خود بھی رقص کرتے تھے۔ اسی طرح امام سیوطی سراج الدین عینی، عبدالوہاب شعرانی وغیرہ علماء نے لکھا ہے، اور امام غزالی رح نے اسکے جواز پر یقین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رقص سرور و نشاط کی تحریک کا سبب ہے اور ہر سرور مباح ہے لہذا اسکی تحریک بھی جائز ہے۔ اور اگر وہ حرام ہوتا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حبشیوں کا رقص نہ دیکھتیں،

صحابہ کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے، کہ جب وہ مسرور ہوئے ہیں تو انھوں نے رقص کیا ہے جسکا سبب انکی مسرت تھی، اور حضرت حمزہ کی بیٹی کے قصہ میں[۱] وارد ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رض سے پوچھا کہ کیا تم حبش کے رقص کو دیکھنا چاہتی ہو۔ اور بخاری شریف میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ عید کا دن تھا اور اہل سوڈان ڈھال اور چھوٹے نیزوں کے ساتھ رقص کرتے تھے تو آنحضرت نے مجھ سے فرمایا کیا تم انہیں دیکھنا چاہتی ہو۔ میں نے کہا ہاں چاہتی ہوں۔ آپ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کیا میرا رخسار آپکے رخسار پر تھا، اور آپ نے فرمایا کہ شروع کر دو اے بنی ارفدہ" یہانتک کہ جب میں تھک گئی، تو آپ نے فرمایا، کیوں بس، میں نے کہا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا اچھا اب جاؤ[۲]۔

امام غزالی کہتے ہیں کہ یہ تمام احادیث صحیحین میں وارد ہیں، اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ غنا اور رقص حرام نہیں ہیں۔ پہلے لہو کی اباحت ہے، دوسرے اس فعل کا مسجد میں کیا جانا، تیسرے آنحضرت کا فرمانا کہ شروع کر دو اے بنی ارفدہ اور یہ تکمیل کا حکم دینا، اور اسکی خواہش کرنا ہے، چوتھے

---

[۱] اس قصہ کی تفصیل بخاری اور احیاء العلوم جلد ۲ صفحہ ۲۵۰ میں دیکھو۔ [۲] بخاری باب العیدین

دیر تک عورتیں رقص دیکھنا اور سننا پایا جاتا ہے۔ آنحضرت کا ابتدا میں حضرت عائشہؓ سے یہ فرمانا کہ کیا تم دیکھنے کی خواہش رکھتی ہو۔ اور یہ کوئی اضطراری فعل نہ تھا، یہ تمام قیاسات اور نصوص رقص و غنا و قتال وغیرہ کی اباحت اور جواز پر دلالت کرتے ہیں۔

لہٰذا ہر ملک کے مسلمان علما نے باوجود اختلاف مذہب و حالات جملہ اقسام رقص کے متعلق یہی کہا ہے، اور اسی خیال کی اکثر فقہا تائید کرتے ہیں جو غنا کے جواز کے قائل ہیں۔ اور یہی حضرات صوفیا کا مذہب ہے لیکن فن رقص تشدد پسند اور بے جا سختی پیدا کرنے والے فقہا کے حملوں سے محفوظ نہیں رہا، یہ فقہا ہر ایسے شخص کو ساقط العدالت سمجھتے تھے، جو غنا سے اشتغال رکھتا ہو۔ اور جو شخص تصویر بناتا یا کوئی مجسمہ تیار کرتا وہ ان کی نظروں میں مشتبہ سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا اس مخالفت سے اس فن کو بھی وہی نقصان پہونچا جو دوسرے فنون جمیلہ کو پہونچا ہے،

ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان علما نے رقص کے جواز پر سنت اور قیاس سے دلائل پیش کئے ہیں سنت تو وہی حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے جو صحیحین میں مسجد کے اندر رقص حبش کے متعلق وارد ہے اور قیاس۔ کہ فرع اپنی اصل کے ساتھ علت حکم میں مساوی ہونا چاہیئے، لہٰذا یہاں بھی اصل فعل اہل حبش۔ اور حضرت علی اور ان کے شریک صحابہ پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اسلام نے رقص کو حرام قرار نہیں دیا جب تک کہ اس میں شک اور لچک کی حرکتیں نہ پائی جائیں جو شہوات بہیمی کو برانگیختہ کرتی ہوں۔ اور یہ اس ترقی یافتہ شریعت کا حکم ہے جو اخلاق کی پاکیزگی اور عفت کی حمایت کرتی ہے، اور یہی حمایت اقوام کے ناموس اور ادب کی حمایت کے لئے مطلوب ہے،

مسئلہ رقص کے متعلق جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے یہ ایک منصف مزاج طالب حق اور ایک کج رو متعصب دونوں کیلئے کافی ہے، اور ہم اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ آگے یہ ثابت کرینگے کہ مسلمانوں نے رقص کے بارہ میں صرف اسی حد تک اظہار خیال نہیں کیا ہے بلکہ علمی حیثیت سے اس میں بحث کر لیا ہے۔

رقص کی تاریخ اسلامی تمدن میں

مسلمانوں نے رقص کا شمار منجملہ علوم و فنون کیا ہے اور جسکو ہم ایک ذلیل چیز خیال کرتے ہیں۔ اُسے ہمارے عرب اسلاف ایک بڑا فن سمجھتے تھے اُنھوں نے اسکو اظہار عواطف اور وجدانیات کا ذریعہ، اور شاعری اور کمال کا سبب قرار دیا تھا۔ انھوں نے رقص کو صرف کھیل اور دل بہلانے کی چیز تصور نہیں کیا، بلکہ اسکے متعلق لکھا ہے:—

”رقص ایک علم ہے جو حرکات موزون کی کیفیت سے بحث کرتا ہے اس حیثیت سے کہ وہ حرکات دیکھنے والے کی طبیعت میں نشاط و سرور پیدا کریں“ عربوں نے اس فن کے اقسام اور احکام کے متعلق متعدد کتابیں لکھی ہیں[1]۔

عربوں کی اقسام رقص

جو ممالک اسلامی حکومتوں کے زیر نگین تھے، ان کے مختلف حصوں میں مختلف قسم کے رقص پائے جاتے تھے، اہل خراسان، فارس، مصر، مغرب، اور اندلس سب کا طرز رقص ایک دوسرے سے مختلف تھا، بلکہ ایک حکومت میں جو رقص تھا وہ دوسری حکومت کے رقص سے اختلاف رکھتا تھا۔ دولت اموی اور عباسی میں جو رقص کی قسمیں اور اس کی شکلیں تھیں وہ حکومتہائے اندلس، مغرب، فارس اور ترکوں سے علیحدہ تھیں، اسی طرح فاطمیین اور ممالیک کے عہد حکومت کے رقصوں میں اختلاف تھا۔ اسی طرح عورتوں، اور مردوں کا رقص ایک دوسرے سے علیحدہ صورت رکھتا تھا۔ ہم ان تمام حکومتوں کے اقسام رقص کو چھوڑ کر صرف سلطنت عباسیہ کے رقص کو لیتے ہیں جس نے ایک طویل عرصہ تک حکومت کی ہے، اور اسکا تمدن بھی لحاظ اپنے اثرات اور وسعت کے بہت شاندار

ہم ذیل میں ان تمام انواع رقص کا ذکر کرتے ہیں جو عباسیوں کے دور حکومت میں عروج پر پہنچی تھیں۔

اس عہد میں اقسام رقص آٹھ تھے۔ خفیف، ہزج، رمل، خفیف الرمل، ثقیل الثانی، خفیف الثانی، خفیف الثقیل الاول اور ثقیل الاول لیکن افسوس ہے کہ اب ان اقسام رقص کا صرف نام باقی رہ گیا ہے۔ اور ان کی تفصیلات زمانۂ ماضی کی تاریکیوں میں پوشیدہ ہو گئیں[1]

رقص کے قواعد اور شرائط | عربوں نے فن رقص میں چند شرطیں مقرر کی تھیں جن کی پابندی ضروری تھی مثلاً خفت روح، حرکات رقص کو بہترین طریقہ پر ادا کرنا، رقص کی مختلف حرکات میں حرکت کی لطافت اور حرکات کا تناسب برقرار رکھنا ۔۔۔ کمر کی باریکی جسم کی خوبصورتی۔ دامن کا طول ہونا۔ پیروں کی لچک۔ انگلیوں کی نرمی۔ دل کا رجحان موسیقی کے قریب ہونا۔ جو زمین پر بحالت رقص میں سرعت انتقال، خوش خرامی، کمر کی لچک، نظام نفس کی درستی، دیر تک مسلسل رقص میں مشغول رہنے کی طاقت، انواع رقص میں ایک قسم میں تصرف کرنا، اور ہر ایک جزئی حرکت کے احکام و قواعد کا لحاظ رکھنا، رقص میں مجموعی بات کی لطافت، قدموں کا اپنے مدار پر قائم رہنا، دائیں و بائیں پیر کے عمل کا ایک ہی طریقہ پر برابر ہونا، وغیرہ وغیرہ

عربوں کے رقص میں قدموں کے اٹھانے اور رکھنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہر قدم کا اوپر نیچے جانا، آہنگ موسیقی کے ساتھ ساتھ اور دوسری صورت یہ ہے کہ تال کے ساتھ قدم زمین پر پڑے اور خالی پر قدم اٹھے یا بالکل اس کے برعکس۔

علامہ ابن خلدون نے جس تناسب اور رعایت کا لحاظ کیا ہے تناسب رقص کی بنیاد ہوتا ہے اور اکثر لوگوں میں فطری طور پر پایا جاتا ہے، ان کو اس کے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

رقاص جماعت کے آداب | جس طرح ایک رقاص کو رقص کے خاص قواعد در قوانین ہیں اسی طرح ایک رقص کرنے والی جماعت کو بعض اصول کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ اور نہایت سختی سے ان قواعد کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ آج کل اہل یورپ کی مجالس رقص میں اس قسم کے آداب کی رعایت ضروری خیال کی جاتی ہے۔ ان شرائط میں اہم ترین شرط یہ ہے کہ رقاص جماعت میں بدنظمی اور بے ترتیبی پیدا نہ ہو۔ اور ان کی حرکات میں رقص کی نوعیت تبدیل نہ ہو جائے۔ اور رقاص جماعت میں وہ شخص داخل نہیں ہو سکتا جو مقابلہ دوسرے رقاصین کے مہارت کم رکھتا ہو یا اس میں سرعت انتقال کا وصف نہ پایا جائے یا دیکھنے والے اس میں تصنع محسوس کریں۔ ان قواعد کی رعایت رقص صوفیہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ علامہ نویری لکھتے ہیں کہ آداب رقص میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ رقص کرنے والی جماعت کے ساتھ مجلس رقص میں ایسا شخص شامل نہ ہو جس کے رقص میں ثقل پایا جائے۔ اور اس کی وجہ سے رقص کے نظام میں بے ترتیبی پیدا ہو جائے کہ وہ رقص میں تکلف پایا جائے مباح ہے اور جو شخص سچائی سے رقص کیلئے کھڑا ہو یعنی اس کی بندش رقص سچا ہو تو وہ حاضرین پر بھاری نہیں ہوتا بشرطیکہ ان کے قلوب صداقت آمیز تکلف کا صحیح معیار ہو[2]

مشہور رقاص | تاریخ اسلام میں بہت سے مشہور رقاصوں کے نام محفوظ ہیں دولت عباسیہ کے زمانۂ عروج میں کنیش اور عبدالسلام فن رقص میں بڑے کامل ماہر تھے صاحب اغانی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ یہ دونوں نہایت باکمال رقاص تھے لیکن اسحاق موصلی جو عربی موسیقی

---

[1] مسعودی جلد ۲ صفحہ ۲۲۵ [2] احیاء العلوم ج ۲ صفحہ ۲۵۱ ـ نہایۃ الارب نویری جلد ۴ صفحہ ۲۰۸

میں زبردست ماہر گزرا ہے رقص میں بھی دونوں پر سبقت لے گیا ہے، ابو الفرج اصفہانی اسحاق موصلی کے اس رقص کا تذکرہ کرتے ہوئے جو واثق باللہ کے سامنے اُسنے کیا تھا لکھتا ہے۔ "اسحاق کھڑا ہوا اور نہایت طرب انگیز رقص کیا۔ اسکا رقص کیشش اور عبد السلام سے بھی بہتر تھا حالانکہ یہ دونوں نہایت اچھا رقص کرنے والے شمار کئے جاتے ہیں، امیر واثق باللہ نے کہا "اسحاق سے زیادہ کوئی اس فن میں کمال نہیں رکھتا [۵۱]

مصر و اندلس میں تمدن اسلامی کے عہد عروج میں فن رقص میں بہت سے لوگوں نے کمال پیدا کیا تھا اس دور کے مشہور رقاص جنہوں نے تمام اسلامی ممالک میں شہرت حاصل کی تھی وہ بادشاہوں کے حضور میں رقص کرتے تھے حیدر بن احمد بن ابراہیم ابو الحسن اور اسکا بھائی ابراہیم تھا۔ یہ دونوں ملک اشرف شاہ مصر کے دربار میں حاضر ہوئے اور رقص اور موسیقی کا کمال دکھایا۔ ابن حجر نے "در رکامنہ" میں انکا تذکرہ کیا ہے [۵۲] ان کے علاوہ مشہور رقص کرنے والوں میں جعفر رقاص بھی تھا جسکا تذکرہ آئندہ ہوگا۔

حالت رقص میں پیروں کی حرکت کو متعصب شیبی نے ایک رقاص کی تعریف میں کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

عجبت من حلیں تتبا ہ - لیو ہا عوز د تملوا نہ - کان فیین یلسعانہ [۵۳] - یعنی میں اسکے دونوں پاؤں دیکھکر بہت متعجب ہوا جو اسکے بالکل قابو میں ہیں۔ کبھی وہ ان دونوں کو اٹھاتا ہے اور کبھی وہ دونوں اسے اٹھاتے ہیں۔ گویا کہ دو سانپ (اپنے در پے) اسکو کاٹ رہے ہیں۔

ایک خوبصورت رقاص کے وصف میں ابن خروف اندلسی کا قول بھی خوب ہے جس سے رقص کے متعلق اندلسی ذوق کا پتہ چلتا ہے

ملاحظہ ہو:-

ومنوع الحرکات یلعب بالنھی	اپنے حرکات رقص میں تنوع پیدا کرکے دلوں کے ساتھ کھیلتا ہے
لبس المحاسن عند خلع لباسہ	جو لباس سے عریاں ہوکر سراپا حسن نظر آتا ہے
متأوّداً کالغصن وسط ریاضہ	وہ لچکتا ہے مثل اس شاخ کے جو باغ کے درمیان ہو،
متلاعباً کالظبی عند کناسہ	اور اس طرح کھیلتا ہے جسطرح ہرن اپنے مستقر کے پاس کھیلتا ہو،
بالعقل یلعب مقبلاً او مدبراً	وہ پیٹھ پھیر کر اور مقابل ہوکر لوگوں کی عقلوں سے اسطرح کھیلتا ہے
کالدھر یلعب کیف شاء بناسہ	جسطرح کہ زمانہ لوگوں سے جیسا وہ چاہے کھیلتا ہے، وہ
ویضم للقدمین منہ راسہ	اپنے دونوں پاؤں سے اپنے سر کو ملا دیتا ہے،
کالسیف ضمّ ذبابہ لریاسہ [۵۴]	جسطرح تلوار دستے اور نوک سے دُہری ہوکر مل جاتی ہے

اور دوسری رقاص ایک رقاص کے متعلق کہتا ہے

اذا تحرکت انامل لرقص	جب اُسکی انگلیاں رقص کیلئے حرکت کرتی ہیں،
تری حب القلوب الیہ تنزوی	تو قلوب کی محبت اُسکی طرف کھنچی چلی جاتی ہے،
حبیبی انت احسن من تثنی	اے میرے دوست تو اُن سب میں زیادہ حسین ہے جو لچک کے ساتھ

---

[۵۱] اغانی جلد ۵ صفحہ ۹۲ [۵۲] تذکرہ منہ ابن حجر علمی جلد ۲ حرف ح [۵۳] محاضرات الراغب اصفہانی جلد ۱ صفحہ ۲۴۴ [۵۴] نفح الطیب جلد ۲ صفحہ ۱۳۸

علیٰ وتر دامسن بن تلوی لے ——— نغمہ ساز پر متحرک ہوتے ہیں، اور ان سب سے خوبصورت جو رقص کیلئے حرکت کرتی ہیں

رقص کرنے والی عورتوں کا شمار ہندوان سے بہت زیادہ ہے۔ ایوبیوں کے زمانۂ تمدن میں جو رقص کرنے والی کمال پیدا کرتی تھی اسکی شہرت تمام ملکوں میں ہوجایا کرتی تھی۔ یہ نازنین خوبصورت عورتیں جو بہلانے بہلانے کے رقص کیلئے مخصوص ہوتی تھیں اور اُن میں وہ تمام شرطیں پائی جاتی تھیں جو رقص میں کمال حاصل کرنے کیلئے ضروری تھیں، اُنہیں یہ فن خاص طریقہ سے سکھایا جاتا تھا۔ ایسی لونڈیاں خاص طور پر تلاش کیجاتی تھیں جن کی کمر باریک، اعضاء متناسب اور پیر نازک، انگلیاں اور جوڑ نرم ہوں اور یہی وہ شرطیں تھیں جو عربوں کے نزدیک رقاص میں ضروری خیال کیجاتی تھیں۔ ایسی جامع الشروط لڑکیوں کو فن رقص کے ساتھ موسیقی کی بھی تعلیم دیجاتی تھی تاکہ ان کے حسن و جمال اور محاسن رقص اور نغمات موسیقی سے ذوق سماعت و بصارت، دونوں لطف اندوز ہوں اور حیات کی مسرت دل کو پہنچے۔ خلفاء، شاہان اسلام، امراء نے مجالس رقص میں شرکت کی ہے اور مشہور صاحب فن لوگوں کا رقص دیکھا ہے۔

بغداد کے آلات رقص

دولت عباسیہ نے فنون لطیفہ کی ترقی میں اس فن سے بھی ... بیجاتی تھی کہ بغداد اور عراق کے دوسرے شہروں میں رقص کیلئے خاص قسم کے آلات ایجاد ہوئے تھے۔ ابن خلدون ابن حمدون اور دوسرے اہل بغداد و عراق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ رقص کیلئے خاص قسم کا لباس اور آلات بنائے گئے تھے اور وہ اشعار بھی خاص اوزان کے ہوتے تھے جن کے ترنم پر رقص کیا جاتا تھا۔ وہ آلات رقص میں سے لکڑی کے بنے ہوئے گھوڑے ہوتے تھے جن پر زین کسا ہوا ہوتا تھا اور جیب سے متعلق کر دیئے جاتے تھے۔ عورتیں اثنائے رقص میں مختلف حرکات کرتی ہوئی ایک دوسرے کی طرف دوڑتی پیچھے ہٹتی اور گھوڑوں پر کود کر سوار ہوجاتی تھیں۔ اسکا بغداد اور عراق کے تمام شہروں میں رواج تھا اور یہاں سے اور ممالک میں بھی پھیل گیا ہے[1]

اندلس کے آلاتِ رقص اور ناچنے والیاں

ابن خلدون کی تاریخ پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ عربی شاعری میں رقص کیلئے مخصوص اوزان تھے جو رقص کے وقت گائے جاتے تھے۔ اندلسیوں کے زمانہ میں جبکہ رقص کو بڑی ترقی ہوئی تھی اشعار رقص ایک مستقل حیثیت رکھتے تھے اسی طرح لباس اور بعض آلات بھی ناچنے کیلئے مخصوص تھے۔ آلات رقص میں کوکج کہتے ہیں اور فرانسیسی میں (Carrousal chevaux de bois) کہلاتے ہیں۔ بغداد کی عورتوں کی ایجاد تھے۔ یہ چیز عراق سے براہ مصر اندلس تک پہونچیں۔ شقندی اپنے رسالہ تفضیل الاندلس علیٰ برالعدوہ میں لکھتا ہے اہل اندلس کو فن سے خاص دلچسپی تھی بلکہ لوازم رقص و ہرج کا تماشہ کیا گیا ہے۔ اس نے اشبیلیہ میں آلات رقص و سرود میں خیال، کرج، دبدبہ، موشح، شبابہ، زلامی، نفقرہ، رفنار، عود، قانون، رباب وغیرہ دیکھا ہے[2]

اگرچہ یہ آلات اندلس کے دوسرے شہروں میں بھی پائے جاتے تھے مگر اشبیلیہ میں انکی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ابن رشد کہتا ہے کہ جب کسی عالم کی وفات ہوتی تھی اور اُسکی کتابیں بیچی جاتی تھیں تو انہیں قرطبہ بھیجا جاتا تھا اور اگر کوئی مطرب مرتا تھا تو اُس کے آلات طرب اشبیلیہ

[1] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۵۴ طبع مصر [2] مقتبس جلد ۱ صفحہ ۳۴۳ و ۳۰۴ نفح الطیب جلد ۲ صفحہ ۱۴۳ و ۱۴۴ مطبوعہ یورپ ۱۸۵۵ء

میں فروخت ہوتے تھے ۔ ابن رشد کے اس بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بمقابلہ دوسرے شہروں کے اشبیلیہ میں فنون جمیلہ کا زیادہ رواج تھا۔

اسکے بعد شقندی نے اندلس کے دوسرے شہروں کا حال لکھتے ہوئے شہر ابدہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہاں کی رقاصہ عورتیں اپنے فن کے لحاظ سے مشہور تھیں اور تلوار سے کھیلنے میں بھی خاص مہارت رکھتی تھیں۔

خیال، رقص و طرب کا ایک مشہور آلہ ہے۔ اسکا تذکرہ شقندی نے کیا ہے۔ اسکو خیال الظل، خیال رقص اور خیال جعفر الرقص بھی کہتے ہیں۔ جعفر اس کے موجد کا نام تھا۔ خفاجی نے شفاء العلیل میں لکھا ہے کہ "جعفر" خیال کے موجد کا نام ہے جیسے کہ ابن عبد الزاہد کہتا ہے

ایا کم ان تنکروا جعفراً	خبردار جعفر اور اسکے ساتھیوں کے کمال کا ہرگز انکار نہ کرو
ذالک الخیالی واصحابہ	وہ جعفر جو خیالی یعنی موجد "خیال" ہے
فنیل مصر کم لہ جعفر اً	مصر کا دریائے نیل بھی کئی جعفروں کا مالک ہے۔
مختلف یخرج فی بابہ [1]	جو مختلف ہیں اور اپنے آلہ "بابہ" کو لیکر نکلتے ہیں۔

صرف اندلس کی رقاصہ عورتیں خیال، رقص کو استعمال نہیں کرتی تھیں جیسا کہ شقندی نے ذکر کیا ہے بلکہ یہ کھیل مصر و عراق وغیرہ کی مشرقی ممالک میں بھی پایا جاتا تھا۔ چنانچہ وجیہہ منانی کے اشعار جو اس نے خیال سے کھیلنے والی ایک لڑکی کے متعلق لکھے ہیں اس بات پر دلالت کرتے ہیں اشعار یہ ہیں۔

وجاریۃ مشوقۃ اللھو اقبلت	اور بہت سی لڑکیاں جنکا کھیل دلنشین ہے اس طرح سامنے آتی ہیں۔
بحسن کزھر الروض تحت کمام	حسن کے ساتھ جس طرح پھول شگوفوں کے نیچے،
اذا تغنت قلت شکوی صبابۃ	اگر وہ نغمہ ریز ہو تو میں کہونگا اس کا نغمہ شکوۂ محبت ہے
وان رقصت قلنا حباب مدام	اور اگر رقص کرے تو ہم کہینگے کہ وہ اپنی لطافت میں شراب کا حباب ہے
ارتنا خیال الظل والستر دونہا	اسنے خیال الظل ہم کو دکھایا اور وہ پردہ کے پیچھے تھی،
فابدت خیال الشمس خلف غمام	تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا ہم آفتاب کو ابر کے پیچھے دیکھ رہے ہیں۔
تلعب اشخاصاً لھا خلف سترھا	"اپنے خاص لوگوں سے پس پردہ کھیل رہی ہے۔
کما لعبت افعالھا بانام [2]	جس طرح اپنے افعال سے ایک مخلوق کے ساتھ کھیلتی ہے۔

"ذکر" ایک خاص قسم کا رقص تھا جس میں شہر ابدہ کی عورتوں نے مہارت حاصل کی تھی اور سوزنت تک بصرہ میں لڑکیاں یہ کھیل کھیلتی ہیں اسی طرح "اخراج القرعی" "مرابط" "قنوخہ" بھی خاص کھیل تھے جن میں جسم کی سبکی اور مشق اور مہارت کی ضرورت تھی۔ شقندی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اندلس کی عورتیں مردوں کی طرح تلواروں کے ساتھ رقص کرتی تھیں، کاٹھ کے گھوڑے پر سواری کرنا ایک دوسرے پر حملہ کرنا بگھنا

---

[1] شفاء العلیل صفحہ ۴۴ مطبوعہ مصر [2] مطالع البدور فی منازل السرور جلد ا صفحہ ۲۶۱

توافق بالرقص اقدامہن — حالت رقص میں ان کے قدم اسقدر ہم آہنگ ہوتے ہیں
یطلان بہن نغمات المذنوب کہ ان سے نغمہ کا ہر مصرعہ پیدا ہو جاتا ہے
یشرن الی کل عضو بما وہ اپنے ہر عضو کی طرف اشارہ کرتی ہے،
یحل بہ فی الھوی من کروب اور بتاتی ہے کہ اس میں تمام محبت جاگزیں ہیں۔
یسطنا لہا وھی شکل الغصون ہم اسکے لئے فرش ہو گئے۔ اور وہ تروتازہ شاخ کی مانند ہے
تمیس بہن الصبا والجنوب جیسے کہ باد صبا اور جنوبی ہوا اٹکھیلیاں کرتی ہو۔
علی الارض منا خدود الوجوہ زمین پر اسکے لئے ہمارے رخسار فرش ہیں۔
وبین الضلوع خدود القلوب[1] اور پہلو میں دل کے رخسار فرش ہو چکے ہیں۔

اور رقاص عورتوں کی درازدامنی کا وصف اسطرح کرتا ہے۔

ومن راقصات ساحبات ذیولہا اور بعض رقص کرنے والیاں
شواذ مسک فی العبیر تضمخ — اپنے مشک اور عنبر سے رنگین دامنوں کو لٹکائے ہوئے ہیں۔
کما جررت اذیالہانی ہدیلہا — جب وہ رقص میں دامن کشاں ہوتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتی ہیں
حمایم ایک او طواویس تبذخ[2] جیسے جنگل کی مست کبوتریاں یا اترانے والے طاؤس

اقسام مذکورہ کے علاوہ اہل اندلس میں اور مختلف انواع رقص کا رواج تھا چنانچہ جماعت شغاثیہ (Zambra) کا خاص رقص مشہور تھا۔ اور ان سے اس رقص کو اہل یورپ نے سیکھا چنانچہ وہ خود اسکا اعتراف کرتے ہیں انہوں نے متعدد اقسام کے رقص سیکھے ہیں۔ اور اب بھی اسپین والوں کے رقص میں عربی آثار پائے جاتے ہیں۔ (باقی)

---

[1] دیوان ابن حمدیس صفحہ ۱۱۱ و صفحہ ۹۳ مطبوعہ ۱۸۹۷ء [2] دیوان ابن حمدیس صفحہ ۱۱۱ و صفحہ ۹۳ مطبوعہ ۱۸۹۷ء

غزل

زندگی صورت خوابیست که خوابیست عجیب　　درمیانِ من و اُو شکل جدا بیست عجیب
اوکه غافل ز من و منکه پریشان ز در او　　دفتر ناز و وفا را چه حسابیست عجیب
دل بر صدمهٔ جانکاه بجا می باشد　　بین که وین موج ہوا را چه حجابیست عجیب
دیده جز عارضِ تابنده قرارے نه کند　　حسن شرمنده که این ننگ نقابیست عجیب
ہوشش رفته ز زنا بود بجامی آمدیم　　زاہدا! آنچه که خوردیم شرابیست عجیب
ایکه دلتنگ نشینی به درِ صد کارے　　جانب میکده برخیز که بابیست عجیب
بوس یکسخنے بود نگہ جنبیدی　　آن سوالِ عجب و این چه جوابیست عجیب
تابِ مردن که بعجز دارد و مرد نتوان　　دل که در سینهٔ ما هست عذابیست عجیب

کیفیا جان بلبی آخر کارش دادی
دردِ عشق فنا شو که ثوابیست عجیب　　(کیفی چریاکوٹی)

زندگی صرف اگر درپئے ہر سود نہ ہو　　وسعتیں اتنی ہوں پیدا کہ تو محدود نہ ہو
پھونک دے نقش و نگار ہوس عیش و نشاط　　یعنی عبرت کدۂ دہر میں محسود نہ ہو
ذرہ ذرہ بنے آئینۂ نیرنگ جمال　　شورش حسن باندازۂ محدود نہ ہو
توڑ دے توڑ دے سر رشتۂ امید و امل　　اس خرابات میں آوارہ پے سود نہ ہو
بے حقیقت ہے ضیا گستری حسن ایاز　　آئینہ دار اگر حیرت محمود نہ ہو
زندگی نام ہے اک جذب پرستاری کا　　وائے وہ بندہ کہ جس کا کوئی معبود نہ ہو

بے نیازانہ گذر عرصۂ ہستی سے سعید
ہمت پائے جنون خستۂ مقصود نہ ہو　　(سعید رزمی)

عالم کا مذہب

گو اہل نظر اور ارباب ہوش کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے، تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں شروع ہی میں اس
امر کی تصریح کر دوں کہ لفظ مذہب سے میری مراد " دین " نہیں بلکہ " مذہب و مسلک " ہے ذیل کی سطروں میں مجھے صرف اسی سے
بحث کرنا مقصود ہے کہ طالب علم یا اور وسیع الفاظ میں، ایک عالم شخص کا مذہب و مسلک کیا ہوتا ہے اور وہ کیونکر بنتا ہے
تاکہ قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں اس کو بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ لفظ " عالم " سے میرا مقصود محض اُن حضرات سے
نہیں ہے جن کو اس عمومی اور متداول لفظ عالم سے یاد کیا جاتا ہے، اور جن کو جمع کے صیغے " علماء " یا زیادہ تفصیل
کے ساتھ " علماء دین " یا اور بہترین صفت کے ساتھ " علماء دین متین " کہا جاتا ہے: بلکہ اس سے ہر وہ شخص مقصود ہے
جو کسی خاص شعبۂ علوم کا ماہر ہو (اور افسوس پھر وہی لفظ آتا ہے) عالم ہو — عام اس سے کہ وہ علم دینی ہو یا دنیوی۔
علیٰ ہذا القیاس اس لفظ کے مفہوم میں ہر مضمون اور علم کے مصنف اور مؤلف بھی شامل ہیں۔

یہ امر بیان کا محتاج نہیں ہے کہ خدائے خالق نے ہر انسان کو دل و دماغ دیا ہے، جن کو ہر شخص اپنی اپنی
عقل و بصیرت اور حواس ظاہری و باطنی کی استعداد کے مطابق استعمال کرتا ہے، اور اپنی موروثی اور کسبی علم اور تجربہ
اپنے ماحول کے کوائف اور حالات و واقعات سے دن رات مستفید ہوتا رہتا ہے اور اس گوناگوں تجربہ سے اپنے
نفس اور یہ دنیا و مافیہا کے متعلق رائیں قائم کرتا رہتا ہے: اور یہی وہ رائیں اور خیالات ہیں جن پر وہ اپنی زندگی کے لئے
ایک عمومی طرز عمل کی بنیاد قائم کرتا ہے، اور اپنے خیال کے مطابق وہ ایسی روش پر چل کر اپنی ماحول سے مطمئن رہتا اور
اپنے خیالات میں کامیاب ہوتا ہے۔ ان تجربوں اور تمام واقفیت ماحول وغیرہ کا خلاصہ ایک لفظ " علم " میں آجاتا ہے
اور علم جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، ایک موروثی اور ذاتی ہوتا ہے اور ایک وہ ہوتا ہے جو استاد کی مدد سے حاصل ہو
پھر اساتذہ کی ذات دو صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، شخصی اور کتابی پہلی صورت میں استاد کا فیض براہ راست
پہنچتا ہے اور دوسری صورت میں اس کے خیال اور رائے کا اظہار تحریر کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ تاہم دونوں صورتوں میں
استاد کا فیض براہ راست پہنچتا ہے اور دوسری میں اسکے خیال اور رائے کا اظہار تحریر کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔
تاہم دونوں صورتوں میں استاد استاد ہی رہتا ہے اور اس کی تعلیم اور تلقین کے فیض سے سننے یا پڑھنے والا بہرہ
یاب ہوتا ہے۔

ایک عام نگاہ سے دیکھا جائے تو ہر شخص کا مذہب و مسلک اس کے پیشہ سے بنتا ہے، خواہ وہ پیشہ کسی
نوع اور قسم کا ہو۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے، کیونکہ ہر شخص اپنے تمام علم اور تجربے کو اپنے پیشہ میں کام لیتا ہے، ——

اور اُس کی یہی کاربراری اُس کے خیالات اور اُس کی رائے کے قائم کرنے میں کام آتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر فرد بشر دنیا و مافیہا کی تمام اشیا کی ماہیت و اصلیت اور ہر نوع کے مسئلہ کا جواب حل کرنے اور پیش کرنے کے لئے اپنے پیشہ کے متعلقہ امور سے دلائل لاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یون کہنا چاہیئے کہ ہر شخص کائنات کے تمام قوانین کا (جس حد تک بھی وہ ان کو سمجھ سکتا ہے) خلاصہ کر کے اپنے پیشہ کے لئے ایک راہ پیدا کر لیتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ یہ راہ اُسے کبھی صحیح راستے سے بھٹکنے نہ دیگا۔ فی الحال ہم صرف علما اور مصنفین کی حالت پر غور کرنا چاہتے ہین۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے میں ان ہر دو شخصیتون کو صرف ایک لفظ "عالم" سے تعبیر کرونگا۔ یہہ تو ظاہر ہے کہ عالم اور ادبیات ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہین: اور حقیقی عالم وہی ہے جو ادبیات کو ادبیات سمجھے، نہ وہ کہ جو محض الفاظ کے پھیر مین رہے اور واہمات اور اموراتِ موہوم مین اپنے آپ کو گم کر دے۔

پروفیسر موٹے نے خوب لکھا ہے کہ "انسان اس خارجی ہستی مین بمنزلہ ایک قیدی کے ہے، اور ہر انسان کا مذہب فی الحقیقت وہ راز سربستہ یا وہ مستقل ذریعہ ہے جو اُسے اس قیدخانہ سے نجات دلوا دے۔ وہ یہہ چاہتا ہے کہ اُسے کوئی ایسی سبیل ہاتھ آجائے جس سے وہ اس قیدخانہ کی دیوارون کو توڑ کر باہر نکل جائے؛ اور تو وہ باہر نکل آنے پر ہی اپنے آپ کو دنیا مین پاتا ہے، مگر اب یہہ نئی دنیا اس قسم کی ہوتی ہے کہ اس مین بہت سے معشوق مل جاتے ہین اور وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ مین قیدخانہ سے نکل کر اب آزاد ہون" بعینہٖ یہی کیفیت اُس عالم کی ہے جو ایک عالمگیر صحیح اور مستقل مذہب نہین رکھتا۔ وہ ایسا ہے کہ گویا خاص اور خودساختہ "حال" مین مبتلا ہے۔ مگر وہ "حال" دوسرون کے لئے کافی ہے اُسے کائنات اور اُس کے امور تک دسترس حاصل نہین ہے، بلکہ وہ چیز جسے وہ اپنے خیال مین "دنیا" اور "حال" سمجھے ہوئے ہے حقیقت مین اس سے زیادہ نہین ہے کہ وہ الفاظ مین اور فقرون کی ساخت ونشست کے ایک جال مین محبوس ہے۔ ایک گورکھ دھندے مین پھنسا ہوا ہے اسے عالم نہین بلکہ دوکاندار کہنا چاہیئے اور دوکان دار بھی ایسا جسکا متاع صرف اُنھین چیزون مین محدود ہے اور ان کے علاوہ اُس سے اور کسی چیز کی توقع رکھنا بیکار ہے۔ لیکن عالم مین یہ دوکان داری کی شان کیون ہے؟ محض اس لئے کہ اُسکا کوئی خاص مذہب نہین ہے جو اُسے بیک وقت آزاد مگر اپنے خاص رنگ اور طرز کا مقید کر دے! اُس کی یہ گرفتاری ہزار آزادیون سے بڑھکر ہے وہی آزادی اور یہی ہمہ گیری وہ چیز ہے، جو اُسے ہر صحیح ذوق رکھنے والے کی نگاہ مین عزیز بنا دیتی ہے۔

پروفیسر آزاد مرحوم نے "سپاک دماک" مین ایک مقام پر "حال" اور "ماضی" اور "مستقبل" کی ماہیت کو خوب واضح کیا ہے۔ وہ اردو کے لفظ "ہے" کو پیش کر کے کہتے ہین کہ اس لفظ کے ادا کرنے کے وقت جب ہم "ہ" کی آواز پیدا کر چکتے ہین اور "ے" ابھی پیدا نہین ہوتی تو "ہ" ماضی مین اور "ے" مستقبل مین ہوتی ہے ان دونون حروف کے ادا کرنے کے وقفہ کے درمیان مین جو کچھ وقت ہے وہ حقیقی "حال" ہے۔ اب "حال" ——

کی اس بے مائیگی کو سامنے رکھ کر غور کیجئیگا تو معلوم ہوگا کہ ہر عالم کی اپنی تقریر اور تحریر مین صرف زمانہ ماضی سے تعلق ہوتا ہے: کیونکہ اس کی تقریر اور تحریر اُس کے علم اور تجربہ کا خلاصہ ہوتی ہے جو اُسے کائنات کے غائر مطالعہ کے بعد حاصل ہوتا ہے اور یہ امر قطعی اور یقینی ہے کہ تقریر یا تحریر کے وقت اس کا وہ تمام علم اور تجربہ ماضی کی چیز ہوجاتی ہے۔

یہی سبب ہے اس امر کا کہ ایک (صحیح معنی مین) عالم کے علم سے (تقریری ہو یا تحریری) فیض یابی کا ذوق رکھنے والے شاذ و نادر ہی ملتے ہین - ان شاذ ہستیوں سے قطع نظر کر کے دیکھئیے تو معلوم ہوگا کہ عموماً عالم ایک کس مپرسی کی ہستی رکھتا ہے، کیونکہ ہر وہ شخص، (اور تقریباً کوئی شخص اس حال سے خالی نہین) جو اپنے خیال مین ایک خاص اور معین خارجی حال مین زندگی بسر کرتا ہے، عالم کو، ماضی سے متعلق دیکھ کر، اسے بالکل ایک غیر ضروری چیز اور ذہن کے لئے محض ایک سامان عیش سمجھتا ہے — بعینہ جیسے کہ ایک غریب آدمی قورمہ پلاؤ کو صرف عید الضحیٰ کے لئے وقف سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ اس پر اسکی زندگی کا دار و مدار نہین ہے۔ اور اس خیال کی بنا یہ ہے کہ عالم کی ہستی کو ماضی سے وابستہ سمجھا جاتا ہے۔

لیکن مقام حسرت یہ ہے کہ ایسا سمجھنے والون کو یہ معلوم نہین ہوتا کہ ایک عالم ماضی کو ماضی صرف اس حیثیت سے سمجھتا ہے کہ اس کی نگاہ مین یہ بھی "وقت" یا "زمانہ" کی ایک شان ہے، اور یہ کہ اس کا مذہب اس ماضی کو بھی اس کے لئے حال (اور وہ بھی پست نظر لوگون کے حال سے بہتر حال) بنا دیتا ہے، کیونکہ وہ چیز جسے وہ عالم ماضی مین تلاش کرتا ہے، اور اپنی محنت شاقہ اور فضیلت سے پا بھی لیتا ہے، وہ اُسے ماضی یا حال کی صورت مین نہین بلکہ **دوام** کی شکل مین پا لیتا ہے۔ وہ **دوام** پر قابض ہو جاتا ہے، اس پر کامل یقین رکھتا ہے — اور اس یقین دوام کو ان لوگون تک پہنچا دیتا ہے جو اس سے فیضیاب ہون۔ وہ **زمان و مکان** کے اس ہر وقت کے بدلتے اور گزرنے والے اختلافات اور تضادات مین **دوام** کو ڈھونڈھ نکالتا ہے، اور اس **دوام** سے دوسرون کو بھی دوچار کر دیتا ہے۔ اس صورت مین ظاہر ہے کہ اگر ہم علوم و فنون کی ان تحریرون کو اپنی نگاہ اور یاد داشت مین محفوظ کر لینے کے عادی نہ ہوتے تو لامحالہ ہم یہ سمجھتے کہ **دوام** کی یہ حس اور تخیل **عالم** کی خود ساختہ چیز ہے، یا بہت سے بہت یہ کہ اُسے **دوام** کا احساس محض اتفاقیہ ہوتا ہے اور وہ نتیجہ ہے محض اُس کشمکش حیات کا جس مین وہ مبتلا ہے - مگر ہماری نگاہ اور یاد داشت مین ان امور کا محفوظ اور جمع کر دینا صرف عالم کا کام ہے: اُسی کا کام ہے کہ ہمکو بھی **دوام** سے آشنا کر دے اور ہمارے اعتقاد کو اُس مین راسخ اور مضبوط کر دے۔ مگر ایسا کرنے کے لئے اُسے اپنے پیشہ سے مدد لئے بغیر چارہ نہین ہوتا۔

مثال کے طور پر عربی یا سنسکرت کے کسی عالم کو لیجئے۔ یہ صرف عربی کے "عالم" کا کام ہے کہ وہ اس زبان کا مطالعہ کرنے کے بعد نہایت احتیاط سے عربی زبان کے پیش کردہ خیالات مین اُن تمام تفصیلی خیالات مین ایک تفریق اور تقسیم قائم کر دے جو آج کار آمد ہین اور وہ جو آج محض بے کار ہین — یہ الفاظ دیگر یہ اُسی کا منصب ہے کہ اس زبان

مردہ اور زندہ خیالات میں تمیز اور تفریق کرے — کیونکر خود زبان ہی سے نہیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اُس کے خیالات زندہ ہیں یا مردہ، دوسرے ایک خاص زمانہ کے لئے ہیں یا دوام کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ مردہ سنسکرت کا عالم اُسے زندہ سمجھکر مطالعہ کرتا ہے اور مطالعہ کے دوران میں اُس پر اس طرح راسخ ترقی کرتا ہے جس طرح کوئی اور شخص کسی موجودہ اور زندہ زبان کے مطالعہ میں کرتا ہے۔ سنسکرت اُسے ویسی ہی معلوم ہوتی ہے کہ گویا وہ زندہ ہے اور لوگ اُسے بے تکلف استعمال کر رہے ہیں۔ اور چونکہ وہ اپنی تمام کوشش اور جانفشانی صرف اِسی امر میں صرف کر دیتا ہے کہ اس مردہ زبان کا مطالعہ کر کے اس کا نگاہ حیات میں **زمان** کے اس زبردست انبار میں سے **دوام** کو کھو دنکالے، اس لئے اُسکی یہ تمام محنت اور عرق ریزی بالکل ہی معدوم ہوتی ہے اور کوئی شخص اِس پر حرف گیری نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہے۔ برعکس اس کے اگر پنڈت ۰۰ یا ۰۰ مولوی ۰۰ سنسکرت یا عربی کے مطالعہ کرنے کے بعد بدستور **ماضی** کے بھنور میں پھنسے رہیں اور ان کو کبھی یہ محسوس نہ ہو کہ انہیں (**دوام** تو ایک طرف) **حال** سے بھی کوئی علاقہ ہے، تو والله کہ ان کی یہ تمام دماغی محنت بیکار ہے: اُنھوں نے اپنی عزیز عمر کو تلف کر دیا!! کہیں اُن عوام سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے جن کے لئے حال بھی کبھی حقیقی حال کے معنی نہیں رکھتا!

اب اس مختصر بحث ہی کے بعد آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ جب تک ایک عالم کا کوئی خاص **مذہب** نہ ہو اُسکے متعلق یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں **تمیز** اور **تفریق** کا مادہ موجود ہے: کیونکہ ایسی صورت میں **ماضی** اُسکے لئے محض **ماضی** (بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اکثر اوقات ایک **ماضی**) ہوتا ہے، اور چونکہ وہ ہر چیز کو **ماضی** کے لباس میں ملبوس دیکھتا ہے اس لئے اس کے لئے ہر چیز اور ہر امر کی اہمیت بالکل مساوی ہے۔ اُس کی نگاہ اُن میں کوئی فرق نہیں سمجھتی۔ وہ اپنے خاص **زمانہ** کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور اپنے خیال میں اس سختی سے مقید ہے کہ وہ اپنے اُس خاص **زمان ومکان** کی خصوصیات سے باہر نکلنے کی ہمت بھی نہیں رکھتا! وہ اپنے خاص اور محدود خیالات اور احساسات کا اسی طرح معتقد (نہیں بلکہ پرستار) ہے جس طرح کوئی جاہل مطلق اپنے توہمات اور واہیات پر راسخ اعتقاد رکھتا ہے اور اُنپر خفیف سے خفیف حملہ کے لئے بھی ہر اہل ہوش سے جنگجوئی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ **ایسا عالم قدامت** سے اُسی طرح مرعوب ہوتا ہے جس طرح ہم میں سے اکثر **جدت** سے مرعوب اور مغلوب ہیں۔ وہ اپنے مطالعہ کی جانفشانی میں صرف ایسے خیالات کو انتخاب کر کے ان کی غلامی اختیار کر لیتا ہے جو اب بالکل مردہ ہیں۔ حالانکہ اُسی زبان میں اُسے ایسے ایسے خیالات بھی مل سکتے تھے جو اب بھی بعینہٖ اُسی طرح زندہ اور پر روح ہیں جس طرح وہ اب سے سیکڑوں اور ہزاروں برس پیشتر تھے — اور صرف یہی نہیں کہ آج زندہ ہیں بلکہ جریدۂ عالم میں **دوام** کے لئے **ثبت** ہو گئے ہیں، **ماضی و حال** سے آزاد ہیں، اور اپنے ہر شیدائی کو بآواز بلند پکار رہے ہیں کہ آؤ! ادھر آؤ! ہم یہاں ہیں! ہم غاروں میں نہیں چھپے ہیں، ہم تم کو **دوام** سے آشنا کر سکتے ہیں!! مگر ایسا عالم نہ کان رکھتا ہے نہ آنکھ اور اس لئے اُن تک نہیں پہنچ سکتا کسی قدیم (یا مردہ) زبان کے خیالات کا **ماضی و حال** سے اس طرح آزاد ہونا اور **دوام** سے اس طرح ہمکنار ہونا ہی وہ جوہر ہے جو اُن کو ایک صحیح عالم کی وساطت سے صحیح طالب تک پہنچاتا اور اُسے اُن کی اس کیفیت سے سرشار کر دیتا ہے۔ وہ خیالات ہمہ گیر ہیں، دوامی ہیں اور یہی اُن کا حسن ہے، یہی اُن کے قیام کا باعث ہے، یہی وہ چیز ہے جس کے لئے ایک صحیح پنڈت اور مولوی شبانہ روز کی جانفشانی سے سرگرم جستجو ہے!

اس میں شک نہیں کہ نفس کی بعض خواہشیں اور تمنائیں ایسی ہیں وہ جو تمام بنی نوع انسان میں مشترک ہیں، لیکن وہ خصوصی اور شخصی ہوتی ہیں نہ کہ عمومی اور ہمہ گیر۔ وہ ہم کو ہمارے ان خارجی **حال** سے آزاد نہیں کرتیں بلکہ اس میں اور بھی زیادہ جکڑ دیتی ہیں۔ ان کا اظہار ہمیشہ محض ایک ہنگامی، مختصر اور حالاتِ وقت کے مطابق محدود اظہار ہوتا ہے: آیندہ نسلوں کے لئے اس میں ایک تاریخی دلچسپی مضمر ہوتی ہے کیونکہ ان کو صرف واقعات سے تعلق ہوتا ہے۔ برعکس اس کے ایک دوامی چیز کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جذبات کی ترجمانی کرتی ہے، اور جذبات بھی وہ جن کو خود **دوام** عالم کے سینہ میں جوش زن اور اس کے قلم میں موج زن کر دیتا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ صرف دوامی چیز ہی میں یہ استعداد ہوتی ہے کہ وہ حالات و کوائف کے ان آفاق گیر تغیر و تبدل میں جذبات کو اس طرح جاری و ساری کر دے۔ پھر یہ ایک صحیح عالم کا دل و دماغ ہے کہ وہ اس **دوام** محض کو اپنے اندر جگہ دے، اور اسی کا کام ہے کہ وہ اس کو اپنے الفاظ یا قلم سے دوسروں کے دل و دماغ ... تک پہنچا کر ان کو بھی کیف سے سرشار کر دے۔ ایسے عالم کا مضمون زندہ ہوتا ہے، اس کی زبان ایک جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہے، اس کی شخصیت ایک حقیقت ہوتی ہے: کیونکہ وہ خود زندہ جاوید ہے، اس کا تجربہ آفاق گیر حقائق پر مبنی اور سرچشمہ سرمدی سے سیراب ہے یہی وجہ ہے کہ آپ علامہ **اقبال** کو بے ساختہ ترجمانِ حقیقت کہہ اٹھتے ہیں! یہی صفت ہے جس نے مولوی معنوی کو "**مولوی**" کا لقب دے کر حیاتِ ابدی کا جامہ پہنا دیا ہے! یہ دوامی کیفیت ہر قوم کی ادبیات میں پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کی دریافت کے لئے تمیز کا مادہ درکار ہے:

اور یہ ایک نہایت مشکل اور دقیق کام ہے کہ معمولی چیزوں سے جدا کر کے اس کو محسوس کیا جائے۔ پھر اقوام عالم کی تمام ادبیات میں سے ایسی تحریروں کے پا جانے کے بعد یہ محسوس اور معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں سے بعض ہی ہیں کہ ان کے اثر اور برکت سے دنیا متاثر ہوئی ہے اور انکی وجہ سے انسانیت میں اور ترقی ہوگئی ہے، اور بعض ایسی ہیں کہ جن کو ابھی تلاش کرنا باقی ہے، جو ابھی تک تاریک **ماضی** میں مدفون ہیں اور بقول حضرت اقبال کے

ع جو ابھی ابھرے نہیں ہیں خانۂ ایام سے

اور یہ کام صرف ایک **عالم** کا ہے! اور صحیح عالم وہی ہے جو ان کو معلوم کرلے اور ان کی عالمتاب ضو سے دنیا کو منور کر کے دنیا کے جاودانی علم میں بیش از بیش اضافہ کر دے! اسی کا کام ہے — اور یہی اس کا مذہب و مسلک ہے — کہ وہ اپنی تحریر سے فیضیاب ہونے والے کے دل و دماغ میں وہ وسعت پیدا کر دے کہ جس میں **دوام** سما جائے، اور اس کی شخصیت میں وہ قدرت اور طاقت پیدا کر دے کہ وہ اپنی ضمیر باطنی طاقت سے بنی نوع انسان کو واقعات اور نفوس کی حقیقت کا احساس کرا دے اور ان کو صحیح معنی میں اللہ کی اشرف مخلوقات بنا دے۔ اس کی تحریر کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ ... پڑھنے والا یہ محسوس کرے کہ وہ ایک طرف تو قدیم بزرگوں کے دربار میں کھڑا ہوا ان کے چھوڑے ہوئے خزانوں کے دیانت دارانہ استعمال کے متعلق جوابدہی کر رہا ہے اور دوسری طرف آئندہ نسلوں سے متوجہ ہے اور ان سے وعدہ کر رہا ہے کہ میں تم کو راستہ دکھا سکتا ہوں جس پر چل کر تم **دوام** تک پہنچ جاؤ گے — اس پر وہ حالت وہ کیفیت طاری ہو جائے کہ جس میں **ماضی**، **حال** اور **موت**، **حیات** سب مترادف ہو جاتے ہیں اور **سوادِ دوام** **فرد** اور **دوامِ قوم** کے دو اور کسی چیز کا نقش اس کی ہستی پر مرتسم نہیں پاتا: کیونکہ یہی کیفیت ہی مضطرب مگر پرسکون حالت وہ چیز ہو جو فرد کو فرد اور قوم کو قوم بناتی ہے۔ یہی وہ "دوِر زندہ تمنا ہے" جس کا **اقبال** دلِ مسلم کے لئے طلبگار ہے — کہ

یا سبحدل سوز کو وہ زندہ تمنا دے　　جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

اسی کا پیدا کرنا اور بڑھانا مولانا عالم کا اعلیٰ مقصد ہے۔ اس کے ہر ہر لفظ ہر ہر حرف میں یہ اضطراب، یہ بیقراری، یہ ناشکیبائی، یہ نا قناعت پسندی پنہاں ہوتی ہے۔ وہ باغ عالم میں قدم رکھتے ہی گل دوام کو تاک لیتا ہے، اور جہاں جہاں اُسے پاتا ہے چن چن کر اپنے دامن تمنا میں بھر لیتا ہے۔ اور اپنی محفل میں وا لینے کو ارزان نو ہر جانی حضرت ہستی کے سامنے پیش کرتا ہے اُن کا طرہ بنا کر اسکی دستار میں ٹانک دیتا ہے اور بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:-

تا جبین یک گل برستاریست بچم　　بنت بیپ بخواب سرشارست نم
تا زنانیت ملال ارستے بر دمد　　نغمہ ہای خفتہ سرزہ وین زند　　(اقبال)

محمد نعیم الرحمان (ام - اے)

غزل

چیدم گل نظارہ کہ ہرگز نچیدہ　　آئینہ دیدۂ ولے خود را ندیدۂ

بودم نگاہبان در چشم و گوش خویش　　دزدیدہ در حریم دل من رسیدۂ

جان و دلم فدائے تو جان و دل مرا　　از دست روزگار ستمگر خریدۂ

از فکر ننگ و نام برستم کہ ہمچنان　　رسوائے عام گشتم و تو ہم شنیدۂ

آوارگی این دل آوارہ من ست　　لے خار راہ یار چہ بیجا خلیدۂ

نازم بشان دلبری و بندہ پروری　　پیوستہ بدشمن واز من بریدۂ

سازِ طرب ز گردش گردون مجو میسر
کز چشم دہر قطرۂ اشک چکیدۂ

میر ولی اللہ (بی اے) ایبٹ آباد

فطرت سے جنگ

(مسلسل)

اجنبی نے مجھے اشارے سے پلنگ کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا۔ پھر اُس نے میری آنکھوں پر بھی ایک نیلی
عینک چڑھا دی اور بتایا کہ مجھے آدھے آدھے گھنٹے کے بعد دیوار کے آلوں سے کاغذ کی دھجیاں علیحدہ کرکے انہیں قرینے سے رکھنا ہوگا
اسکے بعد وہ کمرے کے باہر چلا گیا اور دس منٹ کے بعد واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک بکس لا رہا تھا جو تھا تو چھوٹا لیکن شاید وزنی
بہت تھا۔ احتیاط سے اُسے کھولکر اجنبی نے ایک نازک سی پچکاری نکالی اور اُسے خوب دھو لینے کے بعد بکس کے اندر سے ایک
موٹی شیشی نکالی جسکے اندر نہایت روشن اور سُرخ روغن یا عرق بھرا تھا۔ پچکاری بھرکر اجنبی پلنگ کے قریب آیا اور ہاجرہ کی گردن
میں ایک رگ تلاش کرکے پچکاری اسمیں چبھو دی اور سارا عرق رگوں میں اُتار دیا۔ اور پھر چلا گیا۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ وہ بھاری
قیمت کا تھا اور سُرخ عرق ریڈیم کا ایک خاص مرکب تھا۔

اب میں تھا اور وہ کمرہ اور اسکے مختلف ... جو آنے اور میرے سامنے ہاجرہ کی میت رکھی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے
میت کے گال پر ہاتھ رکھا تو میرے ہاتھ کو ایک جھٹکا ہوا اور ہاتھ میت کے جسم سے اس زور سے علیحدہ ہوا کہ اگر میں نے دوسرے ہاتھ سے
کرسی کا بازو پکڑ نہ لیا ہوتا تو میں گر گیا تھا شاید میت کے جسم میں برقی قوت دوڑ رہی تھی کیونکہ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ بجلی کے پنکھے کا
... جانے وقت بھی میرے ہاتھوں کو اسی طرح کا جھٹکا ہوا تھا۔ لیکن اس قلیل عرصہ میں میں نے پھر محسوس کیا کہ میت کا جسم گرم تھا۔ اس
نے کچھ دیر کے لیے حیران کر دیا۔ کیونکہ آخر یہی وہ میت تھی جو ایک وقت بالکل سرد پڑی تھی پھر اب اس میں زندگی کی حرارت کیونکر آگئی؟
میں ابھی اسی اُدھیڑبن میں تھا کہ مجھے یاد آیا کہ آدھ گھنٹہ ختم ہو گیا ہے۔ میں نے اُٹھ کر آلوں سے کاغذ کی دھجیاں الگ کر لیں۔ انپر نمبر چھپے
ہوئے تھے۔ انھیں قرینے سے رکھ کر میں پھر اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ چھ گھنٹے کے بعد اجنبی نے مجھے اپنے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور میں
باہر چلا گیا۔

....

اس روز سے متواتر پانچ سال تک میں ہر روز دن کے چوبیس گھنٹوں میں باری باری چھ چھ گھنٹے ہاجرہ کے پاس بیٹھا
کیا اور میرا کام صرف یہ تھا کہ ہر آدھ گھنٹے کے بعد دیوار کے آلوں سے کاغذ کی دھجیاں علیحدہ کر لیا کروں۔ اجنبی وقت مقررہ پر آکر پچکاری
لگا دیا کرتا تھا۔

پورے پانچ سال کے بعد بھی مجھے معلوم نہ ہوا کہ یہ اجنبی کون تھا اور کہاں کا رہنے والا تھا اور ہم لوگ ملک کے کس حصہ
میں تھے۔ گھر اور اُسکے قریب کے جنگل کے علاوہ میں نے مکان سے سو گز آگے قدم نہیں بڑھایا تھا۔ اس عرصہ میں میں بارہ سے سترہ
برس کا ہو گیا تھا مونچھیں نکلنے لگی تھیں اور بغیر کسی کے بتائے اب مجھے بہت سی اُن باتوں کی تمیز ہو گئی تھی جنھیں میں پہلے نہ جانتا تھا۔

حالانکہ اس طویل مدت تک ہاجرہ سوتی ہی رہی لیکن اس کے نمو میں ذرہ برابر بھی کمی نہ ہوئی۔ وہ ہاجرہ جو مرتے وقت صرف دس برس کی بچی تھی اب پندرہ سال کی جوان دوشیزہ تھی۔ شاید مجھے یہاں اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اُنس اور محبت جو مجھے اس لڑکی سے پہلے تھی اس پانچ سال کی یکلخت تیمارداری کے بعد اب کسی اور نام سے تعبیر کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ اور میرا انہماک اب اس وجہ سے بڑھ گیا تھا کہ بارہ گھنٹوں کے بدلے میں سولہ سولہ گھنٹے اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے پلنگ کے قریب مجاوری کیا کرتا۔ اور گو اب اجنبی کو کافی فرصت رہتی پھر بھی وہ گھر سے بہت ہی کم باہر نکلتا۔ گونگا حبشی نوکر جنگل سے پرندے اور خرگوش پھنسا کر لے آتا اور اجنبی انہیں اپنے اس خاص کمرے میں جہاں مجھے اب بھی جانے کی اجازت نہ تھی بند کر دیا کرتا۔ دوسرے دن ان کی لاشیں باہر پڑی ہوتیں جنہیں حبشی دفن کر دیتا۔

پانچویں سال کے آخر میں میں نے یہ دیکھا کہ اجنبی اکثر تین تین اور چار چار دن اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتا۔ حبشی پہلے سے بہت زیادہ پرندے پکڑ لاتا اور ان کی لاشیں دوسرے دن دفن کر دیتا۔ اور اس تین چار دن کی گوشہ نشینی کے بعد جب کبھی وہ باہر آتا تو ہاجرہ کے جسم میں پچکاری دیتا۔ لیکن ایسے موقع پر دو مختلف ہوتی پچکاری کے بعد اجنبی دیوار کے آلوں کے قریب جا کر کاغذ پر چھپے ہوئے نمبر پڑھ لیتا اور پھر یاس کی صورت بنا کر سر ہلاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ اسی طرح دو تین مہینے گذر گئے۔

ایک دن کوئی دن کے دس بجے ہوں گے کہ اجنبی نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں ساتھ ہو لیا۔ اور ہم لوگ اس کمرے میں داخل ہوئے جس میں ابھی تک میں نے قدم نہ رکھا تھا۔ کمرے کے چاروں طرف برقی اور سائنس کے آلے رکھے تھے۔ اجنبی نے جیب سے تمنچہ نکال کر سامنے رکھ دیا اور نہایت متانت سے کہنے لگا۔

"رشید۔ اس عرصہ میں تم خود جان گئے ہوگے کہ میں کس دُھن میں ہوں۔"

میں نے سر ہلا کر کہا "ہاں"

"تمھیں تعجب ہوگا کہ میں بھی تمھارے ہی شہر کا رہنے والا ہوں لیکن میں کون ہوں کیا ہوں۔ اور یہاں کب سے ہوں۔ اگر وقت ملا اور فرصت رہی تو کسی دن بتا دوں گا۔ ابھی تک تمھارا مجھ سے ناآشنا رہنا ہی بہتر ہے۔ میں نے اس وقت تک اس کی کوشش کی کہ ہاجرہ زندہ ہو کر اٹھ بیٹھے۔ لیکن اب تک میری ساری کوششیں بے سود اور بیکار ثابت ہوئیں۔ میں یہ کر سکا کہ اس بچی کا خاکی جسم زندہ رہ گیا اور اس میں نمو قائم رہ گیا۔ لیکن روح نہ آنا تھی نہ آئی۔ لیکن میں نے اپنی کوشش میں کبھی کمی نہ کی اور اس پانچ سال کی محنت اور مشقت کے بعد میں نے وہ شے ایجاد کی ہے جس کے ذریعہ سے میں میت میں صرف جان ہی نہیں ڈال سکوں گا بلکہ تمھاری عزیز ہاجرہ اٹھ کر تمھارے ساتھ چل پھر بھی سکے گی۔ لیکن رشید یاد رکھو کہ اگر اس کے بعد تم نے بھاگنے کی کوشش کی یا کسی سے کچھ کہا تو تم ہوگے اور اس تمنچہ کی گولیاں۔"

میں نے اسے لرز لرز کر بتایا کہ میں ایسے محسن کا ساتھ کبھی بھی نہ چھوڑوں گا۔

ایک پنجرے سے اجنبی نے ایک کبوتر نکالا اور اس کے سر پر ایک ایسی ضرب لگائی کہ کبوتر لوٹ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے بعد اجنبی نے

الماری سے وہی بھاری بکس نکالا پچکاری دھوئی اور چھوٹی سی شیشی نکال کر اسے بغور رغبت بھری نظر سے دیکھنے لگا۔ عرق کا رنگ اب بھی بہت ہی روشن اور سرخ تھا لیکن سرخی کے ساتھ ذرا نیلاہٹ بھی تھی۔ نیلاہٹ تھی بھی یا نہیں میں کہہ نہیں سکتا۔ لیکن ایک عجیب طرح کی تڑپ تھی جو آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی تھی۔ جہیں پچکاری بھر کر اجنبی نے تھوڑا عرق کبوتر کے جسم میں اتار دیا۔ دس منٹ کے بعد کبوتر کے مُردہ جسم میں حرکت ہوئی اور آدھے گھنٹے کے بعد وہ اُٹھ بیٹھا۔

شیشی لیکر اجنبی ہاجرہ کے کمرے میں آیا۔ ہاجرہ اسی طرح سو رہی تھی۔ پچکاری بھر کر اجنبی نے ہاجرہ کی پشت گردن کی کوئی خاص رگ تلاش کرنی شروع کی۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ سانس چڑھی ہوئی تھی اور پیشانی پر پسینے کے قطرے جمع ہو گئے تھے جب وہ خاص رگ مل گئی تو اجنبی نے ایک لمبی سانس لیکر پچکاری چبھو دی اور دوا ہاجرہ کے جسم میں اتر گئی۔ اجنبی پیچھے ہٹا اور چند منٹ تک میت کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر دیوار کے قریب آکر آلوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ چند منٹ کے بعد اس نے مجھے اشارہ کر کے بلایا اور آلوں کی طرف اٹھایا۔ میں نے دیکھا کہ نمبر جلد جلد چھپ رہے تھے اور ایک نہایت ہی نازک آلے میں جو اب تک ساکت تھا ایک عجیب ہیجان تھا۔ ایک برقی شرارہ تڑپ کر ادھر ادھر ہو رہا تھا۔ اجنبی پلنگ کے قریب جلد آیا اور بیٹھا ہوا میت کو دیکھتا رہا آدھے گھنٹے کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ جسم کے اوپر کی چادر کو حرکت ہو رہی تھی کچھ دیر کے بعد پلکیں ہلنے لگیں۔ اور چار گھنٹے کے بعد میری ہاجرہ جسے دنیا مردہ تسلیم کر چکی تھی میرے سامنے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اجنبی کرسی اور دوا کی فکر میں باہر چلا گیا۔ لیکن میں سر جھکائے خوشی کے آنسو بہا رہا تھا۔

....

ہاجرہ کو زندہ ہوئے آج چودہ مہینے گزر گئے لیکن ہمارے لئے ہاجرہ ویسی ہی مُردہ تھی جیسی پہلے۔ خدایا۔ اجنبی کے علم و عمل نے ہاجرہ کے خاکی جسم میں جان تو ضرور ڈال دی تھی اور وہ لڑکی جس کو اس کے گھر کے لوگ مردہ جان کر سپرد خاک کر چکے تھے آج چودہ مہینوں سے ایک حسین دوشیزہ کی شکل میں چل پھر رہی تھی لیکن اس کی چال ڈھال وضع ترکیب جانور جیسی تھی۔ میں نے سمجھا تھا کہ پانچ سال کی نیند کے بعد جب وہ اٹھیگی تو مجھے ضرور پہچان لیگی۔ میں جو اس کا سب سے بڑا دوست عزیز اور ہمسبق تھا۔ دل نے کیا کیا منصوبے باندھ رکھے تھے کیسی کیسی حسرتیں میرے دل کو بیتاب کر کے میری رگوں میں خون کی سرعت بڑھا رہی تھیں۔ مگر وہ ہاجرہ جو اس مدت سے ہمارے ساتھ تھی نہ دیکھ سکتی تھی اور نہ سن سکتی تھی اور سب سے مصیبت کی بات یہ تھی کہ جہاں وہ ہماری کچھ سن نہ سکتی تھی وہاں اپنی بھی کچھ کہنے سے بالکل قاصر تھی۔ کمسن ہاجرہ کا وہ خاکی جسم جسے میرے سامنے دفن کر دیا تھا چل پھر رہا تھا لیکن اسکے علاوہ میری کمسنی اور بچپن کی بھولی ہاجرہ کا کہیں نشان بھی نہ تھا۔ ایک نہایت ہی حسین لڑکی جس کے سر کے بال کمر کے بھی نیچے لٹکتے رہتے تھے اور جسکی سیاہ آنکھیں عالم تحیر میں کھلی تو ضرور رہتی تھیں لیکن جو دیکھنے سے معذور تھیں جسکے یاقوت جیسے سرخ لبوں کو میں خاموش بیٹھا دیکھا کرتا تھا۔ اک ذی روح تصویر کی مانند ہمارے گھر میں ادھر اُدھر گھوما کرتی تھی۔

ابتدا میں اجنبی نے بہتیرا سر مارا۔ مختلف جتن کئے۔ کئی جگہ نشتر لگائے۔ انجکشن دیئے۔ دوائیں کھلائیں۔ روغن مالش کئے لیکن نہ منہ سے کوئی آواز نکلی نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا۔ اجنبی وجود باری کا قائل نہ تھا۔ ایک دن میں ایک جھاڑی کے اندر

چھپا رو رو کر خدا سے ہاجرہ کی صحت کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ زمین میرے گرم آنسوؤں سے تر تھی اور میری پیشانی زمین سے ملی ہوئی تھی چھ سال سے میں نے خدا کا نام بھی نہیں سنا تھا لیکن جب میں نے دیکھا کہ اجنبی کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو میں نے اپنے اس خدا کو یاد کیا جس کا نام میں نے اپنے گھر پر سنا تھا اور جسکے بارے میں مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ وہ بڑا کارساز ہے۔ میں نے ابھی سجدے سے سر نہ اٹھایا تھا کہ میری پیٹھ پر ایک لات پڑی۔ میں نے گھبرا کر سر اٹھایا تو اجنبی غصہ میں بھوت بنا کھڑا تھا۔ کڑک کر بولا یہ دعائیں کس سے کی جا رہی ہیں؟ خدا سے؟ اسے دیکھا بھی ہے کبھی۔ یاد ہی جس کا نام گھر پر سنا کرتا تھا؟ میں نے سر ہلا کر کہا "ہاں"

"بیوقوف ارے آخر خدا ہے کہاں؟ وہی نا جو میں جان دیدے بیجان کو جان دار بنا دے۔ سو تو نے خود دیکھ لیا کہ میں نے تیری آنکھوں کے سامنے مردہ کو زندہ کر دیا۔ پھر بھی وہی خدا کی رٹ لگا رکھی ہے۔ وہی ناک رگڑنی اور سجدے کرنے جھولا تو بھی خدا کا نام لیا"

میں سہم کر بیٹھ گیا لیکن دل نے قبول نہ کیا میری دینی تعلیم مولانا قربان علی مرحوم کی دینیات کی پہلی دوسری تک محدود تھی لیکن اس بات نے دماغ کو ضرور پریشان کئے ہوئے تھی کہ گو اس اجنبی نے مردے کو زندہ کر کے خدا کی ہمسری کر لی یا خدا ہی ہو گیا تو پھر یہ بولی کیوں نہ سکتی تھی، دیکھ کیوں نہ سکتی تھی میں اس خدا سے التجا کر رہا تھا جو صرف زندہ ہی نہیں کر سکتا بلکہ جسکے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔

بہرحال جیسا کہ میں نے بیان کیا اجنبی نے عرصہ تک ہاجرہ کی قوت باصرہ اور سامعہ کے عود کر آنے کی کوششیں کیں لیکن جب وہ بالکل ناکامیاب رہا تو اس نے ہمت ہار دی اور آزردہ ہو کر دوسرے تجربوں میں مشغول ہو گیا۔ اب میری بھی اسے ضرورت تھی ہاں اکثر وہ مجھے اپنے خاص کمرے میں لیجا کر بتایا کرتا کہ سائنس کیا ہے اور مختلف گیس کیسے بنتے ہیں۔ اور انکے خواص کیا ہیں انکے مرکب کیسے بنتے ہیں اور مختلف تجربوں کا مقصد کیا ہے اکثر وہ مجھے ریاضی کی باتیں بھی بتایا کرتا۔ اکثر اپنے تجربوں میں مجھ سے مدد بھی لیتا اور بعد کو چند تجربے بھی مجھ سے کراتا۔ بعض باتیں تو میں اچھی طرح سمجھ کر کرتا اور بعض یوں ہی اٹکل سے۔ خدا نے مجھے ذہن پیدا کیا تھا تھوڑے ہی عرصہ میں میں بہت سی باتیں جان گیا۔

جہاں ہاجرہ میں دیکھنے سننے اور بولنے کی طاقت نہ تھی وہاں قدرت نے حس کی قوت کو بڑی ترقی دیدی تھی مجھے وہ صرف چھو کر پہچان لیتی۔ اکثر میرے دامن کا صرف اس سے چھو جانا مجھے پہچان لینے کو کافی ہوتا۔ اجنبی کو بھی وہ پہچان لیتی لیکن اس سے اسے ایسی نفرت تھی کہ اگر وہ قریب آنے کی ہمت کرتا تو شیرنی کی طرح اسپر جھپٹتی۔ اگر وہ کسی سے مانوس تھی تو مجھ سے اور اگر اسے کوئی چھو سکتا تھا تو میں تھا۔ ورنہ اوروں کے لئے وہ انسانی جامہ میں ایک خونخوار جانور تھی۔

چونکہ اجنبی اب اپنے دوسرے تجربوں میں مشغول رہتا اس لئے مجھے اب ادھر ادھر گھومنے کی اجازت مل گئی تھی اور گھنٹوں میں ہاجرہ کا ہاتھ پکڑے جنگل اور پہاڑوں میں گھوما کرتا۔ جنگل کے پھول توڑ کر میں ہار بناتا اور اسے ہاجرہ کے گلے میں ڈال دیتا۔ ہاجرہ اس ہار کو دیکھ تو نہ سکتی تھی لیکن اسے اپنے نازک ہاتھوں میں لیکر مخمل جیسے نرم گالوں کے

برابر رکھتی اور اسکا چہرہ خوشی سے لال رنگ ہو جاتا۔ اکثر کچھ دیر بعد وہ ہار اتار کر میرے گلے میں ڈال دیتی اور میرے سامنے کھڑی ہو کر یوں دیکھتی جیسے دیکھ رہی ہو۔ رفتہ رفتہ ہاجرہ مجھسے بہت ہل گئی اور اکثر جب ہم دونوں جنگل میں گشت لگاتے لگاتے تھک کر بیٹھ جاتے تو وہ نہایت بے تکلفی سے اپنا سر میری گود میں رکھکر لیٹ جاتی اور میں اپنا ہاتھ اوسکے نرم لیکن کنگھی سے غیر آشنا بالوں پر پھیرا کرتا۔ ایک دفعہ کسی خاص جذبہ نے مجھے چند لمحوں کے لئے خود فراموش کر دیا اور میں نے اپنے لب ہاجرہ کی پیشانی پر رکھدیئے ہاجرہ تڑپ کر دور جا کھڑی ہوئی اور مجھے بغور دیکھنے لگی۔ غصہ سے اوسکا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور سانس کی آواز صاف آ رہی تھی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ مجھ پر حملہ کریگی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ ٹھنڈی ہوئی۔ میں گھر کی طرف چلا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی۔ لیکن اسکے وہ میرا ہاتھ بھی پکڑے تھی۔ اسکے بعد دس بارہ دن تک وہ گھر سے باہر نہیں نکلی۔ بعد کو اوسے جب میری طرف سے بالکل اطمینان ہو گیا تو پھر ساتھ جانے لگی۔ ایک دن ہم دونوں یوں ہی گھومتے گھومتے گھر سے بہت دور نکل گئے۔ دو اونچے پہاڑوں کے درمیان ایک نہر تیزی کے ساتھ بہ رہی تھی۔ اور اوسکا شفاف پانی اوپر سے گر کر عجیب دلکش موسیقی پیدا کر رہا تھا۔ چاروں طرف پھولوں کے ڈھیر تھے۔ اور اطراف کے سارے بلبل شاید اسوقت اسی جگہ جمع ہو گئے تھے۔ ہم دونوں نہر کے دو طرف کھڑے ہو کر ایک دوسرے پر پھول پھینک رہے تھے۔ میرا پھول پڑتے ہی ہاجرہ اپنا پھول اس تیزی سے پھینکتی تھی کہ میں اپنی جگہ سے ہٹنے بھی نہ پاتا تھا کہ اوسکا پھول مجھ پر ہوتا تھا۔ دیر تک ہم یوں ہی کھیلتے رہے اور آس پاس کی ہمیں مطلق خبر نہ تھی۔ یکایک ایک بہت سخت اور مہیب دھماکا ہوا۔ اور اسکے ساتھ ایسی کڑک شروع ہوئی کہ میں نے سمجھا کہ سارا آسمان پھٹ کر گر پڑیگا۔ اندھیرا گھپ ہوگیا۔ دھماکے کے ساتھ ہی ہاجرہ نے ایک چیخ ماری اور میری طرف دوڑی بیچ میں نہر تھی گرتے گرتے بچی۔ لیکن میں جھپٹ کر اُسکے قریب تھا۔ عرصہ تک دھماکا اور تڑاقہ ہوتا رہا۔ بادل کے گرج کی انتہا نہ تھی اور پانی موسلا دھار برس رہا تھا۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے سے چپٹے ہوئے ایک بڑے درخت کی آڑ میں لرزتے کھڑے تھے۔ ہاجرہ بید کی طرح کانپ کانپ کر مجھے چمٹی جا رہی تھی اور میں اپنے ہاتھوں سے اوسے اور قریب کر لیتا تھا۔ میرا سر اُسکے سر پر تھا۔

دو گھنٹوں کے بعد بادل کی گرج رکی اور پانی تھما۔ ہاجرہ آہستہ آہستہ مجھسے الگ ہونے لگی۔ کچھ ٹھہر کر اُسنے مجھے دیکھنا شروع کیا لیکن وہ آنکھیں جو مجھے آج دو برس سے دیکھا کرتی تھیں اور پھر دیکھ نہ سکتی تھیں اسوقت کچھ عجیب انداز سے دیکھ رہی تھیں۔ اون آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی اور آنسو کے قطرے گرنے کے لئے بیتابی سے ادھر اُدھر گھوم رہے تھے میں نے دیکھا کہ ہاجرہ کی نرم انگلیاں کانپنے لگیں اور وہ میری طرف جھکی۔ لب مرتعش ہوئے ...... "رشید"

....

دیر کے بعد جب ہم نے خوشی کے آنسو بہانیسے فرصت پائی تو گھر کا خیال آیا اور ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے گھر کی طرف چلے۔ ابھی ہم گھر سے دور ہی تھے کہ میں نے دیکھا کہ جہاں پر ہمارا گھر تھا۔ وہاں اب سوائے ایک خوفناک اور عمیق غار

کے کچھ بھی نہ تھا اور گرد کے پہاڑوں کا پانی بہہ کر اس غار میں جمع ہو رہا تھا۔ میرا سر چکر کھانے لگا اور میں ایک آہ کر کے وہیں بیٹھ گیا۔

شاید تم یہ سننے کے مشتاق ہوگے کہ آخر ہمارا گھر جل کر تباہ ہوا۔ یقین معلوم ہے کہ میں نے بہت ہی کم تعلیم پائی تھی۔ اور سائنس کی چند باتیں مجھے صرف اجنبی کے ساتھ رہنے سے معلوم ہو گئی تھیں لیکن جو میں اب تک سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے۔

اجنبی نے باجرہ کو زندہ کرنے کے بعد مریخ تک جانے کی کوشش شروع کی تھی۔ اور اس لئے اُسنے ایک ایسی ہوائی بنانی چاہی تھی جو ہمارے کرۂ ارض سے مریخ تک جا سکے۔ اسی کوشش میں اُسنے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جو پہلے تو نائٹروجن کے ایک خاص مادہ پر اسوقت تک نامعلوم لیکن نہایت ہی طاقت سے پھٹنے والے مرکب سے بھرا ہوا تھا اور اس ہوائی میں ایک ایسی کل لگی تھی جو خود اُوپر جاتے جاتے ہوا سے اپنی ضرورت کے لئے نائٹروجن بناتی جاتی تھی اور اس باری باری بننے والے مرکب کے پھٹنے سے وہ ہوائی کرۂ ارض سے اور دور ہوتی جاتی تھی یہانتک کہ اپنی کشش سے نکل کر وہ مریخ کے دائرۂ کشش کے اندر آجانے کے بعد مریخ تک بآسانی پہنچ سکتی تھی۔

اسی ارادہ اور اسی اصول پر اجنبی نے ایک چھوٹی سی ہوائی بنائی تھی جسے وہ تجربۃً اوپر بھیجنا چاہتا تھا۔ اور اب مجھے یاد آتا ہے کہ اُسنے مجھسے کہا بھی تھا کہ بہتر ہے کہ تم تھوڑی دیر کے لئے ذرا دور چلے جاؤ۔ میرا ذاتی خیال ہے اور ممکن ہے کہ میں اس میں بالکل ہی غلط ہوں کیونکہ یہ اپنی ہی قیاسات بیان کر رہا ہوں۔ لیکن بہت غور و فکر کے بعد میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ شاید جب یہ ہوائی اُوپر جا کر پھٹی اور اُسنے ہوا سے نائٹروجن لیکر مرکب بنانا شروع کیا تو تھوڑے ہی عرصہ میں اسقدر نائٹروجن نکال لیا کہ آکسیجن اور ہائیڈروجن کی بہت زیادتی ہو گئی۔ اور ہوائی کے پھٹنے سے ہوا میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا اور ہوا کے مختلف حصے ایک دوسرے سے رگڑ کھا کر برقی قوت پیدا کرنے لگے۔ ہیجان والے مختلف حصوں میں آگ لگ گئی اور برقی قوت نے آکسیجن اور ہائیڈروجن کو ملا کر مرکب کر دیا جس سے پانی بن گیا۔ شاید اسی برقی قوت . . . . . کی پیدائش تھی جو مجھے تڑاقے کی طرح سنائی دے رہی تھی اور ممکن ہے کہ کوئی شرارہ اجنبی کے مکان پر اس طرح گرا جس نے سارے مکان کو جلا کر صرف خاک ہی نہیں کر دیا بلکہ جہاں وہ گھر تھا وہاں ایک غار ہو گیا۔ یا ممکن ہے کہ مکان کے اندر ہی کسی آلے کے پھٹنے سے سارا گھر اڑ گیا ہو۔

ہماری داستان ختم ہو گئی۔ باجرہ نے وطن جانے سے انکار کیا اور ہم دونوں نے یہیں پہاڑوں میں بود و باش اختیار کر لی۔

علی اکبر کاظمی (بی اے) کیمبرج

رقاصہ۔ کی جو تصویر اس مہینے میں شائع ہو رہی ہے وہ علیحدہ بھی ۲ آنے کا ٹکٹ بھیجکر منیجر نگار کے پاس سے مل سکتی ہے۔

انتخاب کلام میر پر ایک نظر

انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے جس مہتم بالشان کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ قوم کے لئے نہایت حوصلہ افزا ہے اور امید کیجاتی ہے
(ک)ہ اگر جانفشانی اور سرگرمی سے کارکنان انجمن اپنی اس اہم و دشوار خدمت میں مصروف رہے تو ادب اردو کے افق سے ایک
(ا)یسا آفتاب طلوع ہوگا جسکی ضیاباری ساری فضائے ہند کو "مطلع انوار" بنادیگی۔ لیکن افسوس ہے کہ کتابوں کے ترجمہ و تالیف
(و تر)تیب و اشاعت میں غیر معمولی تاخیر و تعویق ہوتی ہے جس سے شیدایان ادب کو سخت انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس انجمن کے قیام کو
(تی)ن سال سے زیادہ ہی زمانہ گذرا ہوگا مگر اس مدت میں جتنی اچھی کتابیں شائع ہوئی ہیں کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہیں
(ا)سکے علاوہ ایک اور فروگذاشت انجمن سے ہورہی ہے وہ یہ کہ اس امر پر بھی توجہ کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا کہ کتابیں ملک کے
بہترین افراد سے ترجمہ کرائی جائیں جس زمانہ میں علامہ شبلی اس انجمن کے سکریٹری تھے کتابوں کے ترجمہ کرانے کا یہ انتظام تھا
(ک)ہ بذریعہ اخبار اعلان کردیا جاتا تھا کہ فلاں کتاب کا ترجمہ کرانا مقصود ہے ارباب قلم فلاں فلاں باب کا ترجمہ نمونہ کے طور پر
انجمن میں بھیجیں، "جسکا ترجمہ انجمن انتخاب کریگی وہی شخص اس کتاب کے ترجمہ پر مامور کیا جائیگا" یہ ترکیب کسقدر مفید تھی۔
چنانچہ ہربرٹ اسپنسر کی کتاب "فلسفہ تعلیم" اس زمانہ میں اسی صورت سے ترجمہ کیگئی جو میرے خیال میں انجمن کی تمام
کتابوں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اگر برابر یہی روش قائم رہتی تو "مشاہیر یونان و روما" وغیرہ کا یہ حشر نہوتا کہ رسالہ الحمرا میں
اسکی دھجیاں اڑادی گئیں کتابوں کا ترجمہ اگر بہترین نہو تو کم از کم نمایاں عیوب و نقائص سے مبرا تو ہو۔ "مشاہیر یونان و روما"
(کی ط)رح چند اور کتابوں کا بھی یہی حال ہے جن میں ایک "انتخاب کلام میر" ہے جسپر کچھ اپنے خیالات حوالہ قلم کرتا ہوں۔
میر تقی میر کی جو حیثیت شعرائے اردو میں ہے ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے اردو کا یہی ایک شاعر تو ایسا نظر آتا ہے
جسکی آجتک کسی نے مخالفت نہ کی۔ ورنہ اسوقت تک جتنے شعرائے اردو پیدا ہوئے ایک گروہ انکا ہمیشہ مخالف رہا۔ آج
بھی ہندوستان میں ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو غالب و اقبال تک کے کلام کا معترف نہیں ہے۔ آتش و انیس،
داغ و امیر و حالی و اکبر وغیرہ سب کے سب تیر مخالفت کے زخم خوردہ ہیں۔ لیکن میر ایک ایسا شاعر ہے جسکا مدعی سے
(مد)عی شاعر بھی مداح ہے، مخالف سا مخالف شخص بھی معترف ہے۔ یہانتک کہ اسکا ہمعصر سودا بھی اسکا عظمت شناس
نظر آتا ہے۔ میر کی اس ہمہ گیر مقبولیت کا کوئی حریف نہیں ہوسکتا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میر کا سارا کلیات محاسن سے معمور ہے
(او)ر ہر شعر قابل تعریف ہے۔ میر کے کلام پر مولانا آزردہ کی تنقید کسقدر صحیح تھی کہ "پستش نہایت پست و بلندش نہایت
بلند است"۔ علاوہ ازیں کلیات اتنا ضخیم ہے کہ اسکے مطالعہ کی ہر آنکھ زحمت نہیں اٹھا سکتی۔ اسلئے ضرورت تھی کہ کلیات کا
بہترین انتخاب شائع کیا جائے۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو نے ایک انتخاب شائع کیا جسکی ترتیب مولوی عبدالحق صاحب بی اے

...زمرہ اشعار کو نظر انداز کر دیا ہے تو انکا یہ طریقہ مستحسن نہین کہا جاسکتا کیونکہ انکے انتخاب مین سیکڑون ایسے اشعار ہین جنکو نظر انداز کرکے ان قابل
...تخاب شعرون کو جگہ ملسکتی تھی جو مولوی صاحب کی نگاہ توجہ سے محروم رہے۔

کلام میر کا ایک انتخاب جامعہ ملیہ سے بھی شائع ہوا ہے جسکو مین نے تو نہین دیکھا ہے مگر جن حضرات نے اسکا مطالعہ کیا ہے
...نے ہین کہ حیدرآبادی انتخاب سے کہین بہتر ہے۔ کلیات میر ایک حیرت انگیز دریا ہے جس مین ہزارہا گران قدر موتی پوشیدہ ہین
...نے ابھی حال مین سارے کلیات کا مطالعہ کیا اور سیکڑون ایسے اشعار چنے جنکو مولوی صاحب نے اپنی انتخاب مین جگہ نہین
...یا ہے۔ مین ان اشعار کو ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہون پہلے مین ان غزلون کے اشعار درج کرتا ہون جنکے کچھ شعر مولوی صاحب
...کے انتخاب مین موجود ہین اسکے بعد ان غزلون کی طرف رخ کرونگا جنکا کوئی شعر انتخاب مین نہین ہے۔

...شعر ہو ایک نیچرل کیفیت و جذبات کا آئینہ دار ہے قابل انتخاب تھا مگر مولوی صاحب نے اسکو نظر انداز کر دیا ہے۔

ساعدین دونون اسکے ہاتھ مین لاکر چھوڑ دیے ... بھولے اسکے قول و قسم پر ہائے خیال خام کیا

...طرح یہ شعر بھی مردود توجہ نہ تھے ؎

کسی وقت پاتے نہین گھر اسے ... بہت میر نے آپ کو گم کیا

فلک نے آہ تیری رہ مین ہمکو پیدا کر ... برنگ سبزۂ نورستہ پامال کیا

قامت خمیدہ رنگ شکستہ بدن نزار ... تیرا تو میر غم مین عجب حال ہو گیا

...مطلع کسقدر کیف انگیز تھا مگر مولوی صاحب نے اسکی قدر نہ کی حالانکہ بعد کے چند اشعار انتخاب مین موجود ہین۔
...مطلع ملاحظہ ہو ؎

جی تاب بھی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا ... جیتے رہے تھے کیون ہم جو یہ عذاب دیکھا

...ک مشہور غزل (جسکا پہلا مصرعہ ہے "ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا") کا یہ شعر کتنا دلنشین و لطف انگیز ہے مگر مولوی صاحب
...کا قلب اس سے متکیف نہ ہوا۔ کیا خوب کہا ہے ؎

خراب۔ رہتے تھے مسجد کے آگے میخانے ... نگاہ مست نے ساقی کی انتقام لیا

...غزل کا یہ شعر بھی قابل انتخاب تھا ؎

مزا دکھا وینگے بیرحمی کا تری صیاد ... گر اضطراب اسیری نے زیر دام لیا

...غزل کا مقطع

اگرچہ گوشہ نشین ہون مین شاعرون مین میر ... پہ میرے شور نے روئے زمین تمام لیا

...انتخاب مین داخل ہے مگر مذکورۂ بالا شعر و نیز اسکو ترجیح دی گئی ہین اسکے سمجھنے سے قاصر ہون۔ ذیل کا شعر کتنا معنی خیز ہے۔ اسکے
...علاوہ تقریباً کل اشعار انتخاب مین موجود ہین مگر یہ قطعہ جو صبر و رضا کی تفسیر ہے مولوی صاحب کو پسند نہ آیا حالانکہ میرے خیال مین

یہ شعر اسی غزل کا ہے ـــ

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

حسب ذیل دو شعر جنکے ساتھ چند اشعار مطلع و مقطع انتخاب میں موجود ہیں کس قدر بلیغ و لطیف اور حقائق و معارف کا مخزن ہیں مگر انتخاب کے قابل نہ سمجھے گئے ـــ

نہ ہو کیوں غیرت گلزار وہ کوچہ خدا جانے لہو اس خاک پر کن کن عزیزوں کا گرا ہوگا

نہیں جز عرش جائے نالہ ان بے بال و پر کے نفس سے اُڑ کے مرغ روح جب میر رہا ہوگا

دوسرا شعر خواجہ حافظ کے ان شعروں کا ترجمہ ہے ـــ

مرغ دل ما کہ ہست قدسی عرش آشیان از قفس تن ملول سیر شدہ از جہان

از در این خاکدان چون بپرد مرغ ما باز نشیمن کند بر سر آن آشیان

مطلع ذیل اسقدر خوب ہے کہ شاید ہی کوئی اہل ذوق اسکی داد نہ دے مگر انتخاب سے محروم رہا ـــ

فلک کا منہ نہیں اس فتنہ کے اٹھانے کا ستم ظریف ترا ناز ہے زمانے کا

یہ مطلع اس مشہور و معروف مطلع کا ماخذ ہے جو ضرب المثل کے طور پر زبان زد ہے ـــ

کب سایہ ہو فلک کو یہ ستمگاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

اسی غزل کا مقطع جو معنوی خوبیوں کے لحاظ سے مطلع کے مقابلہ میں صفر محض ہے مولوی صاحب نے انتخاب کیا ہے جو انکے ذوق طبیعت پر دال ہے ۔ وہ مقطع یہ ہے ـــ

شریف مکہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

کیا ظلم ہے کہ ہیرے پر ٹھیکرے کو ترجیح دی گئی ۔

اس مطلع کا تیور، صفائی زبان، سادگی انداز بیان ملاحظہ ہو مگر مولوی صاحب نے اسے منتخب نہ کیا ۔ اس غزل کا وہ ایک شعر البتہ جو انتخاب میں درج ہے مگر اس مطلع پر انکی نظر نہ پڑی ـــ

آئے ہیں میر منہ کو بنائے خفا سے آج شاید بگڑ گئی ہے کچھ اس بیوفا سے آج

ذیل کے دو شعر کسقدر پر معنی و کیف انگیز ہیں مگر مولوی صاحب کو پسند نہ آئے ـــ

ہر گام سد راہ تھی بت خانے کی محبت کعبہ تلک تو پہونچے لیکن خدا خدا کر

کچھ کہہ نہیں سکے ہے جو نیم کشتہ جیوڑا ! حسرت نے اسکو آخر مارا الٹا الٹا کر ۔

ایک غزل کا مطلع ـــ گل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل یکمشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

کسقدر حسرت انگیز ہے اسکو مولوی صاحب نے مقدمہ میں اعلیٰ درجہ کے شعروں کی مثال میں تو پیش کیا ہے مگر انتخاب میں

کی ردیف میں اسکو جگہ دینا بھول گئے۔ اسی غزل کا یہ شعر بھی کتنا درد انگیز ہے مگر انکی نگاہ انتخاب سے محروم رہا ۔

کی سیر جذب الفت گلچین نے چمن میں توڑا تھا شاخ گل کو نکلی صدا کہ بلبل

ایک غزل ہے، جوان ہیں، زبان ہیں - اسکے تین شعر انتخاب میں درج کئے گئے ہیں مگر حسب ذیل شعر جو ایک نیچرل کیفیت، صداقت بیان اور خوبی زبان کا اعلیٰ نمونہ ہے اور حاصل غزل کہا جا سکتا ہے مولوی صاحب کو پسند نہ آیا حالانکہ اس غزل کے جو شعر انتخاب میں ہیں اس مقطع کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہیں۔ مگر پسند کو کیا کہئیے ہر شخص کی پسند جداگانہ ہوتی ہے۔ لیکن ارباب نظر غور کریں کیا یہ شعر شایان انتخاب نہ تھا ۔

پھاڑے ہزار جانے گریبان صبر میر کیا کہہ گئی نسیم سحر گل کے کان میں

اس طرح میں سودا و جرأت وغیرہ کی بھی غزلیں ہیں مگر میر کی غزل سب پر بھاری ہے۔ اس کے حسب ذیل تین شعر کسقدر کیف زا، و موثر ہیں لیکن حیف ہے کہ انکی تاثیر مولوی صاحب کے قلب کو تشکیک نہ کر سکی ملاحظہ ہو بیخودی و جانکنی کی کیفیت کو میر صاحب یوں بیان کرتے ہیں، سبحان اللہ ۔

ہم آپ سے جاتے رہے ہیں ذوق خبر میں اے جان بلب رہ تا خبر آئے

دوسرے شعر میں اسیران قفس کی بیکسی اور آزادون کی بیدردی کو یون ظاہر کرتے ہیں ۔

کیا جانیں وہ مرغان گرفتار قفس کو جن تک کہ بصد ناز نسیم سحر آئے

تیسرے شعر میں ذوق قتل و صبر و تسلیم کی یون تفسیر کرتے ہیں ۔

ہر سو سر تسلیم رکھے صید حرم ہیں وہ صید فگن تیغ بکف تا کدھر آئے

یہ شعر امیر خسرو کے اس شعر کا ترجمہ ہے ۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف بہ امید آن کہ روزی بہ شکار خواہی آمد

ذیل کا مطلع زبان زد خاص و عام ہے اور ضرب المثل کے طور پر پڑھا جاتا ہے مگر مولوی صاحب اسکی خوبی کے منکر ہیں حالانکہ اسی غزل کے چار شعر جو اس مطلع سے بہتر نہیں ہیں انھوں نے منتخب کئے ہیں۔ وہ مطلع یہ ہے ۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے اسکی زلفون میں سب اسیر ہوئے

اسی طرح یہ مطلع بھی قابل انتخاب تھا ۔

موا ہوں ہو کے دل افسردہ رنج فرقت سے اُگے ہے سبزہ پژمردہ خاک تربت سے

اشعار ذیل جذبات فطرتی کے نغمہ دار ہیں اور یقینی قابل انتخاب تھے چنانچہ انکے ساتھ کے چند شعر انتخاب میں درج ہیں۔ انکو نظر انداز کر دینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ملاحظہ ہو ۔

ہنگام جلوہ اسکے مشکل ہے ٹھہرے رہنا چتون ہے دل کی آفت چشمک بلائے جان ہے

ہر چند ضبط کرے چھپاتا ہے عشق کوئی　　گذرے ہے دل پہ جو کچھ چہرے سے ہویدا ہے

اسی طرح یہ دو شعر بھی جسکے ساتھ کے چند اشعار انتخاب میں موجود ہیں قابل درج تھے ؎

رہا میں در پس دیوار باغ مدت تک　　گئی گلوں کے نہ کانوں تلک فغان میری

دیا دکھائی مجھے تو اسیکا چہرۂ میر　　پڑی جہانمیں جا کر جہاں نظر میری

ایک غزل ہے جسکا یہ مطلع انتخاب میں درج ہے ؎

وہ رنگ گل سمجھ کے تو کیا ہو دیوانوں کے بیچ　　زخمی پڑے ہیں کتنے ہزاروں چمن کے بیچ

اس غزل میں یہ قطعہ سنا... بلند پروازی، خوبی بیان، سلاست زبان، طرز ادا کے محاسن سے مالا مال ہیں مگر مولوی صاحب کو نکالا جانا انتخاب میں سے عجیب ستم ہے - ملاحظہ ہو ؎

یا ساتھ غیر کے ہو تمہیں ویسی بات چیت　　سو سو طرح کے لطف ہیں اک اک سخن کے بیچ

یا پاس میرے لگتی ہے جب ایسی آن کر　　گویا زبان نہیں ہے تمہارے دہن کے بیچ

اسی غزل کا یہ شعر بھی جو شعرائے مابعد کے بہت سے اشعار سے بلند ہے قابل انتخاب تھا ؎

کنعان سے بہائے مصر میں یوسف ہوا عزیز　　عزت کسی کی ہوتی نہیں ہے وطن کے بیچ

مطلع ذیل بھی انتخاب کے قابل تھا اسکے بعد کے دو شعر انتخاب میں موجود ہیں مگر یہ مطلع نہ جانے کیوں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

کوچہ میں تیرے میر کا مطلق اثر نہیں　　کیا جانئے کدھر کو گیا کچھ خبر نہیں

اسی طرح اس مطلع میں ایک دلی کیفیت کو بیان کیا ہے، مگر نظر انداز کر دیا گیا حالانکہ ایک شعر اس غزل کا انتخاب میں موجود ہے ملاحظہ ہو ؎

کس غم میں مجھکو یارب یہ مبتلا کیا ہے　　دل ساری رات جیسے کوئی ملا کیا ہے

ایسے ایسے اشعار میر کے واردات قلبیہ کی تفسیر ہیں، ان کو انتخاب نہ کرنا ظلم ہے۔

اشعار ذیل عبرت کے مرقع ہیں مگر مولوی صاحب کی میزان نقد میں کوئی وزن نہیں رکھتے۔ حالانکہ اسی غزل کے اشعار جو کسی طرح ان شعروں سے بہتر نہیں کہے جا سکتے انتخاب میں موجود ہیں ؎

گل گئے بوٹے گئے گلشن ہوئے برہم گئے　　کیسے کیسے ہائے اپنے دیکھتے موسم گئے

ہنستے آتے تھے ہوا اس گلزار میں شام و سحر　　دیدۂ تر ساتھ لے وہاں جوں شبنم گئے

ایک غزل کے یہ دو شعر کسقدر پر کیف ہیں ؎

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے　　ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے

لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر　　شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

مگر افسوس اور تعجب کی بات ہے کہ ان شعروں کو مولوی صاحب نے داخل انتخاب نہ کیا۔ اس غزل میں انکو پسند آیا تو صرف یہ شعر واہیات پسند ؎

مرگ مجنون سے عقل گم ہے میر   کیا دوانے نے موت پائی ہے

اسی طرح یہ مقطع بھی بیرحمی سے نظر انداز کردیا گیا ہے ؎

کل جا کے ہمنے میر کے در پر سنا جواب   مدت ہوئی کہ یان وہ غریب الوطن نہیں

ذیل کے دو شعر کسقدر خوب ہیں، انکے ساتھ کے دو اشعار درج انتخاب کئے گئے ہیں مگر انہیں نظر انداز کردیا گیا ؎

گرچہ وہ گوہر تر ہاتھ نہیں آتا لیکن   دم میں دم جب تلک ہے اسکے طلبگار رہو

ساری بازار جہان کا ہے یہی مول اے میر   جان کو بیچ کے بھی دل کے خریدار رہو

اب میں ان غزلوں کے اشعار کو دکھانا چاہتا ہوں جن پر مولوی صاحب کی نگاہ بالکل نہ پڑی اور ایک بھی شعر درج انتخاب نہ کیا۔ سیکڑوں غزلیں مس تک نہیں کی گئیں حالانکہ کتنے ایسے جواہرات مل سکتے تھے جنکے انتخاب سے اس کتاب کی زینت دو چند ہوجاتی۔ ناظرین خود فرمائیں کہ یہ اشعار قابل انتخاب تھے یا نہیں ؎

اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار   یاد ایام جب تحمل تھا

رکھ ہاتھ دل پہ میر کے دریافت کر کیا حال ہے   رہتا ہے اکثر یہ جوان کچھ ان دنوں بیتاب سا

کثرت میں درد و غم کی نہ نکلی کوئی طپش   کوچہ جگر کے زخم کا شاید کہ تنگ تھا

لایا مرے مزار پہ اسکو یہ جذب عشق   جس بیوفا کو نام سے بھی میرے ننگ تھا

ذیل کے دو شعروں میں بے بسی و بیکسی کی کیفیت کس عمدہ اسلوب سے بیان کی گئی ہے ؎

کیا کہوں کیسا ستم غفلت سے مجھ پر ہوگیا   قافلہ جاتا رہا میں صبح ہوتے سو گیا

بیکسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر   جو ہماری خاک پر سے ہوکے گذرا رو گیا

ذرا ان شعروں کی خوبی پر نظر ڈالئے اور فرمایئے کہ یہ کیوں مردود توجہ سمجھے گئے ؎

یاد ایام کہ یان ترک شکیبائی تھا   ہر گلی شہر کی یان کوچہ رسوائی تھا

اتنی گذری جو ترے ہجر میں سو اسکے سبب   صبر مرحوم عجب مونس تنہائی تھا

یہ تین شعر بھی اچھے تھے مگر کس بنا پر نظر انداز کر دیئے گئے سمجھ میں نہیں آتا ؎

لیگیا صبح کے نزدیک مجھے خواب اے وائے   آنکھ اسوقت کھلی قافلہ جب دور گیا

چشم خون بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا   ہم تو جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

نالۂ میر نہیں رات سے سنتے ہم لوگ   کیا ترے کوچہ سے اے شوخ وہ رنجور گیا

اشعار ذیل جوش واثر وجستگی وبے ساختگی کا آئینہ ہیں ؎

جو یہ دل ہے تو کیا سرانجام ہوگا　　تہہ خاک بھی خاک آرام ہوگا

مرا جی تو آنکھوں میں آیا یہ سنتے　　کہ دیدار بھی ایک دن عام ہوگا

ان دو شعروں کی خوبیوں کو دیکھیے مگر مولوی صاحب کو پسند نہ آئے ؎

کار اسلام ہے مشکل ترے خال وخط سے　　رہزن دین ہو کوئی دزد کوئی ایمان کا

چارۂ عشق بجز مرگ نہیں آسے میر　　اس مرض میں ہے عبث فکر تمہیں درماں کا

اسی شعر کے مفہوم کو مرزا غالب نے تشبیہ کے ذریعہ سے بالکل بدیہی کر دیا ہے ؎

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یہ دو شعر بھی پسندیدہ ہیں مگر مولوی صاحب کی نگاہ توجہ سے محروم رہے ؎

لگتی نہیں پلک سے پلک انتظار میں　　آنکھیں اگر یہی ہیں تو بس نیند سو چکا

اک چشمک پیالہ ہے ساقی بہار عمر　　جھپکی لگی کہ دور یہ آخر ہی ہو چکا

اس مضمون کو مرزا سودا نے بھی خوب کہا ہے ؎

ساقی ہے اک تبسم گل فرصت بہار　　ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

اشعار ذیل رنگ تغزل میں ڈوبے ہوئے ہیں مگر مولوی صاحب اسکے معترف نہ ہوئے ؎

جی اپنا ہے تیرے لئے خوار ہو دیا　　آخر کو جستجو نے تری ہمکو کھو دیا

پوچھا جو میں نے درد محبت کو میر سے　　رکھہ ہاتہہ اسنے دل پہ تنک ایک رو دیا

غالب کا ایک مطلع ہے ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے　　ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

درحقیقت یہ مضمون میر کا ہے جسکو وہ یوں بیان فرماتے ہیں ؎

ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا　　دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

مگر مولوی صاحب اس شعر سے مطلق لطف اندوز نہ ہوئے۔

اشعار ذیل میں بیکسی کو کس حسرت آمیز طرز میں ادا کیا ہے ؎

کس کی ہوا کہاں کا گل ہم تو قفس میں ہیں اسیر　　سیر چمن کی روز و شب تجھکو مبارک اے صبا

آئے اگر بہار تو اب ہمکو کیا صبا　　ہمسے تو آشیاں بھی گیا اور چمن گیا

ذیل کے مطلع کو پروفیسر آزاد نے خان آزاد کے ساتھ منسوب کر دیا ہے مگر میر کے کلیات میں موجود ہے ؎

مغان مجھ مست بن پھر خندہ ساغر نہ ہوئیگا — مے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لیکے روئیگا

ذیل کی غزل میر کی عمدہ غزلون مین شمار کی جاسکتی ہے مگر ایک شعر بھی انتخاب مین نہین ہے ؎

بہتوں کے آگے تھا یہی آزار عشق کا — جیتا رہا ہی کوئی بھی بیمار عشق کا
منصور نے جو سر کو کٹایا تو کیا ہوا — ہر سر کہین ہوا ہے سزا دار عشق کا
کھوئے رہا نہ جان کو نا آزمودہ کار — ہوتا نہ کاش میر طلبگار عشق کا

یہ شعر کسقدر دلکش خوش ترکیب ہے اور زبان زد خاص و عام ہے مگر انتخاب کے قابل نہ سمجھا گیا ؎

کہتے تھے ہم تو میر کو عاشق ہی ہو کہین — جب نام عشق سنکے وہ بیتاب سا ہوا

اشعار ذیل بھی کسقدر بلیغ ہین مگر مولوی صاحب کی کم ہمتی نگاہین انکے محاسن کی منکر ہین ؎

دیکھ آرسی کو یار ہوا محو ناز ... کا — خانہ خراب ہو جیئو آئینہ ساز کا
ہم تو سمند نا کے پامال ہو چکے — اسکو وہی ہے شوق ابھی کتا نکا

ذیل کی غزل کے مضامین دکواف غایت بلند ہین۔ کون شخص ہے جو مذاق صحیح رکھتا ہو اور انکی خوبیون سے متکیف نہ ہو۔ ملاحظہ ہو ؎

اس موج خیز دہر مین ہے تو حباب سا — آنکھیں کھلیں تری تو یہ عالم ہو خواب سا
دوزخ ہوا ہے ہجر مین اسکے جہان ہمین — سوز دروں سے جان پہ ہر اک عذاب سا
مدت ہوئی کہ دل سے قرار و سکون گئے — رہتا ہے اب تو آٹھ پہر اک عذاب سا
مواج آب سا ہے ولیکن اٹھے ہے خاک — ہے میر بحر بے تہ ہستی سراب سا

ان شعرون کے جذبات و حسیات کسقدر کیف اندوز و حسرت خیز ہین ؎

جی رک گئے ای ہمدم دل خون ہو بھر آیا — اب ضبط کرین کبتک منہ تک تو جگر آیا
تھی چشم دم آخر وہ دیکھنے آئیگا — سو آنکھوں مین جی آیا پر وہ نظر نہ آیا

اسی طرح یہ اشعار بھی قابل انتخاب تھے ؎

ہماری خاک پہ اک بیکسی برستی ہے — ادھر سے ابر جب آیا تو اشکبار آیا
بہت تصور مین ہو ان مین کبھو ہو نہ ہمین — تو ان کو ہاتھ پھرتا ہی شوق اس در کا
پھر نہ اٹھے جو ہوئے خاک مین آسودہ — غالباً زیر زمین میر ہے آرام بہت
اسنے کھینچا ہے میری ہاتھ سے دامان اپنا — کیا کرون گر نہ کرون چاک گریبان اپنا

یہ اشعار مولوی صاحب کے سیکڑون انتخاب کردہ شعرون سے بہتر ہین لیکن انکے ذوق انتخاب کی نیرنگی سے انہین انتخاب مین جگہ نہ مل سکی۔

ایک غزل کے یہ دو شعر کسقدر دلپذیر ہیں مگر انتخاب میں نہیں پائے جاتے ؎

قفس تو یاں سے گئے پر رہا ہو صیاد — چمن کی صبح کوئی دم کو شام ہے صیاد

مجھی میں ہیں نہیں ایسا پھنسا کہ چھٹ نہ سکوں — مجھے تو ہر رگ گل تار دام ہے صیاد

یہ شعر کس قدر بلیغ و سبق آموز ہے اور لاشبہہ قابل انتخاب تھا ؎

سدا ہو خانہ خراب باغباں کا گل جہاں مانع — سمجھ اے عندلیب اس باغ سے کہ نکہت نکل

ایک غزل کے یہ دو شعر کسقدر حسرت انگیز ہیں ؎

سن اے بیدرد گلچیں غارت گلشن مبارک ہو — پہنک گوش مجھ جانب فریاد بلبل کر

نہ دو اثر کہ اتنا نہ کچھ امید طالع سے — دل بیتاب کو کس منہ سے کہوں ٹک تحمل کر

ذیل کی غزل کتنی پیاری ہے اور اعلیٰ درجہ کی خوبیوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ صداقت جذبات اور فطری کیفیات نے اسے لبریز کر دیا ہے مگر حیرت ہے کہ مولوی صاحب کے ذوق طبیعت نے ایک شعر بھی انتخاب کے قابل نہ سمجھا۔ ملاحظہ ہو ؎

گر رحم ٹک کیک ستم جو پر جفا کار اسقدر — اک سینہ خنجر سیکڑوں دل کیجاں آزار اسقدر

بلبل گئی میری صورت دیکھ عاشق میں تکنے لگا — میں آشنا خواہاں ان تلک نہ مجھ سے بیزار اسقدر

منزل پہنچا آگے سب چونکے ہے سکون — یکسر قدم میں آن بلے پھر راہ پر خار اسقدر

یہ دو شعر بھی بہت خوب ہیں ؎

قید قفس سے چھوٹکے دیکھا جلا ہوا — پہونچے نہ ہوتے کاش کے ہم آشیاں تلک

دوسرا شعر حافظ کے اس شعر کا ہم معنی ہے ؎

چون پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون رو — رندی و ہوسناکی در عہد شباب اولیٰ

یہ شعر کسقدر تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے ؎

اندوہ عندلیب کی آواز کچھ خموش — شاید نکل گیا کہو اس نے ہائے گل

اس شعر کا تخیل بھی قابل داد ہے ؎

ہم چشم ہے ہر آبلہ پا کا مرا اشک — از بس کہ تری راہ میں آنکھوں سے چلا ہوں

ایک غزل کے یہ تین شعر بھی حسرت انگیز ہیں اور قابل انتخاب تھے خصوصاً دوسرا شعر تو صداقت جذبات کا آئینہ ہے۔

آنکھیں ہی کھلی رہی ہیں مرنے کے بعد میری — حسرت یہ تھی کہ اسکو میں ایک نگاہ دیکھوں

یہ دل وہ جا ہے جسمیں دیکھا تھا تجھکو بستے — کن آنکھوں سے اب اجڑا اس گھر کو آہ دیکھوں

چشم و دل و جگر یہ سارے ہوئے پریشان — کس کس کی تیرے غم مین حالت تباہ دیکھون

مختلف غزلون کے یہ اشعار بھی قابل انتخاب تھے ؎

تربت سے عاشقونکی نہ اُٹھا کبھو غبار — جی سے گئے و لے نہ گئین رازداریان

کبتک خراب سعی طواف حرم رہون — دل کو اُٹھا کے بیٹھیے منزلگہ کنشت مین

چلا نہ اُٹھکے وہین چپکے چپکے پھر تو میر — ابھی تو اسکی گلی سے پکار لایا ہون

داغ ہو اسو آہ کے صدمے سے ہوچکا — ڈرتا ہون یہ کہ اب کہین ٹکڑے جگر نہو

کہانتک ناز برداری کرون شام غریبانکی — کہین گرد سفر سے جلد بھی صبح وطن نکلے

کیونکر بجھاؤن آتش سوزان عشق کو — ہے ربط خاص چشم کو افشائے راز سے

ذیل کی غزل سوز و گداز، درد و حسرت، یاس و بیکسی، سے کسقدر معمور ہے اور ہر شعر اسکا کیف انگیز ہے مگر مولوی صاحب کے سنگین دل پر یہ غزل بھی اثر نہ کر سکی ؎

آرام ہو چکا مرے جسم نزار کو — رکھے خدا جہان مین دل بیقرار کو

ہنستا ہی مین پھرون جو مرا کچھ ہو اختیار — پر کیا کرون مین دیدۂ بے اختیار کو

کس کس کی خاک انکے ملاتی ہے خاک مین — جاتی ہے پھر نسیم اسی رہگزار کو

سرگشتگی سوائے نہ دیکھا جہان مین کچھ — اک عمر خضر سیر کیا اس دیار کو

گر ساتھ لے گیا تو دل مضطرب تو میر — آرام کر چکا ترے مشت غبار مین

یہ غزل بھی حقائق و معارف، اخلاق و تصوف، سوز و گداز، کے جذبات سے مالا مال ہے مگر اسکا ایک شعر بھی مولوی صاحب نے داخل انتخاب نہ کیا حیرت ہے - ملاحظہ ہو ؎

دل صاف ہو تو جلوہ گہ یار کیون نہو — آئینہ ہو تو قابل دیدار کیون نہو

عاشق ہوئے تو گو غم بسیار کیون نہو — ناسور چشم ہو مژہ خونبار کیون نہو

ہر دم کی تازہ مرگ جدائی سے تنگ ہون — ہونا جو کچھ ہے آہ سو یکبار کیون نہو

موئے سفید ہمکو کہے ہے کہ غافلان — اب صبح ہونے آئی ہے بیدار کیون نہو

کامل ہو اشتیاق تو آتا نہین ہے دور — حشر دگر یہ وعدۂ دیدار کیون نہو

گلگشت کا تو لطف دل خوش سے ہے نسیم — پیش نظر وگرنہ چمن زار کیون نہو

ایک اور غزل جسکا کوئی شعر مولوی صاحب کے انتخاب مین جگہ نہ پا سکا قابل انتخاب تھی - اسکے بھی تین اشعار ملاحظہ ہون ؎

خوش سرانجام تھے وہ جلد جو ہشیار ہوئے | ہم تو اے ہمنفسان دیر خبردار ہوئے
جنس دل دونوں جہاں کی جو اٹھا سکتا | یک نگاہ مول ہوا تم نہ خریدار ہوئے
میر گلزار مبارک ہو صبا کو ہم تو | ایک پرواز نہ کی تھی کہ گرفتار ہوئے

ایک غزل کے یہ دو شعر بھی کسقدر کیف انگیز ہیں ؎

لیکے بھی سیر باغ کی جی میں ہوس رہا | اپنی جگہ بہار میں کنج قفس رہا
میں پا شکستہ جا نہ سکا قافلہ تلک | آتی اگرچہ دیر صدائے جرس رہی

ایک دوسری غزل کے یہ تین شعر بھی مردود توجہ سمجھے گئے مگر کون ذوق شناس انکے محاسن سے انکار کرسکتا ہے ؎

اس باغ بے ثبات میں کیا دل صبا لگے | کیا کیا نہال دیکھتے یاں پاؤں اکھڑ لگے
کسکو خبر ہو کشتی تباہوں کے حال کی | تختہ مگر کنارے کوئی بہکے جا لگے
مقصود کیمیا میں بہتوں نے چھانی خاک | عالم تمام وہم ہو یاں ہاتھ کیا لگے

بیدل کا ایک مشہور شعر ہے ؎

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست | شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

اس مفہوم کو میر صاحب یوں بیان کرتے ہیں ؎

ناطاقتی ہی جو رہتی ہے مجھے آوارگی | کیجیے کیا میر صاحب بندگی بیچارگی

اسکے بعد کا شعر ہے ؎

کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں | دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا یکبارگی

مگر مولوی صاحب کی نگاہ انتخاب میں دونوں شعر محاسن شعری سے معرا معلوم ہوئے۔ تعجب ہے۔ ذیل کا مطلع جو محاسن شعر کا آئینہ ہے انکو صاحب ذوق ہی سمجھ سکتا ہے مگر مولوی صاحب کی نگاہ انتخاب بھلا اس پر کیوں پڑنے لگی تھی۔ وہ تو ایسے رکیک شعر پر سر دھنتے ہیں ؎

جو شغل کے ہیں بتاں مشہور | بس یہی اعتبار رکھتے ہیں

وہ ایسے عمدہ شعروں کی قدر کیا جانیں۔ ہائے کیا کہا ہے ؎

اسیر زلف کرے قید کہ کمند کرے | پسند اسکی ہے وہ جسطرح پسند کرے

اس غزل کے یہ دو شعر بھی قابل انتخاب تھے ؎

ہمیشہ چشم ہے نمناک ہاتھ دل پر ہے | خدا کسو کو ہماسا بھی دردمند کرے
بڑی بڑوں کو جھکاتے ہی سر ہے اسدم | پکڑ کے تیغ وہ اپنی اگر بلند کرے

ذیل کے دو شعروں میں مسئلۂ وحدت الوجود کو کس خوبی سے بیان کیا ہے مگر مولوی صاحب کو شاید تصوف سے ذوق نہیں ہے اسی لیے
ان کو نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ انکے انتخاب میں بعض ایسے اشعار بھی دیکھنے میں آتے ہیں جن میں تصوف و معرفت کی جھلک
پائی جاتی ہے۔ بہر کیف۔ ملاحظہ ہو ؎

آنکھیں جو ہیں تو عین ہے مقصود ہر جگہ | بالذات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ
واقف ہو شان بندگی سے قید کیا | سر ہے نہیں جھکا کہ ہے مسجود ہر جگہ

اسی طرح یہ دو قابل انتخاب شعر بھی نگاہ توجہ سے محروم رہے ؎

جو کوئی خستہ جگر عشق کا آزار ہوا | جی چکا وہ کہ یہ بے طرح کی بیماری ہے
کاروان گاہ جہاں میں نہیں رہتا کوئی | جسکے ہاں دیکھتے ہیں چلنے کی تیاری ہے

یہ دو شعر بھی مولوی صاحب کے تغافل کے فریادی ہیں ؎

وہ دل شکار آن جو نکلا شکار کو | انداز یک نگاہ سے مارا ہزار کو
چلنا پڑی ہے رکھ کے قدم تیغ تیز پر | کس ڈھب سے کاٹیں اس رہ مشکل گذار کو

ذیل کے اشعار کیفیت سے خالی نہیں مگر مولوی صاحب نے انہیں بے کیف سمجھا ؎

کیسا چمن اسیری میں کسکو ادھر خیال | پرواز خواب ہو گئی ہے بال و پر خیال
مشکل ہے مٹ گئی ہوئی نقشوں کی پھر نمود | جو صورتیں بگڑ گئیں انکا نکر خیال

اشعار ذیل کی تاثیر سے کون دل ہے جو متکیف نہ ہو سکے مگر ایک مولوی صاحب کا دل ؎

خوب تھے وہ دن کہ ہم تیرے گرفتاروں میں تھے | غمزدوں اندوہگینوں ظلم کے ماروں میں تھے
مر گئے لیکن نہ دیکھا تو نے ادھر آنکھ اٹھا | آہ کیا کیا لوگ ظالم تیرے بیماروں میں تھے

یہ دو شعر بھی کتنے کیف اندوز و جذبات افروز ہیں ؎

عشق ہمارے در پئے جاں ہے کیسی صحبت کے ناز | چین نہیں دنیا ہے ظالم جبتک عاشق رہتا ہے
شاید لمبے بال کسی کے بکھری تھی اے باد صبا | دل تو پریشان تھا ہی رات جی بھی بکھر گیا

ذیل کے مطلعوں کو دیکھئے۔ جوش و اثر، سادگی و بے ساختگی، سوز و گداز، درد و حسرت، جذبات و کیفیات سے کس قدر
معمور ہیں مگر مولوی صاحب کی عدالت میں انکی کوئی شنوائی نہیں ؎

خبر تھی تجھے کیا ہے دل کی طاقت کی | نگاہ چشم ادھر تو نے کی قیامت کی
جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے | اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے
دل کو نہیں ہے چین نہ اب خواب شب مجھے | مرنا پڑا ضرور ترے غم میں اب مجھے

ہم بیکسوں کا کون ہو جز درد و غم شریک — تنہائی ایک ہے سو اپنا ستم شریک

جسے دیکھا کرتے ہیں ادا کیا ایک ہی — ایک دل قطرہ خون تھا سو جفا کیا کیا

کبھی میر اس طرف آکر جو چھاتی کوٹ جاتا ہے — خدا شاہد ہے اپنا تو کلیجہ ٹوٹ جاتا ہے

جس کو یاد کر کر میر بھی فریاد کرتا ہے — کوئی ایسا ستم دنیا مین اے جلاد کرتا ہے

ہے تمنائے وصال اس کی مری جان کے ساتھ — جان ہی جائیگی نہ کہ اس ارمان کے ساتھ

جنون سے کر دم الفت یہ بھی زیر و دام ہے — مسلمان ہو خدا لگتی نہین کہتے دیا ہے

ہائے ستم ناچار معشوق کی پڑی بہر الم کیا ساتھ — جلوہ تو زمین کی ہوتی کاش ایک سال بہار

مسلم خان اللہ کو تمیز نے تشبیہ کے ذریعہ سے کسقدر رنگین کر دیا ہے۔ اس جدت کے ساتھ شاید ہی کسی نے اردو مین لکھا ہو۔ مگر باوجود ان خوبیون کے مولوی صاحب نے اسکو قابل انتخاب نہ سمجھا ۔

جو کر آنکھ ہو تو یہی ہین اسکے جیسے — بوند پانی کی نہین آتی نظر پانی مین

اکبر دانا پوری کا ایک شعر ہے ۔

کفن کی فکر کیا ہم جیتوں کے واسطے اکبر — کسی جا سو رہینگے اوڑھ کر دامن بیابان کا

اس شعر کا ماخذ میر کا یہ شعر ہے اور کتنا خوب ہے مگر انتخاب مین نہ آیا ۔

ہم کشتہ عشق ہین ہمارا — میدان کی خاک ہی کفن ہو

یہ شعر دل کی ایک فطری کیفیت کو ظاہر کرتا ہے اور فلسفہ جذبات کا ماہر اسکی داد دیے بغیر نہین رہ سکتا مگر مولف قواعد اردو مستغنی ہے ۔

ہوتی ہے دل کی محویت یکسان یا غم شادی — نہ مرنے کا ہے ماتم مرے جینے کی شادی ہے

غرض کہان تک لکھون - ایک دفتر ہے جو ختم کرنا نہین ہوتا۔ مجھے جہان تک ممکن تھا عمدہ عمدہ اشعار چھانٹ کر ان کو مولوی صاحب نے اپنے نادر انتخاب مین جگہ نہ دی اگر کوئی اہل ذوق کلیات میر کا بالاستیعاب مطالعہ کرے تو ایسے اور جواہرات مل سکتے ہین جو دامن انتخاب مین نہ آسکے۔ میری رائے مین "انتخاب کلام میر" اس قابل ہے کہ انجمن اسکو ارباب نظر کے سامنے پیش کرے تاکہ معمولی معمولی اشعار نظر انداز کر دیے جائین اور عمدہ عمدہ اشعار ملحق کر لیے جائیں۔ کیا مین امید کرون کہ آئندہ ایڈیشن مین انجمن اس اہم کام کی طرف متوجہ ہو کر ان نقائص کو دور کریگی۔

یا ایک ایسا ایڈیشن شائع کریگی جو ہر لحاظ سے مکمل کہا جا سکے ؟ ۔

(اڈیٹر) جہان تک ہمین معلوم ہے یہ انتخاب مولوی عبدالحق صاحب نے نہین کیا بلکہ یہ مجموعہ ایک اور صاحب کی ذہانت کا ۔

سید شاہ ولی الرحمن ولی۔ بی اے۔ کاکوی

ابو نصر فارابی

جن مشاہیر کو مرے ہوئے صدیاں گذر چکی ہیں اُنکے تذکروں میں بھی بصیرت کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ کسی باکمال کے زندہ جاوید ہونے کا اس سے زیادہ کیا معجزہ ہے کہ لوگ اسکو اپنے دلوں میں یا اسکی یاد سے اپنے خیالات کی اصلاح کرتے رہیں۔ فلسفہ کا معلم ثانی لیکن اہل اسلام کا معلم اول ابو نصر فارابی انہیں لوگوں میں سے ایک ہے جو زندہ ہے اور زندہ رہیگا جب تک اُسکے دماغی افکار باقی ہیں زندہ رہیگا۔

فارابی نے معلم ثانی کا خطاب کس طرح حاصل کیا؟ فلسفہ یونان کی بے شمار تصنیفات خلفائے عباسیہ کی بدولت عربی میں ترجمہ ہو چکی تھیں لیکن اکثر ترجمے ناقص تھے اور باہم مختلف۔ نوح بن نصر نے جو خاندان سامانیہ کا تاجدار تھا فارابی کو بلا کر فرمائش کی کہ ان تراجم کو سامنے رکھکر ایک صحیح اور جامع ترجمہ تیار کر دے، فارابی نے اس فرمائش کی تعمیل کر کے کتاب کا نام "تعلیم ثانی" رکھا، اس واقعہ کو تاریخی حیثیت سے یاد رکھنا چاہیے کہ حکمائے اسلام میں فارابی نے "معلم ثانی" کا خطاب اس کتاب کی بدولت حاصل کیا تھا، افسوس ہے کہ وہ کتب خانہ جس میں اس کتاب کا مسودہ فارابی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا جل کر خاک ہو گیا

اسلام کی تیسری صدی (سنہ ۲۶۰ھ) میں یہ "معلم ثانی" پیدا ہوا ہے، نسل کے اعتبار سے فارسی (ترکی) تھا، اسکی کنیت ابو نصر اور نام محمد بن اوزلغ تھا، فاراب اسکا آبائی وطن تھا۔ اسکی پیدائش اُس زمانہ میں ہوئی تھی جبکہ فن تاریخ نے گہوارے سے پاؤں نکالنا شروع کئے تھے اسلئے اسکے ابتدائی حالات سے تاریخ ساکت ہے۔ اسکا باپ ایک فوجی عہدہ دار تھا اسلئے ابو نصر کی ابتدائی تعلیم جس انداز کی ہوئی ہوگی ظاہر ہے چونکہ فطرت کو آگے چلکر اُسے "معلم ثانی" بنانا تھا اور خدا نے غیر معمولی دماغ و حافظہ بھی عطا فرمایا تھا اسلئے اُسنے اپنی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کو بھی سیکھا اور پوری دستگاہ حاصل کر لی۔ عربی زبان کے ملک کی دوسری زبان کی استعداد بھی اسلئے اسکی تحصیل سے اُسوقت معذور رہا، مگر اُسنے اس ضروری کمی کو پورا کرنیکا ارادہ کر لیا۔

ابن خلکان نے لکھا ہے کہ "فارابی فلسفیوں میں اپنا مثل نہیں رکھتا تھا اور جن جن علوم و فنون سے اُسکا دماغ بہرہ اندوز تھا اُن میں کوئی شخص اُسکا مقابل نہ تھا۔ شیخ الرئیس بو علی سینا نے اپنی تصنیفات میں اسکی کتابوں کا تتبع کیا اور اُسکے اقوال سے مستفید ہوا۔ علم کے شوق نے اُسکو گھر سے نکالا اور وہ نکل کر مختلف شہروں میں سیاحی کرتا اور ہر جگہ کے واقعات و حالات، رسوم و رواج اور طرز معاشرت سے واقفیت پیدا کرتا ہوا۔ بغداد پہنچا جو اُسوقت اسلامی دنیا میں علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا اور جہاں کی علمی شعاعیں دور دور پھیلی ہوئی تھیں، بغداد کے شاہی دربار میں علماء و فضلاء کی مسندیں ایک امتیازی خصوصیت پیدا کئے ہوئے تھیں۔ فارابی نے یہاں عربی کی تحصیل شروع کر دی، بسر اوقات کیلئے ایک معمولی سی ملازمت کر لی، کوئی کہتا ہے کہ باغ کی خدمت پر تھا، اور کوئی باغبان بتاتا ہے۔ خیر جو کچھ بھی ہو مگر یہ یقینی ہے کہ نہایت عسرت سے بسر کرتا تھا اور معاش کی قلت ایک چراغ کیلئے تیل بھی مہیا کر سکتی تھی مگر چوکیداروں کی قندیلیں اُسکے لئے روشن تھیں جنکے سہارے وہ تمام تمام رات پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہتا۔ عربی کی تحصیل میں اُسنے ایسی ایسی ریاضتیں اور کوششیں کیں کہ تھوڑے ہی دنوں کی لگاتار محنت نے اُسنے عربی کو اپنی مادری زبان بنا لیا۔ اُسکے بعد منطق کی طرف متوجہ ہوا اور حکیم ابو البشر متی بن یونس سے منطق کا درس لینے لگا۔ ابو البشر کی برابری کا دعوی اُس زمانہ میں کوئی نہ کر سکتا تھا۔ تالیفات میں حسن عبارت اور لطف اشارات کو مد نظر رکھتا تھا۔ ابو البشر کی تقریر عالمانہ اور متانت و برجستہ و شستہ ہوتی تھی، اہم سے اہم علمی مسائل کو وہ ایسے سہل ممتنع طریقہ سے حل کر دیتا تھا کہ پڑھنے والے اسکے شش

دا ے حیرانی مقصد رہا ہے۔ اسی لئے اس فن کے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ابونصر فارابی جو دقیق معانی و مطالب کو سہل الفاظ اور آسان و سلیس
عبارت میں سمجھا دیتا ہے یہ حکیم ابونصر کا فیضان ہے۔

فارابی نے بغداد ہی میں علوم فلسفہ کو بھی پڑھا۔ ارسطو کی تمام کتابوں کو بھی جمع کیا۔ اسکو تصانیف ارسطو سے اسقدر شوق تھا کہ خود نسخہ
لکھا ہے کہ میں نے ان کتابوں کو دو دو سو مرتبہ پڑھا ہے۔ نیز اسی کا قول ہے کہ میں نے ارسطو کی کتاب (سماع طبعی) کا چالیس مرتبہ بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور
میری خواہش ہے میں ابھی اسکے مکرر مطالعہ کا محتاج ہوں۔ کسی نے فارابی سے پوچھا کہ فن کا سب سے بڑھکر کون ماہر ہے تم یا ارسطو؟ اس نے کہا؛ اگر میں ارسطو
کا زمانہ پاتا تو اسکے شاگردوں میں خاص امتیاز رکھتا۔ فلسفہ کے متعلق ابونصر کا یہ قول ہے کہ فلسفہ یونانی لفظ فلاسفی کا معرب ہے۔ کلمہ فلاسفی فیلا اور
سوفیا دو لفظوں سے مرکب ہے۔ فیلا محبت اور دوستی کو کہتے ہیں اور سوفیا حکمت کے معنوں میں آتا ہے لفظ فیلسوف اسی فلاسفی سے مشتق ہے۔ اصل میں
یونانی لفظ فیلسوفوس تھا، عربی لب و لہجہ نے اسکی صورت بدلکر فیلسوف بنالیا۔ اسکے معنی محب حکمت کے ہیں۔ یہ لقب اس شخص کے لئے موزوں ہے
اور اسی کو مل سکتا ہے جس نے اپنی زندگی کا مقصد علم و حکمت کی خدمت اور اسکی ترقی کی کوشش ٹھہرایا ہو۔

ابونصر فلسفہ کا امام تھا اس نے محققانہ و مجتہدانہ انداز سے فلسفہ کے تمام شعبوں میں اپنے کمالات کا حقیقی ثبوت دیا ہے۔ ابوالقسم صاعد
اندلسی نے طبقات الامم میں لکھا ہے کہ فارابی فی الحقیقت مسلمانوں کا فیلسوف ہے۔ فن منطق کو یوحنا ابن حیلان سے (جسکا انتقال بغداد میں بعہد خلیفہ معتضد
ہوا) اخذ کیا۔ اسلام کے تمام فنون کو قید ضبط میں لایا۔ ان علوم کی تحقیق و تدقیق میں سب پر فوقیت لے گیا۔ ان کے غوامض و اسرار کو حل کیا۔ ان کی تعلیم
و تعلم اور ضروری باتوں کو آسان اور قریب الفہم کر دیا۔ ان علوم میں مستند کتابیں، دلکش عبارت اور لطیف اشاروں میں تصنیف کیں۔ انہی ایک اور نادر کتاب
علوم کی تقسیم و غایت کے بیان میں لکھی تھی۔ یہ اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے۔ اس سے پہلے کسی نے اس بحث پر کچھ نہیں لکھا تھا۔ اس کا ایک نسخہ
اسکوریال (واقع اسپین) کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

فارابی نے بغداد میں مسلسل تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ ان میں کامل اور اپنے ہمعصروں سے ممتاز ہو گیا۔ بغداد ہی میں
وہ اکثر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کیں۔ بغداد سے دمشق پہنچا اور وہاں چند روز قیام کر کے مصر چلا گیا۔ اس نے اپنی کتاب سیاست مدن میں ذکر کیا ہے کہ
کہ اسکی تالیف کا آغاز بغداد میں ہوا اور اتمام مصر میں۔ [illegible]ء میں یہ کتاب لیڈن (ہالینڈ) میں طبع ہوئی اور اب مصر میں بھی چھپ گئی ہے جب مصریوں
کی حلاوت سے فارابی کے علم کا ذائقہ سیر ہو گیا تو سیاح فارابی نے دمشق کا راستہ لیا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا اسوقت وہاں سیف الدولہ بن حمدان کا عہد تھا
جس نے فارابی کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کیا اور قدردانی کا سلوک۔

طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے ابونصر نے خود درس کا سلسلہ شروع کیا۔ طلبہ کثرت سے اسکی طرف رجوع ہونے لگے وہ تنہائی کو نعمت سمجھتا اور علمی
مسائل پر غور و خوض اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ رکھنے کے لئے دریا کا کنارہ اور باغوں کی سبزی مرغوب طبع تھی۔ درویشانہ زندگی نے اسباب راحت
کو ٹھکرا دیا تھا۔ دنیاوی شان و شوکت کو وہ نمائش سمجھتا تھا۔

امیر سیف الدولہ نے اپنے بیت المال سے چار درہم یومیہ مقرر کر دیئے تھے اس پر قناعت کرتا تھا۔ اس حکیم جلیل القدر کو دیکھیے اور چار
درہم یومیہ کو خیال کیجیے۔ ایک درہم ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے گویا اسکی ساری معیشت چاندی کی آجکل کی ارزانی کے لحاظ سے ایک روپیہ

معلوم ہوتا ہے کہ کسی فاقہ کشی یا انکی فرح کا کمال لکر کے اس سے روگئی ہوگی ابو نصر کا نہ گھر تھا اور نہ سامان خانہ داری پر نظر کرکے یہ خیال ہوتا ہے کہ فارابی شاید حضرت مسیح کی زندگی کا مقلد تھا۔ نہ لباس کی صفائی کا خیال تھا اور نہ پھٹے پرانے پر نظر، علم اُسکا اوڑھنا بچھونا تھا اور ہر وقت اُسکی تلاش جستجو میں انہماک تھا۔ یا سیر و سیاحت سے دلچسپی۔

ابو نصر کی تصانیف سو اسو کے قریب بتائی جاتی ہیں اسکی تصانیف کا بڑا حصہ چھوٹے چھوٹے پرزوں پر تھا اسی لئے اکثر کتابیں ضائع ہو گئیں اب چند گنتی کی رہ گئی ہیں جن میں کچھ اصل عربی میں ہیں اور بعض کا عبرانی میں ترجمہ پایا جاتا ہے۔ ارسطو کی کتاب ارغنون (تنظیم المنطق) کا اس نے نہایت پاکیزہ ترجمہ کیا تھا۔ فارابی کے تصنیف و تالیف کا اصل میں قابل تقلید یہ طریقہ ہے کہ ترجمہ لفظی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ کتاب کے صحیح مفہوم کو اپنے روزمرہ کی سیدھی سادی زبان میں اسقدر خوبی کے ساتھ ادا کر دیتا تھا گویا خود اپنا خیال بے تکلفی سے ظاہر کر رہا ہے منطق اور الہیات میں امام فن مانا جاتا ہے۔ امام غزالیؒ اور اکثر علماء اسلام نے فارابی پر کفر کے فتوے تک دیئے تھے۔ ظاہراً اس تکفیر کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسکی کتابیں حشر اجساد سے انکار کرتی ہیں جو در حقیقت حکماء یونان کے اقوال کی ترجمانی ہے نہ کہ فارابی کا عقیدہ چنانچہ رسالہ فصوص جو فارابی سے منسوب کیا جاتا ہے ان خیالات کا مخالف ہے۔ فارابی ایکساہی وقت میں حکیم بھی تھا اور فلسفی بھی منطقی بھی تھا اور ادیب بھی فقہ و احادیث، مذہب و مناظرہ غرضکہ جملہ علوم عقلی و نقلی کا جامع تھا۔ مولانا نفیس جو بہت بڑے حاذق اطباء میں گذرے ہیں، اپنی کتاب شرح اسباب میں فرماتے ہیں کہ فارابی مالیخولیا میں مبتلا تھا اور یہ بھی نقل کیا ہے کہ اکثر فلاسفر جیسے افلاطون اور دوسرے حکماء جو اسکے ہم پلہ تھے۔ یہ سب لوگ اپنے دماغی انہماک کیوجہ سے اسی مرض میں مبتلا تھے۔ بو علی سینا [illegible] میں مشہور تھا جیسا کہ ابی تاریخ نے مشہور کیا ہے۔

سیف الدولہ کا دربار ہر فن کے کاملین کا مجمع تھا۔ ایک روز فارابی بھی ترکی لباس میں اسکے شاہانہ دربار میں پہنچ گیا اور سیف الدولہ کے سامنے کھڑا ہو گیا، سیف الدولہ نے بیٹھ جانے کے لئے اشارہ کیا، فارابی نے کہا۔ کہاں بیٹھوں میں جس جگہ کے لائق ہوں وہاں یا تم جس جگہ کے لائق ہو وہاں؟ بادشاہ نے کہا تم جس جگہ کے لائق ہو۔ یہ سنکر فارابی لوگوں کو پھاندتا ہوا بادشاہ کی مسند پر جا بیٹھا اور اسکو دھکے دیکر ہٹا دیا بادشاہ کے پاس ہی غلام حاضر تھے جن سے وہ ایک غیر معروف زبان میں بات چیت کیا کرتا تھا جسکو ان غلاموں کے سوا کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا تھا بادشاہ نے غلاموں سے کہا کہ اس شخص کو اپنی گستاخی و بے ادبی کا خمیازہ اچھی طرح بھگتنا چاہیئے اگر اس نے میرے سوالات کے معقول جواب نہ دیئے تو تم لوگ اسکو جلا کر خاک میں ملا دینا۔ فارابی اسی زبان میں جواب دیتا ہے "کہ اے بادشاہ صبر سے کام لے ہر کام کے انجام کا لحاظ ضروری ہے" بادشاہ تعجب سے پوچھنے لگا کہ کیا تم اس زبان کو جانتے ہو۔ فارابی نے کہا کہ میں سب زبانوں سے زیادہ جانتا ہوں۔

یہ واقعہ روضۃ الصفا سے ماخوذ ہے مگر عقل سلیم اسکو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتی اس لئے کہ فارابی کا علم و حکمت تہذیب و انسانیت اور بادشاہ کا رعب و سطوت یہ تمام باتیں ہرگز اس امر کی مقتضی نہیں کہ فارابی سے ایسا خلاف تہذیب امر وقوع میں آیا ہو۔ فارابی نے سیف الدولہ کے دربار میں علماء و فضلاء سے مختلف مباحث پر مکالمہ شروع کیا، کون تھا جو اسکے مقابلہ میں ٹھہر سکتا، جو لفظ نکلتا تھا وہ علمی خزانہ پر اترا ہوا، علماء دربار حیران ہو گئے اور جواب دینے کے بجائے اُسکی تقریر کو قلمبند کرنا شروع کر دیا جب دربار برخاست ہوا تو بادشاہ نے فارابی کو روک لیا اور بسر اوقات کی تواضع کی، فارابی نے کہا میں اسکا عادی نہیں اور نہ کبھی اس سے اپنے ہونٹوں کو تر کیا ہے، ہاں گانا جسکو

کارخانہ اصغر علی محمد علی ابتک اس تدبیر کی نگرانی میں ہے جو چالیس سال سے کام کر رہا ہے

عودِ شباب

افسانہ

(۱)

ہر شام جب شفق مغرب کی زرین سرخیاں اولمپس کی مقدس چوٹیوں پر لالہ پاشی میں مصروف ہوتیں، اور دیوتاؤں کے محبوب مسکن کی دلفریب وادیاں آفتاب کی آخری شعاعوں سے منور ہو جاتیں تو بوڑھا ساحر ایک طویل آہ سرد کے ساتھ افسردگیوں کی نیند سے بیدار ہوتا۔ اپنے بوسیدہ بربط کو اٹھاتا۔ اور دامن کوہ میں پانی کے ایک بلوریں چشمہ کے کنارے جا بیٹھ جاتا۔ اسکے لرزاں ہاتھ بربط کے زنگ آلودہ تاروں کو نغمہ آفرینی کا پیغام دیتے اور مقدس مسکن کی مقدس فضا اسکی موسیقی سے معمور ہو جاتی۔ یہ اسکا معمول تھا

ہر صدا جو بربط کے تاروں کی لرزش سے پیدا ہوتی۔ دنیا کے عہد اولین کی معصومیت کی تفسیریں کر اس وادی کی وسعتوں پر چھا جاتی جس کی پاک بلندیاں ابھی تک انسانی معصیت کی عریانیوں پر خندہ زن تھیں۔ اور دیوتاؤں کے بلند قہقہے جو ابن آدم کے گنہ آلود کان نہیں سن سکتے۔ خاموش ہو جاتے حسین اور طلعت دیویاں اپنے دلفریب مشاغل کو چھوڑ کر ہمہ تن محو ہو جاتیں۔ اور آسمانی ہستیوں کی یہ مختصر سی آبادی۔ خاموش ہو جاتی۔

ایک شام جب آفتاب کی روشنی میں زردی پیدا ہو گئی تھی۔ ساحر حسب معمول اپنے گوشہ تنہائی سے نکلا۔ بربط شانہ پر تھا۔ اور نگاہ ان بلندیوں پر جن کی آبادی کو وہ مدت سے اپنے ساز کی نغمہ آفرینیوں سے مسحور کرتا رہا تھا۔ وہ آہیں بھرتا اور ڈگمگاتا آیا۔ اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ نغمے حسب معمول تاروں سے بے تابانہ نکلنے اور اضطرابانہ کیفیتوں سے وادی میں گونجنے لگے۔ نسیم فردوسی بیقرار ہو کر جنبش میں آئی۔ اور ساز کی رنگینیاں جبیں قدرت نے ہمیشہ کے لئے اس وادی کی خدمت پر کر دی تھی۔ چمک اٹھیں پھول بے نقاب ہو گئے۔ اور غنچوں نے بے اختیار منہ کھول دیئے۔ اپالو دیوتا جس کے جبروت۔ اقتدار کا عکس آفتاب کی جلوہ ریزیوں سے نمایاں ہے۔ آج اسقدر متاثر ہوا۔ کہ والہانہ طور پر پکار اٹھا۔ اے خاطی انسان کے بربط نواز فرزند۔ مانگ کیا مانگتا ہے۔

بوڑھے ساحر کے ہاتھ سے بربط چھوٹ گیا۔ وہ فرط عقیدت سے سجدے میں گر گیا۔ اور بولا "پاک اولمپس کی پاک بلندیوں کے مقدس دیوتا۔ میں شباب مانگتا ہوں"۔ اسکے بعد خاموشی چھا گئی۔ اپالو کے منور چہرہ پر ایک خفیف سی تبسم کی لرزش پیدا ہوئی اور اس نے جواب دیا "جا۔ تیرے بربط کے نغموں کی شیرینی کے صلہ میں اولمپس کے دیوتاؤں کے سردار نے تیری التجا قبول کی۔ کل صبح آفتاب کی پہلی شعاع جب تیری جھونپڑی کی شکستگی کو روشن کرے گی۔ تو تو اپنے آپ کو جوان پائیگا"۔ ساحر فرط خوشی سے چلا اٹھا "فیاض دیوتا تیری تعریف ہو۔ محبت اور عشق کی برکتوں سے میرے عہد شباب کو منور کر دے"۔ آواز آئی "ایسا ہی ہو گا۔ جا کل کی آنے والی گھڑی کا انتظار کر۔ مگر اولمپس کے سردار کی نوازش کا راز افشا نہ کرنا"! بوڑھے ساحر نے کانپتی ہوئی زبان سے شکریہ ادا کیا۔ اور خوشی خوشی گھر واپس گیا۔ جب وہ اپنے شکستہ جھونپڑے میں پہنچا۔ تو رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ تمناؤں کے ہجوم سے مغلوب ہو کر۔

اس نے اپنے آپ کو اپنی لٹتی ہوئی چاندنی پر گرا دیا۔ اس کامیابی کے نشہ سے سرشار دماغ دل کی امنگوں کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ اور وہ بیہوش ہو گیا۔ ماہ عصر اسی عالم سکرات میں پڑا رہا۔ اور جب صبح اپنی نگاہ خیز یوں کو لے کر افق مشرق سے برآمد ہوئی۔ تو بوڑھا ساحر اس کے استقبال کے لئے اپنے جھونپڑے سے باہر نکلا۔ لیکن آفتاب کی پہلی شعاع اسکے جسم کو گرم نہ کر چکی تھی کہ ساحر کی جوانیاں شباب کی رعنائیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اسکے دل میں جذبات کا سمندر موجزن تھا۔ اور اسکا دماغ جوانی کی کیفیتوں سے مسحور ہو جاتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا (اور کیوں نہ چاہتا) کہ اس محدود رقبہ کی نگہبانی جہاں بڑھاپے کی بے دست و پائی نے اُسے محصور کر رکھا تھا چھوڑ دے۔ اور ان لذتوں کے لئے اپنی توانائی وقف کر دے۔ جو شباب کی سرمدی آرزوؤں نے اسکے لئے مہیا کر دی تھیں۔ اُسنے ایک حقارت بھری نگاہ اپنے جھونپڑے پر ڈالی۔ اسکا دل بڑھاپے کی اس یادگار سے بیزار ہو گیا۔ اسنے اپنے بڑھاپے کے واحد رفیق ارغنون رباب کو بھی منہ پھیر لیا۔ اسکی بوسیدہ ہڈیوں کو استغنا کے پاؤں سے ٹھکرا دیا۔ اور جوانی کی ہر من کو محبت کی مسرتوں سے آباد کرنے کا تہیہ کر لیا۔ وہ کہتا تھا "میں محبت کرونگا۔ میں کس قدر نادان تھا۔ کہ گذشتہ زندگی کی قیمتی گھڑیوں کو رباب کی نغمہ سرائی میں ضائع کر دیا۔ اور ایسے شغل سے جسکا انجام اہلیس کی بلندیوں کو جاودانی مسرتوں سے معمور رکھتا ہے۔ محروم رہا۔ اب میں اپنے دل کو حسن و عشق سے بہرہ یاب کرونگا۔ اور اپنی زندگی کی نئی مہلتوں کو جن میں اپالو نے شباب کے جوش سے کامیاب بنایا ہے۔ الفت کے قدموں پر ڈالونگا۔ جب میرے جذبات کی شورشیں رباب کے تاروں سے ہمکنار ہو کر نکلیں گی۔ تو دنیائے عشق کے افسانے سوز و ساز کی رنگینیوں سے منور ہو جائیں گے۔ میں آرزوؤں کی سرزمین کو سرسبز کر دونگا۔

اور آہوں کی ناکامیوں کو امید کی فراوانیوں میں تبدیل —

(۳)

دامن کوہ میں ایک مرغزار تھا۔ جسے آب و ہوا کی لطافت نے سبزیوں سے مالا مال کر دیا تھا۔ بہار کے جلوے ہمیشہ اُسکی آغوش میں کھیلتے رہتے۔ اور نمود و پھولوں کے رنگ اسکو ہمیشہ رنگین بنائے رکھتے تھے۔ پہاڑ کی بلندیوں کی برف ڈھل ڈھل کر آتی تھی اور اپنی روانی سے اسے شاداب بنائے رکھتی تھی۔ یہ سرزمین جسے کیوپڈ نے محبت کی جذبہ رانیوں کے لئے منتخب کیا تھا نئی نئی پرداز مخلوق کے چہچہوں اور انکے پروں کی پرواز سے آباد تھی۔ اسی سبزہ زار کے ایک سراپا بہار گوشے میں جہاں درختوں کی گھنی شاخیں ایک کنج خلوت بنانے کے لئے آپس میں ہمکنار ہو رہی تھیں۔ بوڑھا ساحر جسکو اب جوانی کی کامیابیوں نے سرور و انبساط سے معمور کر رکھا تھا۔ ایک حسن دلکش کے حضور میں دو زانو بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا "میرے رباب کے تاروں کی صدائیں اپنی ناکامی کی معترف ہیں۔ اور میرے ہنگامہ خیز جذبات اپنی نارسائیوں کا اقرار کرتے ہیں۔ کیونکہ اے نادرۂ روزگار جولیا میری موسیقی تیری بے پناہ نگاہوں سے مسحور ہو چکی ہیں۔ اور تیری سیاہ آنکھوں نے میرے دل کی تمناؤں میں ایک تلاطم برپا کر دیا ہے۔ میں تیرے شوق دیدار کی مسرتوں کی روانی میں بہا جاتا ہوں۔ آ میرے قلب کی مدہوش کیفیتیں تیرے قدموں پر نثار ہونے کے لئے بیتاب ہیں اور عشق تیرے حسن کی سحر آفرینی پر فدا ہونے کے لئے بیتاب ہیں" وہ اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ اور یہ کہہ کر حسین جولیا کے قدموں پر گر پڑا۔" اور اس کے یا اقتدار دیوتا تیری تقدیس"

جولیا کے نازک گلابی ہونٹ ایک روحانی تبسم سے رنگین ہو گئے۔ اور اسکا دلفریب حسن گرمی محبت کی سرخیوں سے چمک اٹھا کیونکہ عشق جب اپنے جذبات کو اظہار شوق میں محو کر دیتا ہے تو حسن کی زینت آرائیاں بے چین ہو جاتی ہیں۔ جولیا کی نگاہیں اعتراف محبت کی روشنی سے معمور ہو گئیں۔ اسنے فتحمندانہ انداز سے اپنے پرستار کو دیکھا۔ اور بولی "جولیس۔ اٹھو۔ کہ بہار کی جلوہ پاشیاں نسیم جان افروز سے ہمکنار ہو رہی ہیں اور آب رواں کی لرزشیں آفتاب عالم تاب سے ہم آغوش ہو کر عالم بیخودی میں رقص کر رہی ہیں۔ پرندے ہماری کامیابی کے گیت گاتے ہیں۔ اور مرغزار کے سبز پوش فرد سرور میں جھوم رہے ہیں۔ اٹھو۔ کہ حسن فطرت کے دیوتا نے سبزہ زار کو بہار کے نور سے منور کر دیا ہے۔ اور نسیم عشق کی روحانی کیفیتیں ہماری منتظر ہیں۔ آ کہ قدرت کی اعجاز نمائی کو انسانی محبت کی جادوانیوں سے منور کر دیں" جولیس اٹھا۔ مگر اس حالت میں کہ خوشی کے آنسو اسکے رخساروں پر ڈھلک رہے تھے۔ اسنے اپنی نگاہیں اٹھائیں۔ اور بے خود ہو کر اپنے آپ کو جولیا کی آغوش میں ڈال دیا۔

(۴)

جلوہ اقتدار کی خودسری نے جولیس کے شباب کو ہوس رانیوں میں بدل دیا۔ اسکا گنہگار دل معصیت کی تاریکیوں میں گم ہو گیا۔ اور اصطلح سے اسنے اپالو کی دی ہوئی نعمت کی ہتک کر کے اسکی برکتوں کو پاؤں سے روند ڈالا۔ جولیا کی سرد آہیں اور گرم آنسو باوجود اپنی تمام لجاجت اور عاجزی کے اسے گمراہیوں کی سرزمین سے واپس نہ لا سکے۔ وہ گنہگاریوں کی تاریک گہرائی میں بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ نازنین جولیا اسکی جانب سے مایوس ہو گئی۔

(۵)

جب جولیا کی زندگی کی رونق مایوسی اور ناامیدی کی افسردگیوں پر ختم ہو کر ویران و برباد ہو چکی تو اسنے جولیس کی آئے دن کی ستم رانیوں سے تنگ آ کر ارادہ کر لیا کہ انسانی جور و جفا کی ظلم انگیزیوں کی داستان دیوتاؤں کے با اقتدار شہنشاہ کے گوش گذار کرے۔ اور اپنے خون شدہ دل کی حسرتوں کو خود ابلیس کی قدسی صفات مخلوق کے پاؤں میں ڈال دے۔ چنانچہ ایک رات جب کہ جولیس کے معصیت آفرین قہقہے پاکدامنی کی ہنسی اڑا رہے تھے۔ جولیا بستر سے اٹھی (ارادے کا استحکام اسکے کمزور اور نحیف جسم کو سنبھالے ہوئے تھا) اور جولیس کی خوابگاہ میں داخل ہو گئی۔ اور بے اختیار ہو کر پکاری "اپالو کی فیاضی کو اپنی بد اعمالیوں سے ذلیل کرنے والے انسان اپنی زنگیتگی کا افسانہ میرے افسردہ جسم کی شکنوں میں پڑھ۔ میری آنکھیں تو تیری جفاکاریوں کا ماتم کرتی ہیں۔ خدا کی نامہربانیوں نے تمہیں خاموش کر دیا۔ تونے اپنی کس مپرسی کا زمانہ فراموش کر دیا ہے۔ مگر یاد رکھ وہ دیوتا جسنے تجھ کو اپنے بے بدل انعام سے سرفراز کیا ہے۔ میرے دکھ درد کے آنسو بھی قبول فرمائیگا۔ میں آج ہمیشہ کے لئے سیاہ کاریوں کی اس چار دیواری سے جسے تیرا غرور شاہی محل کے نام سے پکارتا ہے۔ رخصت ہوتی ہوں۔ خبردار ہو جا۔ کیونکہ سیاہ کاریوں کی عمر تھوڑی ہوتی ہے۔ اور بد اعمالیاں بہت جلد بے بسی میں بدل جاتی ہیں" وہ خاموش ہو گئی۔ جولیس جسکا دماغ اسوقت شراب لالہ گوں کی مستیوں کا سنت پذیر تھا۔ چلایا۔ "یہ دیوانی کون ہے۔ دربان۔ یہ شاہی محل میں کیسے آ گئی" دربان بھاگا آیا۔ مگر جولیا جا چکی تھی۔

(۶)

شام ہو چکی تھی۔ اور دن کا فرمانروا یعنی آپالو روشنی کے طویل سفر سے ابھی ابھی واپس لوٹا تھا۔ شفق کا تبسم اسکے نورانی ہونٹوں کو شگفتہ کر رہا تھا اور اسکی پیشانی انوار آسمانی کے جلووں سے تابندہ تھی۔ جب اسکے سریع السیر قدموں نے المپس کی بلندیوں کو روشنی کی برکتوں سے منور کر دیا۔ اور

اُسکی عظمت و بندگی کے پرستار تھے کہ اُسکے نورانی ہاتھوں کو اپنی فرمان برداری کی عقیدت مندیوں سے چومیں۔ تو یکایک شور و شیون کی صدائیں اُسکے نیچے انسانی مسکن کے دامن میں بلند ہوئیں۔ اُس دیوتاؤں کی کام نگاہیں دکھی اور وہ دست اُنکی فریادوں سے لرز اُٹھیں۔ دیوتا کی باجبروت پیشانی شکنوں سے سکڑ گئی۔ اور اُسکا سفید اور پُرنور چہرہ جوشِ غضب سے تاریک ہوگیا۔ معاً آسمان پر کالے بادل چھا گئے۔ رعد کی مہیب صداؤں نے خاطی دنیا کی آبادیوں کو گھیر لیا یعنی وسعت خوف و ہراس کی اندوہناک مصیبتوں سے لبریز ہوگئی اور آدم کے نافرمان بیٹوں کے شور اور پکار نے فضا کو معمور کر دیا۔ یہ حالت تھوڑی دیر تک رہی۔ ابلیس کی فردوس نما وادیوں کا اقتدار شکستہ اور اپنے پرستاروں کی عقیدت مندیوں کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ گرجنے والے بادلوں نے اپنی غضبناک صداؤں کو لپیٹا۔ اور پسپا ہوگئے۔ عناصر کی باہم پیکار کی آئی ختم ہوگئی۔ اور آسمان کی پیشانی ستاروں کی روشنی سے چمک اُٹھی۔ جب دنیا کو اس طرح غضب سے نجات ملی نو انسان کی تمام راتوں کے فریادی نے پھر اپالو کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اُسنے حاجب کو حکم دیا۔ کہ جائے اور دریافت کرے کہ کون ہے۔ حاجب نے اپنا پردار عصا اٹھایا۔ اور عالم بالا سے زمین کی پستی کی جانب اُترا۔ دامن کوہ میں پہنچکر اُسنے ایک پریشان حال عورت کو دیکھا۔ کہ سجدے میں پڑی ہے اور اپنی بدبختیوں کا ماتم کر رہی ہے۔ حاجب بولا "تو کون ہے" عورت نے روتے ہوئے جواب دیا "میں بدنصیب جولیا ہوں" دیوتاؤں کے پردار ایلچی نے منہ پھیر کر آنسوؤں کے دو چار قطرے زمین پر گرائے کیونکہ دیوتا انسانی انسان کے سامنے نہیں روتے۔ اور پوچھا "تو کیا چاہتی ہے" دکھیا عورت نے اپنا سر اٹھایا۔ اور پھٹے ہوئے دامن سے آنسو پونچھ کر بولی "روشن چہرہ والے اجنبی کیا تو اپالو ہے" وہ بولا "نہیں۔ میں اُسکا پیغامبر ہوں" جولیا نے کہا "رحمدل دیوتا۔ جا تجھے مجھ سے کیا کام۔ میں اور میری فریادیں تیرے آقا کو پکارتی ہیں" جولیا یہ کہکر پھر سجدے میں گر پڑی۔ اور اُسکے دل کی جگر دوز صدائیں پھر ابلیس کے مسکنوں کو تہ و بالا کرنے لگیں۔ اب اپالو اپنے تخت زریں سے اُٹھا۔ اُسنے اپنی جہان بین آنکھیں دنیا کی پستیوں کی جانب ڈالیں۔ اور دیکھا کہ دامن کوہ کی گہرائیوں میں حوا کی ایک بدقسمت بیٹی پیشانی سنگریزوں پر رکھے اپنی تقدیر کو رو رہی ہے۔ اُسکا باخبر دل انسانی محبت کی ناہمواریوں کو دیکھ کر تڑپ اُٹھا۔ اور وہ پکارا "ماتم بند کر۔ اپنی پیشانی اُٹھا۔ اور بتا۔ کہ تو اپالو سے کیا چاہتی ہے" جولیا بولی "عشق ناکام نے میری ہستی کو بےرونق بنا دیا ہے۔ اور محبت کی تلخ افسردگیوں نے میری مختصر زندگی کی خوشیوں کو پامال کر دیا ہے۔ اسلئے میں اپنی شگفتگی کی افسردگی کو تیرے قدموں پر ڈالنے کے لئے لائی ہوں میری نذر کو قبول کر۔ اور جولیس کی ہوس رانیوں کا خاتمہ کر دے" جولیا خاموش ہوگئی شام کی تنہائیوں نے افسردگی کی چادر میں منہ چھپا لیا۔ بہار کی رنگینیاں کم ہوگئیں۔ انسانی جذبات کے عبرتناک انجام کے غم آگیں افسانے نے فضائے عالم کی وسعتوں کو تاریک کر دیا۔ اور اپالو کی پرنور جبین جوشِ انتقام سے سکڑ گئی اُسکی غضب آلود نگاہیں اُوپر کی طرف اُٹھیں۔ اور بجلی اپنی تباہیوں کا سامان لیکر بادلوں کی ظلمتوں پر چھا گئی۔ رعد نے اپنی صداؤں کو خاطی دنیا کی فراخ سطح پر پھیلا دیا۔ ہوا حرکت میں آئی اور انسانی دل جن کی جسارت ناپاکیوں کے طوفان سے خائف نہیں ہوتی۔ قدرت کی سخت گیریوں کو برسرِ پیکار پا کر خوف و دہشت سے کانپ اُٹھے۔ آسمان کی بلندیاں انتقام کی ہنگامہ آرائیوں سے تاریک ہوگئیں۔ اور اپالو کے انتقامِ آتشیں نے اُسکے محلسرا کو شعلوں کے آغوش میں دیدیا۔ گناہ کی مختصر سی سنگین دنیا کچھ مدت کے لئے روشن ہوگئی۔ اور جب قہر و جبروت کے کارفرما اپنا آتشیں فرمان ادا کر چکے۔ تو اپالو نے ایک آہ سرد بھری اور مڑا۔ کہ جولیا نے بڑھ کر اسکا دامن تھام لیا" اور بولی "بس۔ دائمی اقتدار کے مالک دیوتا۔ تیری تقدیس ہو۔ میری تلخ کامیوں کی فریاد" ——— اپالو بات کاٹ کر بولا "تیری ناکامیوں کا انتقام لیا جا چکا ہے۔ گذشتہ زندگی کی تلخیوں کو بھول جا۔

شباب کی رعنائیاں پھر ایکبار تری ہیں۔ جو عشق کی نازنینوں سے کھیل۔ اور اپنے حُسنِ عالم افروز سے آدم کے فرزندوں کو بہلا" جولیا کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ مگر اپالو جا چکا تھا۔ اب رعد کی گرج آتی مشرق کی دوری میں گم ہو گئی۔ اور برقِ سوزاں کی تیزی نے سرعت سے تباہیوں کے اسباب کو سمیٹ لیا۔ ہوا کی تیزی سکون سے بدل گئی۔ اور آسمان کی کدورتیں زائل ہو گئیں۔ ہنگامہ خیز رات کے گذر جانے کے بعد صبح نمودار ہوئی۔ اور نسیمِ سحر نے پھر ایکبار دنیا کو سکوت و سکون کا پیغام پہنچایا۔ تو جولیس اور اُسکی عشرت گاہ کی خاک پر ماتم کرنے والوں سے کلاڈیو نے ایک نازنین حسینہ کو دیکھا۔ کر پھٹے پرانے کپڑے پہنے شباب کی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اور اپنی بھدی انگلیوں سے راکھ کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ یہ جولیا تھی۔

(۷)

نا شکر گذار جولیس کی بے لوث الفتوں کے بے نشان مزار پر جولیا نے ایک مختصر سی نشست گاہ تعمیر کرائی۔ اور یہیں اُس جگہ پر جہاں شباب کی جذبہ رانیاں امارت کی فراوانیوں سے ہمکنار رہا کرتی تھیں۔ حسنِ ہنگامہ خیز نے اپنی جلوہ آرائیوں کے لئے ایک کنجِ خلوت کا انتخاب کیا۔ جو جلد عاشقانِ ناکام کی سرد آہوں سے معمور ہو گئی۔ لوگ خلوص و ایثار کے نذرانے لے کر جولیا کے حضور میں آتے اور ناکام لوٹ جاتے۔ دولت و اقتدار اپنے تمام جلوؤں کے ساتھ فخر و غرور سے آتی اور عجز و انکسار سے سر جھکا کر لوٹ جاتی۔ شجاعت و بہادری کی ولولہ انگیزیاں سرعت سے قدم بڑھاتیں۔ اور نگاہوں کی تاب نہ لا کر شکست خوردہ واپس جاتیں۔ آخر کار جب جولیا کے حسن نے تمناؤں کی دنیا میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ تو پھر سرد آہیں دیوتاؤں کی پاک آبادی کی طرف بڑھیں۔ یعنی پھر ایکبار اپالو کا مقدس مسکن دادخواہوں کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ الپس کا فرمانروا مسکرا دیا۔ اور حاجب کو حکم دیا۔ کہ جولیا کو اسکے حضور میں پیش کرے۔ جولیا مسکراتی ہوئی آئی۔ اور اپالو کے تختِ زریں کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور بولی "دیوتاؤں کے شہنشاہ تیری مرضی پوری ہو" اپالو مسکرایا اور بولا "اب تیرا جذبۂ انتقام پورا ہو گیا ہوگا۔ ادھر دیکھ"

جولیا کی نگاہوں کا اپالو کی نگاہوں سے ملنا تھا کہ اُسکا انسانی لباس اتر گیا اور وہ الپس کی غیر فانی مخلوق میں شامل ہو گئی

امیر حسن ناز سیالکوٹی

یہ کس کو اپنی سنانا تھا یادگار مجھے ۔۔۔ ازل کے روز ملا دل جو داغدار مجھے

بقدرِ ظرف محبت کی بھی ہوئی تقسیم ۔۔۔ چمن کو پھول ملا سینہ فگار مجھے

گلوں میں رہ کے مراد دل شگفتہ ہو نہ سکا ۔۔۔ خزاں کا رنگ دکھاتی رہی بہار مجھے

مجنون گورکھپوری

مخمس بر غزل میر تقی میر علیہ الرحمۃ

غرور تاجداری سے نے مزین کر کے زندان کو — کیا پابستۂ زنجیر جب یوسف سے مہمان کو
خبر اسکی ہوئی جس روز سے اک خستہ ماں کو — نسیم مصر کب آئی سواد شہر کنعان کو
کہ پھر جیوں نہ یاں سے لیگئی گلہائے حرمان کو

زمانے بھر کا غم شاید مرے حصے میں آیا ہے — کہ خود روتا ہوں اور محفل کی محفل کو رلایا ہے
یہ کیسی خاک سے تو نے مرا پتلا بنایا ہے — زبان نوحہ گر ہوں میں قضا نے کیا ملایا ہے
میری طینت میں یارب سودۂ دلہائے نالان کو

صلہ نومیدیٔ جاوید کا اک اشک تر بس ہے — نہیں تو جانے والے ایک عبرت کی نظر بس ہے
تری بے اعتنائی سے حذر بس ہے حذر بس ہے — کوئی کاشانہ سر رہ کا ہماری خاک پر بس ہے
گل گلزار کیا درکار ہے گور غریبان کو

کسی پہلو قرار آتا نہیں بسمل کو اے ناصح — تڑپتا ہے ہوائے خنجر قاتل کو اے ناصح
بہت مشکل ہے تو سمجھے میری مشکل کو اے ناصح — یہ کیا جانوں ہوا سینے میں کیا اس دل کو اے ناصح
سحر خون بستہ تو دیکھا تھا میں نے اپنی مژگان کو

نہ کچھ خوف خدا اسکو نہ کوئی عار گزرے ہے — وہ چارہ ساز بنکر زخمیوں کو مار گزرے ہے
کوئی پوچھے تو یہ کہتا ہوا اک بار گزرے ہے — صدائے آہ جیسے تیر جی کے پار گزرے ہے
کسو بیدرد نے کھینچا کسو نے دل سے پیکان کو

(نواب) جعفر علی خان اثر لکھنوی

بشریت کا مہد اولین

یا

سرزمین مابین النہرین

(دجلہ و فرات)

جغرافیۂ قدیم کے علمانے سرزمین مابین النہرین یعنی میسوپوٹیمیا کی حدبندی میں اختلاف کیا ہے بعض کا خیال ہے کہ اس ملک کی جنوبی حد خلیج فارس تک پہنچتی ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ اسے موجودہ عراق عرب کی جنوبی سرحد تک سمجھنا چاہیئے۔ دنیا کی قدیم روایات اور قبل تاریخ کے افسانوں میں اس ملک کا ذکر آیا ہے، توریت میں اس کو آرام النہرین اور فدان آرام کے نام سے یاد کیا گیا ہے، قدیم مصریوں نے اسے نہرینا یعنی سرزمین نہرین لکھا ہے، اور یہی نام مصر کے ان نقوش میں ملتا ہے، جو مسیح علیہ السلام سے آٹھ صدی پہلے کے ہیں۔ آرامی زبان میں اس کو "بیت نہرین" یعنی نہرین کا درمیانی ملک کہتے ہیں۔

اقسام زمین کے لحاظ سے اس ملک کے دو حصے ہیں، ایک وہ جو دریائے فرات کے کنارے کنارے نہر خابور تک پھیلا ہوا ہے، اور یہ حصہ زیادہ آباد نہیں ہے، دوسرا زرخیز حصہ ملک ہے، جو دریائے دجلہ کے کناروں تک شمار ہوتا ہے،

بعض اہل جغرافیہ کا یہ غلط خیال ہے کہ مابین النہرین صرف اس سرزمین کو کہتے ہیں جو دریائے فرات اور نہر خابور کے درمیان واقع ہے۔ کیونکہ یہ اصطلاح اس وقت کی تھی جبکہ ۶۵ ق م میں اس ملک پر رومن سلطنت کا قبضہ ہوگیا تھا، چونکہ ان کے مقبوضہ علاقہ کے سیاسی حدود فرات اور خابور کے درمیانی علاقہ میں منحصر تھیں، اس لئے صرف اس حصہ پر مابین النہرین کا اطلاق کیا گیا، ورنہ حقیقت میں مابین النہرین اس تمام علاقہ کا نام ہے، جو فرات اور دجلہ کے درمیان واقع ہے البعتہ ان دونوں دریاؤں کے منابع کے قریب جو ملک ہے اسے اکثر علمائے جغرافیہ نے آرمینیا کا جز تسلیم کیا ہے، لہذا اس تحقیق کی بنا پر مابین النہرین کے حدود حسب ذیل ہیں۔

مغرب میں دریائے فرات، مشرق میں دریائے دجلہ، شمال میں پہاڑوں کا وہ سلسلہ جس کا قدیم نام جبال طوروس ہے، اور آجکل اُسے قرہ جہ داغ کہتے ہیں، اور یہ وہ کوہستانی سلسلہ ہے، جس میں دریائے دجلہ و فرات ہو کر گزرتے ہیں، ان پہاڑوں سے گذرنے کے بعد یہ دونوں دریا ایک وسیع اور سرسبز میدان میں ایک دوسرے سے دور ہوتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور جنوب میں اس سرزمین کی حد بغداد سے کے پاس اس مقام سے کچھ آگے ختم ہوتی ہے جہاں دجلہ و فرات ایک دوسرے سے قریب ہوکر پھر علیحدہ ہو جاتے ہیں، اخری تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں اہل بابل نے زراعت کی سیرابی کے واسطے نہایت باقاعدہ چھوٹی اور بڑی نہریں کھودی تھیں، اور اس سیرابی کے بدولت یہ ملک آبادی میں ضرب المثل ہوگیا تھا،

اس ملک کی مٹی اور اسکے طبعی خواص کا مطالعہ کر کے علمائے طبقات الارض (جیالوجسٹ) اس نتیجہ پر پہونچے ہین کہ از منۂ قدیم مین (تخلیق انسان سے لاکھوں برس پہلے) خلیج فارس انہین حدود سے شروع ہوتی تھی۔

ارض ما بین النہرین کا رقبہ (۵۵۴۰۰) میل مربع ہے۔ شمالی حدود کے قریب جہان دجلہ و فرات پہاڑوں سے نکلتے ہین، زمین کی بلندی سطح سمندر سے صرف (۱۶۵) فٹ رہ گئی ہے۔

ملک کے دو حصّے اور انکی تاریخ —— ہم پہلے میسوپوٹیمیا کو باعتبار اقسام زمین دو حصوں مین تقسیم کر چکے ہین۔ لیکن جغرافیین کی ایک جماعت نے اس ملک کو تین حصوں پر اس طرح تقسیم کیا ہے۔

(۱) بلاد شمالی جو دریائے خابور سے مغرب کی طرف واقع ہین۔

(۲) بلاد شمالی مشرقی۔

(۳) بلاد جنوبی۔

قسم اول ان بلاد کو شامل ہے جن کا ذکر اسفار توریت مین ارام النہرین اور "فدان آرام" کے نام سے آیا ہے۔ اور یہ بلاد سلوقین (خلفائے سکندر) کے زمانہ مین "اور رونہ" یا "ادرحونہ" کے نام سے مشہور تھے۔

بلاد شمالی پر مختلف سلطنتوں نے حکومت کی ہے اس کا پایۂ تخت شہر ادیسہ تھا جسکو آج کل "اد" یا "رہا" کہتے ہین۔

قسم ثانی یعنی بلاد شمالی یا شرقی مملکت اسوریہ (اسیریا) مین داخل تھی اور ان کا پایۂ تخت شہر نینوی تھا جو دجلہ کے مغربی ساحل پر ایک بڑا تاریخی شہر تھا۔ اس شہر کے کھنڈر موجودہ شہر موصل کے بالکل سامنے ہین۔

قسم ثالث یعنے بلاد جنوبی حکومت بابلیہ قدیم مین داخل تھے جس کا پایۂ تخت شہر بابل تھا یہ شہر بھی تاریخ مین بڑی شہرت رکھتا ہے اس کا محل وقوع دریائے فرات کے مشرقی کنارے پر ہے۔

یہ ارض ما بین النہرین کی مختصر جغرافی تقسیم ہے جو تاریخی حالات سے قبل بطور مقدمہ درج کیگئی۔ اب ہم اس ملک کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہین کیونکہ اس سرزمین کا تفصیلی حال لکھنے کے لئے سیکڑوں جلدین بھی کافی نہین۔

مملکت بابل ۔ ارض ما بین النہرین یا میسوپوٹیمیا مین یہ مشہور ترین سلطنت گذری ہے اور حقیقت مین اس کی تاریخ ان تمام حکومتوں کی تاریخ کو شامل ہے جو دجلہ و فرات اور دجلہ کے کناروں پر قائم ہوئین اس سلطنت کے حدود شہر حیت سے جو فرات پر شمالی طرف واقع ہے شہر سامرہ تک جو دجلہ پر جنوب کی طرف ہے پھیلی ہوئی تھین اس کا پایۂ تخت بابل مسیح علیہ السلام سے دو ہزار برس پہلے اپنے تمدن کے لحاظ سے دنیا مین مشہور تھا بلکہ ان قدیم آثار سے جن کی تحقیقات علمائے آثار نے کی ہے ثابت ہوتا ہے کہ بابلی تمدن کا آغاز تین ہزار برس قبل مسیح سے ہے۔

تاریخ اس کی رہبری نہین کرتی کہ بابلی قوم کی اصل کیا تھی لیکن اس قدر ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس قوم کے دو مختلف حصے تھے اور انہوں نے سنہ ق م مین قبائل سامیہ کو ما بین النہرین سے نکال کر ان کی جگہ سکونت اختیار کی۔

اس قوم کے شہری لوگ کچی اینٹوں کا مکان بنا کر رہتے تھے، مکانات کے درمیان مین معبد ہوتا تھا، کاشت کاری اور وحشی جانوروں کے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ گلزار حوض حیدرآباد دکن میں ہے

تھا پہ گنبد تھی اور مذہب بت پرستی اور ستارہ پرستی تھا ان کی سب سے قدیم سلطنت جس کے آثار شہر ایلیس (قادسیہ) میں پائے گئے ہیں تقریباً سنہ ۳۰۰۰
قبل از مسیح اس قوم میں قائم تھی۔ یہ سلطنت (۹۹) سال تک رہی اور اس عرصہ میں (۶) بادشاہوں نے حکومت کی اسکے بعد سنہ ۲۹۲۵ ق م
میں دولت قبیسہ کا غلبہ ہوا اُسنے بھی تقریباً ایک صدی تک حکومت کی اور اُس میں (۹) بادشاہ گذرے سنہ ۲۸۱۵ ق م میں دولت ارکیہ
کا قیام ہوا جس میں ایک بادشاہ لوجال زاجیسی نے (۲۵) سال حکمرانی کی اس نے شہر لجش یا لجیش کو جلا دیا تھا پھر سنہ ۲۷۰۰ میں دولت عقادیہ
قائم ہوئی جس میں (۱۹۷) سال تک حکومت رہی اور بارہ بادشاہ گذرے سب سے پہلے کا نام شاروکین تھا بعض کا خیال ہے کہ یہی
سرجون تھا جس کا ذکر توریت میں آیا ہے۔

شاروکین دولت سامیہ کا مؤسس اول ہے جس کی حکومت بابل عیلام اور شام پر رہی سنہ ۲۹۰۰ ق م میں دولت اریکیہ ثانیہ
قائم ہوئی اور صرف بارہ سال تک اس کا دورہ رہا اور اس قلیل مدت میں پانچ بادشاہ گذرے آخر میں ان پر بادشاہ محوطہ بانی سلطنت عطلیہ نے
قبضہ کر لیا۔ پھر حکومت اوریہ کا آغاز ہوا اور اس کا دورہ ۱۱۹ سال رہا۔ اسکے بعد دولت اسینیہ ۲۲۵ سال تک رہی۔ اور یہ عیلامی
حکومت تھی پھر سنہ ۲۳۰۰ ق م میں دولت بابلیہ اولی کا قیام ہوا۔ اس حکومت کا بانی ساموآبو تھا۔ اس میں سب سے مشہور بادشاہ حمورابی گذرا
جس کا دور حکومت سنہ ۲۱۰۰ ق م سے شروع ہوتا ہے اس نے حکومت کے لئے قوانین اور ضوابط بنائے جس میں سب سے مشہور "قانون حمورابی" ہے
جس کا نسخہ ایک ستون پر لکھا ہوا علمائے آثار کو مل گیا ہے۔ انگریزی میں اسکا ترجمہ اولڈسٹ لا ان دی ورلڈ کے نام سے شائع ہوا ہے اور قابل دید ہے
اس قانون کے بہت سے احکام توریت سے ملتے جلتے ہیں۔

اس دولت کا خاتمہ حیثیوں نے کیا اس قوم نے بابل پر قبضہ کرکے اس میں آگ لگا دی پھر دولت بابلیہ ثانیہ، پھر ثالثیہ، پھر رابعہ کا قیام ہوا اس
چوتھی حکومت نے زیادہ شہرت حاصل کی اسکا سب سے مشہور بادشاہ بنوخذ نصر اول تھا جو سنہ ۱۱۰۰ ق م میں بادشاہ ہوا جسکو عبرانی بخت نصر
کہتے ہیں اس نے بابل کو بنی عیلام کے تسلط سے آزاد کیا۔ فلسطین پر حملے کئے اسکے بعد پے در پے حکومتیں بابل پر گذریں پھر نبوپولاسر نے ایک نئی بابلی حکومت
کی بنیاد رکھی یہ شخص کلدانی امراء میں سے تھا جس نے سنہ ۶۲۵ ق م میں بغاوت کی اور سقوط نینوی کے بعد مملکت اشور پر قابض ہو گیا اسکے بعد بنوخذ
نصر ثانی کا زمانہ آیا جس نے سلطنت کو متحد کرکے ترقی دی مصر پر حملہ کیا بہت سی لڑائیاں لڑیں اور مشہور محل بنوائے۔

بنوخذ نصر ثانی کے بعد اور چند بادشاہ ہوئے جو طاقت و شوکت میں بہت کم تھے چنانچہ سلطنت میں روز بروز ضعف پیدا ہوا اور سنہ ۵۳۹ ق م
کے شروع ہونے سے پہلے حکومت بابل کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا اور ملک ایران کے قبضہ میں آیا ایرانی عہد حکومت کو مورخین دولت اخمینیہ کے
نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایران کے قبضہ میں یہ ملک (۲۰۸) سال تک رہا اور دس بادشاہوں نے حکومت کی۔

سنہ ۳۳۱ ق م میں سکندر اعظم نے بابل اور سرزمین مابین النہرین کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کیا تھا سکندر کے بعد یہ ملک یونانی حکومت
میں شامل کر لیا گیا اس حکومت کو تاریخ دولت سلوقیہ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ یہ دور ۱۹۲ سال تک رہا اور ۱۸ بادشاہوں نے حکمرانی کی
جن میں سلوقس اول اور انطیاقوس مشہور ہیں۔ سلوقیہ کے بعد دولت بالعیثیہ کا آغاز ہوا اس میں ۲۶ بادشاہوں نے ۴۷۶ سال تک حکومت کی سنہ ۲۲۶
ء میں دولت ساسانیہ کا اس ملک پر قبضہ ہوا (۲۹) بادشاہوں نے ۴۱۰ سال سلطنت کی جن میں اردشیر اول بانی سلطنت ساسانیہ

اور دیگر وفات خاص طور پر مشہور ہیں۔ ۶۳۶ء میں حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں عربوں نے ما بین النہرین پر حملہ کیا اور حضرت سعد وقاصؓ نے قادسیہ کی لڑائی میں ایرانیوں پر فتح حاصل کی اور ما بین النہرین کی تمام سرزمین عربوں کے قبضہ میں آگئی۔ خلافت راشدہ اور بنی امیہ کے عہد میں اس ملک میں اسلامی اثر و اقتدار روز افزوں ترقی کرتا گیا بنی امیہ کے بعد کئی صدی تک یہ ملک عباسی خلافت کا تخت گاہ رہا یہاں تک کہ چنگیز خان کے پوتے ہلاکو تاتاری نے ۱۲۵۸ء میں بغداد پر حملہ کر کے سلطنت عباسیہ کے آخری خلیفہ مستعصم باللہ کو شہید کر دیا اور خلافت عباسیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

زوال خلافت عباسیہ کے بعد دولت تاتاریہ کا دور رہا اس کے بعد ۱۵۰۸ء میں شاہ اسمٰعیل اول بادشاہ ایران نے حملہ کر کے بغداد فتح کر لیا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ترک قسطنطنیہ فتح کر چکے تھے (۱۴۵۳ء) اور انکی سلطنت بڑے عروج پر تھی سارا یورپ ان کے نام سے کانپتا تھا ترکوں کی سیاسی مصلحت اس کی مقتضی نہ تھی کہ ان کے پہلو میں ایک زبردست ایرانی حکومت قائم رہے انہوں نے کم از کم سرزمین ما بین النہرین کو اپنے قبضہ میں رکھنا ضروری سمجھا جیسا کہ آج کل ولایت موصل کا ترکی سلطنت میں شامل رہنا اپنی بقا کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں چنانچہ ۱۵۳۴ء میں سلطان سلیمان اعظم نے بغداد پر فتح حاصل کی لیکن پوری ایک صدی بھی اس قبضہ پر نہیں گذری تھی کہ ۱۶۲۳ء میں یہ ملک پھر ایرانیوں کے پاس واپس چلا گیا۔ پھر شاہ عباس اول کے عہد حکومت میں سلطان مراد خان رابع نے دوبارہ بغداد اور تمام ملک عراق پر قبضہ حاصل کیا تین صدی سے زائد عرصہ تک اس ملک پر ترک قابض رہے اور موصل بغداد اور بصرہ کی ولائتیں عثمانی سلطنت کا سب سے زیادہ زرخیز حصہ شمار کیا جاتا تھا لیکن گذشتہ جنگ عظیم میں یہ ملک ترکی سلطنت سے علیحدہ ہو کر اس قوم کے قبضہ میں آگیا جو ایک ملک کے مذہب زبان، رسم و رواج، معاشرت، غرض کسی شعبۂ حیات میں ان سے مشابہت اور مناسبت نہیں رکھتی۔ اور اسکا وطن اصلی بھی سرزمین ما بین النہرین سے ہزارہا میل دور واقع ہے۔ اس نے چالیس سال تک اس ملک پر قبضہ رکھنے کا خیال ظاہر کیا ہے تاکہ اس عرصہ میں میسوپوٹیمیہ کے لوگ مہذب بن جائیں کیونکہ انگریز اپنے خیال میں تمام دنیا میں تہذیب پھیلا دینے کے ذمہ دار ہیں اور یہ غالباً اس لئے کہ اگر اس قسم کی تہذیب نہ پھیلائی جائے تو دنیا کے وسیع زین ملک جو اسوقت برطانوی جھنڈے کے نیچے محکومانہ زندگی بسر کر رہے ہیں انگلستان والوں کے کھانے کے لئے غلہ اور دوسری ضروریات زندگی کیونکر میسر آسکتی ہیں اور نہ ان ممالک کے علیحدہ اور خودمختار ہونے پر لندن میں عظیم الشان مکانات سر بفلک عمارات اور تمول و ثروت کا مظاہرہ دکھائی دے سکتا ہے۔

یہ خلاصہ ان اقوام کی تاریخ کا جنہوں نے عہد تاریخ سے اسوقت تک ما بین النہرین پر حکمرانی کی اب ہم اس ملک کے مشہور تاریخی شہروں کا حال مختصراً ذیل میں سپرد قلم کرتے ہیں۔

اس سرزمین کے مشہور شہروں میں سے ایک اودیا یا اورفا تھا اسکے جنوب میں شہر حاران کے کھنڈر واقع ہیں حاران کا ذکر توریت میں متعدد جگہ آیا ہے اس شہر کی اہمیت اسوقت سے جاتی رہی جب سے یہ شہر تاتاریوں کے قبضہ میں آیا۔

اورفا کے قریب شہر سروج ہے اس کا ذکر بھی توریت میں آیا ہے جب اس پر یونانیوں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے اس شہر کا نام تبدیل رکھا لیکن آج بھی یہ شہر اپنے قدیم نام سروج سے مشہور ہے۔

دریائے فرات کے بائین کنارے پر شہر اپامیہ ہے جسے آج کل بیرہ جک کہتے ہین اور جنوب کی طرف شہر نیقا فورم ہے جو سلوقیین کے دور حکومت مین عروج پر تھا اور اس کی تجارت نے بڑی وسعت حاصل کی تھی اس شہر کو سکندر اعظم کے حکم سے بادشاہ نیقانور سلوقی نے اپنے نام پر بنایا تھا آج کل اسکا نام الرقہ ہے اور شاید شہر کرشیش یا کرکمش جس کا ذکر توریت مین ہے اس جگہ تھا جو آج کل قلعۃ النجم کے نام سے مشہور ہے۔

ما بین النہرین کے شمالی شہرون مین نصیبین خاص طور پر مشہور ہے یونانی اسکو نصیبس کہتے ہین تجارتی لحاظ سے بھی اس شہر نے شہرت حاصل کی تھی اور دولت اشوریہ کے عہد حکومت مین سیاسی مرکزیت بھی رکھتا تھا روم سلطنت اور فارس کے محاربات نے اس کی اہمیت کو اور بھی بڑھا دیا تھا ابتدا مین اس پر لوکلس رومانی نے قبضہ کیا پھر ایک عرصہ کے بعد روم تسلط سے نکل گیا پھر شہنشاہ اور یانوس نے دوبارہ واپس لیا۔ اور شہنشاہ سویروس نے یہان فوجی استحکامات بنوائے جو یانوس رومانی کے زمانے تک اس پر رومیون کا قبضہ رہا پھر ایرانیون نے حملہ کرکے واپس لے لیا سیاسی نقطہ نظر سے روم سلطنت کے لئے اس شہر کا نکل جانا بے حد مضر تھا چنانچہ بادشاہ انسطاسیوس نے نصیبین کے جواب مین شمالی مغربی جانب ۵۰۷ء مین ایک زبردست قلعہ تعمیر کرایا جسے قلعۂ داراس کہتے تھے اور اب دارا کے نام سے مشہور ہے پھر شاہان روم نے سرحد پر متعدد قلعے بنوائے جن مین انطونوپلس سب سے زیادہ مشہور ہے اس کو بعد مین قسطنطین نے اور زیادہ مضبوط کرکے اپنے نام سے مشہور کیا، ور اس قلعہ کے آثار اب تک حاران اور نصیبین کے درمیان اس جگہ کے قریب واقع ہین جو آج کل تلا کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔

رومی حکومت کے بنوائے ہوئے قلعون اور شہرون مین آمد بھی قابل ذکر ہے اس شہر مین ایک قدرتی قلعہ ہے اور شہر ایک پہاڑ پر واقع ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے (۳۶۵۰) فٹ ہے اس کے چارون طرف باغات ہین اور آب وہوا بھی معتدل ہے رومی قلعون مین دیار بکر بھی مشہور تھا مدین قوم اسکو آمید کہتی تھی اور اب بھی اسکا نام قرا آمید ہے قرہ ترکی زبان مین سیاہ کو کہتے ہین کیونکہ یہان کے پتھر سیاہ رنگ کے ہین اس لئے ترک اسکو قرہ آمید کہتے ہین، قسطنطین اکبر نے اس کے مستحکم کرنے مین بڑا اہتمام کیا تھا، لیکن چوتھی صدی عیسوی مین شاپور ثانی ساسانی شاہ فارس نے اس قلعہ کو رومیون سے فتح کر لیا، پھر پانچوین صدی مین رومیون نے واپس لے لیا، پھر ایک عرصہ کے بعد دوبارہ ایرانیون کے قبضہ مین آیا، اسکے بعد یہ شہر انہین کے پاس رہا یہان تک کہ ۶۳۸ء مین اس پر عربوں نے قبضہ کیا، پھر چند انقلابات کے بعد ۱۵۱۵ء مین اس پر ترک قابض ہوگئے، اور اس وقت تک انہین کے پاس ہے۔

ما بین النہرین کے شہرون مین ایک شہر ہے، جس کا قدیم نام اورفا تھا اس کا کچھ ذکر ہم پہلے کر چکے ہین، سلوقس اول نے اس شہر کو وسعت دی، اور یہان استحکامات بنوائے۔ اور اسے گرد و پیش کے ممالک کا پایۂ تخت مقرر کیا، یہ شہر دولت ابجریہ کا بھی پایہ تخت رہا ہے، جو پہلے سلوقیین، پھر مدین سلطنت کے ماتحت رہی تھی، ایک روایت یہ بھی ہے کہ ابجر اول مسیح علیہ السلام کا معاصر تھا، اور ان دونون کے درمیان مراسلت بھی ہوئی تھی، ان خطوط کا ترجمہ اسیبوس نے یونانی زبان مین کیا ہے، لیکن تحقیق اس روایت کو غلط ثابت کرتی ہے

تیسری صدی عیسوی کی ابتدا مین روم سلطنت نے اورفا پر قبضہ کیا، پھر یہ شہر مختلف سلطنتون کے حصہ مین آتا رہا یہان تک کہ اس پر عربون کا تسلط ہوگیا، ۱۰۹۸ء مین بادشاہ بلدوین صلیبی نے اس پر قبضہ کیا اور اپنے کو امیر اودیسا کے نام سے شہرت دی، بارھوین صدی کے نصف تک یہان پر صلیبیون کا دور دورہ رہا، پھر ۱۱۴۴ء مین امیر زنگی خان بادشاہ موصل نے اورفا کو صلیبیون سے واپس چھین لیا اور ۱۵۱۶ء مین سلطان سلیم ثانی

کے زمانہ میں اس پر ایران کا قبضہ ہو گیا اور اسوقت تک ہے۔

مابین النہرین کے درمیانی علاقے میں شہر موصل ہے جو قدیم شہر نینوی کے پاس واقع ہے نینوی دولت اشوریہ کا آخری پایہ تخت تھا ۱۰ قائم تک یہ شہر قائم رہا پھر ویران ہو گیا۔ ابھی تک اُسکے قلعہ کے آثار اور کچھ حصہ اس وقت تک باقی ہے جس کی بلندی ۴۰ اور ۵۰ فٹ تک ہے۔ یہ قلعہ بارہ میل کے احاطہ میں شہر کے گرد تھا۔

موصل میں جامع یونس مشہور ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں یونس علیہ السلام کی قبر ہے یونس علیہ السلام کو توریت میں یونان کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ سنحاریب اشوری کا اس شہر میں ایک عالیشان قصر تھا جس کے آثار قدیمہ اُس کی عظمت کا پتہ دے رہے ہیں جنوب مغرب کی طرف عاقوف نمرود کے آثار ہیں جسے توریت میں کالح کہا گیا ہے (تکوین ۱۰ : ۱۱)

مابین النہرین کا مشہور ترین شہر بغداد ہے جو دریائے دجلہ کے بائیں کنارہ پر واقع ہے جس جگہ بغداد کا شہر ہے وہاں دجلہ کا عرض ۶۰۰ آج کل بغداد کی آبادی تقریباً دو لاکھ ہے جو مسلمانوں یہودیوں اور عیسائیوں پر مشتمل ہے یہ شہر قدیم شہر "بغداد" کے کھنڈروں پر بنا ہے جسکے آثار ابھی تک باقی ہیں انہی میں سے ایک شہر کا بندرگاہ ہے جہاں کشتیاں ٹھہرتی ہیں جو اینٹوں کا بنا ہوا تھا اور اس پر بنوخذ نصر کا نام منقوش تھا۔

شہر بابل جو مملکت بابل کے عہد عروج میں اسکا پایہ تخت تھا اسکے آثار بغداد سے ۶۵ میل دور واقع ہیں آج بابل چند ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں سے عبارت ہے لیکن زمانہ گذشتہ میں ایشیا کا سب سے بڑا شہر تھا یونان کے مشہور مورخ ہیرو ڈوٹس نے لکھا ہے کہ بابل بہت بڑا شہر تھا اسکا محیط ۵۵ میل کا تھا (موجودہ لندن اور پیرس کا اگر محیط ۵۵ میل ہوتا ہے) شہر پناہ کی بلندی ۳۳۰ فٹ اور عرض ۸۰ فٹ کے قریب تھا محیط کے متعلق تو اس روایت میں کوئی بات قابل تعجب اور غیر ممکن نہیں ہے کیونکہ واقعی بابل ایشیا کا عظیم ترین شہر تھا مگر شہر پناہ کی بلندی اور عرض ضرور مبالغہ شامل ہے کیونکہ اس قدر بلند ٹھہر نہیں سکتی اور شہر پناہ کے واسطے اسقدر بلندی کی ضرورت ہے۔

جب سکندر اعظم اس شہر میں داخل ہوا تو اسکا محیط صرف ۱۰ میل رہ گیا تھا اسی مسافت میں اسکے موجودہ کھنڈر پھیلے ہوئے ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ دریائے فرات نے بھی اس شہر کے ایک بڑے حصہ کو کاٹ ڈالا ہے۔

بابل کے آثار باقیہ میں ایک بڑی عمارت کے کھنڈر ہیں جو القصر کے نام سے مشہور ہے یہ ایک ٹیلہ پر واقع ہے جس کی بلندی ۷۰ فٹ جنوبی سمت میں قصر بنوخذ نصر کے آثار ہیں۔ اس محل کے موجودہ آثار میں تخت شاہی کا صحن ہے یعنی جہاں تخت شاہی رکھا جاتا تھا اس کا طول ۱۷۰ فٹ تھا اس کا ذکر صحیفہ دانیال میں ایک قصہ کے ساتھ آیا ہے اسکو سنا تحقیق کرتے ہیں۔

تکری کے شمالی جانب تخت نصر کے ایک دوسرے محل کے آثار ہیں مشرقی جانب معابد اور دوسری عمارات کے آثار پائے جاتے ہیں جن کی تفصیل اس مختصر مضمون میں نہیں ہو سکتی۔ بابل سے ایک میل سے کچھ زائد فاصلہ پر بنوخذ نصر کے اُن معلق باغات کے آثار ہیں جن کا شمار دنیا کے مشہور عجائبات میں کیا گیا ہے ان کو بنوخذ نصر نے اپنی بیوی سمیرامیس کے لئے بنوایا تھا اور جنوب مغرب کی طرف بارہ میل کے فاصلہ پر برس برسیب یا بورسیبا کے آثار موجود ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ مشہور برج بابل کا بقایا ہے۔

حقیقت میں بشریت کا عہد اولین یعنی سرزمین مابین النہرین کی تاریخ اس قدر وسیع اور دلچسپ ہے کہ اسکے لئے مورخین نے صدہا جلدیں لکھی ہیں

سے ... ہزار سال پہلے یہاں کی انسانی آبادی نے تمدن کا قدم ... شروع کر دیا تھا اس ملک کی گذشتہ عظمت کا نشان یہاں کے آثار قدیمہ سے مطلب ہیں کو علمائے آثار نے ایک شب سلسلہ ... ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے مزید تفصیل آئندہ فرصت پر چھوڑتے ہیں۔

(امروہوی)   ابو المحاسن محمود علی خان

حسن و عشق

پردہ دار ہستی تھی ذات کے سمندر میں — حسن جب بکمال کھیلا اس صفت کے منظر میں

حسن چھا گیا بن کر شکل شاہ خاور میں — جو ازل میں دیکھا تھا دیکھتے ہیں محشر میں

عشق محشر آرا کی طور پر گری بجلی — حسن لنترانی کی رہ سکا نہ چادر میں

حسن عشق میں پیدا عشق حسن میں مکنون — جوہر آئینہ میں یا آئینہ ہے جوہر میں

مجھکو کیا خبر کیا گزری گل اور بلبل میں — چشم پوش مستی تھی اس برہنہ منظر میں

چارہ گر کو وحشت ہے ارتقائے الفت سے — پاؤں میں جو چکر تھا آ رہا ہے وہ سر میں

فرط سوز الفت میں دیکھکر سکون دل کا — بجلیاں مچلتی ہیں بادلوں کے لشکر میں

رند و صوفی سب مست اکی دھن میں ہیں — جانے کتنے مینا نے بھر دیے ہیں کوثر میں

جھجھک کیا اتر آیا آج فرش گیتی پر — رند بھی ہیں چکر میں میکدہ بھی چکر میں

مے وہ ہوش افگن اور ظرف ہے پیا پاش

مست کیوں نہ ہو کیفی ایک ہی ساغر میں

کیفی (چریا کوٹی)

فریب خیال

(افسانہ)

رشید کبھی مشتاقانہ قدموں کے ساتھ اور کبھی غصہ و بےبسی کی تیز رفتار سے برآمدہ کی کوئی سو مرتبہ پیمائش کر چکا ہو گا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا فیصلہ کرے اور فیصلہ نہ کرے تو کب تک اپنی بےمزہ و غیر مطمئن زندگی کی تلخیوں کو برداشت کئے جائے ——— آخر اُس نے اپنی مٹھی کھول کر ایک پرچہ کاغذ کا نکالا اور دیکھنے لگا کیا اور بیتابانہ بےبسی کے ساتھ ٹہلنے لگا۔

وہ اس وقت اپنی گزشتہ زندگی پر تنقید کر رہا تھا حال کی امیدوں کے تجزیہ میں مصروف تھا اور اپنی مستقبل پر بھی ایک سرور آمیز نگاہ ڈالنا چاہتا تھا اُس کی بیک گرونڈ (Back ground) اُس کو کیسے نقش و نگار نظر آرہی تھی تھوڑی دیر بعد اُس نے پھر اُسی تحریر کو دیکھا اور اب اُس کے خیال نے الفاظ کی اور جذبات نے آواز کی صورت اختیار کر لی:—

میں کہ اس وقت علمی دنیا کی تمنائیں میرے ساتھ وابستہ ہیں۔ میں کہ میرے قلم سے ہر ہر لفظ معیار ادب بنکر نکلتا ہے اور اہل دہلی میں کہ جس کے افکار دماغ اور نوازئیدہ ہائے خیال کا ایک ایک نقش لطیف مستقبل آفریدہ سمجھا جاتا ہے (وہ اہل ایں ادبیت سے متاثر ہو کر خود ہی تن گیا) کسقدر دردناک فیصلہ غلط کا ہے کہ دہلی میں اپنی ازدواجی زندگی کے اعتبار سے اُس شعبہ حیات کے لحاظ سے جو آج مہذب دنیا میں تمام ذہنی و دماغی ترقیوں کا سرچشمہ خیال کیا جاتا ہے اس قدر بدنصیب واقع ہوا

پھر پڑ رشید کی بیوی کی! سواد تحریر کا خط ہو گویا بےاختیاری میں کچھ لکیریں کاغذ پر بن گئی ہیں حرفوں کا جوڑ دیکھئے کسقدر مسلسل ہے جیسے کوئی ہکلا رہا ہو۔ املا تو خیر کیا درست ہو گا۔ جب کہ اُن کے باپ کو بھی اسکا سلیقہ نہیں اور فقرہ کو نا رہ منشیج کو محبتی لکھ! اور بولنا اُنکا روزمرہ ہے۔

مجھے کسقدر شرم آتی ہے جب کوئی دریافت کرتا ہے کہ آپ کی شادی کہاں ہوئی ہے نہ کوئی دنیاوی جاہ و ثروت نہ کوئی علمی قابلیت و شہرت نہ کوئی ذاتی وجاہت و اہمیت۔ یہ معمولی طبقہ کے لوگ اور معمولی انسانوں کے اندر نشو و نما پائے ہوئے جانور کیا سمجھ سکتے ہیں کہ میں کیا چیز ہوں اور دنیا مجھے کس نگاہ سے دیکھتی ہے سال گزشتہ جب میں ان حضرت (خسر) کا اسٹیشن پہونچانے گیا تو میں نے اسی خیال سے کہ خدا جانے کیا حماقت اُن سے سرزد ہو جائے "افضال (رشید کا دوست) کو منع کیا تھا کہ اس کے اسٹیشن آنے کی ضرورت نہیں لیکن وہ نہیں مانا پھر کیا وہ وقت میں بھول سکتا ہوں جب حضرت نے میرے اور افضال کے سامنے ہی ناول بیچنے والے کو بلایا اور اُس سے چار چار آنے کی "شہنشاہ عیاراں" "بنیمی چپری" اور "باگی سانپن" خرید کیں

کنکھیوں سے ہم لوگوں کی طرف بھی دیکھ لیا کرتا اپنی نزدیک بڑا زبردست سکہ اپنی قابلیت کا ہم پر جما رہے تھے - اور ادھر میرا شرم کے مارے یہ حال تھا کہ نگاہ اوپر نہ اٹھتی تھی۔

والد مرحوم اپنی فراست و دانائی کے لحاظ سے خواہ کتنا ہی فائق مرتبہ کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن یقینی ہے کہ وہ نبض شناس فطرت نہ تھے اور انہوں نے میری شادی کے مسئلہ میں اسقدر استبداد سے کام لیا کہ دنیا کا کوئی حساس دماغ اسکو برداشت نہیں کر سکتا۔ ہر چند جسوقت انہوں نے میری شادی کی میں طالب علم تھا اور اُن کے ہاتھ میں ایک بندۂ بیچارہ کی حیثیت رکھتا تھا لیکن وہ یہ تو سمجھ سکتے تھے کہ میری دماغی افتاد کیا ہے اور میں کیونکر ایک جاہل عورت کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا ہوں۔

طرز خطاب ملاحظہ ہو :-

"میرے سرتاج"

استغفر اللہ یہی دقیانوسیت یہی ابتذال پیدا کرنے والی فرسودگی ہزار مرتبہ سمجھایا کہ مجھے کسی ایسے کردہ لفظ سے مخاطب نہ کیا کرو بلکہ بغیر کسی تمہید کے مطلب کی بات شروع کر دیا کرو لیکن وہ تو دماغ کی راہیں قدرت کی طرف سے پیچیدہ بنادی گئی ہیں سمجھ میں کیونکر آسکتا ہے -

"یہاں بہمہ وجوہ (وجوہ) خیریت ہے اور آپکی خیریت خداوند (خداوند) کریم سے نیک خاہاں (خواہاں)"

اللہ تمہو خیریت چاہنے والی کو دنیا سے اٹھا لے تاکہ پھر دوبارہ یہ فقرے نظر سے نہ گزر سکیں اسی انداز تحریر پر میری خیریت چاہی جاتی ہے نہ پر دیگر مزاج پرسی کی جاتی ہے۔ بارہا کہا کہ تو خط نہ بھیجا کر لیکن اظہار محبت کی تکمیل بھلا بغیر میری جان لئے کیونکر ہو سکتی ہے۔

"عرصے (عرصہ) سے آپ نے اپنی خیریت ...."

پھر وہی خیریت ضد ٹھیری نا۔ نامعقول جاہل بدتمیز۔

"...سے آگاہ (اطلاع) نہیں دی دلکو بہت فکر ہے"

بجا ہے درست ہے یہ بیہودہ دماغ اور فکر کمبخت اگر تجھ میں حس ہوتی تو کب کی فکر کے مارے مر چکی ہوتی لیکن ایسے بے غیرتوں اور بے شرموں کو فکر تردد اور تاثرات سے کیا واسطہ۔ جانور ہیں جانور اکہا رہے ہیں جی رہے ہیں

"میں جانتی ہوں کہ آپ کو مجھ سے محبت نہیں تھی اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ میں جاہل ہوں اور کسی طرح آپکی بیوی بننے کے قابل نہیں ہوں لیکن مجھ کو میری محبت تو کم نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ تو میرا دین ہے ایمان ہے خدا کے لئے"

کبھی کبھی تو اپنا مال کہہ دیا کیجیے "میری خاطر نہیں سعیدہ کی خاطر سے کہ باز

(سبق) وفا (دفعہ) وہ آپ کو یاد کرکے رو دیتی ہے"

خدا جانے یہ جو کیونکر ایسا مربوط ہو گیا مگر چلتے چلاتے باز اور وفا کے دو جرگے انو لگا ہی گئیں ان پر سعیدہ ہی کا
خیال ہے جو اس وقت تک مجھے روکے ہوئے ہے ورنہ خدا جانے میں کب کا آزاد ہو چکا ہوتا غضب تو یہی ہے کہ
ایک نا اہل اور جاہل ماں کی ربیعا اپنے مستقبل کو بھی تباہ کر رہی ہے اور میرے لئے اس میں بھی عار ہے کہ میں اسکو
ہم بچی کہوں ———"

رشید کا غصہ دفعتہ چڑھ جاتا ہے اور اس تحریر کے پرزے پرزے کرکے منتشر کر دیتا ہے۔ تھوڑی دیر تک پھر ٹہلتا ہے لیکن اس
مرتبہ اسکے چہرے سے خاص قسم کی مسرت ٹپکتی ہے رفتار میں بجائے اضطراب کے سکون ہے اور چہرہ پر غصہ کے بھیانک نقوش کی جگہ لطف و
نشاط کے خطوط نمایاں ہیں ——— وہ جیب سے دوسرا خط نکالتا ہے اور آرام کرسی پر بیٹھ کر پہلے لفافہ کو دیر تک دیکھتا ہے :—

"انگریزی کا خط اور ایسا خوبصورت! اس درجہ لبریز صنعت! الفاظ کا رنگ تو دیکھئے حسن ذوق
کی آخری حد ہے۔

پھر لفافہ کے اندر سے اسی کے ہمرنگ ایک کاغذ نکالتا ہے اور پڑھنے لگتا ہے :—

"..... رشید" ———

اسکو کہتے ہیں ذوق کی لطافت اپنی نزاکت حسن سعی کہ صرف نقطے لگا کر کس طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے
کہ ہر چند تم ہو تو "میرے" ہی لیکن میں تم کو ایسا لکھ نہیں سکتی یہی ہے وہ شاعرانہ لہجہ اور یہی ہے وہ تمہاری
ناز و ادا جس کو

پرستش ہے اربابِ سخن در میان نہیں

سے تعبیر کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بلا کا ذہن پایا ہے۔

میں یہ کب تک لکھے جاؤں کہ زندہ ہوں بے غیرتی اور اسپر یہ اصرار!
خدا کے لئے اس احساس کو میرے اندر قوی نہ ہونے دیجئے کیونکہ زندگی
نام ہے صرف بے حسی کا"

کیا ناز و ادا ہے کس قدر دلکش اسلوب بیان ہے۔ شوق میں جان دینے کا مفہوم نہایت پامال بات ہے لیکن
یہاں اسکا کہیں ذکر نہیں کیا گیا حالانکہ مدعا وہی ہے۔

"آپ سے بارہا عرض کیا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے لیکن آپ
نہیں مانتے کسی واقعہ آہستی کی دلچسپی اگر تنگ پاشی نہیں تو اسکی

مترادفِ ضرور ہے"

سبحان اللہ! نمک پاشی سے اعراض کر کے خندہ زنی یکنا جو شاعر کی زبان میں عین نمک پاشی ہے کس قدر دلنشین الفاظ مترادف! ظالم کا مبلغ علم تو دیکھیئے، عام لوگوں کی طرح مرادف نہیں لکھا' بلکہ مترادف لکھا جس کو خواص ہی لکھ سکتے ہیں۔

"آپ تفصیل دریافت فرماتے ہیں؟ اچھا تو سنئے شبِ گزشتہ جو میری
اور سوگوار راتوں سے کم تاریک نہ تھی اس تفصیل کے اجمال کو یوں
ظاہر کر سکتی ہوں:—

کیا ہو گیا نسیم کو پھر پر خبر نہیں
گلشن تو سنی تھی دمِ انتہائے شب

کیا اس سے زیادہ تفصیل آپ چاہتے ہیں؟ اگر یہی خواہش ہے
تو اس وقت کا انتظار کیجئے (جو غالباً دور نہیں ہے) جب میرے
لبوں پر ہمیشہ کے لئے مہرِ سکوت ثبت ہو چکی ہوگی کہ اس کے
بیان کے لئے ایسے ہی سکونِ مطلق کی ضرورت ہے۔ اسی زمین
میں ایک خیال اور نظم ہو گیا تھا جس کا مفہوم اب میرے ذہن
میں بھی نہیں ہے:—

داماں صبح پر نظر آتا تو ہے... مجھے
ہاں ایک داغِ بے اثری دعائے شب"

پہلا شعر کس قیامت کا ہے اور کس درجہ میر کا رنگ لئے ہوئے ہے' دوسرا شعر بالکل مومن کا معلوم ہوتا ہے آفتاب کو دامنِ صبح کا ایک داغ لکھ کر دعائے شب کی بے اثری کے اثر کو ثابت کرنا کس قدر بلیغ انداز بیان ہے۔ مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اگر شبِ ہجر کی صبح ہوئی بھی تو کیا' جب کہ ایک مہجور کا دن بھی داغدار رہتا ہے' لیکن اس کو بیان کیا ایسے انداز سے کہ رات کی دعائیں خواہ کتنی ہی بے اثر رہی ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ آفتاب کی صورت میں دامانِ صبح پر ایک دھبہ چھوڑ گئی ہیں' پھر اسی کے ساتھ ضمناً التہابِ عشق کا اظہار جس حسن کے ساتھ ہو گیا' وہ ایک جداگانہ لطف ہے۔

خیر یہ باتیں نہ کرنے کی ہیں' نہ سننے کی' وقت آجائے تو صرف دیکھنے کی
ہیں' چھوڑیئے ان قصوں کو۔ اب یہ بتائیے کہ آپ کا "ذاتِ ظلمت

وقت مکمل ہو کر شائع ہو جائے گا۔ آپ نے بڑا ظلم کیا کہ اس کے ناقص
اجزاء بھیجکر مجھے بیتاب بنادیا۔ ہر چند یہ حقیقت ہے کہ آپ کے خیالات
سے پورا لطف اٹھانیکی اہلیت مجھ میں نہیں ہے لیکن اپنی قابلیت
کے لحاظ سے جو کچھ میں آپ کی تحریر سے سمجھ لیتی ہوں وہ بھی سر دھننے
کے لئے کافی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتی کہ ایک انسان کیونکر الفاظ پر
ایسی زبردست قدرت حاصل کر سکتا ہے اور اس درجہ بلند خیالات
کی بارش مسلسل اور متواتر کس طرح ہو سکتی ہے۔ آپنے شیطان کا
یہ کتنا پیش کر کے فی الحقیقت اس تصور انسانی کو بیدار کر دیا جا کہ
جس کے وجود کا علم بھی ابتک لوگوں کو نہیں ہے۔ حیرت کرتی ہوں
کہ کتنے آدمی اس کے سمجھنے والے آپ کو مل سکیں گے۔ مگر آپ تو
ان باتوں سے بے نیاز ہیں صنعت کسی اعتراف کی محتاج نہیں
گلاب کا پھول جنگل کی جھاڑیوں میں بھی وہی صنعت رنگ و بو ہے
خواہ نگاہ انسانی اس تک پہنچے یا نہ پہنچے۔ معاف کیجئے میں نے
بہت سی خراشی کی اب اجازت دیجئے کہ اس تحریر کو ختم کروں

نسیم"

نسیم کا جو خط آتا ہے وہ تازہ اور زیادہ گہرا اثر دل پر چھوڑ جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ کس فضا میں اسکی تربیت
ہوئی ہے اور اسقدر بلند خیالات اس کے دماغ میں پیدا ہونے کا کیا سبب ہے پھر سنجیدگی کا یہ عالم ہے کہ
باوجود اتنے عرصہ سے خط و کتابت ہونے اور باوصف اس حقیقت کے کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے،
آج تک ایک لفظ بھی بے تکلفی یا بے اختیاری کا اسکے قلم سے نہیں نکلا۔
کتنی بار دبی زبان سے اسنے یہ بھی خواہش کی ہے کہ کلکتہ جا کر اس سے ملوں لیکن اس کمبخت کاروبار سے
فرصت ہی نہیں ہوتی اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں خود بھی پس و پیش کرتا ہوں کہ مبادا ملنے کے بعد وہ
میری طرف سے ان خیالات و توقعات کو واپس لے لے جو اس وقت تک تحریروں کے ذریعہ سے
اسکے دل میں پیدا کر سکا ہوں۔ لیکن آخر اسکا نتیجہ کیا ہو گا اس ڈرامہ کا اختتام کیا ہو سکتا ہے
یا کیا ہونا چاہیئے ......"
اسکا خیال اس حد تک پہونچا تھا کہ عباس آگیا اور اسنے آتے ہی رشید کی صورت دیکھکر سمجھ لیا کہ آج پھر حضرت پر نجومی

عشق طاری ہے۔

——— وشیمان کیا کوئی اور تازہ خبر کہ موصول ہوئی ہے؟

——— میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم کسی وقت انسان بھی بنتے ہو یا نہیں؟ خدا کے لئے کبھی تو سنجیدہ بن جایا کرو میں ہزار دفعہ کہہ چکا کہ معاملہ مذاق کی حد سے گزر گیا ہے اور اگر جلد میں نے کوئی فیصلہ نہ کیا تو ممکن ہے کوئی زیادہ قبیح صورت پیدا ہو جائے لیکن تمہیں تو دوسرے کی تکلیف سے صرف لطف اٹھانا آتا ہے تم کیوں کوئی صائب مشورہ دینے لگے۔

——— "آپ جیسے عقلمند میں بیس دفعہ کہہ چکا کہ سعیدہ کی ماں کو طلاق دو اور کلکتہ جا کر نسیم کو بیاہ لاؤ۔ اس سے زیادہ دل خوش کن مشورہ تمہارے لئے کیا ہو سکتا ہے؟"

——— "وہ تو میں سمجھتا ہوں۔ کہ کوشش کے بعد بھی تم کبھی متانت اختیار نہیں کر سکتے"

——— "اچھا یہ منظور نہیں تو نسیم سے خط و کتابت بند کرو بیوی کو پاس بلاؤ اور وہ زندگی بسر کرو جو شریف خاندانوں کا دستور ہے۔ اور ہاں ایک تیسری صورت بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ نہ ایک کو طلاق دو اور نہ دوسری سے شادی کرو لیکن اسکو مطلقہ کے حکم میں رکھو اور اس کو منکوحہ کی شان سے"

——— "اور ایک چوتھی صورت اور بھی تو ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ صفیہ کو طلاق دئے بغیر نسیم سے نکاح کر لوں؟"

——— "یہ صورت ناقابل عمل ہے کیونکہ اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ نسیم تم سے شادی کرنا چاہتی ہے اور اگر خفا نہ ہو تو یہ کہوں کہ وہ تم سے محبت بھی کرتی ہے یا نہیں لیکن اگر بفرض محال وہ نکاح کے لئے راضی ہوئی بھی تو اس کی اولین شرط یہ ہوگی کہ صفیہ کو طلاق دو"

——— "ممکن ہے ایسی صورت پیش آئے لیکن پہلے ہی سے اس پر یقین کر کے کیونکر راہ عمل مقرر کیا جا سکتی ہے"

——— "کیوں دماغ خراب ہوا ہے؟ نسیم اور کسی سے شادی کرنے پر راضی ہو جائے! آپ تو کیا چیز ہیں کہ آپ کا سارا کاروبار بھی اس کے ایک حقیر ترین ناز معشوقانہ کی قیمت نہیں ٹھیر سکتا یہ وہ بلائے بد ہے کہ نورتن کے کارخانہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دے میں نے نہ دیکھا نہیں اور نہ میں اسکی حقیقت سے آگاہ ہوں لیکن صرف اسکی تحریروں سے یہ اندازہ کیا ہے کہ وہ دنیا میں کسی سے محبت نہیں کر سکتی اور ہر اس شخص سے اظہار الفت کے لئے آمادہ ہو سکتی ہے جس کے اندر کچھ بھی خون نچوڑنے کے لئے آسے مل سکتا ہے۔

علاوہ اس کے میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ خود تم کو اسقدر غلط فہمی کیوں پیدا ہو گئی ہے۔ دنیا میں تین چیزیں ہیں جن کی کشش صنف نازک کا میلان ہو سکتا ہے اول حسن صورت سو وہ آپ کو قدرت سے ملا نہیں دوسرے دولت وہ بھی تمہارے پاس نہیں اگر لفظ دولت کا صحیح مفہوم لیا جائے رہی تیسری چیز قابلیت و شہرت سو اس خصوصیت میں بھی بہت سے لوگ تم سے زیادہ نمایاں و ممتاز نظر آتے ہیں ——— خدا کے لئے اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہ مارو اور اس کو لکھ دو کہ اگر محض شہرت و اقتدار ہی پسند ہے تو براہ کرم مہاتما گاندھی سے شادی کی درخواست کریں"

— "اس سے زیادہ تحلیل و تجزیہ تمہارے اختیار سے باہر ہے اس لئے تم نہیں سمجھ سکتے کہ محبت ان باتوں سے بے نیاز ہے اور جس طرح

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

ایک مسلم حقیقت ہے اسی طرح اس رمز سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ

عشق گاہے بے سبب ہم رخنہ در دل می کند

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ واقعی اس کو مجھ سے محبت ہے یا اگر محبت بھی ہے تو اسکی نوعیت کیا ہے لیکن یہ ضرور کہونگا کہ خوش قسمت ہے وہ شخص جس کی زندگی کو نسیم اپنی معیت سے پر نور بنادے اور اسی خیال کے ماتحت میری تمنا بھی یہی ہے ۔ اس کی تحریروں سے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ میری طرف بہت مائل ہے جس کو میں ۔ دل کے خوش قسمتی کے اور کیا کہہ سکتا ہوں ؟"

— "خیر خوش قسمتی یا بدقسمتی کا مال تو بعد کو معلوم ہوگا اور خدا نے چاہا تو وہ چیز جسے تم خوش بختی کہتے ہو کمبختی ہی نکلے گی ۔ فی الحال رائے زنی بیجا لیکن یہ تو بتاؤ کس خاندان کی لڑکی ہے اور اسکی تعلیم کہاں اور کس حد تک ہوئی ہے ؟"

— "مجھے خود نہیں معلوم میں نے تو کیمبرج کلب ([illegible] Exchange) کے شعبۂ ادبیات کا ممبر ہونے کے بعد فہرست میں اس نام کو دلچسپ دیکھ کر خط بھیجدیا اور اسکے جواب میں جو اسکی تحریر آئی تھی وہ تم بھی دیکھ چکے ہو اور اس غزل کی بے انتہا تعریف کر چکے ہو جس کا یہ شعر تمہارے نزدیک [illegible] ہے

وہ کیا نظر ہے ذرا آنکھ بھر کر دیکھ لو جس کو

وہی دنیا سے کھو جائے وہی دیوانہ ہو جائے

پھر رفتہ رفتہ نوبت اس حد تک پہونچ گئی کہ تم کو لکچر دینے کی ضرورت محسوس ہونے لگی میں نے ایک مرتبہ ......؟"

رشید کی تقریر ختم نہ ہوئی تھی کہ ڈاکیہ نے لاکر چند خطوط دئیے جن میں سب سے پہلے رشید نے یہ کہتے ہوئے کہ "لیجئے ایک اور خط ان کا آگیا" سب سے بڑے لفافہ کو چاک کیا جس میں تحریر تو نہایت مختصر تھی کہ :-

"میں میوزک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ آرہی ہوں"

لیکن اسی کے ساتھ ایک تصویر بھی تھی جس کے نیچے یہ تحریر درج تھی :-

"تاکہ آپ مجھے پہچان لیں —— نسیم"

رشید دیر تک تصویر کو دیکھتا رہا اور پھر پاس کے حوالہ کر کے خود سر پکڑ کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے کوئی بڑی سخت مصیبت اس پر نازل ہوئی ہو۔

اس وقت تک رشید کی جو کچھ گرویدگی نسیم کے ساتھ تھی اس کا بڑا سبب صرف یہ تھا کہ نسیم نہ صرف تعلیم یافتہ بلکہ ادب کا صحیح ذوق رکھنے والی ثابت ہوئی تھی اور شاید ایک ہلکا سا تعلق اس فلسفہ سے بھی تھا کہ ابتک وہ نگاہوں سے دور تھی لیکن اب جو تصویر دیکھی تو اس کی گرویدگی دفعتہ محبت میں تبدیل ہوگئی اور بس وہیں کا وہ عالم کہ اسے کیا کرنا چاہئیے دفعتہ دور ہو گیا اور اس کے دیکھتے

اُسنے فیصلہ کرلیا کہ اگر حقیقی معاشرتی زندگی کا ہوسکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ نسیم کو شریک زندگی بنالیا جائے۔

ایک سرو قامت، زیادہ سے زیادہ ۱۸ سال کی لڑکی، بنگال کی نیلی آنکھیں، خدوخال نہایت دلفریب، ریشمی ساری میں نہایت خوش وضعی کے ساتھ لپٹی ہوئی ——— یہ تھا مجموعہ تصویر کے سیاہ و سفید خطوط کے امتزاج و اختلاط کا ——— ہرچند بہ حیثیت مجموعی اُس میں کوئی ایسی ندرت نہ پائی جاتی تھی جو صاحب تصویر کے غیر معمولی حسن کی شہادت میں پیش کیجاسکے لیکن رشید چونکہ پہلے ہی بڑی حد تک مغلوب ہو چکا تھا اور اب تصویر کے جابجا اُن ہلکے سایوں نے جن کو مشاق مصور کی پنسل نے پیدا کیا تھا اُس کے صنعت پسند دماغ کو اور زیادہ متاثر بنا دیا تھا۔ اسلئے وہ دیکھتے ہی مسحور ہو گیا اور دفعتہ اسکے دماغ میں اسقدر کثیر خیالات اور جذبات کا ہجوم پیدا ہوا کہ اسکا سر چکرانے لگا اور تھوڑی دیر کے لئے وہ ایسا محسوس کرنے لگا کہ وہ اس آسمان زمین سے علیحدہ کسی اور جگہ پھینک دیا گیا ہے، جہاں انسان خواب و بیداری کے درمیان ایک لنگڑی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔

ہرچند رشید، تعلیم کے لحاظ سے کسی خصوصیت کا مالک نہ تھا، لیکن اپنی فطرت و ذہنیت کے اعتبار سے یقیناً وہ عام سطح انسانی سے کسیقدر بلند واقع ہوا تھا۔ وہ ایک شریف مگر معمولی خاندان کا شخص تھا جس میں تعلیم کا رواج زیادہ نہ تھا، لیکن چونکہ یہ قدرت کی طرف سے ذہین دماغ لیکر آیا تھا اس لئے اسنے خود اپنی کوشش و کاوش سے عربی فارسی کی ضروری تعلیم کے ساتھ انگریزی بھی حاصل کی اور پھر مطالعہ سے اُسنے اپنی قابلیت میں کافی اضافہ کرلیا۔ لوگوں کا خیال ہے اور ایک حد تک غلط بھی نہیں کہ شروع ہی سے اُسکا میلان طبع افرنجیت کی طرف زیادہ تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی معیشت و معاشرت نے بالکل انگریزی اصول اختیار کرلئے اور وہ یورپ کی ہر ادا کو نگاہ پسندیدگی سے دیکھنے لگا۔ اسکی شادی خاندان ہی میں چچا کی لڑکی سے ابتدا عمر میں ہوگئی تھی اور چونکہ شادی کے بعد بھی عرصہ تک اسکے ذوق میں کوئی خاص انقلاب پیدا نہ ہوا تھا اس لئے وہ بھی اس زمانہ تک اس تعلق سے مطمئن رہا لیکن جب رفتہ رفتہ انگریزی اثر نے اسکے دماغ پر قابو حاصل کرلیا تو اُس کو صفیہ سے نفرت ہونے لگی اور اسکے بعد اُسنے شاعری، ادب نگاری اور تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں ملک کے اندر کچھ شہرت حاصل کرلی تو اس نفرت میں اور اضافہ ہوگیا کیونکہ اگر پہلے اس کو صفیہ سے اس لئے بیزاری تھی کہ اُسے جدید طرز سے خوشنما ساری باندھنا نہیں آتا، اپنے بالوں کو مختلف انداز سے سنوارنا نہیں جانتی، وہ زینت اور آرائش کے جدید اصول سے ناواقف ہے، اس کی رفتار اور گفتار میں کوئی لوچ نہیں ہے، پردہ کی شدت سے پابند ہے، تو اب اس میں ان الزامات کا اضافہ ہوگیا تھا کہ وہ اس کے مضامین نہیں سمجھ سکتی، وہ اس کی ادبی شہرت کی اہمیت کا اندازہ نہیں کرسکتی اور اس کے کہے ہوئے شعروں میں سے کسی معمولی شعر تک بھی اس کے ذہن کی رسائی نہیں ہے۔

صفیہ قدرتاً ذہین تھی اور اس میں کلام نہیں کہ اگر اسکی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جاتا تو آسانی سے رشید اسکو اپنے ذوق کا بنا سکتا تھا لیکن چونکہ وہ حد درجہ سرعت پسند تھا اور چاہتا تھا کہ ایک ہی دن میں اسکے اندر انقلاب پیدا ہو جائے، اس لئے مہینہ دو مہینہ تک کوشش کرنے کے بعد مایوس ہوگیا اور اُس نے فیصلہ کرلیا کہ ایسی بیکار صرف دماغ سے کہیں یہ اچھا ہے کہ صفیہ کو اسکے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور رفتہ رفتہ اسکی بیگانگی نے نفرت و بیزاری کی صورت اختیار کرلی۔ ہفتوں ہو جاتے تھے اور وہ مردانہ

نشست سے اٹھ کر گھر کے اندر نہیں جاتا تھا اور اگر کبھی وطن سے باہر چلا گیا تو مہینوں اُس نے یہ بھی نہ پوچھا کہ منیرہ مرتی ہے یا جیتی ہے — چونکہ رشید کی ماں زندہ تھی اس لئے وہ اپنی بیوہ اور بہو کو سنبھالے ہوئے بیٹھی تھی ورنہ رشید نے اپنے طرز عمل سے کوئی دقیقہ اپنے آپ کو بداخلاق ثابت کرنے میں نہ اٹھا رکھا تھا۔ اسی طرح اُس نے کئی سال وطن میں بسر کئے لیکن اتفاق سے کاروبار کی ضرورتوں نے اُسے کسی دوسری جگہ چلے جانے پر مجبور کر دیا اور وہ سب کو خیرباد کہکر اور اپنے خیال میں ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر کے لکھنؤ چلا آیا۔

رشید اس قدر معمولی شکل و صورت کا انسان تھا کہ زیادہ سے زیادہ اسے صرف بے عیب کہہ سکتے تھے لیکن فطرت نے اس کمی کو اس طرح پورا کر دیا کہ دماغ غیر معمولی دیدیا اور زبان و قلم میں خاص قوت ودیعت کر دی۔ یہی اصل راز اس کامیابی کا تھا اور اسی نے اس کی بہت سی اخلاقی عیوب پر پردہ ڈال رکھا تھا۔

چونکہ از روئے زندگی کے لحاظ سے وہ اپنے آپ کو بدنصیب جانتا تھا، اس لئے منجملہ بہت سی آرزوؤں کے جن کی تکمیل کے لئے وہ ہر وقت بیتاب رہا کرتا تھا اُس کی ایک آرزو یہ بھی تھی کہ کوئی نہایت شائستہ و تعلیم یافتہ عورت اس کو مل جائے، لیکن وہ ہنوز اس میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ اب نسیم کے ساتھ خط و کتابت کرنے اور اس کی تصویر دیکھ لینے کے بعد البتہ اس کو یقین ہو گیا کہ شاید تکمیل آرزو کی ساعت آ گئی ہے اور اس لئے یہ معلوم کر کے کہ وہ لکھنؤ آ رہی ہے، اُس نے اپنی زندگی کی ساری اسکیم بھی مرتب کر لی اور نسیم کی پذیرائی کے لئے طیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ (باقی)

(ماخوذ از مرقع گیتی) نیاز فتحپوری

واردات قلب

آغاز ہوا ہے الفت کا اب دیکھئے کیا کیا ہونا ہے — یا ساری عمر کی راحت ہے یا ساری عمر کا رونا ہے

قلعہ تھا بیاض شب میں کہیں اکسیر کا نسخہ بھی کوئی — ای صبح یہ تیری جھولی ہے یا دنیا بھر کا سونا ہے

تم پھول سمجھتے ہو جنکو وہ میری پیاری ساتھی ہیں — تم دوب بتاتے ہو جسکو وہ میرا نرم بچھونا ہے

تدبیر کے ہاتھوں سے گویا تقدیر کا پردہ اٹھتا ہے — یا کچھ بھی نہیں یا سب کچھ ہے یا مٹی ہے یا سونا ہے

ٹوٹے جو سند حیات کہیں اس شور و شر سے بچ جائیے — مانا کہ وہ دنیا ای افسر صرف ایک لحد کا کونا ہے

حامد اللہ افسر (میرٹھی)

علی گڈھ جبلی

تانگے والوں، شوفروں، سپاہیوں، بے فکروں، لوہاروں، نجاروں، معماروں، بلکہ مہاجنوں اور تاریک خیال مولویوں کی آبادی کو اگر "اسلامی ہند" کہتے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں، لیکن اگر اسلامی ہند سے مراد وہ مسلمان آبادی ہے جس میں، علماء، فلاسفہ، وصلحاء، مصنفین، مولفین، محققین، ومورخین، ارباب سیاست واصحاب فکر وفراست داخل ہیں تو ہم آپ سے کہتے ہیں کہ ان سب کے نزدیک "مسلم یونیورسٹی علی گڈھ" کا وقار اس کی عظمت وعزت نہایت رفیع ہے، لیکن اس سربرآوردہ جماعت میں یونیورسٹی یا علی گڈھ کالج کی تمام تر توقیر وسربلندی سرسید علیہ الرحمتہ کے اس اعلان کی بنا پر ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ

"مسلمان کے فارغین علم وحکمت کے اکتساب کے ساتھ ہی قومیت ومذہبیت
کے زندہ کرنے والے ہوں گے"

مرحوم کا یہ وہ اعلان تھا جو دنیا کے متمدن سے متمدن ممالک اپنی تعلیم گاہوں کے متعلق کیا کرتے ہیں، اور یہ امر واقعہ ہے کہ متمدن ممالک کی ایسی ہی تعلیم گاہوں کو نتائج ہیں جنہیں آج انگریزوں سے لیکر وہ یہودی افراد بھی خال خال ہیں جو کسی ایسی ہی قومی درس گاہ سے استفادہ کرکے اپنے ملک اپنی قوم اور اپنے مذہب کے لئے وجہ افتخار وعزت بنے، اور یہی وہ تصور ہو سکتا ہے جس کے ساتھ ہندوستان کا ہر صاحب علم وبصیرت علی گڈھ کو دیکھنا چاہتا ہے،

لہٰذا ہم جو آج سارے ہندوستان میں سب سے زیادہ، قابل لائق، ایم اے، مولوی، فاضل، روشن خیال، بیدار مغز، اور مفلس واقع ہوئے ہیں کچھ ایسے ہی تصورات کے عملی نمونے دیکھنے کے لئے علی گڈھ جانے کے لئے تیار ہوئے، گو پچاس سال کے عملی نمونے خوب خوب دیکھ لینے کے بعد اس مرتبہ پھر علی گڈھ جانا "آزمودہ را آزمودن" کا بقیہ حصہ ضرور تھا، لیکن جس طرح ایک اردو شاعر کسی جگہ "مشاعرہ" کی خبر سنکر "ناقہ بے طرح میں غزل کہنے پر مجبور رہتے ہیں ٹھیک اسی طرح ایک علمی آدمی خصوصاً اخبار نویس کے لئے کسی جگہ بھیڑ اور ہجوم کی اطلاع بس ہے، خاص کر ایسے وقت میں علی گڈھ نہ جانا جبکہ کارکنوں نے "تشنہ ذوق نظر" کے لئے تمام اسباب فراہم کرنے کا اعلان کر دیا تھا کفران نعمت ؟

پس آل انڈیا نیشنل کانگریس کانپور کے غل سے فراغت ہوئی تو وطن واپس ہونا دوبھر ہو رہا تھا اور چشم تماشہ طلب کو کسی نئے "مجمع" کی تلاش میں جب جمائیاں آنے لگیں تو کانپوری میزبان کی اجازت کے بعد پوری آن بان سے بستر کو ایک لکڑی میں لٹکا کر کاندھے پر رکھ سالنس جلد کانو کانپور کے بڑے اسٹیشن پر جا پہنچے اور پوری عجلت سے بستر فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کے سامنے رکھدیا تاکہ رخصت کرنے والے احباب اور اجنبیات سمجھیں کہ ہم فرسٹ کلاس میں سفر کرنے والے ہیں، اتفاق سے آج مسافروں کی تھی کثرت جب ہم نے "بابو جی" سے فرسٹ کلاس ٹکٹ مانگا تو انہوں نے کہا کہ آپ دیر میں آئے اس لئے فرسٹ اور سیکنڈ کے ٹکٹ تو فروخت ہو گئے البتہ تھرڈ کلاس کے کچھ ٹکٹ الا نتا

احقر علی محمد جی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ گلزار حوض حیدرآباد دکن میں ہے

سبب یہ تھا کہ اس زمانہ میں ان میں سے ایک دو سکنا پہلوان رومی اپنی لیڈرانہ پوزیشن کے افریقی تھے، لہٰذا ہم نے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے لیا جو ہماری عادت کے خلاف تھا، لیکن ۱۹۳۶ء میں ایک علی گڑھی بیرسٹر صاحب کے ساتھ فیض آباد سے پٹنہ تک کا سفر کیا تھا جس میں انہوں نے ہمیں یہ سکھایا تھا کہ

صرف انگریزی لباس پہن لو، اور تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیکر فرسٹ میں

بیٹھ جاؤ، جب منزل مقصود بقدر دو اسٹیشن رہ جائے تو اس ٹکٹ کو

فرسٹ کے ٹکٹ سے بدلوالو،

پس اس حساب سے جب ہم اسٹیشن ! اترس تک پہونچے تو اسٹیشن ماسٹر سے وہی سبق دہرا دیا لیکن اسکو کیا کہیئے کہ اسٹیشن ماسٹر اترس بھی تھے ہمارے ہی بھائی فوراً تاڑ گئے مگر پر رعب طریقہ کے ساتھ مسکرا کر فرمایا کہ جہاں آپ اتنی دور تھرڈ کلاس میں آگئے ہیں وہاں علی گڑھ تک اور تھرڈ ہی میں چلے جایئے، اس وقت مارے خوشی کے ہمارے چہرہ کا جو رنگ تھا اُسے تو دیکھا صرف خدا نے لیکن ہم نے بھی ارادہ کر لیا کہ اب فرسٹ کلاس ہی میں جائینگے لہٰذا اس حالت میں کہ بستر تو تھرڈ میں اور ہم فرسٹ میں جوں ہی علی گڑھ کے پلیٹ فارم پر قدم رکھا کیا دیکھتے ہیں کہ ڈپٹی کلکٹر کے چپراسی ٹکٹ کلکٹر سلام کر رہے ہیں ہم جواب سلام بھی نہ دینے پائے تھے کہ ٹکٹ کا مطالبہ ہو گیا، ہر چند اسوقت سوائے خدا کے ہمیں دنیا میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر بھی ہم نے خود کو سنبھال کر یہ ترکیب اختیار کی کہ فوراً سے انگریزی بولنا شروع کر دیا جسکا ایک حرف بھی وہ نہ سمجھے لیکن جب اس پر بھی ٹکٹ کلکٹر ہی بنے رہے تو اردو زبان میں صاف صاف کہدیا کہ

اور ہم کے تمام خاندان کے شجرے ہوئے رکھے ہیں زندگی ہونٹ نے دقیقہ تک ضبط

کر رکھا ہے انہیں کیا خبر کس رنگ میں بیٹھے ہیں؟

تھا اور بلا اس تما خوش رہ گیا اور ہم مع بستر پلیٹ فارم کے دروازہ سے بھاگئے۔ مولوی ۔۔۔۔ ایم اے ایل ایل بی اور مسٹر ۔ ایل ایس سی حیدر آبادی علی گڑھ میں دروازہ تاریخ ولادت سے باخبر تھے دیکھا تو سامنے کھڑے ہانپ رہے ہیں ہمیں دیکھتے ہی مارے خوشی کے پھٹ پڑے بل ہی گئے ادھر ہم نے بھی جب دونوں کی خفت یوں دور کی کہ غصہ کا چہرہ بناکر بستر دے مارا اور کہا لاحول ولا کوئی قلی تک نہیں۔ اب جو نظر اٹھا کر دیکھا تو دھا کا روں کا قصہ ہو رہا تھا ایک لیڈر صاحب سے دس بارہ رضا کار جھوٹ جا رہے تھے کوئی بستر چھینتا تھا تو کوئی صندوق وہ تو لیڈر صاحب نے لباس مضبوط پہن رکھا تھا ورنہ رضا کاروں کا جذبہ وہ دیتا کہ بھی بستہ بنا دیتا، معلوم ایسا ہو رہا تھا کہ اسوقت دخانی جہاز بندر گاہ پر لنگر پڑا ہے اور سلطان انگلستان کی نیلی وردی والی فوجیں اُسے اپنی حفاظت میں کیمپ تک پہونچانے کیلئے گھیر رہی ہیں،

آج شب سوسائٹی مسلم لیگ کا اجلاس ہے، خدا علی گڑھ کے تانگے والوں کو نمونیہ کے مرض سے بچائے، کل صبح کی اذان ہی کے وقت
_______ تانگہ حاضر ہے کی صدائیں آنے لگیں، گو اسوقت ہم کابوسی سفر کی تھکن اور سردی کے پیاپے حملوں سے شکست کھا کر لحاف سے لپٹے میٹھی میٹھی اور راحت پا نیند میں خراٹے فرما رہے تھے لیکن وہ تو آئے اسی غرض سے تھے، وضو کے ایمان آزما امتحان سے فارغ ہو کر ساتھیوں کو اٹھایا مگر سردی کا یہ عالم تھا کہ آج صبح کی نمازیں دو سنتیں اور دو فرض ہی پڑھ کر رہ گئے تانگہ نہایت خوش گلو تھا جسکے ہر عضو سے ترنم اور موسیقی کے نغمے بلند ہو رہے

چونکہ گلچین ہم کبھی پیچھے نہیں بیٹھتے اس لئے کہ اس حساب سے اُلٹا چلنا ہے جو صریح حماقت ہے لہذا تانگہ والے کے پاس بیٹھ گئے، اتفاق سے تانگہ ایک تاجر کے پاس سے گزرا اور چونکہ اس سے قبل ہم یہاں کے جغرافیہ سے واقف نہیں تھے لہذا یہ سمجھ کر "کلاک ٹاور" کسی بڑے بلڈنگ کا منارہ ہے گزر گئے تاکہ پوچھنے، تانگہ والے کو جو دیکھا تو مسکرا رہا تھا بس اس کی اسی مسکراہٹ پر ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور معاملہ اس سے آگے نہ بڑھنے پایا۔

بڑی فکر یہ تھی کہ جبلی کے میدان حشر میں خدا دو جماعتوں سے پالا ڈالے، ایک وہ جس میں ہمارے وطن کے بڑے لفظی دوست، بڑے لفظی ہمدرد، اور بڑے لفظی قدردان" شامل ہیں، دوسری وہ جماعت جس میں ایسے ایڈیٹروں کا خطرہ تھا جن کے ساتھ ہم نے کام کیا، روزنامہ کا وہ بازاروں میں گھومے، مگر ہم نے ترکیب یہ کی کہ ایک چادر اوڑھ لی تھی جہاں کوئی خطرناک سا نظر آیا "زیر نقاب" والا مسئلہ کر لیا، پھر بھی سلطان جہاں منزل میں دھن کے تین آدمیوں اور "ایڈیٹرس کانفرنس" میں پانچ ایڈیٹروں نے پہچان ہی لیا؟ اب ہم مع اہل و عیال یعنی ہمراہیوں سمیت اس میدان حشر میں داخل ہوئے جہاں جبلی کے فلک بوس خیمے تنے ہوئے تھے، جس وقت اس کے دروازہ پر پہونچے تو وہ سائنٹفک تختہ نظر آیا جس کے حروف میں رنگا رنگ بانی دونوں "گریٹ ویل کم" کے الفاظ کو روشن کیا جاتا تھا، اس انگریزی زبان کے "ویل کم" کے سوا جب ہم نے اس کے قریب اردو فارسی، عربی، سنسکرت، پنجابی، گجراتی، غرض کسی ایک ہندوستانی زبان میں بھی "خوش آمدید" کا تختہ نہ پایا تو ہم کسی قدر جھجک گئے اور خیال پیدا ہوا کہ شاید یہ تمام میدان "صرف انگریزوں کی آمد" کے لئے ہے مگر وہ تو مسٹر بی ایس سی، نے ٹوک کر کہہ دیا کہ

یہ پہلا نمونہ ہے یہاں کی تربیت کا کہ ہم اپنی مادری زبان کی محبت اور
غفلت سے بیگانہ ہو گئے،

آگے جو بڑھے تو معاملہ اس سے بھی زیادہ خطرناک نظر آیا یعنی ایک بورڈ پر لکھا تھا "جہل مرکب" ہم نے فوراً ہی قدم روک لئے اور گھبرا کر بی ایس سی، سے کہا کہ "بھاگو" "بھاگو" انھوں نے کہا خیر تو ہے ہم نے کہا دیکھتے نہیں، جاہل گھوڑا اس طرف بندھا ہوا ہے انھوں نے کہا کہ یہ گھوڑا نہیں "مرکب" ہے یعنی کسی تعلیم یافتہ نے مسلمانوں کی اقتصادی پستی دور کرنے کے لئے رسالہ سود مند کے ساتھ رسالہ "جہل مرکب" جاری کیا ہے اور اردو ادبیات میں مسلمانوں کی اس حالت کو نمایاں کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی نام بھی نہیں تھا، ذرا آگے بڑھے تو جبلی کے محکمات انتظامی کے دفاتر نظر آئے جہاں دفتر تنظیم کانفرنس کے دروازہ پر ڈاکٹر کچلو صاحب کے سودیشی پرائیویٹ سیکرٹری منشی حسین ایڈیٹر اخبار "لاحول" کھڑے مسواک کر رہے تھے، انہیں دیکھ کر اور ان کے اخبار کا نام یاد کر کے بی ایس سی، فوراً ہی بولے "سمجھئے یہ فیصلہ نمونہ"

غرض اب مناسب یہی سمجھا کہ جلد پنڈال میں پہونچ جائیں ہمارا داخلہ چونکہ غیر سرکاری تھا اس لئے کوئی سلامی نہیں اتاری گئی، پنڈال یوں تو نہایت سائنٹیفک اصول سے بنایا گیا تھا مثلاً پولس کے چپراسیوں کو نیلے اور سفید رنگ کے کپڑوں سے ایسا من و عن خود کر دیا تھا کہ ایک تختہ عمارت اور اس میں فرق محسوس نہیں ہوتا تھا، اسٹیج پر سرسید، حالی، اور محسن الملک، کی تصاویر تھیں، چونکہ ہماری تصویر ندر میں پہونچی تھی اس لئے آویزاں نہیں کی گئی، البتہ اخبار نویسوں اور رپورٹروں کی نشست اس جگہ بنائی گئی تھی جہاں کسی تھیٹریکل کمپنی آف انڈیا میں ہارمونیم ماسٹر بیٹھتا ہے یعنی اسٹیج کے نیچے، اور اسی لئے ہم نے اس نشست میں بیٹھنا توہین سمجھا، حاضرین

کی تعداد اس لئے کرتی کہ مسلمانوں میں صرف زیادتا اتفاقی بانی پھیل گئی ہے جو کوئی نقصان کی بات نہیں جب حاضرین شور و غوغا سے فارغ ہوئے تا ظر اعزازی مسلم لیگ نے رپورٹ سنانا شروع کی جو خدا ہی کے فضل سے ختم ہوئی اور سر عبدالرحیم صاحب نے اپنا خطبۂ صدارت شروع فرمایا جو خالص انگریزی زبان میں تھا گویا ہم سب حاضرین انگلینڈ کے بسنے والے تھے۔ جلسہ میں تہذیب صرف اس قدر باقی تھی کہ لوگ خطبۂ صدارت کی کاپیاں لیکر باہر چلے جا رہے تھے البتہ خطبۂ صدارت کی خوبیوں پر تحسین کرنا صاحب صدر خود ادا کر لیا کرتے تھے، اور حاضرین تالیاں بجا دیتے تھے گویا صدر صاحب کوئی تماشہ ہیں۔ اب اگر مسلم لیگ کی ایسی حالت پر کوئی شخص جل رہا ہوگا تو وہ محمد علی شوکت علی ہونگے جو چار و ناچار کی شطرنج کی طرح اپنی اپنی کرسیوں پر اس لئے بیٹھے بیٹھے تھے کہ آج مسلم لیگ کے بادشاہ کیا بات ہی دیکھ رہے تھے، چنانچہ دوسرے دن اونھوں نے فرمایا کہ مسلم لیگ کو چاہیے کہ وہ گورنمنٹ سے صاف اور دو دار الفاظ میں کہدے کہ اگر سکلہ موصل میں مسلمانوں کی بابعدا نہ قوم ترکی پر کوئی زیادتی کی گئی تو ہم یہ کریں گے وہ کریں گے مگر وہ تو خدا کا شکر ہے کہ. جلی امام صاحب کا مذہبی جوش کام آگیا اور اُنھوں نے ایسی تجویز پیش کر کے معاملہ ختم کر دیا ورنہ مسلم لیگ محمد علی کے ورغلانے سے ایسا ریزولیوشن پاس کر دیتی تو ہم سب لوگ پنڈال کے اندر ہی گرفتار ہو جاتے اور ہمارے اہل و عیال بیچارے حوض کوثر پر ہی ملتے ہاں محمد علی نے دوسرے اجلاس میں تقریر کرکے جا بجا دل ہلا دیا لیکن ان سے ہوا ہی کیا ہے بس یہی ہوا کہ ہم تمام حالات کو چھوڑ کر ایک خیمہ میں جا پڑے اور تاثر کا یہ عالم ہوا کہ مسٹر بی، اے، سی، ایل، اٹھے کہ سمجھئے یہ ہوا تھا نمونہ،

غرض ان حالات کے ساتھ جب ہم لیگ کے اجلاس سے فارغ ہوئے تو مولوی، ایم، اے، ایل، ایل، بی، فرمانے لگے کہ چلو چلیں نئے میدان کا تماشہ دیکھو، یہاں سے چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ علی گڈھ اولڈ بوائز کی ایک نہایت شاندار پر بہار کاربات آتی ہوئی دکھائی دی، اعلیٰ درجہ کے کشمیری کے سوٹ، خدام بات باندھے پیچھے پیچھے اور دہن مبارک سے سیگریٹ اور سگار کے کرہ ہائے ابر بلند ہو رہے تھے سنا ہے کہ یہ لوگ یہاں اس لئے آئے تھے کہ اپنے قومی بھائیوں کو دکھا دیں کہ دیکھو ہم اس چندہ کے کالج سے تعلیم پاکر غریب اور بےکس مسلمانوں پر اس طرح حکومت کرتے ہیں؟ اب یہ اور بات ہے کہ اس حالت میں ان حضرات سے قومی معاشرت، آداب مذہبی، قومی زبان، اور وضع ترسی کے اوصاف مٹ گئے ہوں جو کسی صحیح تعلیم کے صحیح نتائج ہو سکتے ہیں لیکن ابھی ہم ان لوگوں کی ان قومی خصوصیات کو مٹا ہوا پاکر افسوس کے گنبد ہی میں تھے کہ آنکھیں ایک اور تماشہ سے دو چار ہو گئیں یعنی یہ کہ یہ اولڈ بوائز تو وہ تھے جو ۹۰ فیصدی کے حساب سے نپولین اور گلیڈسٹون بنکر رہ گئے ہیں. لیکن یہاں کے وہ ۱۰ فیصدی طلبہ جو آج علم و اصول اور سائنس و فلسفہ کی رو سے صحیح طالب علم، فارغ التحصیل اور دلچسپ اور سب پسند کئے جاتے ہیں ان کا حال اپنی جگہ پر کچھ کم نہ تھا مثلاً مولانا شوکت علی جب آپ مسلم لیگ سے نکلے تو اولڈ بوائز کی کافی تعداد نے آپ کو گھیر لیا اب جو مولانا کو ان لوگوں نے گھیرا تو سونا تاگے معانقہ کئے اور طریق معانقہ یہ اختیار کیا کہ عربوں کے رسم و رواج کے موافق آپ ہر ملنے والے کی پیشانی اور ناک کے قریب کے اُن دونوں عضوں کو بوسہ دیتے تھے جہاں "خال ہندو" واقع ہوتا ہے، کیوں صاحب اگر علیگڈھ کے اولڈ بوائز نے اپنی قومی زبان، لباس، تہذیب، عمل، اور مذہبی آداب کو بھلا کر انگریزی تہذیب اختیار کر لی ہے تو آپ نے یہ رسم کس ہندوستانی معاشرت سے اخذ فرمائی ہے؟ اور کیا اس طرح اگر اولڈ بوائز انگریزی کے لحاظ سے نیم انگریز خطۂ ہندوستان ہو گئے ہیں تو کیا آپ اس عربی رسم سے نیم عرب خطۂ عربستان نہیں ہو گئے بھلا بتلائیے کہ علی گڈھ کے طلبہ سے عالم اسلام پر کیا نہ کھلاتے ہیں؟

حضرت شیخ سراج الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ

سراج الدین نام، حبیب الرحمٰن کنیت، والد کا نام کمال الدین تھا، احمد آباد میں پیدا ہوئے، اور مدت العمر وہیں رہے۔

بچے کے اخلاق و عادات، والدین کے اخلاق و عادات کا عکس ہوتے ہیں، آپکی زندگی اس نظریہ کی عملی تفسیر ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی پڑھنا لکھنا شروع کیا تو اسی وقت پتہ چلا جب مولد یدیات سے بچپنے۔ والدین ان باتوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے، اور سب بچوں سے زیادہ انہیں کو پیار کرتے تھے، عزیز و اقارب بھی انہیں بہت بچہ کی ادائوں پر فریفتہ تھے۔ (سلسلہ نظامیہ) اس فرق طرح کے، دوران میں آپنے زہد و ریاضت اختیار کی، اور ہر شخص کو اپنا بنا رکھنے کیلئے بچپن سے ہی باتیں اختیار کیں، جن کا حامل اپنے والدین کو دیکھتے تھے۔ ابتدا میں یہ باتیں محض نقالی تھیں، لیکن بعد کو یہ نقالی ہی اصل بن گئی، اور استعداد و تسلسل نے مجاز کو حقیقت کا رنگ دیدیا۔ علامہ کی نظروں نے انہیں جوہر قابل کو بچپن ہی میں جانچ لیا تھا، اور وہ سمجھ چکے تھے کہ سجادۂ طریقت انہی کے حصہ میں آئیگا چنانچہ مستقبل نے بتلا دیا کہ یہ توقع غلط نہ تھی۔

(اخبار الاولیا) میں لکھا ہے کہ جب آپ حدیث، تفسیر، فقہ، اور ادب کی تکمیل کر چکے تو علامہ نے علوم عقلیہ کا درس دینا چاہا، ان کا خیال تھا کہ اپنی جنس معلوم کرنے کیلئے انسان کیلئے علوم عقلیہ کی تحصیل ضروری ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کیا ہے کائنات میں اسکا کیا درجہ ہے، وہ یہاں کس لئے آیا ہے، اسکا مقصد کیا ہونا چاہیے خالق سے اسکا کیا تعلق ہے۔ ہرچند اس عقیدہ کا تلخ تجربہ وہ خود اٹھا چکے تھے، اور مولانا نظام کو بھی معقولات پڑھا کر بہت پشیمان ہوئے تھے کہ وہ انہی تاریکیوں میں الجھکر رہ گئے۔ لیکن اب پھر ان میں وہی شوق عود کر آیا، اور چونکہ آپ کی ذہانت و ذکاوت سے انہیں بہت توقعات تھیں اور منجملہ بیٹے (اخبار الاولیا سلسلہ نظامیہ۔ اخبار الاولیا) کی عدم موافقت طبیعت کے سیلاب میں ہلکا سا پیدا کر کے، طوفانی زور پیدا کر دیا تھا اس لئے وہ اپنے والد کے شوق کو دیکھکر بھی تحصیل ارشاد کے لئے تیار ہوگئے، اور جو کچھ انہوں نے کہا مان لیا لیکن یہ کام دل سے نہیں کیا جاتا، اسکا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا، آپنے اپنے والد کے حکم کے آگے سر تسلیم خم تو کر دیا، مگر دل اسطرف مائل نہ تھا۔ آخر کار حیات علامہ پر ختم ہوگئی تو انہوں نے یہ سلسلہ بند کر دیا، اور سلوک کی تعلیم دینے لگے، اگر شیت کو یہی منظور تھا اور اسکا فیصلہ دوسرا تھا۔

علامہ کو گجرات آئے تیس برس گزر چکے تھے، اس عرصہ میں وہ کئی بار ارادہ کر چکے تھے کہ دہلی جائیں۔ مگر یہاں کے انتظامات کی ذمہ داریوں نے اجازت نہ دی، اور آپ صبر و تحمل کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے لیکن اب خدا کی طرف سے چلنے کا انتظام ہوا حضرت محمود کا خط آیا جو شوق ملاقات کے جذبات سے لبریز تھا۔ پہنچتے چلنے کا بندوبست کیا، سجادۂ درس مولانا نظام الدین کے سپرد کیا، مسند خلافت آپکو تفویض کی، اور ہمیشہ کیلئے احمد آباد کو خیر باد کہکر دہلی چلے آئے۔

علامہ نے چلتے وقت آپکو دو وصیتیں کی تھیں، ایک یہ کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے غافل نہ رہیں۔ اور ہر حال میں احکام شرع کو مقدم رکھیں۔ دوسرے یہ کہ سلوک کی تکمیل کریں، اور اپنے اندر صدق و خلوص اسلئے فرض نہ سے بے نیازی پیدا کریں۔ آپنے ان دونوں وصیتوں کی بدرجۂ اتم پابندی کی۔ امر بالمعروف کیلئے مسند وعظ و ارشاد بچھائی اور تکمیل سلوک کیلئے رو گ اختیار کرکے عبادت و ریاضت کو زور اوڑھنا بنایا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ سراج الدین انسانوں کے لباس میں فرشتہ ہے۔

لیکن سلوک کی انتہا ریاضت و عبادت کی شدت نہیں ہے۔ کتنے ہیں جن سے اصل مقصود حاصل نہ ہوا، مجاہدہ کے قدم جسقدر آگے بڑھتے جاتے تھے اتنے ہی شوق و تجزیہ وصل محسوس کرنے جاتے تھے مجاز کی دنیا میں جسقدر منزلت، شہرت و مقبولیت جتنی بڑھتی جاتی تھی دل پژمردہ ہوتا جاتا تھا، اسکی تسکین کیلئے کسی اور ہی چیز کی ضرورت تھی۔ پھر کیا اسے دلفریبی سنگ راہ بھی ہوتا ہے! ان کیلئے کبھی ایسا ہی ہوتا ہے اور یہ تریاق زہر کا کام دے جاتا ہے جسطرح ہر طبیعت مختلف ہوتی ہے، اسی طرح اللہ

کے لطف وکرم کے طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں، وہ پابستۂ زنجیر تکلف نہیں

لے ترا با ہر دلے رازے دگر　　ہر گدا را بر درے نازے دگر

آپ نے جب دیکھا کہ اس سے کام نہیں چلتا، تو درماندگی کے غم میں بہت روئے، اور والد کے فیض صحبت کی محرومی کے رنج میں بہت ماتم کیا۔ لیکن آہ وزاری سے کیا ہو سکتا تھا، نتائج کا فیصلہ تو صرف میدان کارزار ہے، جہاں محنت اور کوشش کا فولادی ہاتھ اور عزم وہمت کا قوی دل متحرک رہتا ہے۔ آپنے رنج فرسودہ دل سے سعی باطل کی شکست پائی چھوڑی، اور ہمہ تن سرگرم تلاش وجستجو ہو گئے۔ مدتوں اہل ہوش وخرد کی مجلسوں میں اس جوہر گمشدہ کو ڈھونڈا، ہر خانقاہ میں جا کر متاع طلب کی جستجو کی۔ لیکن یہ جوہر کہیں نہ ملی، اور جہاں بھی جاتے تھے وہاں سے یہ جواب ملتا تھا کہ تمہاری قسمت کا سامان کچھ نہیں۔ آخر مجبور ہو کر اس طرف سے منہ موڑا، علم وتقدس کو چھوڑ کر شاہراہ عشق اختیار کی، اور سجادگی کی تعلیم نشانات آتشکدہ با محبت کی ویرانیوں میں دوڑنے لگے، اور یہ عقدہ کھلا کہ

عاشق نہ شدی محنت الفت نہ کشیدی　　کس پیش تو غم نامۂ ہجران چہ کشاید

اب دل میں سچی طلب پیدا ہو گئی تھی، عشق کی آگ دل میں بھڑکنے لگی تھی، خلوص نے ننگ وناموس کا خیال اٹھا دیا تھا، حرص وہوس کی طلق گرفت نہ رہی تھی، دل لذت پرستیوں سے خالی اور بے نیازیوں سے معمور ہو گیا تھا، اور ظاہر کی پابندیوں سے سبک دوش ہو گئے تھے

ہم کعبہ وہم بت کدہ سنگ رہ ما بود　　رفتیم وصنم بر سر محراب شکستیم

لوگوں نے کہا خاندانی عزت وشرافت کو کیوں خاک میں ملاتے ہو، دیوانگی کی سرخوشی سے ساغر ضبط چھلک گیا ہے تو کچھ دن کسی خلوت میں بیٹھ کر گذارو اور اپنے دامن کو آوارگی کے گرد وغبار سے میلا نہ ہونے دو۔ بولے۔ ان ہی بت پرستیوں میں بیس برس ضائع ہو چکے، اب کہاں تک اس بت خانہ کی دیواروں سے سر ٹکراتے جاؤں۔ طلب حقیقی خاندانی عزو وقار کو نہیں دیکھتی، اور خدا کی محبت کے ساتھ مشیخت ربانی کا نباہ ناممکن ہے۔ یہ غیر وشکر کی گفتگو نہیں بلکہ دوزخ میں کا معاملہ ہے۔ میں اسکا طالب ہوں اسکا جلوہ جہاں بھی بے نقاب نظر آجائیگا، دین کا ہو رہوں گا، خلوص کے یہی معنی ہیں

برو ریختا ذو خواہم گشت چون حافظ تیم　　چلی خدا آلیٰ شد اے پاطریقت پیرما

محمد الیاس نامی ایک مرید نے آپ کے ملفوظات جمع کئے ہیں، ان میں لکھا ہے: جب اس آئینہ خانہ میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ گذشتہ زندگی کے کاروبار باطل اور ریاکاری پر مبنی تھے۔ ہر کام کی تہ میں کوئی نہ کوئی دینی و دنیاوی آرزو نظر آئی، نماز کے خشوع میں جنت کی طلب تھی، روزے کے تقوے میں دوزخ کا ڈر تھا، خیرات واحسان میں بڑائی جتانے کی خواہش تھی۔ غرض جو کام تھا رعادت تھا، حالانکہ ضرورت اسکی تھی کہ دل بالکل بے مدعا ہو جائے، اور بقول جامی حقیقت طاری ہو جائے کہ

ہر کس بہ ہوائے خود دادہ وز تو مقصود　　این جملہ طفیل تو من از تو ترا خواہم

بس یہ اللہ کا بڑا فضل وکرم تھا کہ قبل اس کے کہ اقرار کرتا کہ بنفسک الیوم علینا حسیبا) والا دن طاری ہو، تلافی مافات کیلئے کتاب اعمال کھل گئی اور اسی نے طلب حقیقی کی سچی راہ بھی بتلادی۔

اب تک اپنی قوت بازو کے سوا دوسری چیز کا سہارا نہ تھا، اس مقام تک اپنے ہی پیروں سے چلکر آتے تھے۔ لیکن جب یہ منزل ختم ہو گئی اور معلوم ہوا کہ ابھی اور بہت کام کرنے ہیں تو ایک پختہ کار رہنما کی جستجو میں لگے۔ پہلے دو چار جگہ سے یہ جواب سن چکے تھے کہ تمہارا حصہ ہمارے پاس نہیں ہے، اسلئے گھر آنگن سے قدم نکالا، اور رندوں اور پارساؤں سے ملنے ملانے دہلی آئے۔ یہاں پہنچکر سب سے پہلے جو خبر سنی وہ والد کے انتقال کی تھی۔ یہ خیال کر کے کہ آخری وقت ایک نظر بھی نہ دیکھ سکے،

اور طریقت میں بھی جا سکے، خوب زار زار روئے حضرت محبوب نے سمجھایا کہ جو ہونا تھا ہو گیا، رونے سے کیا ہوتا ہے۔ اب اپنے دل کی طلب کو پوری کرو، کامیابی تمہارے ساتھ رہے گی، اور ان شاء اللہ بامراد واپس ہو جاؤ گے۔ آپ آنسو پونچھ لئے اور یہ کہتے ہوئے کہ ؎

من بہرچہ گفتی باد راضیم حقا کہ ہرچہ از تو رسد جز عطا نمی بینم

اپنے شیخ کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے خاص لطف و توجہ سے تربیت کی، اور تھوڑے ہی دنوں میں نظر آنے لگا کہ حالت میں نمایاں تبدیلی ہو رہی ہے، اور سحاب کرم کے چھینٹوں نے مزرع قلب کو شاداب کر دیا ہے۔ حضرت محبوب نے پہلے ہی ان احوال کے طاری ہونے سے مطلع کر دیا تھا۔ چنانچہ جب آپ نے صبر و سکون سے تمام مراحل طے کر لئے تو خلافت و ہدایت کی اجازت ملی، اور خلافت نامہ کا تاج پہن کر احمد آباد کو روانہ ہوئے۔ لنوانی نے لکھا ہے:۔

"از ان رو بہ شیخ زادہ دست بادۂ وحدت می گردید"

قاضی کمال الدین کو اس طرح آپ کے دہلی جانے اور حضرت نصیر الدین سے بیعت ہونے سے انکار ہے، وہ کہتے ہیں:۔

"پدر بزرگوار ہنگام رحلت او را در خلوت طلب داشتہ از انعام اولین و آخرین نوازش فرمود"

لیکن یہ صحیح نہیں، علامہ کا انتقال دہلی میں ہوا ہے، اور آپ اس وقت احمد آباد میں تھے۔

احمد آباد واپس پہنچے تو یہاں مولانا فخر الدین صاحب کو تخت بچھا پایا، آپ باوجود مفر کی تکان کے تیمارداری میں مصروف ہو گئے، لیکن کاسۂ زندگی لبریز ہو چکا تھا، والد کے انتقال کی ٹھیس لگتے ہی چھلک پڑا۔

والدہ کیلئے یہ دوسرا صدمہ تھا جس سے ان کا ساغر حیات بھی چکنا چور ہو گیا۔ شوہر عزیز کی موت کے جانگداز آنسو بھی خشک نہ ہوئے تھے کہ یہ دوسرا رونا پڑا، ضبط کر سکیں، قلب کی حرکت بند ہوئی اور چل بسیں۔

ایک ہی تاریخ ایک ہی وقت میں دو جنازے اٹھے، ایک ماں کا، دوسرا بھائی کا۔ تمام عزیز و اقارب جمع تھے، گھر مجلس عزا بن رہا تھا، سب کی آنکھیں نمناک تھیں، لیکن آپ کی آنکھیں بالکل خشک، اور آپ کا چہرہ رنج والم سے بے اثر تھا۔

ان تنہائی ایک جگر گوشہ، اور اسکے بعد رفیقۂ زندگی سے جدا ہونا پڑا، مگر آپ کی رضا پسندگی اب بھی متزلزل نہ ہوئی۔ ان باتوں سے عشق اور گیان دن بدن بڑھتا جاتا تھا۔ رگ رگ میں مصیبتوں پر مصیبتیں ٹوٹ پڑتیں، لیکن آپ کو خبر بھی نہ ہوتی۔ ایک دفعہ آستین میں سانپ چڑھ گیا، مگر آپکو پتہ نہ چلا، خادموں نے جھٹ اترتے دیکھا تو مارا۔ ایک دفعہ حجرہ میں نماز پڑھ رہے تھے کسی کونے سے نکل کر بچھو نے ڈنک مارا، اور آپ بدستور نماز میں مشغول رہے۔ بیماری میں طبیب کو بلانے کی ممانعت تھی، کہ جس نے بیمار ڈالا ہے وہی شفا دینے والا ہے، روحانیت اس قدر ترقی کر گئی تھی، اور قیود بشریت سے اتنے بلند ہو گئے تھے کہ دنوں بے آب و دانہ رہتے تھے، اور کوئی پہچان بھی نہ سکتا کہ بھوکے ہیں یا شکم سیر۔

اخبار الاولیاء کے ایک راوی کا بیان ہے کہ بیعت ثانی کے بعد سے آپ کی غذا صرف چار تولہ رہ گئی تھی، گیہوں کے بجائے جو کی روٹی کھاتے، اور گوشت کے سالن کی جگہ ساگ کی بھجیا ہوتی تھی۔

ریاضت اور مجاہدہ کا یہ حال تھا کہ رات رات بھر نماز میں کھڑے رہتے، اور ایک ہی رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے۔ دن کو اکثر جنگل سے لکڑیاں چن لاتے اور بازار میں بیچ کر مزدوروں کو دیدیتے جس زمانہ میں طبیعت ناساز ہوتی تو بیاں بنتے تھے۔

سمنانی کو جذب و سرمستی سے محبت ہے، وہ آپ کو مجذوب کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایسا کہنا دراصل آپکے کمال عرفان کی توہین ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ پر جذب طاری رہتا تھا اور اکثر کیفیت سکر میں مدہوش رہتے تھے۔ لیکن ہر مدہوش مجذوب نہیں ہوتا۔ کیا خبر کہ وہ بظاہر مدہوش اور بباطن ہوشیار ہو، جاننے والے جانتے ہیں کہ مستی و ہشیاری کے درمیان بھی ایک کیفیت ہوتی ہے اور بے خودی و سرشاری میں فراست و دانائی کا بھی ایک مقام ہوتا ہے۔ دریا میں آب شور و شیریں کی لہریں ایک ساتھ بہتی ہیں، انسانی قلب میں بھی سکر و صحو، مستی و ہشیاری کی کیفیتیں بھی ایک ساتھ پیدا ہو کر قائم رہ سکتی ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ جذب و سرمستی عقل و خرد کی متحمل نہیں ہو سکتی، اور ہوش و خرد جذب و دیوانگی کے ساتھ ساز نہیں کھا سکتے۔

صوفی جب تجلی ذات کے مقام پر فائز ہوتا ہے تو اس پر علی قدر استعداد سکر و صحو کی کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔ وہ اپنے حال کی سرشاری اور مقام کی وارفتگی میں ہر تعلق و معاملت سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے، محبوبات و مالوفات کو بھی چھوڑ دیتا ہے۔ لوگ اس کیفیت کو جذب سمجھتے ہیں، لیکن یہ عین ہوشمندی ہے، کیونکہ یہ سب کچھ کیا جاتا ہے جان بوجھ کر کیا جاتا ہے ؎

گر بدانم کہ وصال تو بدین دست دہد ۔۔۔ دل و دین را ہمہ در بازم و توفیر کنم

مگر اسکے مدارج مختلف ہیں۔ صحو کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جب پر سکر کا غلبہ ہوتا ہے ایسے میں فرائض و واجبات بالکل ساقط ہو جاتے ہیں۔ سکر میں ایک درجہ ایسا آتا ہے کہ ہوشیاریاں بھی اسکے آگے بیہوشیاں نظر آتی ہیں۔ اس کیفیت کو منزل صحو کا مقدمۃ الجیش سمجھنا چاہیئے۔ جو رہروان طریق اس رنگ میں ترقی کرتے ہیں وہ اپنی ذات سے گذر کر دوسروں کیلئے بھی مفید ہوتے ہیں، ان کا فیضان بعد موت بھی جاری رہتا ہے، وہ ترقی کرتے ہوئے اقطاب و اوتاد کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ دنیا کیلئے ان کا وجود بمنزلہ آفتاب کے ہوتا ہے۔ لیکن جن پر سکر صحو آمیز کا غلبہ ہوتا ہے ان کی حالت درمیانی ہوتی ہے، وہ نہ بالکل بیہوش ہو جاتے ہیں، اور نہ بالکل ہوشیار ہی رہتے ہیں۔ وہ زندگی ایک مستمر تلون ہوتی ہے۔ وہ کبھی شہر و آبادی میں آجاتے ہیں اور کبھی جنگل و ویرانہ میں جا بیٹھتے ہیں۔

بہرحال اصل چیز ان دونوں کا ایک خاص تناسب یا باہم اجتماع ہے، یعنی مخلوق کی طرف سے مدہوشی اور خالق کی طرف ہوشیاری۔ یہ اجتماع ابتداء ہوتا ہے۔ شیخ پر کیفیت صحو سکر آمیز سے شروع ہوئی تھی۔ کچھ دنوں تو سکر کا غلبہ رہا لیکن اسکے ساتھ صحو بھی عنان گیر رہتا، فرائض و واجبات کیطرف سے غافل نہ ہوتے۔ جب مزاج اعتدال پر آیا تو صحو نے غلبہ پائی اور دونوں کے درمیان ایک مساویانہ عہدنامہ ہوا۔ اپنی کمزوریوں کی اصلاح کی، سکر کی سرشاری نے دامن کھینچنا چھوڑ دیا اور پانی سے اسکو دھویا، درس و ہدایت کیلئے تیار ہوئے، پند و مواعظ کی مجلسیں مرتب کیں، خانقاہ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تربیت ہونے لگی، گم گشتگان راہ کو صراط مستقیم کی طرف بلایا اور ہر شخص کو کعبۂ حقیقت کی طرف صدائے عام دی۔ سلسلۂ نظامیہ میں لکھا ہے،

"شیخ در کیفیت سکر و مدہوش و بے حال بود، لاکن در قیام امر بالمعروف و نہی عن المنکر از صحو و ہشیاری لبیاد مطلوب" (صفحہ ۸۵)

یعنی محبوب حقیقی کے عشق میں لذت مدہوشی سے لطف اندوز بھی تھے، اور خالق کی جانب عقلمندی و ہوشیاری کی شراب سے سرشار بھی، وہ فقط الا الحب کھلاتے کہ آپ عشق الٰہی میں ایسے فنا ہو گئے تھے کہ جو قدم حدود اللہ سے باہر پڑتا، بزور قوت اسے مجبور کر دیتے کہ وہ صراط مستقیم کی طرف ہٹ آئے۔ رہروان طریق کی اعانت و دستگیری کیلئے آپنے اپنی زندگی بالکل وقف کر دی تھی۔

آپ کے چار فرزند تھے جن میں ایک محمد شیخو اوائل میں اور دوسرے آغاز شباب میں فوت ہو گئے۔ تیسرے کیفیت جذب میں گھر سے نکلکر لاپتہ ہو گئے تھے،

جو تیرہ برس کی عمر میں آپ کے جانشین ہوئے مگر کمالات ظاہری و باطنی میں یکتا و کامل تھے ۔

نے ۱۳ برس کی عمر میں بمقام ... کرامات کے ... انتقال کیا ۔ خانقاہ میں ... اور وہیں ایک گوشہ میں دفن کر دیے گئے ۔

ناظر دہلوی

غزل

چشم را کاوش مژگان تو دیدن ندہم — دل ہمہ خون کنم از دیدہ چکیدن ندہم

غنچہ بو بست چہ بیرون داد تو دل تنگ مباش — من ز دل بوئے وفائے تو رمیدن ندہم

نگذارم کہ تو با خود ہمہ تنہا باشی — من ترا ہم بحریم تو رسیدن ندہم

ذوق بے بال و پری تا پر پرواز شکست — چشم را گر ہوسے ہست پریدن ندہم

تمایم بتو حال دل صد پارۂ خویش — من ترا زحمت صد نالہ کشیدن ندہم

جان من جامہ ترا تنگ در آغوش کشد — جامۂ ہستی عشاق دریدن ندہم

تا گزیدہ است لب لعل شکر خائے ترا — من ترا نیز لب خویش گزیدن ندہم

کیست آن کو برسد تا بحریم نازت — کہ خود را بخیال تو رسیدن ندہم

بیخود اکنون کہ بہ بستم سر زلفش دادند
از قیامت برسد صبح دمیدن ندہم

بیخود موہانی (ام۔ اے)

ماجرا

شب کہ بزم عالم کا ذرہ ذرہ اپنا تھا — کیا بتائیں اے ہمدم ہائے کیا نظارہ تھا

آشنائے مسلم تھا ساقی مے عرفان — میکشی ہماری تھی میکدہ ہمارا تھا

عرق طور سینا تھی اور تھا دل مسلم — جلوہ گاہ راز و ناز آئینہ ہمارا تھا

کیا جمال رنگین ہے کیا خیال رنگین ہے — دلربائی کیا شے ہے دلربا ہمارا تھا

عالم دنی کیا ہے ہم خدا کے طالب تھے — ہمتیں ہماری تھیں، حوصلہ ہمارا تھا

بادۂ حقیقت کا دور کچھ بڑی شے ہے — یہ تو ایک ادنیٰ سا مشغلہ ہمارا تھا

جستجو نے پہونچایا منزل حقیقت تک — وادیٔ طلب میں شوق رہنما ہمارا تھا

علم سے محبت اور اس قدر محبت تھی — علم جسکو کہتے ہیں، دلربا ہمارا تھا

فخر ہے حقیقت ہے عالمان یورپ کو — فلسفہ تمہارا کیا، فلسفہ ہمارا تھا

عارف الٰہیات اہل دل ہمارے تھے — فلسفہ حقیقت میں حق نما ہمارا تھا

بو علی و فارابی، ابن رشد و غزالی — اہل علم و دانش کا قافلہ ہمارا تھا

دانش ارسطو نے سو سبق لئے ہم سے — علم جانتا ہے وہ مدرسہ ہمارا تھا

خاک چھانی دنیا کی جستجوئے علمی میں — علم اور حقیقی علم مدعا ہمارا تھا

یہ تلاش علمی تھی، سیکڑوں ہزاروں کوس — پاپیادہ پھرتے تھے، ڈھونڈھنا ہمارا تھا

شاہد حقیقت ہیں اندلس کے ویرانے — جن میں اک بڑا بھاری مدرسہ ہمارا تھا

یہ تو ہم نہیں کہتے ہم خدا کے عالم تھے — ہاں خدا کے بندے تھے اور خدا ہمارا تھا

اس طویل قصے کا اسعد خلاصہ ہے — سب خدائی تھی اپنی جب خدا ہمارا تھا

حیف سرگذشت اپنی آج اک فسانہ ہے
ہم بھی کیا کہیں گویا یہ بھی اک زمانہ ہے

آج ہم کہیں کس سے بیکسی کا افسانہ — یہ زمین بیگانی، آسمان بیگانہ

بادۂ حقیقت کی اب کہاں خریداری — اب کہاں وہ بادہ کش اب کہاں وہ پیمانہ

علم و فن کے چرچے جب کہیں نہیں ہوتے — اٹھ گیا زمانے سے وہ سمجھنا سمجھانا

غیر کی شکایت کیا اپنی ہی جہالت ہے — علم کو مرض سمجھے جہل کو دوا جانا

اپنی خود پرستی ہی انتہائے پستی تھی — غیر کو خدا سمجھے، غیر کو خدا جانا

زندگی کے مقصد کو بھول ہی گئے ہم تو — اپنی سر تمنا کو اصل مدعا جانا

علم سے عداوت کی جہل سے محبت کی — ٹھکرا دیا ساقی کو، آہ کو رسا جانا

وقت کی یہ ناقدری عمر بھر رلائیگی — عمر جیسی نعمت کو ہنسے پھونک جانا

ای فنائے سرشاری زندگی بھی دیداری

زیست کو آلِ مسلم! چاہئے ہی خیزی

پھر تو ای دلِ مسلم! راز آشنا ہو جا — چھوڑ دے خودی اپنی بندۂ خدا ہو جا

راز سرفرازی کا بندگی میں پنہاں ہے — بندۂ خدا! پھر تو بندۂ خدا ہو جا

چھوڑ دے تو تنگ ظرفی، قلزم حقیقت بن — قطرۂ حباب دل! آپ میں فنا ہو جا

غیر سے بھی الفت کر دامن نظر پھیلا — پھر تو ای دلِ مسلم! مثل آئینہ ہو جا

ذرہ سے دلِ مسلم! نیر درخشاں بن — نیرِ درخشاں سے عالم ضیا ہو جا

پھر وہی زمانہ ہو، پھر وہی ترانہ ہو

ای خرد! تو ہمرازِ رازِ ارتقا ہو جا

گویا جہان آبادی
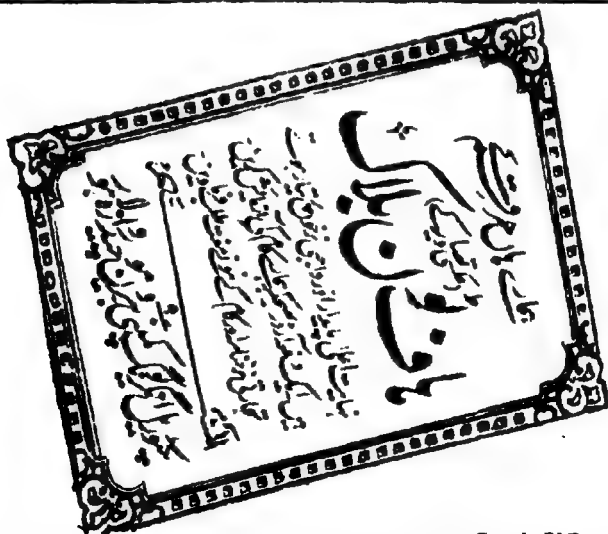
(استفسارات)

نیوپلاٹنزم

(جناب سید اصغر حسین صاحب۔ بلاری)

فلسفۂ Neo-platonism سے کیا مراد ہے؟ اسکی ابتدا کب ہوئی اور اس کی مختصر تاریخ کیا ہے؟ اس کے ساتھ اگر ممکن ہو تو اسلام کی تاریخ فلسفہ پر بھی کچھ روشنی ڈالئے۔

(نگار) آپنے ناحق اس سوال کے دو ٹکڑے کر دئے، کیونکہ تاریخ فلسفۂ اسلامیہ کے ضمن میں فلسفۂ Neo-platonism (افلاطونیت جدیدہ) کا ذکر یوں بھی ضروری تھا۔

آپ کا استفسار ایک بسیط مقالہ چاہتا ہے مگر چونکہ آپ صرف "کچھ روشنی" پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ معلوم ہوتے ہیں، اس لئے بسیط مضمون کو کسی دوسرے وقت پر منحصر رکھکر مختصراً بیان عرض کرتا ہوں :-

جس وقت ہم اسلام کے متعلق کسی مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو لازمتہً ہمارے سامنے سرزمین عرب کا نقشہ آجاتا ہے اور ہر بحث کا مبدا وہیں کی تاریخ قرار پاتی ہے۔ چنانچہ فلسفۂ اسلامیہ کی تاریخ پر تبصرہ کرتے وقت بھی بے اختیار ہمکو رجوع کرنا پڑتا ہے اسی ملک کی تاریخ کی طرف اور نیز اس امر کی جانب کہ قبل اسلام وہاں کی حالت اس مخصوص نقطۂ نظر سے کیا تھی۔ لیکن عرب قبل اسلام میں ہمیں کسی فلسفی کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ شعراء اور حکماء ضرور تھے جن کے اقوال ملک میں بہت مقبول تھے۔ طبیعی اسباب کی بنا پر انہوں نے محض ستاروں کے ضرور کچھ نام رکھ لئے تھے کیونکہ رات دن کھلے ہوئے آسمان کے نیچے رہنے سے انھیں ستاروں کے مشاہدہ کا اکثر موقعہ ملتا تھا لیکن اس میں کوئی علمی رنگ پیدا نہ ہوا تھا۔

جب ظہور اسلام ہوا تو اس وقت بھی فلسفہ کی نشو و نما کا کوئی موقعہ نہ تھا کیونکہ اس وقت سارے ملک کے امیال و عواطف کا مرکز صرف حیات مذہبی اور سیاست دینی تھا۔ خلفاء راشدین اور امویین کے عہد میں بھی سنہ ۱۳۲ھ تک فضا کی حالت قریب قریب یہی رہی اور مسائل دینی کی اہمیت نے لوگوں کو کسی اور طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔

عیون الانباء فی طبقات الاطباء میں بیشک بعض ایسے علماء کا ذکر پایا جاتا ہے جو طب میں کافی دستگاہ رکھتے تھے اور ابن خلکان نے خالد بن یزید اور جعفر الصادق کے حالات میں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ علم الکیمیا اور طب میں انھوں نے بعض رسائل بھی مرتب کئے تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اس زمانہ کا ذوق عام علم و فلسفہ تھا۔

جب وقت امویین کے زوال کا زمانہ آیا تو اس وقت دینی مسائل کے متعلق جو بحث ہوتی تھی اس کا تعلق علم کلام یا ما بعد الطبیعت تھا یعنی یہ کہ انسان مجبور ہے یا مختار، کبائر کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے یا نہیں، قرآن مخلوقات میں شامل ہے یا نہیں؛ لیکن یہ تمام مباحث حقیقتاً

سیاسی تھے جن کو مذہبی رنگ میں پیش کیا جاتا تھا اور اس نے علم و فلسفہ کا اطلاق ان پر بھی نہیں ہو سکتا۔

جب دولت عباسیہ کے عہد میں فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا اور حضارت اسلام عروج پر پہونچی تو علوم کی طرف بھی توجہ ہوئی اور منصور، رشید، مامون کے زمانہ میں علوم یونانی عربی زبان میں منتقل ہوئے۔ ان علوم میں نہ صرف طب، ہندسہ، ہیئت شامل تھے بلکہ فلسفہ، طبیعیات، الٰہیات، منطق، نفسیات اور سیاست و اخلاق کی کتابیں بھی ترجمہ کی گئیں۔ اور اسی طرح دوسری تیسری صدی ہجری میں افلاطون، ارسطو، اقلیدس، بطلیموس اور جالینوس وغیرہم کی کتابیں عربی میں آگئیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ہم اس عہد کو بھی اسلام کا عہد فلسفہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ سوائے ترجمہ کرنے کے انہوں نے اپنی طرف سے کسی بات کا اضافہ نہیں کیا اور نہ کر سکتے تھے کیونکہ وہ ہنوز دور تراجم سے نہ گزرے تھے اور دور ابداع و اختراع ہمیشہ اس دور کے بعد آتا ہے۔ علم الکیمیا، طب، عضویات اور معدنیات میں بیشک انھوں نے بعض ایسے قوانین کا اضافہ کیا جو علوم یونانی میں نہ پائے جاتے تھے لیکن دیگر علوم میں (مثلاً منطق، نفسیات اور اخلاق) میں وہ بالکل فلسفہ ارسطو اور افلاطونیہ جدیدہ [illegible] کے متبع تھے۔

سب سے پہلے مسلمانوں کو جس فلسفہ کی طرف توجہ ہوئی وہ یہی افلاطونیہ جدیدہ کا فلسفہ تھا یہ فلسفہ کی وہ شاخ یا قسم تھی جس میں مذہب و فلسفہ کو ملانے کی کوشش کی گئی تھی اور دوسری صدی عیسوی میں بمقام اسکندریہ ظاہر ہوا تھا۔ اس فلسفہ کے بانیوں کا مقصد یہ تھا کہ دین مسیحی کے ساتھ مذاہب شرقیہ، مذاہب یونان علی الخصوص افلاطون کے مسلک کو ملا دیا جائے۔ اور اس کی یہی وہ خصوصیت تھی جس نے مسلمانوں کو اپنی طرف مائل کیا کیونکہ ان میں مذہبیت زیادہ قوی تھی اور وہ اسی فلسفہ کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے جس میں مذہب کا بھی کچھ رنگ پایا جائے۔ مسلمانوں نے جب افلاطونیہ جدیدہ کا مطالعہ کیا تو وہ اس سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ بعد کو جب افلاطون و ارسطو کے فلسفہ کا مطالعہ کیا تو اسی تاثر کے ساتھ جو پہلے سے ان کے دماغ میں پایا جاتا تھا۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے جس نے اس لحاظ سے شہرت حاصل کی یعقوب الکندی تھا جو فیلسوف عرب کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے ترجمہ و نقل کے ذریعہ سے عربی زبان کو فلسفہ کی بہت سی کتابوں سے مالا مال بنا دیا چنانچہ اخبار الحکما اور فہرست ابن ندیم میں ۲۵۶ کتابیں اس کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔

اس کے بعد ابو نصر فارابی رونما ہوا جو سیف الدولہ بن حمدان کے زمانہ میں پایا جاتا تھا۔ یہ کثیر زبانوں کا ماہر تھا اور علاوہ لغت و فلسفہ کے موسیقی و ریاضی کا بھی ماہر تھا۔ یہ تعلیمات ارسطو کا اتنا شائق تھا کہ اس نے اسکی کتاب النفس کا سو مرتبہ مطالعہ کیا۔ چونکہ ارسطو کو معلم اول کہتے تھے اس لئے فارابی کو (اس لحاظ سے کہ وہ ارسطو کا بڑا مداح تھا) معلم ثانی کہنے لگے۔

فلسفۂ اسلامیہ میں جماعت اخوان الصفا کے تحریرات کا بھی خاص مرتبہ ہے یہ چند لوگوں کی ایک جماعت تھی جنھوں نے اپنے آپ کو اخوان الصفا کے نام سے ظاہر کیا۔ اس جماعت کا مقصود یہ تھا کہ اسلام کو بالکل فلسفہ کے لباس میں پیش کیا جائے ان کا قول تھا کہ جب تک فلسفۂ یونانیہ اور شریعت عربیہ کا آمیزہ نہ ہو جائے تکمیل حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس جماعت نے ۵۱ رسالے لکھے جن میں تصوف اور افلاطونیہ جدیدہ کو مخلوط کر کے پیش کیا گیا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ جماعت باطنی اسماعیلی طبقہ سے متعلق تھی۔ ان کا زمانہ چوتھی صدی ہجری کا وسط تھا۔

ان کے بعد ہی بو علی سینا پیدا ہوا جس نے ایک فلسفی کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی۔ یہ نہ صرف طب کا ماہر تھا بلکہ الٰہیات منطق کا بھی بڑا فاضل شمار کیا جاتا تھا الغرض تیسری، چوتھی، پانچویں صدی ہجری میں یونانی فلسفہ اسی طرح مسلمانوں میں پھیلتا رہا حتے کہ ایک جما ایسی پیدا ہوئی جس نے الٰہیات کے متعلق ارسطو، افلاطون اور افلاطونیہ جدیدہ کی تعلیمات کا رد شروع کیا۔ یہ گویا علم کلام کی بنیاد تھی۔ اس سلسلہ میں علت و معلول، زمان و مکان، حرکت و سکون اور دور و تسلسل وغیرہ کی بحثیں شروع ہو گئیں اور متکلمین نے نہ صرف فلاسفہ بلکہ معتزلہ زنادقہ اور حنابلہ وغیرہ کا رد کیا۔ اس جماعت میں ابوالحسن اشعری، امام الحرمین اور باقلانی نے خاص شہرت حاصل کی۔ ان کے بعد غزالی آئے اور انھوں نے فلسفۂ یونا نہایت غائر مطالعہ کر کے اس کے رد میں تہافت الفلاسفہ لکھی جس نے لوگوں کو خالص تعلیم دینی اور تصوف کی طرف مائل کیا غزالی کے بعد جو لوگ آئے انھوں نے غزالی ہی کا تتبع کیا۔

اندلس اور شمالی افریقہ میں بہ نسبت مشرق کے فلسفہ کو زیادہ ترقی ہوئی اور حکم ثانی کے زمانہ (نصف چوتھی صدی ہجری میں) علوم نجوم، طب، کتب فارابی، رسائل اخوان الصفا کا بڑا سرمایہ اندلس منتقل ہو گیا۔ یہاں کے فلاسفہ میں ابن باجہ، ابو بکر بن طفیل اور ابن رشد کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ ابن رشد نے غزالی کے رد میں تہافت التہافت لکھکر پھر ایک مرتبہ لوگوں کا رخ پھیر دیا اور فلسفہ کی گرم بازاری ہر جگہ نظر آنے لگی۔ جب چھٹی صدی ہجری آئی تو فلسفیانہ بحثوں کا مدار صرف اسلاف کے اقوال رہ گئے اور تحقیق و ابداع کی جگہ تقلید نے لے لی۔ بعد کو ابن خلدون نے ضرور اس طرح کو سنایا اور فلسفۂ تاریخ و علم الاجتماع میں مجتہدانہ درجہ حاصل کیا۔ لیکن اس کے علاوہ پھر کوئی شخص نمود نہ ہوا جو حقیقی معنی میں محقق کہلایا جاتا۔

⁂

بیدل کے بعض اشعار

(جناب مرزا رحیم بیگ صاحب۔ حصار)

بیدل کی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے اور اشعار ذیل کا کیا مطلب ہے:۔

بسوز دستی ہے اگرچہ نقاب نش کنم از حیا ۔۔۔ تو گہر بہ نظرے کنی کہ دے عرق کنم از حیا

اگر از خطا امتحان ہوس کتاب نہ آسمان ۔۔۔ مژدہ بہم آرم از زین داغ یک رگ کنم از حیا

نیست خرابات جنوں عرصۂ جولان سکون ۔۔۔ لغزش مستانہ خوش ست آبلہ پا را

کف پائے جادہ نشین پائمال کدورتیں ما ۔۔۔ پئے آرزوے جبیں ما چراغ رنگ طلب

چو حباب غیر لباس تو چہ توقع وچہ ہراس تو — نہ توانی وہ قیاس تو چکشند جامۂ بیکری

ز بلند و پست ملال تنگ اثری نزد ور آگہی — کہ چہ بافت سبزہ وکلاہ سر و دچہ چید و خفتہ فگلی
بخیال غنچہ نشستہ ام بخیال آئینہ بستہ ام — ز دل شکستہ کجا رسم چو بہار آبلہ پائے گل
تو بہ ستگاہ چہ آیدت ز طرب وفاکنی آرزو — کہ شکست کاسۂ رنگ شد ز براے خندہ گدائے گل

بکجاست آنقدرم بقا کہ تلافئ کنم وفا — عرق خجالت فرصتم نم انفعال زمانیم
نفسے ز دم ہمہ تن الم بہ نبود آبلہ در قدم — چو غبار دلغ نشستنم چو شرر بہ تنگ ادائیم

(نگار) بیدل کے متعلق ملک میں دو مختلف رائیں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے ہاں زبان کا کوئی لطف نہیں ہے خیالات میں ضرورت سے زیادہ آورد و تصنع ہے اور تخیل کی بلندی غیر مناسب حد تک بڑھکر معما ہو کر رہ گئی ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ بیدل کی شاعری زبان کی شاعری نہیں ہے بلکہ صرف تخیل کی شاعری ہے اور چونکہ وہ بہت بلند ہے اس لئے ترکیب الفاظ اور اسلوب بیان میں پیچیدگی کا پایا جانا ضروری ہے، چونکہ مضامین کی رفعت مستلزم ہے الفاظ و ترکیب کی جدت کو اور چونکہ ابداع و اختراع کو ہر معمولی دماغ پسند نہیں کر سکتا اور نہ کچھ سمجھ سکتا ہے اسلئے اکثر لوگوں نے اسکے کلام کو مہمل کہدیا۔ میرا میلان طبع بھی یہی ہے کہ میں اس دوسری رائے کو پسند کروں بات یہ ہے کہ بیدل نے اپنی تمام تصنیفات میں خواہ وہ نظم کی ہوں یا نثر کی صرف ایک فلسفہ پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ ذات باری کی کنہ تک پہونچنا امر محال ہے اور انسان اس باب میں بالکل عاجز ہے اس سلسلہ میں اُنھوں نے وحدت الوجود کو بھی اکثر جگہ بیان کیا ہے اور صرف اسی ایک خیال کے تحت اُنھوں نے ایسے ایسے بلند مضامین اور اسقدر نازک و پاکیزہ جذبات سے کام لیا ہے کہ اُن تک ہر ذہن کی رسائی ممکن نہیں ہے یقیناً زبان کا لطف بیدل کے کلام میں نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے چونکہ اس کی شاعری کسی معمولی عاشق کی غزل سرائی نہیں ہے جس میں پیش پا افتادہ جذبات ہجر و وصال کا اظہار ہو بلکہ وہ بیان ہے اُن کیفیات کا جن کا تعلق اس مادی دنیا سے بالکل نہیں ہے اور اسکی شاعری ایک آواز ہے جو صرف اعماق روح سے پیدا ہوتی ہے اور جن کے قبول کرنے کے لئے وسیع زمین الفاظ کا ملبوس بھی تنگ نظر آتا ہے۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جب خیالات بلند، مضامین ارفع، جذبات نازک، کیفیات غیر معمولی اور واردات قلب نادر ہونگے تو اُن کے بیان کرنے کے لئے عام الفاظ اور معمولی ترکیبیں کبھی کارآمد ثابت نہ ہونگی اور لا محالہ ان کے لئے کوئی جدید اسلوب بیان کچھ نئے الفاظ اختراع کرنے پڑیں گے اور اسی حقیقت کا اظہار ہے یہ کہنا کہ:-

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیان کے لئے

لیکن عام طور پر دماغ ہی ایسے پیدا ہوتے ہیں جو اس حقیقت کو سمجھ سکیں اور نہ اُن کی قدامت پرستی ہی اس امر کی اجازت دیتی ہے

اختر علی فرد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ گلزار حوض حیدرآباد دکن میں ہے

اور ہر نئی بات کو بغیر "استاد" کے قبول کرین اس لئے بیدل کے کلام کو مہمل کہنے والے زیادہ نظر آتے ہین ۔ اسی کشمکش مین غریب اقبال مبتلا ہے
جب تک اُردو مین اُس نے اظہار خیال کیا دہلی لکھنؤ کی لسانیات عائے جان بنی رہی اور اب جبکہ فارسی ملبوس اختیار کیا تو زبان دان حضرات اسے مین
بھول بتاتے ہین حالانکہ جو کچھ وہ کہتا ہے نہ اس سے قبل لکھنؤ کا روزمرہ اُسے پیش کر سکا اور نہ ایرانی زباندانی مین اسکی کوئی مثال نظر آتی ہے ۔ لیکن
مخالفین صرف سطح تک پہونچکر رہجاتی ہین یا جنکے نزدیک صرف ظاہری رنگ ہی اصل چیز ہے وہ بطون وحقیقت کے سمجھنے سے عاجز ہین اور اس لئے
قابل عفو ۔

ادبیات کا مسئلہ اصول ہے کہ خیال کی نوعیت کے ساتھ طرز ادا کا بدلجانا ضروری ہے اور اگر کوئی شخص اس کا اہل نہین ہے تو اسکو
صحیح معنی مین ادیب نہین کہ سکتے ۔ مولوی نذیر احمد مرحوم کا ترجمۂ قران اسی لئے پسند نہین کیا جاتا کہ انھون نے اسکو توبۃ النصوح بنانے کی کوشش کی
تبلی کوئی فسانہ نہ لکھ سکے کیونکہ مراۃ العروس کی زبان پر اُن کو قدرت حاصل نہ تھی ۔

جس طرح مذہب وسیاست وعلیحدہ چیزین ہین جس طرح تاریخ و فسانہ ایک دوسرے سے مختلف ہین اسیطرح اُن کے لئے زبان بھی
جدا ہونا چاہیئے ورنہ اگر اصل چیز صرف زباندانی ہو تو باقر علی داستان گو سے زیادہ سیرۃ نبوی لکھنے کا اہل اور فسانہ کو پیدا لکھنے کا مستحق کون ہے
سجاد سے زیادہ اور کون ہو سکتا ہے ۔

رنگ بیدل کو جو لوگ ناپسند کرتے ہین وہ وہی حضرات ہین جو اس اصول سے ناواقف ہین اور ہر خیال کو ایک ہی لباس مین دیکھنا چاہتے
ہین یقیناً تنقید کی بے اعتدالی قیام معیار کی نامناسبت اور ذہن کی نارسائی ہے جس کو کوئی ذی فہم دماغ جو ہر چیز کو اسکی اصلی جگہ دیکھنے کا
خوگر ہے ہفوات سے زیادہ اور کچھ نہین سمجھ سکتا ۔

بیدل جس آسانی کے ساتھ اپنے مطلب دشوار کو بیان کرجاتا ہے اسکا حال اسوقت معلوم ہوتا ہے جب کوئی دوسرا اسکے تتبع کی کوشش
کرے غالب سے زیادہ سخن گو وسخن سنج کون ہو سکتا تھا لیکن "طرز بیدل مین ریختہ لکھنا" اسکو بھی قیامت ہو گیا ۔ البتہ چونکہ غالب کی ذہنیت بہت بلند
تھی اس لئے اس مین اکثر جگہ بیدل ہی کے چراغ سے کسب ضیا کیا گیا اور بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ۔

بیدل کا کلام اپنے معنی کے لحاظ سے جس بلند مرتبہ کا ہے اسی طرح لفظی خصوصیات کے اعتبار سے وہ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے معمولی
مضمون کو بھی وہ اپنے الفاظ وندرت ترکیب سے آسمان پر پہونچا دیتا ہے ۔ مثلاً قناعت کے پامال مضمون کو لیجئے کہ ہر شخص نے اُسپر خامہ فرسائی کی
لیکن بیدل محض انداز بیان سے اس مین ایسی ندرت پیدا کر دیتا ہے کہ مضمون کی فرسودگی کی طرف خیال ہی منتقل نہین ہوتا ۔ جب فرمانروائے
[illegible] کی طرف سے نامہ طلب پہونچا تو بیدل نے اپنی قناعت کا اظہار کر کے وہان جانے سے ان الفاظ مین انکار کیا ۔

دنیا اگر دہند نہ خیزم زجائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

پہلے مصرعہ کا مضمون نہایت معمولی تھا لیکن دوسرے مصرعہ سے جو اسکی توجیہہ کی گئی تو شعر عام سطح سے نہایت بلند ہو گیا ۔ دوسری
بات بیدل کے لئے مخصوص ہے اسکے کلام کا توازن ہے آپ مشکل سے کوئی شعر ایسا پائین گے جس مین عدم توازن کا نقص پایا جائے

قوانین سے میری مراد یہ ہے کہ الفاظ کا استعمال صحت کے ساتھ استعمال کیا جائے کہ سارا شعر صرف کی رو سے معلوم ہو اور اس میں کوئی لفظ ایسا نہ ہو جو فصاحت یا لہجہ کے لحاظ سے غیر مناسب سمجھا جائے۔

تیسری خصوصیت بیدل کی یہ ہے کہ وہ فلسفیانہ ترین چیز الفاظ میں بیان کر دیتا ہے اور اگرچہ بسا اوقات شعر کا تنگ میدان اسکے مجبور کرتا ہے کہ بہت سی درمیانی کڑیوں کو ترک کر دے لیکن وہ بحیثیت مجموعی اپنے وسیع خیال کو ایسے رنگ میں پیش کرتا ہے کہ ذہن سامع ان تمام متروک کڑیوں کو پیدا کرکے معا تک پہنچ جاتا ہے اور پھر اسکی لذت میں غرق ہو جاتا ہے۔

"ذات باری کے مظاہر کا تنوع اور باوجود اخفا کے اسکا ذرہ ذرہ سے ظہور" - یہ ایسا مسئلہ ہے جس کو قریب قریب تمام صوفی شعراء نے بیان کیا ہے لیکن بیدل کی قدرت شاعرانہ ملاحظہ ہو کہتا ہے:-

تجدید ناز آشفتۂ رنگ لباس آرائیت
بے پردگی دیوانۂ طرح نقاب افگندنت

وہ یوں بھی کہہ سکتا تھا کہ تیری لباس آرائی کے انداز کا وہ عالم ہے کہ ہر وقت اس سے نیا ناز پیدا ہوتا رہتا ہے اور تیری نقاب افگنی کی ادا کا وہ رنگ ہے کہ اس سے زیادہ بے پردگی اور کوئی نہیں ہو سکتی لیکن اس نے پہلے مصرع میں لفظ آشفتہ اور دوسرے میں دیوانہ کہکے مضمون کو اس حد تک پہونچا دیا کہ اس سے زیادہ ترقی ناممکن تھی۔ تجدید ناز کے متعلق یوں کہنا کہ وہ رنگ لباس آرائی کی فریفتہ ہے اور بے پردگی کو "طرح نقاب افگنی" کا دیوانہ کہنا مضمون کو جس قدر بلند کر دیتا ہے ارباب ذوق سے مخفی نہیں۔

اسی زمین میں اسی مفہوم کو دوسرے شعر سے یوں ظاہر کیا ہے:-

ہر جا بروں پوشیدۂ خود را بخود پوشیدۂ   در بزم شمعت مضمحل فانوسی پیراہنت

شمع کے فانوس کا مضمحل ہوکر شمع کے چھپانے میں کامیاب نہ ہونا اتنی زیادہ جذبات نہ تھی لیکن "خود را بخود پوشیدۂ" کہکر یہ بتا کر ناکہ وہ فانوس بھی خود تیری ہی ذات ہے اور ذات بھی وہ جسکا حال یہ ہے کہ "ہر جا بروں پوشیدۂ است" ذہن کو خیال کی اس سرحد تک پہونچا دیتا ہے کہ اسکے آگے پرواز محال معلوم ہوتی ہے۔

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:-

در نوبہار لم یزل جوشیدہ از باغ ازل   تا آسمان گل ہر بیدل یک برگ سبز گلشنت

معترض سے کہیے کہ "تا آسمان گل" کی ترکیب کو یہاں سے علیحدہ کرکے کوئی دوسرا لفظ یا فقرہ استعمال کرے لیکن اس شرط کے کہ لفظ جو شعر کے ثبوت کو تکمیل تک پہونچانے والا ہو۔ کیا اس میں کامیابی ممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔

بیدل کی قدرت شعر گوئی کا ثبوت مشکل زمینوں میں زیادہ ملتا ہے۔ بعض بعض ایسے پیچیدہ ردیف و قافیے کی غزلیں ہیں کہ کسی شاعر کو ایک شعر کا نکالنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے لیکن بیدل وہاں بھی اسی طرح خلاق معانی نظر آتا ہے اور اسکی چست ترکیبوں کا وہی عالم ہے۔ ایسی ہی ایک مشکل زمین کا مطلع ہے:-

تمام شوقیم لیک غافل کرمل پرواز گیرد — مگر دماغ کوئی نشیند نفس تا و گرسنه ما

فلسفہ یہی ہے اور خیال وہی کہ کنہ حقیقت باری کا علم حاصل نہیں ہو سکتا لیکن انداز بیان ملاحظہ ہو اور اسکے ساتھ زمین کی دشواری پر نگاہ کرکے ردیف و قافیہ کا صرف دیکھو کہ کتنا مربوط و دلنشین ہے۔

اپنے آپ کو پرتو سبحانی کا ایک مظہر قرار دیکر دوسرا شعر کہتا ہے :-

گر نہ رنگ ازل نو دار د بہار ہستی ما — پیرزدہ چاک این کتانہا فروغ ماہ کہ سیخر اند

مقطع دیکھئے، اسی کو سحر حلال، شاعرانہ اعجاز اور طلسمات بیانی کہتے ہیں :-

گر ز چشمش غلط نگاہے رسد بفریاد دل بیدل — مگر ز ناز برق بے نیازی پے گیاہ و کہ بیخ اند

یعنی یہ اس خستہ خاشاک سے زیادہ خوش قسمت کون ہو سکتا ہے جس کو وہ برق بے نیازی اپنا نشیمن بنانا پسند کرے۔ بیدل سمجھتا ہے کہ کب اس برق کی بے نیازیاں متوجہ ہو سکتی ہیں لہذا اسلئے ایک عالم یاس میں کہتا ہے کہ اگر کوئی صورت اسکے حصول کی ہے تو بس یہ کہ شاید کوئی نگاہ غلط انداز میسر آجائے۔

اس شعر میں ایک ایک لفظ کو دیکھئے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ جوہری نے نہایت احتیاط سے نگینے جڑ دئے ہیں اور اگر ایک لفظ بھی علیحدہ کرکے دوسرا لفظ رکھدیا گیا تو وہ رنگ جاتا رہیگا جو بحیثیت مجموعی ان تمام نگینوں کی آب و تاب سے پیدا ہو رہا ہے۔

کہاں تک عرض کروں بیدل کا تو سارا کلام نظم ہو یا نثر اس لحاظ سے منتخب ہے اور ساری عمر صرف کرنے کے بعد بھی ایک شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اسکی لذتوں سے سیر ہو چکا ہے۔

شاید چہار عناصر کی ابتدا میں بسلسلہ حمد وہ اسی خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ خدا کی حقیقت تک کون پہونچ سکتا ہے اور ہمارا یا کسی اور انسان کا اسکے بابت کچھ کہنا یا اسکی حمد میں کسی خیال کا اظہار کرنا کیا وقعت رکھتا ہے۔

اسی خیال کو لکھتے لکھتے وہ ایک جگہ جوش میں آکر کہتا ہے کہ :-

"غبار سطر آشفتگی بر ہوا انگاشت، پنداشت مصنف کتاب آسمانم، پرکاہ بنیاد دعلقہ بر باد گزاشت، دانست نفس طومار کہکشانم"۔

یہ عالم اسکی نثر نگاری کا ہے۔ الغرض بیدل میرے نزدیک ایک ایسا شاعر تھا جس کی مخالفت ملک میں ہونی ضروری تھی، ورنہ آج اسکے مثال کی کوئی یقینی دلیل پیش کر سکتے۔

معاف کیجئے حکایت لذیذ تھی اسلئے درازی طلب حد تک پہونچ گئی۔ اب آپ کے رسالہ اشعار کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

(۱) ہنوز ہستی بے اثر چہ نقاب شوق کنم از حیا — تو مگر بمن نظرے کنی کہ دست عرق کنم از حیا

مطلب یہ ہے کہ میں اپنی بے اثر ناکارہ و فانی ہستی کو ظاہر کرنے کے لئے کیا نقاب اٹھاؤں کہ مجھے ایسا کرتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن منع کیا ہوں جو پردہ اٹھنے کے بعد کوئی مجھے دیکھیگا۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی صورت مجھے اپنے آپ کو ظاہر کرنے کی ہو سکتی ہے تو صرف اسطرح

یعنی میں ایک غنچہ کے درمیان بیٹھا ہوا ہوں اور ایک آئینہ کے خیال سے وابستہ ہوں - اور وہ غنچہ یا آئینہ میرا دل شکستہ ہے پھر اب میں اسکو چھوڑ کر کہاں جاسکتا ہوں کیونکہ میری حالت تو ایسی ہے جیسے بہار کہ جس طرح پھول اُسکے پاؤں کا آبلہ ہے اسی طرح میرا دل میرے پاؤں کا چھالا بنا ہوا ہے - نہ پھول بہار سے جدا ہو سکتا ہے اور نہ میرا دل شکستہ مجھ سے -

(۸) تو بہ شوخی چہ آبرو طرب وفائی آرزو کہ بہ خشت کاسہ رنگ و بو براج خندہ گدہ گل

تو کس اعتماد پر یہ آرزو کرتا ہے کہ مسرت و طرب تیرے ساتھ وفا کرے - گدائے گل یہ تو چاہتا ہے کہ خندہ وصال کرے لیکن اپنے کاسہ رنگ و بو کو اس قابل نہیں سمجھتا - مدعا یہ ہے کہ ہم خود اسکے اہل نہیں ہیں کہ مورد لطف و کرم ہوں شکایت کس کی ؟

(۹) بکجاست آنقدرم بقا کہ تلافی کندم وفا عرق خجالت فرصتم نم انفعال زمانیم

مجھ میں اسقدر بقا کہاں ہے کہ کوئی عذر تلافی کر سکوں میری ہستی تو گویا شرمندگی فرصت کا پسینہ اور انفعال زمانہ کا نم ہے - یعنی میرا وجود تو ایسا ہے کہ اگر لفظ فرصت انکے آگے استعمال کیا جائے تو وہ شرم سے عرق عرق ہوجائے -

(۱۰) نفسے دہم ہمہ تن الم بہ ترددآبلہ در قدم چو غبار داغ نشستنم چو سرشک ننگ رواںیم

زندگی کے لحاظ سے یکسر درد و الم ہوں اور چلنے میں بالکل آبلہ پا اسلئے کیا میرا بیٹھنا اور کیا میرا چلنا کہ اگر بیٹھوں بھی تو غبار کیطرح جو حقیقتاً بیٹھنے کے لئے عار ہے اور چلوں بھی تو آنسو کے مانند جو فی الحقیقت ننگ روانی ہے - اپنے آپکو آبلہ در قدم ہونیکے سرشک سے تشبیہ دینا نہایت خوب ہے -

---

مطبوعات جدیدہ

روح نشاط مجموعہ ہے جناب اصغر گونڈوی کی غزلوں کا جو بہترین طباعت وکتابت کے ساتھ چھوٹے سائز پر شائع ہوا ہے۔ جناب اصغر اسوقت ملک کے اُن شعراء میں سے ہیں، جن کی شاعری کو متفقہ طور پر پسند کیا جاتا ہے، اور جن کے افکار کو یقیناً عہد حاضر کی بہترین دماغی پیداوار کہی جا سکتی ہے۔

اس مجموعہ میں جناب سہیل اور احسان علی صاحب بی اے کا دیباچہ و مقدمہ بھی شامل ہے جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ حضرت اصغر کی شاعری پر بحث کی گئی ہے اور اس کے تمام محاسن پر ایک نقادانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔

حضرت اصغر کی شاعری چونکہ زبان کی شاعری نہیں ہے بلکہ تخیل کی ترجمانی ہے۔ اس لئے اس میں تمام وہ باتیں موجود ہیں جو ایک بلند خیال شاعر کے کلام میں ہونی چاہیئے۔ اس لئے اگر کہیں کہیں زبان کی غلطی پائی جائے تو قابل لحاظ نہیں۔ اس وقت ہم مزید تفصیلی تبصرہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور نہ اسکی ضرورت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اول تو اصغر کوئی غیر معروف شاعر نہیں ہیں اور دوسرے سہیل کے مقدمہ کے ہوتے ہوئے اسپر کچھ اور لکھنا بیکار سی بات ہے۔ قیمت اسکی دو روپیہ ہے جو مجموعہ کے مختصر حجم کو دیکھتے ہوئے شاید زیادہ بھی جائے لیکن اسکے محاسن کے لحاظ سے کم ہے۔

ملنے کا پتہ "بلگرامی بک ایجنسی لکھنؤ" ہے۔

تعلیمی مسائل خطبۂ صدارت ہے جناب مولوی مرزا اللہ بیگ صاحب (مرزا یار جنگ بہادر) کا جو حیدرآباد کے جلسۂ تعلیمی میں سنایا گیا تھا اور جو کتاب کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ مرزا یار جنگ بہادر ملک کے اُن منتخب نفوس میں سے ہیں، جو اپنی صحت فکر اور اصابت رائے کے لحاظ سے "سند" کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور جنکا ایک ایک لفظ ملک وقوم کیلئے "سبیل راہ" کا حکم رکھتا ہے۔

فاضل صدر نے اس خطبہ میں تعلیم کے مسائل حاضرہ پر نہایت بسط وجامعیت کے ساتھ اپنے خیالات وتجربات کا اظہار کرکے ایک ایسا لائحۂ عمل پیش کیا ہے کہ اگر رہنمایان تعلیم اسپر عمل کریں تو قوم کا مستقبل نہایت شاندار بن سکتا ہے۔ بحث کے سلسلہ میں دینی تعلیم اور مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ ایسی حقیقتوں پر مبنی ہیں کہ اُن سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا، اسی طرح مسئلۂ دار الاقامہ کے متعلق جو کچھ فاضل صدر نے ارشاد فرمایا ہے وہ بھی ملک کی خاص توجہ کا مستحق ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر شخص جس کو مسئلۂ تعلیم سے ذرا بھی دلچسپی ہے اسکا مطالعہ کرے اور مرزا یار جنگ بہادر کے قیمتی مشوروں پر غور کرکے فیصلہ کرے کہ ملک کے مستقبل کی اصلاح کس درجہ ان پر منحصر ہے۔

ضخامت ۱۲ جزو، طباعت کتابت صاف۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

بادۂ ناب مجموعہ ہے مولوی میر ولی اللہ صاحب بی اے۔ ال ال بی وکیل ایبٹ آباد کی فارسی رباعیات کا جو خوبصورت سائز پر نفیس طباعت وکتابت کے ساتھ دس جزو پر شائع کیا گیا ہے۔

میر صاحب موصوف کا فارسی کلام ملک کے اکثر مشہور رسایل و جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے اور چونکہ آپ کا مقصود شاعری
اس لئے ارباب ذوق اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔

میر صاحب کی شاعری کا مدعا افراد قوم میں آزادی کی روح پیدا کرنا ہے۔ اور اسی مطمح نظر کو سامنے رکھکر آپنے رباعیاں کہی
ہیں۔ آپ کا مشن یہ ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کی عملی روح پیدا ہو اور پستی سے نکلنے کی کوشش کریں چنانچہ آپ اس خیال کو ان الفا
میں ظاہر کرتے ہیں :-

عین اسلام کوشش پیہم   عین کفر ست زشتی و پستی

حساب عمر نے از ماہ و سال ست   نہ از مستقبل و ماضی و حال ست
بود از کارہا اندازۂ عمر   کہ عمر بے عمل خواب و خیال ست

اے آنکہ بخانقاہ نشینی بے کار   برخیز و بیا کارے کن و تخم بکار
مطلوب تو در زاویۂ عزلت نیست   موجود ہر جاست بدشت و کہسار

الغرض آپکے خیالات نہایت پاکیزہ ہیں اور چونکہ خلوص نیت کے ساتھ انکا اظہار کیا گیا ہے اس لئے پڑھنے والے کے د
انکا خاص اثر ہوتا ہے۔ قیمت اس مجموعہ کی ایک روپیہ ہے اور میر صاحب موصوف سے ایبٹ آباد کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

گلشن حیات ملک کے مشہور سخنور حضرت شاد عظیم آبادی کے سوانح حیات کا دوسرا ایڈیشن ہے جسے ملا معین الدین احمد صاحب
نے مرتب کیا ہے۔ ابتدائی چار صفحات رسمی طور پر عرض حال کیلئے وقف کئے گئے ہیں، اسکے بعد تین صفحات کی تمہید
جس میں ملک کی ناقدری کی شکایت کی گئی ہے اور پھر صفحہ ۱۵ سے ۶۲ تک حضرت شاد کا تذکرہ اور مرثیوں کا انتخاب درج کیا گیا ہے۔
کتاب کا بڑا حصہ (صفحہ ۶۶ - ۱۴۳) تذکرۂ تلامذہ اور اُن کے نمونۂ کلام کے نذر کیا گیا ہے اسکے بعد ۱۴۴ سے ۲
حضرت شاد کے کلام کا انتخاب پیش کرکے کتاب کو ختم کر دیا جاتا ہے۔
شاد کی شاعری زیادہ تعارف کی محتاج نہیں، آپ اُن شعراء میں سے ہیں جنہوں نے قدامت پرستی کی زنجیریں توڑ کر اد
میں اصلاح کی کوشش کی، اس سے قبل ہم آپ کے کلام کا نمونہ بھی درج نگار کر چکے ہیں کتاب ۱۲ میں جناب قیس رضوی سے اقبال
پوری کٹرہ پٹنہ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

قیل و قال "اتحاد مذہب و فلسفہ" کے سلسلہ کی پہلی کتاب جسے محمد فاروق صاحب ایم۔ ایس۔ سی (علیگ) نے مرتب کی
مضامین سے مصنف کی روشن خیالی اور وسعت نظر پر کافی روشنی پڑتی ہے اور خاص خاص عنوانات مثلاً مسئلہ

ارتقائے شعور، ارتقائے مذہب، توحید و الوہیت، الہام و نبوت، کفر و اسلام، دعوتِ عمل وغیرہ پر نہایت سلجھے ہوئے انداز سے گفتگو کی گئی ہے۔
ہر چند یہ کتاب ان لوگوں کے نزدیک جنہوں نے مذہب کے دائرہ کو نہایت محدود و تنگ سمجھ رکھا ہے، اپنے اندر کافی سامانِ تکفیر رکھتی ہے، لیکن اہلِ تکفیر کی ارزانی نے اس کی اہمیت کو بھی اسقدر ضعیف کر دیا ہے کہ اس سے کسی کارگر حربہ کا کام نہیں لیا جا سکتا۔
امید ہے کہ محمد فاروق صاحب اس کے باقی حصے بھی جلد شائع کرینگے جنکا وعدہ فاضل مصنف نے کیا ہے۔ یہ رسالہ مجلد شائع ہوا ہے اور علاوہ محصول ایک روپیہ میں منیجر نگار سے مل سکتا ہے۔

بہشتی جوہر مستورات کی تعلیم و تربیت کے متعلق محمد مرزا خان صاحب دہلوی نے چند اسباق کا مجموعہ اس نام سے شائع کیا ہے جو زبان کے لحاظ سے بہت سلیس، اور درس کی حیثیت سے نہایت مفید اور نتیجہ خیز ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان گھرانوں میں لڑکیوں کے سامنے ایسی ہی کتابیں پیش کی جائیں، تاکہ وہ ان کے مطالعہ سے اپنے مستقبل کو درست کر سکیں۔ ضخامت تقریباً پانچ جزو، کتابت طباعت پاکیزہ، قیمت ۱۱، ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ۔ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

نقادی کے نکتے فن نقاشی کے متعلق محمد علی صاحب ردولوی کا مختصر سا رسالہ ہے، لیکن چونکہ ہماری زبان میں فنونِ لطیفہ کے متعلق بہت کم سواد نظر آتا ہے، اس لئے محمد علی صاحب کی یہ کوشش یقیناً قابلِ ستائش ہے اور فنِ تصویر کشی سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے مفید اطلاعات کی حامل ہے۔ ۳ر میں تعلقدار پریس لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

قریۂ ویران جناب سید راحت حسین صاحب بی۔ اے نے انگریزی کے مشہور شاعر گولڈ اسمتھ کی مقبول نظم ڈزرٹڈ ولیج (Deserted Village) کا منظوم ترجمہ اس نام سے شائع کیا ہے۔ اس رسالہ میں پہلے ایک مقدمہ ہے جسکو اردو شاعری کی تاریخ پر ایک طائرانہ تبصرہ کہنا چاہیئے، اس میں قابل مترجم نے نہایت جامعیت کے ساتھ اردو شاعری کے عروج و زوال سے بحث کر کے اس کے مختلف دور قائم کئے ہیں اور ہر دور کے شعراء کا مختصر ذکر کر کے شاعری کے محاسن و معایب کو دکھایا ہے اور آخر میں شاعری کے جدید دور سے بحث کر کے مقدمہ کو ختم کر دیا ہے۔
مقدمہ کے بعد "ورود" کے عنوان سے اصل نظم کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے اور پھر گولڈ اسمتھ کے حالاتِ زندگی لکھ کر نظم کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔
گولڈ اسمتھ کی یہ نظم اپنے جذبات کے لحاظ سے عجیب دلفریب سمجھی جاتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ غیر زبان کے جذبات کو اپنی زبان میں منتقل کرنا اور وہ بھی نظم میں نہایت دشوار امر ہے، لیکن سید راحت حسین اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں ہر چند یہ ترجمہ لفظی نہیں ہے اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن مفہوم پر پوری طرح حاوی ہے۔ چونکہ یہ نظم انگریزی اکثر میٹرک اور ایف۔ اے کے کورس میں شامل رہتی ہے اس لئے امید ہے کہ راحت حسین صاحب کا یہ ترجمہ طلبہ میں بھی مقبول ہوگا۔
ضخامت ۱۰۰ صفحات بر تقطیع چھوٹی، کتابت و طباعت دلکش قیمت ۸ر ملنے کا پتہ مرغوب ایجنسی لاہور۔

تیغ اور مسلم اختر صاحب جالندھری کی ایک دل آویز نظم ہے جسے مرغوب ایجنسی لاہور نے اپنے مخصوص سائز پر شائع کیا ہے۔

پہلے حصہ میں مسلم کا تیغ سے شکوہ ہے اور دوسرے حصہ میں اس شکوہ کا جواب ہے۔ ضخامت ایک جزو ہے اور قیمت ۲ر

خطاب بہ اقبال

سید شوکت حسین صاحب (علیگ) کی ایک مختصر فارسی نظم ہا جزو ہے جسے بشیر بک ڈپو کمالیہ (منٹگمری) نے شائع کیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر اقبال کی [illegible] کا شکوہ کیا گیا ہے اور عمل کی دعوت دی گئی ہے۔ اگرچہ خاک شر بجا بجا خود داری کے بھی آنسو ٹپک گئے ہیں۔ قیمت ۲ر

پردۂ غفلت

یہ ڈرامہ نتیجہ ہے سید عابد حسین صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی جنبش قلم کا جس میں مسلمان رئیسوں کی معاشرت پر روشنی ڈالتے ہوئے نسائیات کے بعض اہم مسائل (تعلیم، پردہ، شادی وغیرہ) پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے۔

اس وقت اردو میں ڈراموں کی متعدد کتابیں نظر آتی ہیں، لیکن غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حقیقتاً پردۂ غفلت ہی ایک ایسا ڈرامہ ہے جسے ہم صحیح معنی میں اس لفظ سے موسوم کر سکتے ہیں۔

جس طبقہ کے حالات فاضل مصنف نے پیش کئے ہیں، اسکی تمام خصوصیات اور خصوصیات کی تمام جزئیات کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ڈرامہ کا مطالعہ کرنے والا ایسا محسوس کرتا ہے کہ تمام باتیں واقعی اسکے سامنے ہو رہی ہیں۔ اسی کے ساتھ جہاں جہاں مسائل معاشرت پر اصولی گفتگو کی گئی ہے وہاں ایسے عمیق خیالات پیش کئے گئے ہیں کہ ان سے زیادہ نفسی تجزیہ ممکن نہیں اس میں ایک مزاحی کیرکٹر بھی ہے اور وہ بھی کم دلچسپ نہیں۔

یہ کتاب برن میں ٹائپ کے حروف میں طبع کرائی گئی ہے اور نہایت خوبصورت نمونہ ٹائپ کی طباعت کا ہے ضخامت [illegible] صفحات۔ قیمت [illegible] ملنے کا پتہ شرکت اوبیہ علیگڈھ۔

چند جدید رسائل

اس زمانہ میں جو چند جدید رسائل جاری ہوئے ہیں، ان میں سے قابل ذکر اکبر، نورجہان، تجلی اور پریم ہیں

اکبر ماہواری رسالہ ہے جسے الہ آباد کی انجمن دار الادب نے [illegible] سائز کے ۶۰ صفحات پر اکبر مرحوم کی یادگار میں جاری کیا ہے اس میں وقتاً فوقتاً اکبر مرحوم کے غیر مطبوعہ خطوط و اشعار شائع ہوتے رہتے ہیں اور افسانوں، علمی مقالات اور ڈراموں کے علاوہ ایک ناول کا ترجمہ بھی مسلسل شائع ہوتا ہے طباعت و کتابت پاکیزہ ہے اور کاغذ بھی اچھا استعمال کیا جاتا ہے۔ قیمت سالانہ [illegible] ہے۔

نورجہان، زنانہ رسالہ ہے جو ایک خاتون سعادت سلطانہ کی اڈیٹری میں امرت سر سے جاری ہوا ہے، بڑی تقطیع کے ۸۰ صفحات پر شائع ہوتا ہے اور قسم اول کی قیمت پانچ روپیہ اور قسم دوم کی قیمت تین روپیہ مقرر ہے۔

تجلی، مولوی سید ظہور احمد صاحب دہلوی کا ماہوار رسالہ ہے جو [illegible] سائز کے ۴۴ صفحات پر دہلی سے ماہوار شائع ہوتا ہے۔ جنھوں نے دین و دنیا کا مطالعہ کیا ہے انھیں معلوم ہے کہ آپکے مضامین میں کس قدر تنوع اور ادبیت ہوتی ہے۔ اس رسالہ کا مقصود مسلمانوں کی اقتصادی اور [illegible] اصلاح ہے سالانہ چندہ دو روپیہ مقرر ہے اور دفتر تجلی فراشخانہ دہلی سے۔

پریم بچوں کا ہفتہ وار اخبار ہے جو جنوری سے [illegible] جناب تاجور نجیب آبادی کی اڈیٹری میں لاہور سے جاری ہوا ہے۔ اسکے مضامین نہایت صاف و سلیس زبان میں ہوتے ہیں اور متعدد تصاویر بھی بچوں کی دلچسپی کیلئے دیجاتی ہیں۔

اقتباسات و معلومات

ہمالیہ کی بلندترین چوٹی ایورسٹ ۲۹۱۳۰ فٹ ہے اور یہاں تک پہونچنے کیلئے ہر سال جانوں کی قربانی کیجاتی ہے۔ اس وقت تک ہوائی جہاز کے ذریعہ سے وہاں پہونچنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی کیونکہ کوئی شخص اسوقت تک جہاز کو اسقدر بلند نہیں لیجا سکا تھا۔ لیکن اب مسٹر کالینز دجس نے ۳۹۰۰۰ فٹ کی بلندی تک اڑکر تمام گزشتہ ریکارڈ کو توڑ دیا ہے) اس امر کیلئے آمادہ ہوئے ہیں کہ وہ ایک چھوٹے لیکن نہایت بلند پرواز والے جہاز کو وہاں تک لیجائیں۔ انکے ساتھ امریکہ کا ایک مصور بھی ہوگا جو تماشائی تصویریں بناتا ہے

اس چوٹی پر اسکی بلندی کی وجہ سے آکسیجن کی بہت کمی ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ وہاں کی ہوا بڑے بڑے پتھروں کو دور تک اڑا لیجاتی ہے۔ اس لئے اہتمام کیا گیا ہے کہ آکسیجن کی ایک خاص مقدار اپنے ساتھ لیجائیں اور پتھروں کی پرواز سے بلند رہکر اس چوٹی کے مناظر کی تصویریں حاصل کریں۔

فرانس کے ایک پروفیسر ڈارسنوآل نے دنیا کو اس عجیب و غریب تجربہ سے آگاہ کیا ہے کہ برقی آلات سے خواہ وہ کتنی ہی قوت کے ہوں کوئی جاندار مر نہیں سکتا۔ بلکہ وہ صرف ایک وقتی غفلت ہوتی ہے جو بعد کو دور ہو سکتی ہے۔

اپنے متعدد حیوانات پر نہایت شدید برقی قوت کا تجربہ کیا یہانتک کہ موت کی تمام علامتیں نمودار ہو گئیں لیکن بعد کو اسنے پھر ان کو زندہ کر دیا۔

ٹرامویز اور ٹیلیفون وغیرہ کے تاروں اور ستونوں سے لپٹ کر موت کے حوادث اکثر ہوتے رہتے ہیں لیکن اب اس تجربہ کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اسوقت تک جتنے آدمی اس طرح مردہ سمجھے گئے وہ حقیقتاً زندہ تھے اور صرف جہل کی وجہ سے زبردستی مردہ بنا دئے گئے لیکن جب تک پروفیسر مذکور کی تدبیر عام ہوگی اس وقت تک خدا جانے کتنی جانیں اور بجلی کی نذر ہو جائیں گی

امریکہ ایک مہندس آرمسٹرانگ نے فولاد اور سمنٹ کے مصنوعی جزیرے بنائے ہیں جن کا طول ۱۲۰۰ گز اور عرض ۴۰۰ گز ہے یہ جزیرے سمندر میں لنگروں کے ذریعہ سے قائم کئے جا رہے ہیں تاکہ وسیع سمندروں پر اڑنے والے جہازوں کیلئے اسٹیشن کا کام دیں

فرانس کے ایک موجد نے حال ہی میں ایک تصویر متحرک کو لاسلکی امواج کے ذریعہ سے منتقل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے اسکا بیان ہے کہ سنہ ۱۹۲۶ء ختم ہونے سے قبل نہ صرف ایک متحرک تصویر بلکہ اسکے تمام حرکات و سکنات دنیا کے ہر گوشہ میں لاسلکی ذریعہ سے منتقل ہو سکیں گے یعنی لاسلکی کے ذریعہ سے سننا اور دیکھنا دونوں ساتھ ہو سکیگا اور بالکل ممکن ہے کہ چند سال بعد ہم

یہ سو گنا ہی اسی طور پر ہوسکے ۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ جب انسان کسی امر کا خیال کرتا ہے تو اسکے دماغ سے ایک سلسلۂ امواج کا پیدا ہوکر فضا میں پھیلتا ہے اور دیگر
ہر وہ شخص جس کا دماغ ان امواج کے قبول کرنے کا اہل ہے آسانی سے سمجھ سکتا ہے ۔
اطالیہ کے پروفیسر کازا مالی نے اسکا تجربہ بعض دماغی امراض میں مبتلا ہونے والے لوگوں پر کیا اور کامیابی ہوئی ۔ اس نے ایک مرد اور
ایک عورت کو کوٹھری میں بند کرکے مسمریزم کا معمول بنایا اور اُن کی دماغی امواج میں تحریک پیدا کی اور ایک لاسلکی آلۂ سامعہ کے ذریعہ سے اُن
کے دماغ کے امواج کو سنا ۔

گذشتہ جنگ عظیم کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس وقت تک اسکے نقصانات کا پورا علم بھی لوگوں کو حاصل نہیں ہوا
اور ابتک ماہرین فن اسکا صحیح علم حاصل کرنے کیلئے کوشش کر رہے ہیں ۔
حال ہی میں رسالہ کرنٹ ہسٹری کے ایک فاضل مضمون نگار نے اس بحث پر گفتگو کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس جنگ عظیم میں
۸۱۳۶۸۵۹۵ جانیں ضائع ہوئیں اور ۲۱۰۹۹۳۵ آدمی زخمی ہوئے گویا کل ۶۵۰۰۰۰۰۰ افواج میں سے ۳۰۰۰۰۰۰۰
ہلاک و مجروح ہوئے ۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ بیماری کی وجہ سے بہت کم موتیں وقوع میں آئیں اور یہ غالباً پہلا تجربہ ہے ورنہ
اس سے قبل افواج کا نقصان جنگ سے اتنا نہیں ہوتا تھا جتنا بیماری سے تاہم امریکہ کی افواج کو نسبتاً بیماری سے زیادہ نقصان پہونچا ۔ روس کے
نقصانات ہر چند جرمنی سے کم ہوئے لیکن روس نے جنگ بھی پہلے ہی ختم کردی تھی ، جرمنی کا نقصان ۱۷۷۳۰۰۰ جانوں کا ہوا ۔ لیکن رومانیا
سب سے زیادہ خسارہ میں رہا کیونکہ اسکی ۷۵۰۰۰۰ آدمیوں میں سے ۳۳۵۷۹۰ ضائع ہوئے ۔

اہل نیویارک کی راحت پسندی اور عیش پرستی کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ وہاں ۱۹۲ باضابطہ تھیٹر قائم ہیں اور ۴۸۵
سنیما خانے (سنما) ہیں ۔ تھیٹروں کے اسٹیج میں ۱۶۷۹۳۰ آدمی آسکتے ہیں اور سنیما خانوں میں ۴۴۳۴۰۹۵ آدمیوں کی گنجائش ہے
جو ہجوم کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ہمیشہ ذرا دیر میں پہونچنے والوں کو باہر ہی اعلان نظر آتا ہے کہ "صرف کھڑے ہونے کی جگہ باقی ہے"
ریڈیو کو گزشتہ دو تین سال کے اندر وہاں اسقدر درجۂ قبول حاصل ہوا ہے کہ صرف سال حال میں وہاں کے باشندوں نے
اس پر ۴۰۰۰۰۰۰ پونڈ صرف کئے ہیں ۔ اس وقت امریکہ میں ۱۲۰۰ کارخانے ہیں جہاں ریڈیو کے آلات بنائے جاتے ہیں ان تمام
کارخانوں میں تین لاکھ آدمی کام کرتے ہیں اور ۴۰۰۰۰ دوکانیں اسکا سامان فروخت کرتی ہیں ۔

آفتاب کی شعاعوں میں ایک غیر مرئی رنگ ہے جسے "فوق البنفسجی" (Ultra - Violet) کہتے ہیں

صرف نور دنی خضاب لگائیے

سارٹیفکٹ ملاحظہ ہو

نگار

ایک علمی و ادبی رسالہ

مرتبہ

نیاز فتحپوری

نگار

ایڈیٹر: نیاز فتح پوری

فہرست مضامین اپریل ۱۹۲۶ء

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

فہرست مضامین اپریل سنہ ۲۶ء

حشمت علی عباسی اورووعے تحریر کند ۔

تاریخ اشاعت　　بسم اللہ　　ہر ماہ کی پندرہ

نگار

ایڈیٹر: نیاز فتحپوری

قیمت سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ　　ہندوستان سے باہر علاوہ محصول چھ روپیہ

جلد (۹)	اپریل سنہ ۱۹۲۶ء	شمار (۴)

ملاحظات

گذشتہ ماہ کا اہم ترین واقعہ جس کا تعلق "نگار" سے نہ ہو لیکن مدیر محرر نگار سے ضرور ہے، اعلیٰ حضرت فرمانروا بھوپال کے چھوٹے شاہزادہ نواب محمد حمید اللہ خان بہادر بالقابہ کے مسئلۂ جانشینی کا طے ہونا ہے - ولیعہد بہادر مرحوم کے بعد اس مسئلہ نے جسقدر پیچیدگی و طوالت اختیار کرلی تھی، وہ متوسلین ریاست کیلئے بہت پریشان کن اور تکلیف دہ تھی اور ہر چند اصحاب فہم و ادراک جانتے تھے کہ حکومت ہند کبھی شرع و انصاف اور معاہدہ و قرار داد کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرے گی، لیکن چونکہ دنیائے سیاسیات کے حدود ماورا عدل و صداقت واقع ہوئے ہیں، اس لئے کون کہہ سکتا تھا کہ وہاں کی فضا کا اقتضا کیا قرار پائے گا اور نتیجہ کی نوعیت کیا ہوگی۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر واقعہ اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال کا وہ عزم ملوکانہ ہے جو یقیناً انسانی صداقت من کی تاریخ کا ایک یادگار واقعہ سمجھا جائے گا۔ اعلیٰ حضرت بالقابہا نے باایں ہمہ کبرسنی و پیرانہ سری جس ہمت و استقلال جس جرأت و دلیری کا ثبوت دیا ہے، وہ نہ صرف عالم نسواں بلکہ دنیائے رجال میں بھی قابل تقلید و تتبع ہے۔

اس دوران میں ملک کے اخبارات دو مختلف رائیں رکھتے تھے، بعض ہز ہائنس کو مشورہ دیتے تھے کہ وہ اپنے پوتے کے حق کو پامال کرنے کی کوشش نہ کریں اور بعض پرنس حمید اللہ خان بہادر کے طرفدار تھے، لیکن ان میں سے کسی نے حقیقت کو نہ سمجھا تھا اور ان کی رائیں صرف ذاتی اغراض و توقعات کا نتیجہ تھیں

واقعہ یہ ہے کہ ہز ہائنس نہ پرنس کی طرفدار رہی تھیں اور نہ اپنے پوتے کی مخالف جہانتک محبت کا واسطہ ہے، انکی نگاہ

میں دونوں ایک درجہ رکھتے ہیں اور ان کے قلب میں دونوں کی جگہ برابر ہے، لیکن چونکہ ولیعہدی یا جانشینی کا فیصلہ محض قلبی تعلقات یا ذاتی بنا پر نہیں بلکہ اس قانون وراثت سے وابستہ تھا جسپر ابین حکومت برطانیہ و ریاست بھوپال توثیق معاہدہ ہوچکی تھی، اسلئے ہرہائنس کا پرنس حمیداللہ خان بہادر کیلئے سعی فرمانا اپنے فرزند کیلئے کوشش کرنا نہ تھا بلکہ حق و صداقت اور شرع و انصاف کی حمایت کرنا تھا۔ عوام کی نظر اس مسئلہ میں صرف بیٹے اور پوتے کی تفریق تک تھی، لیکن ہرہائنس کے سامنے اصول کا سوال تھا اور اگر اسوقت وہ خاموش ہو بیٹھ جاتیں تو صداقت اصول پر ہمیشہ کیلئے پردہ پڑجاتا اور مسلمان ریاستوں کے مسئلۂ جانشینی میں شرع اسلامی کی اہمیت حکومت ہند کے نزدیک بالکل محو ہوجاتی۔

اسلئے اسوقت سوال صرف بھوپال اور وہاں کی جانشینی کا نہ تھا بلکہ سوال اصول و حق کا تھا اہمیت شرع و انصاف کا تھا اور یقیناً ہندوستان کی تمام اسلامی ریاستوں کو ممنون ہونا چاہیئے، ہرہائنس کی ان مساعی کا جنہوں نے آئندہ کیلئے اس مسئلہ کو بالکل صاف کردیا۔ یہانتک تو اصولی گفتگو تھی لیکن اگر ذاتی حیثیت سے نگاہ ڈالی جائے تو بھی پرنس حمیداللہ خان بہادر کی اہلیت کیسکو انکار نہیں ہوسکتا اور آپکے عہد وزارت و ممبری کے کارنامے کافی شہادتیں اس امر کی فراہم کرسکتے ہیں کہ آپکا عہد حکومت ہر لحاظ سے "عہد سلطانی" کی بہترین یادگار ثابت ہوگا۔

خدا کرے علیا حضرت کا ظل عاطفت تا دیر قائم رہے اور پرنس کو اپنی والدہ محترمہ کی خدمت کرنیکا فخر عرصہ تک حاصل ہو کہ اس سے زیادہ سعادت ایک انسان کیلئے اور کوئی نہیں ہوسکتی۔

گزشتہ چند ماہ سے میں جن افکار و آلام کا شکار رہا ہوا ہوں، ہرچند انکا تعلق بالکل میری ذات سے ہے اور میں اسکو پسند نہیں کرتا کہ خواہ مخواہ ذاتی معاملات کو پبلک میں لایا جائے، لیکن چونکہ وہ تردات ایسے نہیں ہیں جن سے میرے موجودہ مشاغل بالکل غیر متاثرانہ گزر جاتیں اس لئے اسکا اظہار ضروری ہے نہ اس لئے کہ میں ناظرین نگار سے دعا کی درخواست کروں کہ "شرمندۂ معنی" ہونیکے لحاظ سے یہ بھی لفظ "دعا" سے کچھ کم نہیں ہے، بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ اگر کوئی فروگزاشت میری طرف سے محسوس ہو تو اسکو میری مجبوری پر محمول کیا جائے۔

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں نظم "حسن و عشق" مولانا کیفی چریاکوٹی کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔ حالانکہ وہ جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی ہے، میں دونوں حضرات سے معافی کا طالب ہوں۔

مارچ کے رسالہ میں جو تصویر رقاصہ کی شائع ہوئی ہے، اس پر عنوان درج ہونے سے رہگیا جس کی وجہ سے لوگوں کے خیال میں اضطراب عجیب پیدا کردیا۔ اس تصویر کا عنوان "رقص نا جائز" ہے اور میں بعض ان ذوق رقاصی رکھنے والوں سے معافی چاہتا ہوں جنہوں نے اسکو پسند کرکے مجھ جواز کیطرف مائل کرنیکی کوشش کی۔ متعلقہ مضمون میں رقص نا جائز کا جسجگہ ذکر آیا ہے، اسکے ساتھ اس تصویر کو متعلق سمجھا جائے۔

فن رقص تاریخ اسلام کی روشنی مین

(بسلسلۂ سابق)

عرب کی شاعری مین رقاصونکا وصف

ناظرین کو عجب نہ کرنا چاہیے کہ ہمنے اس سلسلہ مین کثرت سے شعرا عرب کے اشعار نقل کئے ہین۔ اسلئے کہ اس موضوع کیلئے شاعرون سے بہتر کوئی شاہد پیش نہین کیا جاسکتا۔ شعرا عرب نے رقص اور رقاصات کے وصف مین بڑے تعمق سے کام لیا ہے ابن رومی ایک رقاصہ کی تعریف مین کہتا ہے۔ جو ایک باریک کپڑا پہنتی تھی،

اذا ہی قامت فی الشفوف أضاءہا	جب وہ باریک کپڑے پہنکر کھڑی ہوتی ہے تو وہ کپڑے
سناہا فشفت عن سبیکۃ سائک	سکے نور جسم سے منور ہوجاتے ہین اور اسکا جسم پگھلی ہوئی چاندی کیطرح نظر آتا ہے

ایک دوسرا شاعر حرکات رقص کے متعلق کہتا ہے کہ رقاص کی حرکات کو دیکھنے والا بسبب انکی تیزی کے سکون سمجھتا ہے اور حالت رقص مین اسکی حرکت آفتاب کی طرح ہے جو نظرون کو محسوس نہین ہوتی۔

ترى الحركات منہ بلا سکون	تو اس رقاص کے حرکات سریع کو جن مین سکون ہے دیکھے گا
فتحسبہا لخفتہا سکونا	تو بسبب غایت سرعت کے حرکت کو سکون سمجھے گا
کسیر الشمس لیس بمستقر	وہ مثل حرکت آفتاب کے ہے جو ساکن نہین ہے،
ولیس یمکن ان یستبینا	لیکن یہ ممکن نہیں کہ اسکی حرکت ظاہر ہو۔

ایک دوسرا شاعر رقص کے کمال فن کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ گویا زمین ایک بڑے جابر اور قاہر بادشاہ کا سر ہے رقص کرنے والیان جسکے چھونے سے ڈرتی ہین۔

یحاذرن وطء الارض حتی کانما	وہ زمین پر قدم رکھنے سے حذر کرتی ہین۔
یطأن بظہر الارض ہامۃ اصید	گویا وہ زمین پر نہین بلکہ کسی جابر و قاہر بادشاہ کے سر پر پاؤن رکھتی ہین

صفی الدین حلی اوزان شعر اور نغمات موسیقی کے ساتھ رقاص کے ہاتھ اور پاؤن کی حرکت اور اسکے تناسب کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

والراقصات وقد شدت مآزرہا	رقص کرنے والیون نے پٹکے باندھے ہین،
علی خصور کاوساط الزنابیر	ایسی کمرون پر جو پتلی باریکی مین زنبورون کے مثل ہین۔
ترعی الضروب بکفیہا وارجلہا	ان کے ہاتھ پیر کی حرکت اوزان شعر کی مناسبت سے ہوتی ہے
وتحفظ الاصل من نقص وتغییر	وہ شعر کی اصل کو نقص اور تغییر سے محفوظ رکھتی ہین

ابن محاسن نے ایک پرلطف قصیدہ ایک رقاصہ کی تعریف میں لکھا ہے جس کے بعض اشعار یہ ہیں۔

اذا ہزت معاطفہا لرقص۔	جب وہ اپنے اعضاء کو رقص کیلئے حرکت دیتی ہے ،
وحرکت الانامل والنھودا۔	اور انگلیوں اور سینہ کو بھی جنبش دیتی ہے ،
ومالت والتوت دلًا وظرفًا۔	جھکتی ہے بل کھاتی ہے ناز و انداز سے
ورنحت الشمائل والقدودا۔	اور اپنے اعضا اور قد کو بھی حرکت میں لاتی ہے ،
رمت بقسیّ حاجبہا الینا۔	اور اپنے کمان ابرو سے ہماری طرف تیر چلاتی ہے
بنا لافئدت منا الکبودا۔	تو ہمارے کلیجے کو ٹکڑے کر ڈالتی ہے

جمال الدین ابن حسن بن علی بن داؤد فاروقی حرکات رقص کی سبکی اور سرعت انتقال کو اس طرح بیان کرتا ہے

للہ راقصۃ تمیل کانہا	کیا خوب ہے وہ رقاصہ جب وہ جھکتی ہے
ظل القضیب اذا تمایل مزہرا	تو گویا وہ سایہ ہے ایک ایسی شاخ کا جو اپنے پھولوں کو لئے ہوئے لچکتی ہو۔
تزہو وترجع کالخیال فلا تری	ظاہر ہوتی ہے اور واپس ہوتی ہے سرعت خیال کی طرح اسلئے اسکے حرکات دکھائی نہیں دیتے
حرکاتہا الا لطارقۃ الکری	مگر اس طرح جیسے خواب شیریں کا خیال آجائے۔
لانت معاطفہا فکیف تلفتت	اسکے جوڑ نرم ہیں۔ اسلئے وہ اس سرعت سے مڑ سکتی ہے۔
وتفلتت لا یستطاع بان تری	اور مڑتی ہے اس طرح کہ کوئی دیکھ نہیں سکتا۔

ابوالحسن علی بن ابوالسیر اور عزالدین موصلی وغیرہ علی الخصوص شعرائے اندلس نے رقاصہ عورتوں اور رقاص مردوں کے اوصاف میں بہت کچھ اشعار لکھے ہیں جو اس مختصر مضمون میں درج نہیں کئے جاسکتے۔

فن تصویر و رقص

جس طرح فن رقص نے عراق اور اندلس میں ترقی کی تھی اسی طرح جب اسلامی تمدن عراق سے مصر میں عہد فاطمیین میں منتقل ہوا، تو اس فن کو وہاں بھی عروج ہوا۔ مقریزی نے "خطط" میں اس امر کی تصریح کی ہے کہ خلیفہ ظاہر بن حاکم بامر اللہ کے عہد میں رقص کو کمال ہوا۔ رقاصہ عورتیں ناچتی تھیں۔ اور اس میں بڑی دلچسپی لیجاتی تھی۔ رقص ہی پر منحصر نہیں بلکہ تمام مترحانی لذتیں اس زمانہ میں تکمیل کو پہونچ گئی تھیں، جس طرح رقص مصر میں شعرا کی طبع آزمائی اور مضمون آفرینی کا موضوع تھا، اسی طرح مصوروں نے واسطے بھی ایک خاص موضوع کا حکم رکھتا تھا، خلافت فاطمیہ کے زمانہ میں مصور، اور نقاش رقص کے تمام اصناف کی بہترین تصویر کھینچتے تھے۔ قاہرہ اس وقت فنون جمیلہ کا مرکز تھا۔ مشہور مصور قصیر، اور ابن عزیز استاد کا مناظرہ مصر میں بڑے زور و شور سے ہوا تھا جس کا موضوع رقاصہ عورتوں کا رقص تھا۔ یہ مناظرہ قاضی القضاۃ وزیر یازوری کے سامنے ہوا تھا۔ وزیر مذکور نے قصیر کے مقابلہ کیلئے ابن عزیز کو عراق سے مصر میں بلایا تھا۔ کیونکہ قصیر تصویر کی اجرت بہت زیادہ لیتا تھا اور اسے اپنے کمال پر بڑا ناز تھا۔ اس مناظرہ میں قصیر نے ایک رقاصہ کی تصویر سیاہ لباس میں کھینچی۔ رقاصہ جنبیہ کی صورت پر تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیوار کے اندر داخل ہورہی ہے۔

اور ابن حزم نے سبز لباس میں ایک رقاصہ کی تصویر بنائی یہی جنبیہ کی صورت بنتی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیوار سے نکل رہی ہے

مصر کا تمدن جب عروج پر پہونچا ہوا تھا۔ تو اس فن سے مصریوں کی دلچسپی اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ رقص کی تعلیم کیلئے خاص علم ہوتے تھے، جیسا کہ آج کل ہمارے زمانہ میں ہوتے ہیں۔ اور رقص ایک باقاعدہ پیشہ ہو گیا تھا جس کے متعلق ابن خلدون کہتا ہے کہ مصر میں بعض ذرایع معاش کو اس درجہ ترقی ہو گئی ہے، کہ بمقابلہ دوسرے پیشوں کے ان سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے، کیونکر ایسے پیشے تمدن کی زیادتی اور تنعم کی فراوانی سے پیدا ہو جایا کرتے ہیں، ان کی مثال میں۔ غنا اور رقص کے معلمین کو پیش کیا جا سکتا ہے، اور جب تمدن معمولی حد سے بھی تجاوز ہو جاتا ہے، تو اس قسم کے مکاسب کی اور بھی کثرت ہوتی ہے، جیسا کہ ہمکو مصر کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہاں پرندوں اور گدھوں کو تعلیم دیکر سدھایا جاتا ہے، اور ناچ اور رقص کی باضابطہ تعلیم ہوتی ہے[1]

امرا اور خواص کا رقص

تمدن اسلام کے دور ترقی میں رقص صرف عورتوں اور عام مردوں میں منحصر نہ تھا بلکہ خاص لوگوں میں بھی پایا جاتا تھا۔ مصر میں شاہان ممالیک کے زمانہ میں بادشاہ کی مجالس اور تقریبات میں امرا رقص کرتے تھے، چنانچہ بادشاہ اشرف خلیل بن قلاوون نے جب سنہ ۶۹۲ھ میں اپنے مشہور محل "الاشرفیہ" کی عمارت مکمل کی، تو نئے محل میں ایک عظیم الشان جشن کیا، اسکے متعلق مقریزی لکھتا ہے، "جب امرا رقص کیلئے کھڑے ہوئے تو شاہی خزانچی نے انپر اشرفیاں برسائیں"[2] بلکہ عراق، مصر، اندلس، فارس وغیرہ میں جب تمدن انتہائے عروج پر تھا تو بڑے طبقہ کے لوگ بھی رقص سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ رقص وسرود، غنا اور آلات موسیقی سے خود بھی انہوں نے مشغلہ کیا ہے، فقیہ، محدث، طبیب اور بڑے صاحب وقار قاضی اور صوبوں کے گورنروں نے اس میں عملی حصہ لیا ہے چنانچہ وزیر مہلبی کی مجلس میں بہت سے قاضی اور دیگر اکابر قوم جن میں قاضی التنوخی بھی ہوتے تھے ہفتہ وار جمع ہوتے تھے ان میں سے کوئی بھی نہیں تھا جو سفید ریش بزرگ نہ ہو۔ اسی طرح وزیر مہلبی بھی ایک معمر اور باوقار شخص تھا۔ اس اجتماع کی مسرت اس طرح تکمیل کو پہونچائی جاتی تھی کہ ہر ایک شراب سے لبریز پیالا اپنے ہاتھ میں لیتا تھا اور داڑھی کو اسمیں غوطہ دیکر ایک دوسرے پر چھڑکتا تھا اس شراب پاشی کے بعد سب کے سب رقص کرنے لگتے تھے رقص کے ساتھ آلات طرب اور گانا بھی ہوتا تھا۔

خلفا اور شاہان اسلام کی سب سے زیادہ عجیب مجلس رقص جس میں بڑے بڑے ارباب دولت اور خاص عہدہ دار باری باری سے رقص کرتے تھے منصور بن ابی عامر کی مجلس اندلس میں تھی جس کے متعلق صاحب نفح الطیب لکھتا ہے "منصور بن عامر کی مجلس میں کئی لوگ جمع ہوتے تھے اور باری باری رقص کرتے تھے جب ابن شہید کی نوبت آئی تھی تو وہ رقص کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھتا تھا۔

ہاک شیخاً قادہ السکر لکا۔	اس بڈھے کو دیکھو جسے شکر نے بدمست کر دیا ہے
قام فی رقصتہ مستھلکا۔	وہ اپنے رقص میں جاہ ومال پر دریغ نہیں کرتا
لم یطق یرقصہا مستنبعاً۔	وہ حالت رقص میں اپنی مسرت کے اضطراب سے ٹھہر نہیں سکتا۔
فانثنی یرقصہا مستمسکا	وہ جھک جاتا ہے۔ اور کسی شے کو پکڑ کر رقص کرتا ہے

[1] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۳۸ مطبوعہ مصر [2] مقریزی جلد ۲ صفحہ ۲۱۱

من وزیر فہیم رقاصۃ ۔	اور ایک وزیر بھی اس جماعت میں رقص کرنے والا ہے
قام للسکر ینازع الملکا ۔	جو بدمست ہوکر کھڑا ہے اور بادشاہ سے ہمسری کرتا ہے

خلاصہ یہ تمام روایات عرب کے حسن ذوق اور لطافت طبع پر دلالت کرتی ہیں تاریخی واقعات جو اوپر ذکر کئے گئے عرب اور دوسری اسلامی سلطنتوں کی حالت پر روشنی ڈالنے کیلئے بالکل کافی ہیں ۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کس درجہ فن رقص سے دلچسپی لیجاتی تھی ۔ رقص، غنا اور موسیقی سے اُنکی حیات اجتماعی کی مسرت مکمل ہوتی تھی (جیسا کہ آج کل یورپ اور امریکہ میں ہوتا ہے) یہ طبعی اور فطری مسرتیں ہیں جو وقار متانت کے ہرگز منافی نہیں، بلکہ اسباب ظرافت اور مسرت میں شمار کیجاتی ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مسرتیں اسوقت تک اُن میں پائی گئیں جب تک کہ اُن کا تمدن عروج پر رہا ۔ اور اُن کے وہ اخلاف اس سے محروم رہے جو اپنے تاریک عہد میں ان فنون جمیلہ کی طرف حقارت وعداوت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کو نہایت ذلیل بلکہ اقسام کفر سے شمار کرتے تھے ۔

کیا آپکی لائبریری ان کتابوں سے خالی ہے

لسان الغیب ۔ حافظ شیرازی کی مکمل سوانح عمری اور اُن کی دیوان کی بہترین شرح جلد اول ۳ر جلد دوم ۲ر

کاس الکرام ۔ عمر خیام کے مفصل حالات زندگی اور رباعیات کی مکمل شرح ۔ اس موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے ۔ ۳ر

نہران فصاحت ۔ فارسی، عربی اردو کے بہترین علمی تاریخی وادبی لطائف .... قیمت ۱۲ر

بندگی ۔ امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب "العبودیت" کا بےمثل ترجمہ حقائق دینی وتصوف کی بےنظیر کتاب قیمت ۱۰ر

غالیۂ فطرت (مجلد) ۔ مصنفہ محمد فاروق ام ۔ اس ۔ سی ۔ فلسفہ واسلام کے اتحاد پر بےمثل تصنیف ...... قیمت ۸ر

سالومی ۔ آسکر وائلڈ کے نہایت مشہور ڈراما کا بےمثل اردو ترجمہ .... قیمت ۱۲ر

تذکرۂ خلق قرآن ۔ امام عبدالعزیز بن یحییٰ کی کتاب الحیدہ کا ترجمہ مسئلہ خلق قرآن کے متعلق ایک بےمثل وبےنظیر مناظرہ قیمت ۱۰ر

طلسم مسموم ۔ کینن ڈائل کے علمی فسانہ کا اردو ترجمہ .... قیمت ۱۲ر

مینجر نگار بھوپال

اکبر الہ آبادی و شاد عظیم آبادی

گمان مبر کہ بپایان رسید کار مغان
ہزار بادہ ناخوردہ در رگ تاک است
(اقبال)

نفسیات کا ایک عالمگیر قاعدہ ہے کہ عنایت ایزدی و توفیق الٰہی تمام عرصۂ کائنات پر یکسان جاری و ساری ہے، کمال اور ترقی کسی عہد اور کسی ملک کیلئے مخصوص نہیں ہے۔ آفتاب کی شعاعیں کائنات کے ذرہ ذرہ پر یکسان پڑتی ہیں، البتہ اکتساب نور صلاحیت و استعداد پر منحصر ہے۔ کمال شاعری کا بھی یہی حال ہے کہ کسی عہد یا کسی ملک کا حصہ نہیں ہے۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں شعرا پیدا ہو سکتے ہیں، ہر عہد میں پیدا ہوئے اور جب تک اردو کا وجود ہے اسی طرح پیدا ہوتے رہینگے۔ ولی دکنی کے عہد سے لیکر امیر و داغ تک سیکڑوں شعرائے گرامی پیدا ہوئے جنھوں نے ہر دور میں عروس سخن کی زلفوں کو اپنے مذاق طبیعت کے موافق سنوارا۔ ان شعرا میں میر و درد، ناسخ و میر حسن، آتش و انیس، مومن و غالب بزم اردو کو نئے نئے سر و سامان سے سجانے میں امتیاز رکھتے ہیں۔ مگر بعض نقادوں کی رائے ہے کہ اردو شاعری ترقی کی حد کو پہونچ گئی، یہاں تک کہ پروفیسر آزاد نے آب حیات میں انیس و دبیر کو خاتم الشعرا قرار دیا ہے۔ بعض سخن فہموں کی رائے میں امیر و داغ اردو شاعری کی آخری یادگار ہیں۔ ان حضرات کا مطلب ہے کہ گذشتہ شعرائے شاعری کی حد بندی کر دی، اب قدیم طرز کے شعرا پیدا ہی نہ ہونگے اور قدیم شاعری کا وجود بھی نہ رہیگا۔ یہ خیال بھی اصول نفسیات کے خلاف ہے ؎

ہنوز آن ابر رحمت در فشان است خم و خمخانہ با مہر و نشان است

قدرت ہمیشہ فیض رساں ہے، شاعری کسی خاص ملک کی ملکیت نہیں ہے۔ ہر دور میں باکمال شعرا پیدا ہوتے آئے اور پیدا ہوتے رہینگے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک رنگ جو ایک زمانہ میں مقبول خاص و عام سمجھا جاتا ہے دوسرے دور میں کہنگی و فرسودگی کی بنا پر اسکی وقعت کم ہو جاتی ہے اور اسکی جگہ دوسرا رنگ چھا جاتا ہے۔ یہ قانون فطرت کا اقتضا ہے کہ جدید چیزیں قدیم چیزوں پر غالب آجاتی ہیں۔ ہر دور میں طبائع و خصائل انسانی کچھ نہ کچھ تغیر پذیر ہوتے ہیں اور طرز معاشرت و انداز تمدن میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اسی فطری ماحول کے زیر اثر شاعری کا نشو و نما ہوتا ہے۔

اس آخری دور میں لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی اور سید الشعرا مولانا شاد عظیم آبادی کی ذات گرامی اردو شاعری کے ارتقائے حیات کیلئے نہایت مبارک ثابت ہوئی۔ حضرت اکبر سے تو ہر سخن فہم واقف ہیں، انکا نام تعارف سے بالکل بے نیاز ہے، ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان کے جذبات فرزانہ و انقلاب انگیز کلام کی شہرت ہے۔ ملک کی سیاسی و معاشرتی، ملی و مذہبی کیفیت پوشیدہ نہیں ہے۔ اکبر کی حساس طبیعت نے ملک کے انحطاط و زوال کا بغور مطالعہ کیا اور ابنائے زمانہ کے تمدنی و ملی تغیر کی حقیقت کو پورے طور پر سمجھا۔ انکے سینہ میں ایک درد مند دل تھا جو [illegible] متاثر ہوا۔ انھوں نے [illegible] رنگ میں ایسے اخلاقی و مذہبی

ضمائم کی اشاعت شروع کی جو ملک کے قوائے خفتہ کو بیدار کرنے اور سیاسی و معاشرتی جمود کو دور کرنے مین نہایت مفید ثابت ہوئے۔ انکے نکتہ رس و دقیقہ سنج دماغ نے ہر پہلو پر غور کیا اور ہر واقعہ سے گہرے فلسفیانہ نتائج پیدا کئے جو ملک کی اصلاح کیلئے بدرجۂ اتم سودمند ہین۔

اسی طرح صوبۂ بہار مین مولانا شاد کی ذات گرامی باعث صد فخر و ناز ہے۔ آپکی عمر اسی سال سے بھی متجاوز ہے، ساٹھ برس سے زیادہ کی مشق سخن ہے۔ شاعری کے تمام اصناف پر آپکو ید طولی حاصل ہے، مرثیہ، قصیدہ، مسدس، رباعی، غزل، قطعہ وغیرہ ہر نوع سخن پر آپکی قدرت تامہ مسلم ہے۔ خصوصاً عالم تغزل مین آپکی سحر بیانی اردو کیلئے سرمایۂ نازش ہے۔ آپنے ایک خاص رنگ تغزل اختیار کرلیا ہے۔ عامیانہ و مبتذل مضامین اور صوفیانہ طرز ادا سے آپکی شاعری قطعی پاک ہے، حقائق و معارف، رموز و اسرار، اخلاق و تصوف، فلسفہ و حکمت، پاکبازانہ حسن و عشق کے راز و نیاز سے آپکا کلام مملو ہے۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہین ہے جہان آپکا پاکیزہ کلام نہ پہونچا ہو اور اس سے لوگ مستفید نہ ہوئے ہون۔ ملک مین آپکی شاعری نے کافی شہرت حاصل کی ہے۔ تمام جرائد و رسائل آپکی غزلون کی اشاعت کو فخر سمجھتے ہین اور ملک کے اہل قلم آپکا نام ادب سے لیتے ہین۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی رائے بہت صحیح ہو کہ جس زمانہ مین محسن زندہ تھا آپ یگانۂ فن سمجھے جاتے تھے اور اب تو آپ بزم سخن کی صدارت کی حیثیت رکھتے ہین اور اس دور سخن کے میر ہین۔ علی ہذا مولانا عبدالسلام ندوی بھی آپکے مرتبۂ استادی کے معترف ہین۔ چنانچہ اپنی تازہ تصنیف "شعر الہند" مین انہون نے مولانا شاد کو موجودہ شعرا کا پیشرو" قرار دیا ہے۔ علمائے موصوف کے علاوہ علامہ ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ بھی آپکو استاد فن مانتے ہین اور آپکے رنگ تغزل کے نہایت مداح ہین۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا شاد کی شاعری دور جدید مین ایک نمایان حیثیت رکھتی ہے۔ شعرائے لکھنؤ نے جو رنگ تغزل اختیار کیا تھا اس مین اسقدر بے اعتدالی پیدا ہوگئی کہ شاعری محض ضلع جگت ہوگئی۔ بجز آتش و انیس کے تمام شعرائے لکھنؤ کے کلام کو بغور پڑھو اور دیکھو کہ ان حضرات نے کیا کچھ گورکھ دھندا تیار کر رکھا تھا۔ سی شاعری کی جو گت ناصر علی سرہندی وغیرہ کے عہد مین ہوئی وہی حال اردو شاعری کا امانت لکھنوی وغیرہ کے ہاتھون ہوا۔ شعرائے دہلی سے یہان پر بحث نہین، انکی سلاست روی، پاکبازانہ رنگ تغزل، جدت تخیل وغیرہ کا ہر ذوق شناس سخن معترف ہے، مین لکھنوی شاعری کے تخریب و تنزل کا ذکر کر رہا ہون۔ بالآخر قدرت نے صوبۂ بہار مین ایک صحیح الوجدان و سلیم المذاق استاد غزل پیدا کیا جسکے تخئیلات عالیہ نے عالم شاعری مین ایک ہیجان برپا کردیا، جسکے اچھوتے رنگ تغزل نے شعرائے لکھنؤ کی آنکھین کھولدین، جسکے پاکبازانہ سحر کار کلام نے لکھنؤ کی شاعری کو متاثر کردیا، جسکے حقائق و معارف کے اثرات نے عزیز لکھنوی، یاس عظیم آبادی، جوش ملیح آبادی وغیرہ کے سے شعرا پیدا کئے۔ حضرات لکھنوی اور انکے مقلدین مانین یا نہ مانین مگر مین تو صاف دیکھ رہا ہون کہ شعرائے موصوف کا رنگ تغزل بہت بڑی حد تک شاد کی شاعری کے اثرات کا رہین منت ہے۔

اس وقت میرا موضوع بحث اکبر الہ آبادی و شاد عظیم آبادی کے کلام کا ایک خاص نقطۂ نظر سے موازنہ کرنا مقصود ہے۔ اکثر حضرات یقیناً حیرت زدہ ہون گے کہ اکبر و شاد کا موازنہ کیا معنی رکھتا ہے، دونون کی رنگ الگ الگ راہین ہین، کوئی بات دونون مین مشترک نہین پائی جاتی، مگر مین انہین یہ کہکر مطمئن کردینا چاہتا ہون کہ مین شاد کے کلام کے مقابلہ مین اکبر کے اس ظریفانہ رنگ کو نہ لاؤنگا جو مطبوع خاص و عام ہے جسکی بدولت اکبر اکبر ہین، کیونکہ اس رنگ مین تو انکا کوئی حریف نہین، وہی اسکے موجد ہین اور خاتم بھی۔ لیکن اس جدید رنگ کے علاوہ

اکبر قدیم رنگ میں بھی کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ اگر ایک طرف ظریفانہ اشعار کی کثرت ہے تو دوسری طرف متین اور سنجیدہ کلام کا بھی ایک انبار نظر آتا ہے۔ مرحوم کے تینوں دواوین میں سیکڑوں غزلیں ہیں جن میں حسن و عشق، حقائق و معارف، اخلاق و تصوف کی قدیم انداز میں نغمہ سرائی کی گئی ہے۔ باوجود اسکے کہ دونوں کی الگ الگ راہیں ہیں یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ کون کون سی باتیں دونوں میں مشترک پائی جاتی ہیں۔ اس اظہار و تحریر میں کوئی میرا ہمنوا ہو یا نہ ہو مجھے اسکی پروا نہیں۔ دونوں مشاہیر جدید کی غزلوں کو ایک نقطۂ خیال سے دیکھکر تغزل کی صفت مشترکہ کو بیان کرتا ہوں:—

(۱) دونوں کا دل سوز و گداز کا آتشکدہ معلوم ہوتا ہے اور عالم پیری میں یہ صفت بہ وجہ فرط تاثر اور نمایاں ہوگئی ہے۔

(۲) دونوں کی غزلوں میں سادگی بیان، صفائی زبان، جدت تخیل، متانت و سنجیدگی اور فارسی ترکیبوں کا اعتدال کے ساتھ استعمال نمایاں نظر آتا ہے۔

(۳) طویل بحروں میں اکثر دونوں کہتے ہیں اور خاص دلآویزی و شیرینی پیدا کر دیتے ہیں۔

(۴) دونوں کے ہاں آخر عمر کے کلام میں درد و غم، سوز و گداز، یاس و حسرت، ضعف قویٰ و پیرانہ سالی کی گلہ طرازیوں کی ایک تفسیر نظر آتی ہے۔ (حضرت شاد کے تیسرے دیوان میں یہ خصوصیت نمایاں ہے)

(۵) دونوں کا کلام کہنہ مشقی و قادر الکلامی کا پتہ دیتا ہے اور اسلوب بیان و طرز ادا کا دونوں خاص لحاظ رکھتے ہیں۔

(۶) دونوں کی غزلوں میں حقائق و معارف، اخلاق و تصوف، فلسفہ و حکمت بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔

لیکن اسکا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ دونوں اساتذہ ایک ہی روش پر چلے ہیں۔ باوجود مذکورۂ بالا خصوصیات مشترکہ کے دونوں کی راہیں جداگانہ ہیں۔ حضرت اکبر کی اصلی جولانگاہ ظرافت آمیز کلام ہے جس کے پردہ میں تکمیل اخلاق، اصلاح معاشرت، ارتقائے تمدن و تہذیب ملت کی تعلیم دیتے ہیں۔ انکا کلام زیادہ تر سیاسی و معاشرتی، مذہبی و ملی پہلو لئے ہوئے ہے۔ بقول جسٹس شیخ عبد القادر وہ "روشن خیالی کے ساتھ مشرق کی سچی محبت" کے داعی ہیں۔ حضرت شاد کا رنگ تغزل عجیب و غریب ہے۔ انکے "بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہان معنی آباد ہے"۔ انکے "بیساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں"۔ انکے مجازی طرز کلام میں ایک دنیائے حقیقت مضمر ہے۔ اس خصوصیت میں وہ خواجہ حافظ شیرازی سے مناسبت رکھتے ہیں۔ وہی پاکبازانہ حسن و عشق ہے، وہی عامیانہ و سوقیانہ الفاظ و معانی سے گریز ہے، وہی وسعت مشرب ہے وہی قیود و رسوم سے آزادی ہے، وہی ساقی اور پیر مغان کی داستان ہے، وہی ساغر و مینا، بادہ و خم، میکدہ و خرابات کی کہانی ہے، اور اسی طلسم میں ایک مجاز حقیقت خوابیدہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

ز آئینہ کا قصہ در زلف شانہ کہتے ہیں   حقیقت میں جمال یار کا افسانہ کہتے ہیں

اور جہاں شاد دونوں سوز و گداز، یاس و حسرت، ناکامی و حرمان، جذبات و کیفیات کے مضامین نظم کرتے ہیں وہاں انکا تغزل کی سرحد میر سے جا ملتی ہے۔

اس وقت مولانا شاد کے کلام پر تفصیلی تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے ؎ سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کیلئے۔ اسکے متعلق ایک

کارخانہ میونسپل دہلی بیگ اسٹیشن کی نگرانی میں ہے جو سات سال سے کام کر رہا ہے

میں بعد مستقل مضمون بشرط فرصت لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ خدا پورا کرے۔

اب میں اصل مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ دونوں نے ایک تخیل کو کس انداز میں ادا کیا ہے۔

اکبر ؎ حباب آسا اٹھایا بحر ہستی میں جو سر اپنا　　بنایا بس وہیں موج فنا نے ہم سفر اپنا

شاد ؎ موج فنا مٹا نہ دے نام و نشان وجود کا　　دیکھ حباب کی طرح شوق نہ کر نمود کا

دونوں شعروں میں یہ اتفاقی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ زندگی کا انجام موت ہے، غرور و خودبینی کا نتیجہ فنا ہے۔ اکبر کا شعر محض اظہار حقیقت ہے۔ برخلاف اسکے شاد کے شعر میں بیان واقعہ کے ساتھ ہی عبرت پذیری و سبق آموزی کا پہلو بھی موجود ہے اور طرز ادا نے اس شعر کو اور چمکا دیا ہے۔

اکبر ؎ پروانہ جل کے خاک ہوا شمع رو چکی　　تاثیر حسن و عشق جو ہونی تھی ہو چکی

شاد ؎ پروانے کی یہ ست جب یوں آگ میں جلتی ہے　　گو سخت ہے ظاہر میں پر شمع پگھلتی ہے

مضمون عام ہے مگر حسن بیان نے ان شعروں میں جان ڈال دی ہے۔ اکبر کا شعر بے نیاز تعریف ہے۔ حسن و عشق کے پر تاثیر انجام کو ایسے دلآویز انداز میں ادا کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ اس شعر کے مقابلہ میں اسی مضمون کا جدت تخیل کے ساتھ شعر نکالنا شاد ہی کا کام تھا۔ انکے شعر سے یہ بلاغت بھی نمایاں ہے کہ گو دیکھنے میں شمع صورتاً و معناً سنگدل معلوم ہوتی ہے اور پروانے کے حال زار پر رحم نہیں کھاتی مگر جب پروانہ اسکے جمال پر قربان ہو جاتا ہے تو محبت کی آگ سے وہ بھی متاثر ہوتی ہے اور گھل گھل کر فنا ہو جاتی ہے۔

اکبر ؎ اگرچہ تلخ ملا جام عمر فانی کا　　مگر محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا

شاد ؎ دیکے تہی سبو مجھے صبر کا حوصلہ دیا　　جبکی طلب تھی ساقیا اس سے کہیں سوا دیا

مفہوم دونوں کا ایک ہے۔ دونوں میں صبر و توکل، تسلیم و رضا کی تلقین ہے۔ اکبر کے دوسرے مصرعہ کا تیور دلاویز ہے۔ وہ ناکامی پر قضا و قدر کی شکایت نہیں کرنا چاہتے۔ شاد میدان رضا میں ایک قدم اور آگے ہیں اور انہیں ناکامی اور نامرادی پر عدم شکایت کے بجائے الٹے شکر ادا کرتے ہیں۔ گو معنوی حیثیات شاد کے شعر میں زیادہ ہیں تاہم طرز ادا کے لحاظ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیجا سکتی۔ شاد قریب قریب اسی مفہوم کو دوسری جگہ یوں ادا کرتے ہیں ؎

طلب کرتے نہیں ساقی سے گو انداز طلبی کی　　زباں روکے ہوئے ہیں رنگ محفل دیکھنے والے

اکبر ؎ اگرچہ تکلیف نزع میں ہوں حلقوں تک بھی کم نہیں ہے　　کسی سے ملنے کی ہیں امیدیں کسی سے چھٹنے کا غم نہیں ہے

شاد ؎ آخر ہے عمر ضیق میں دل بھی ہے جان بھی　　مردانہ باش! ختم ہے یہ امتحان بھی

اکبر کے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ معشوق حقیقی کے وصال کی امید ہے اور زوال دنیا سے مفارقت کا مطلق رنج نہیں ہے لہذا امید بحالت میں نزع و سکرات کی تمام تکالیف و آلام گوارا ہیں اور مسرت و اطمینان حاصل ہے۔ شاد کے شعر کا مفہوم بہت بلیغ و ابلغ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عالم وجود میں آنا معشوق حقیقی سے دور ہونا تھا۔ زندگی کی تمام تکالیف و مصائب بطور امتحان عشق و محبت کے تھے جن کے سہنے پر وصال

یہی شاد کا بھی حشر تھا ۔ اب تمام آلام و تکالیف کا خاتمہ ہو رہا ہے اور شاہد حقیقی سے ملنے کا وقت قریب ہے صرف ایک آخری امتحان محبت باقی ہے یعنی نزع کی ہچکی، کرب و الم، تکلیف و انقباض ۔ لہٰذا پامردی و استقلال کے ساتھ ان مصائب کو بھی برداشت کرنا چاہیئے پھر تو روح مشتاق ہو اور معشوق کے گلشن وصال کی گلچینی ۔ ظاہر ہے کہ شاد کے شعر میں جو حقائق و اسرار، اسالیب بلاغت، اور جوش بیان موجود ہے اکبر کے شعر میں نہیں ۔

اکبر ؎ آنے دو مصیبت کو ذرا شاد دل ہو ۔ جو بند ہو غفلت میں وہ عبرت میں کھلیگا

شاد ؎ جو دیکھے غور سے سارا جہان کھلتا ہو دنیا کا ۔ مصیبت آدمی کو صاحب ادراک کرتی ہے

انگریزی کا ایک فلسفیانہ مقولہ ہے "ادبار بہترین مدرسہ تربیت ہے" اسی مفہوم کو دونوں نے نظم کیا ہے ۔ شاد کے شعر کو قطعی ترجیح ہے ۔ اکبر کا مصرعہ تو مقولۂ مذکور کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتا ہے اور شاد کا ایسا ساختہ ہے کہ ضرب المثل کے طور پر مستعمل ہونے کے لائق ہے

اکبر ؎ آئیگی تجکو نظر صانع عالم کی جھلک ۔ سامنے کچھ نہ رکھ آئینۂ فطرت کے سوا

شاد ؎ صانع کو دیکھنا ہو تو عالم پہ کر نظر ۔ آئینہ آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا

دونوں شعر متحد المضمون ہیں جنکا مفہوم فلسفۂ الٰہیات کی ایک دلیل ہے منجملہ ان دلیلوں کے جو اثبات باری تعالےٰ میں پیش کیجاتی ہیں ۔ شاد کے شعر کو اکبر کے شعر پر فوقیت ہے خصوصاً مصرع ثانی کا زور بیان، طرز ادا، اور حسن بندش قابل داد ہے ۔

اکبر ؎ دل ہو ملول فرقت قامت رسائے یار میں ۔ جا نہیں جا میں سرو و گل آکے تمہارے بہار میں

شاد ؎ ہیں اور سیر لالہ و گل ہجر یار میں ۔ کیسی بہار آگ لگا دو بہار میں !!

شاد کے شعر کا طرز ادا، صفائی زبان، چستی بندش، بے ساختگی اور تیور محتاج بیان نہیں اکبر کا شعر اسکے مقابلہ میں بہت سست ہے اور لفظی رعایت نے اسکو اور بھی بے مزہ کردیا ہے ۔

اکبر ؎ باغ دلبر نظر پاس نگر اے اکبر ۔ کوئی ذرہ چمن دہر میں بیکار نہیں

شاد ؎ خالی سمجھکے پھینک نہ اے موج رائگان ۔ ہر کیسۂ حباب کے اندر خزانہ ہے

اکبر کے شعر کا ماخذ مرزا غالب کے یہ دو مصرع ہیں ؎

۱ ۔ یک ذرۂ زمین نہیں بیکار باغ کا

۲ ۔ ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار

ظاہر ہے کہ اکبر نے اس مضمون کو بجنسہٖ لے لیا اور کوئی جدت نہیں پیدا کی ۔ برخلاف اسکے شاد نے اسی عالمگیر کلیہ کو ایک جدید اسلوب اور اچھوتی تمثیل میں بیان کردیا ۔ میرے خیال میں اس خوبی سے اس مضمون کو اردو میں کسی نے نہیں ادا کیا ہے۔

اکبر ؎ دل بے تاب کیا کیا دکھا رہی ہیں عجائب عالم ۔ یہ ہر ذرہ بھی قیامت ہے خدا کے کارخانے میں

شاد ؎ سرکار دل کی ہو شہرہ ہائے زمانہ ہے ۔ وسعت تو کچھ نہیں مگر اک کارخانہ ہے

دونوں اپنے اپنے رنگ میں سلطانِ دل کی کارفرمائیوں کو بیان کر رہے ہیں۔ اکبر کا شعر صاف ہے شاد دل کی طلسمی کیفیت کے متعلق زبان تحسین کو دیکھنے میں دل تو ایک مختصر مضغۂ گوشت ہے مگر اسکے اندر ایک وسیع کارخانۂ قدرت نظر آتا ہے کیونکہ تجلیات و جذبات کا جلوہ گاہ دل ہی ہے۔ شعر کے طرزِ ادا اور جوشِ بیان کو اکبر کا شعر نہیں پہونچتا۔ اور معنوی محاسن کے لحاظ سے بھی شاد کا شعر کہیں مرجح ہے۔

اکبر ؎ خلوتِ ناز میں کیا شان خود آرائی ہے — حسن خود عالمِ حیرت میں تماشائی ہے

شاد ؎ دیدنی تھا یہ سماں تیرے نکھرنے کی قسم — سکتہ آئینہ کا جلوہ ترا حیرت میری

اکبر نے مطلع خوب کہا ہے الفاظ نہایت رنگین آئے ہیں۔ ایک حسین کی فطرت میں داخل ہے کہ آرائش کے بعد اپنے حسن کا نظارہ آئینہ میں ضرور کرتا ہے۔ شاعر ایک ایسے پرجمال معشوق کی خود آرائی کا ذکر کر رہا ہے جو حسن و جمال میں اپنی آپ نظیر ہے۔ لہذا معشوق اپنی حسن و جمال کا عکس آئینہ میں دیکھکر حیرت زدہ ہو جاتا ہے اور آپ اپنا تماشائی بن جاتا ہے۔ مولانا وحید الہ آبادی نے بھی اس مضمون کو خوب ادا کیا ہے ؎

ادہر آئینہ رکھا ہوا ادہر وہ تن کے بیٹھے ہیں — جو اپنا دیکھنا منظور ہو کیا بنکے بیٹھے ہیں

شاد نے معشوق کے آرائش کی تصویر کشی نہایت خوب کی ہے معشوق آرائش جمال سے فارغ ہوا ہے، اسکی جلوہ پیرائی نے ایک حشر برپا کر دیا ہے کہ ایک طرف تو اسکا تماشائی محوِ حیرت ہے اور دوسری طرف آئینہ دم بخود ہے۔ اس شعر کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ حسن تخیل کا آئینہ ہے "تیرے نکھرنے کی قسم" کان لطافت کا ایک جوہر ہے۔ دوسرے مصرعہ کا حسن تقسیم اتنا لطیف ہے کہ اسکے محاسن ضبط تحریر میں نہیں آسکتے۔ ذوقِ سلیم خود اس سے لذت اندوز ہو سکتا ہے۔

اکبر ؎ کہتے ہیں فطرت ہے یہ بے نقاب رنگ و روئے — ہو اسی پردہ میں پنہاں آفتابِ روئے دوست

شاد ؎ جو آنکھیں ہوں تو چشمِ غور سے اوراقِ گل دیکھو — کسی کے حسن کی شرحیں لکھی ہیں ان رسالوں میں

اکبر کہتے ہیں کہ مظاہر فطرت کے پردہ میں شاہدِ حقیقی کا حسن و جمال مستور ہے۔ اسی مسئلہ کو شاد دلآویز انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اوراقِ گل جو اندر فطرت ہیں جن میں حسن حقیقی کی شرحیں مرقوم ہیں، اگر شیدائے حقیقت ان رسالوں کو غور سے دیکھے تو انوار معرفت کا نظارہ دیکھ سکتا ہے۔ پھولوں کو رسالہ قرار دینا کتنا معنی خیز ہے اور لفظ "کسی" میں کتنی بلاغت مستور ہے۔ شاد کا شعر اکبر کے شعر سے بہرحال بہتر ہے۔

اکبر ؎ بہار آئی ہے اک آئینۂ معنی نشاں ہوکر — چمن میں بوئے گل پھیلی ہو تیری داستاں ہوکر

شاد ؎ مہک اٹھا چمن دہر کا پتہ پتہ — راز چھپنے نہیں دیتی تیری خوشبو تیرا

اکبر نے بہار کو "آئینۂ معنی نشان" قرار دیا ہے جو نہایت خوش اسلوب و بلیغ ہے۔ بوئے گل کے انتشار کو داستانِ معشوق کی تشہیر ثابت کرنا بھی کتنا دلآویز ہے۔ شاد کا بھی وہی مضمون ہے اور نہایت خوبی سے بندھا ہے۔ دوسرے مصرعہ کی ترکیب کتنی پیاری ہے شاد کا ذوقِ نظر نہایت وسیع ہے، وہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں معشوق کی جلوہ پیرائی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اکبر نے اسکو صرف موسم بہار تک محدود کر دیا ہے۔

اکبر ؎ آج آرائشِ گیسوئے دوتا ہوتی ہے — پھر مری جان گرفتارِ بلا ہوتی ہے
شاد ؎ چشمِ سیاہ میں سرمہ دو زلفِ سیاہ میں شانہ کر — قتلِ جہان کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر

اکبر کے شعر کا مضمون سامنے کا ہے اور کوئی جدت نہیں پائی جاتی۔ شاد کا شعر ایک مخزنِ تخیل ہے اور اس میں جو مستی، جوش، دلآویزی، چستی، اور بلاغت پائی جاتی ہے اکبر کے شعر میں نہیں ہے۔

اکبر ؎ یہ ادائیں یہ نگاوٹ یہ بلا کی چتون — میں تو کیا ضبط فرشتوں سے بھی [illegible]
شاد ؎ ہائے وہ جادو بھری آنکھیں وہ کافر چتونیں — وہ بڑا مومن تھا قائم جس کا ایمان رہ گیا

دونوں معشوق کے طلسمات فریب مجموعۂ حسن کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ میرے خیال میں شاد کا شعر زیادہ مستانہ ہے۔ دوسرے مصرع میں لفظ "مومن" کتنا بلیغ واقع ہوا ہے۔ اور خصوصاً "کافر" کے مقابلہ میں اس کا بے اختیار و برمحل استعمال نہایت کیف انگیز ہے۔

اکبر ؎ حیرت میں ختم ہو گئی انشائے زندگی — حل ہو سکا نہ ہم سے معمائے زندگی
شاد ؎ ہزاروں آئے دنیا میں ساتھ ہیں اسی کی ہے — ہماری روح بوجھی ہوئی اب تک پہیلی ہے

دونوں اشعار کا مضمون فلسفیانہ ہے جس کا نتیجہ ایک ہے۔ معنویت کے لحاظ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ شاد نے اس فلسفہ کو رنگِ تغزل میں ادا کیا ہے جس سے شعر میں زیادہ کیف پیدا ہو گیا ہے۔

اکبر ؎ امتیازِ حسرت و رنج و راحت جاتا رہا — غم ہوا اتنا کہ اب احساسِ غم جاتا رہا
شاد ؎ خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے — تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

دونوں اساتذہ نے فلسفۂ جذبات کے مسئلوں کو نظم کیا ہے جس میں دل کی ایک پوشیدہ اور گہری کیفیت کی تصویر کشی کی ہے۔ اکبر کا فلسفہ یہ ہے کہ غم و الم کی کثرت دل کو غم و الم کا اتنا خوگر بنا دیتی ہے کہ اس کا احساس باقی نہیں رہتا اور رنج و الم ایک راحت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ فلسفۂ جذبات کا ایک مسئلہ ہے۔ مگر اس مسئلہ کو مرزا غالب بہت قبل نہایت لطیف انداز میں نظم کر چکے ہیں ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اکبر کا شعر اسی شعر سے ماخوذ ہے۔ شاد قلب کی ایک دوسری کیفیت کی مصوری کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ مصائب و آلام کو ضبط کرنا اور بھی اندوہ افزا ہے۔ اس سے غم اور سنگین ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی روح اندر ہی اندر تحلیل ہوتی رہتی ہے۔ رنج و الم کی اس خلش کو کم کرنے کی صورت یہ ہے کہ انسان دل [illegible] تڑپ لے اگر ہے۔ اس سے غم ہلکا ہو جاتا ہے اور ایک تسکین محسوس ہوتی ہے۔ دونوں شعروں کا فلسفہ جداگانہ ہے۔ اپنی جگہ پر دونوں شعر خوب ہیں مگر اکبر کا شعر مستعار ہے اور شاد کا شعر اوریجنل۔ اس لئے شاد کے شعر کو ترجیح دینا چاہیئے۔

اکبر ؎ بہار بے ثباتِ ناز ایسا اور خوشی کیسی — بجا ہو حیرت نرگس کہ گل کی یہ ہنسی کیسی
شاد ؎ یہاں نشو و نما کا ماحصل ذوقِ فنا ہر رنگ و بو کا — ہنسو گے خود اس چمن میں غنچو! زمانہ آئے ذرا نمو کا

دونوں شعروں میں دنیا کی بے ثباتی و عبرت پذیری کی تلقین ہے۔ اکبر کہتے ہیں کہ پھولوں کی ہنسی کو دیکھکر نرگس حیرت زدہ ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ بہار چند روزہ ہے اور پھولوں کا انجام ایکدن خاک ہے۔ لہذا اپنی بہار پر مسرور ہونا عبث ہے۔ شاد کہتے ہیں کہ گلشن عالم کی عشرت سی تو راس نہیں آتی، ابھی کم سنی کی وجہ سے غنچوں کو اپنے رنگ و بو پر مسرت ہے مگر جب نمو پذیر ہونگے تو محسوس کریں گے کہ نشو و نما کا کوئی حاصل نہیں ہے، اس رنگ و بو کو آخر خاک میں ملنا ہے۔ لہذا وہ خود بہار و باغ کے وجود پر ہنسینگے۔ شاد کے شعر کو اکبر کے شعر پر فوقیت ہے مضمون تو دونوں کا ایک ہے مگر بلاغت کے پہلو شاد کے شعر میں زیادہ ہیں۔ مضمون کی ترکیب بھی نہایت مترنم و کیف زا ہے۔

اکبر ؎ فروغ دل اب نہیں باقی وہ سوز و ساز اسمیں الہی ہے　　یہ آہ و فریاد ہے جو لب پر بجھی ہوئی شمع کا دھواں ہے ملک

شاد ؎ نہیں مدتوں سے وہ دلولہ دل زار سینہ میں جل گیا　　فقط ایک ڈھیر ہے راکھ کا نہ وہ سوز ہے نہ وہ ساز ہے ملک

میرے خیال میں اکبر کا شعر شاد کے شعر سے بہتر ہے۔ اولاً تو اول الذکر نے اس مضمون کو مطلع میں ادا کیا ہے جس سے مصرعوں میں ترنم پیدا ہو گیا ہے۔ ثانیاً آہ و فریاد کو شمع دل کا دھواں قرار دیا ہے جس سے تخیل میں نہایت نزاکت پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہ بات مسلمہ ہے شمع کے بجھنے پر تھوڑی دیر تک دھواں اٹھتا ہے۔ مضمون بہت نیچرل ہے اور تشبیہ مکمل۔ شاد کا شعر بھی نہایت دردانگیز اور موثر ہے۔

اکبر ؎ یاس ہی یاس تھی جبتک کا پیغام آیا　　میں نہ سمجھا کہ یہ جینا مرے کس کام آیا

شاد ؎ اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا　　زندگی چھوڑدے پیچھا مرا میں باز آیا ملک

دونوں کا مضمون فلسفۂ زندگی کے متعلق جداگانہ ہے۔ اکبر زندگی کی ہیچ انجامی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ موت کے وقت سوائے یاس و حرماں کے اور کچھ نہیں ہے شاد کا شعر ایک وسیع تخیل پیش کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک عمر طویل گزارنے پر بھی نہ نصب العین حیات کی تکمیل ہوئی اور نہ زندگی کو بہتر و مفید اسلوب میں صرف کرنے کا سلیقہ آیا، لہذا ایسی ہستی سے دل بیزار ہے اور اس سے پناہ مانگتا ہے یہ شعر سے اکبر کے شعر کو کوئی نسبت نہیں۔ یہ حسن تغزل کا بہترین نمونہ اور جوش واثر اور تمام محاسن شعری کا گنجینہ ہے۔

اکبر ؎ سالک راہ محبت کو خرد سے کیا کام　　وہ تو چاہیگا کہ خود ہوش بھی ہمراہ نہ ہو

شاد ؎ جسم خاکی کے تعلق نے گرانبار کیا　　کاش میں راہ میں تیری تن تنہا ہوتا

محبت ایک لطیف و مجرد جوہر ہے جو انسان کے آئینۂ دل میں ودیعت کیا گیا ہے اس کی مدد سے روح ذات واجب الوجود سے مواصلت کی کوشش کرتی ہے۔ مگر اس کیلئے ضرورت ہے کہ انسان ہوش و خرد، جسم و مادہ وغیرہ سے تمامتر بیگانہ ہو جائے کیونکہ عالم روحانیات میں ان مادی چیزوں کا وجود راہ ترقی میں سدراہ ہے۔ اس مسئلہ کو دونوں نے نظم کیا ہے۔ اکبر کہتے ہیں کہ ہوش و خرد راہ عشق میں سالک کیلئے سدراہ ہیں۔ شاد کہتے ہیں کہ روح جسم سے منزہ ہوتی تو راہ محبت با سانی طے کر لیتی مگر چونکہ جسم خاکی بھی روح سے وابستہ ہے اسلئے ہزار ہا علائق دنیوی کا سامنا ہے اور منزل حقیقت تک رسائی نہیں ہوتی۔ معنویت کے لحاظ سے شاد کے شعر کو ترجیح ہے کیونکہ "سالک راہ محبت" کی تکمیل نصب العین میں صرف ہوش و خرد ہی نہیں بلکہ اسکا سراپا مادی وجود ہی رخنہ انداز ہے۔

اکبر ؎ اس وعدہ خلافی پہ کرو غور کسی دن | ہر روز یہ کہہ دیتے ہو اب اور کسی دن

شاد ؎ جل جل کے وضع طور سے بے طور ہو گیا | تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے

دونوں شعروں کی صفائی زبان، انداز بیان، خوبی بندش، چستی ترکیب نہایت دل آویز ہے، اور میرے خیال میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل نظر آتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو شاد کا شعر زیادہ پرمعنی و تخیل ہے۔ اکبر صرف معشوق کی وعدہ خلافی کے شاکی ہیں۔ شاد کے شعر سے ایک دنیائے تخیل سامنے آجاتی ہے خصوصاً اسکا دوسرا مصرعہ غضب کا ہے۔

اکبر ؎ اس گلستان میں بہت کلیاں مجھے تڑپا گئیں | کیوں لگی تھیں شاخ میں کیوں بے کھلے مرجھا گئیں

شاد ؎ آئی کس شوق سے اور باغ میں پھولی نہ پھلی | اے کلی کیوں تجھے صدمہ ہے مرجھانے کا

ان شعروں کا ماخذ ذوق کا یہ مصرعہ ہے ؎

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بے کھلے مرجھا گئے

بہرکیف مضمون کے لحاظ سے دونوں شعرا اپنے اپنے انداز بیان میں قابل داد ہیں۔ اکبر کا مضمون چونکہ مطلع میں ادا ہوا ہے اسلئے زیادہ مترنم، کیف زا اور مؤثر ہے۔

اکبر ؎ نشتر لگا کے جا تو اے رنج ناامیدی | دل کو ابھی شکایت باقی ہے جوش خوں کی

شاد ؎ یونہی رہ رہ کے تو اے ناامیدی دل پہ مہمیز چلا | یہی مہمیز رخش عمر کو چالاک کرتی ہے

اکبر کے شعر میں ناامیدی سے استدعا کی گئی ہے کہ دل سودا زدہ میں اتنی نشترزنی کرے کہ جوش خون بالکل زائل ہو جائے اسمیں کوئی ولولہ و امنگ اور جنون و سودا باقی نہ رہے اور اطمینان و سکون حاصل ہو جائے۔ شاد کہتے ہیں کہ ناامیدی کی مہمیز دل کیلئے نہایت امید افزا ہے کیونکہ اسی مہمیز سے توسن عمر تیز گام ہو جاتا ہے۔ شاد کے دونوں مصرعے باہم نہایت متوازن و متقابل ہیں، مفہوم پاکیزہ ہے، تخیل میں جدت ہے، ترکیب پرجوش و پراثر ہے۔ اکبر کا شعر بھی خوب ہے۔

اکبر ؎ دل شکستہ ہوں مگر دل میں خدا کا نور ہے | یہ وہ ویرانہ ہے روشن جسمیں شمع طور ہے

شاد ؎ سراپا سوز ہے اے دل سراپا نور ہو جانا | اگر جلنا تو جلکر جلوہ گاہ طور ہو جانا

دونوں شعروں کا مطلب قریب قریب ایک ہے فرق صرف طرز بیان کا ہے۔ دونوں شعر اپنی جگہ پر اچھے ہیں۔ اکبر کہتے ہیں خانۂ دل کی تخریب کے بعد جلوۂ الٰہی اسمیں جلوہ گر ہوتا ہے۔ شاد دل کو ہدایت کرتے ہیں کہ آتش عشق میں جلنے کا نتیجہ نور مجسم ہو جانا ہے لہٰذا اگر جلنا ہے تو کوہ طور کی طرح جل تاکہ انوار الٰہی نورفشاں ہو۔ شاد کے شعر میں دل کا "سراپا سوز" ہوکر "سراپا نور" ہو جانا بہت نیچرل ہے۔

اکبر ؎ اگرچہ دل کو ہو سودا اسے برا نہ کہو | کسی کی زلف سے ملتا ہے سلسلہ اس کا

شاد ؎ واعظ بتوں کو تونے کہا اہل زور رنگ | ای بیخبر یہ بات پہونچتی ہے دور تک

دونوں شعر خوب ہیں۔ اکبر کے شعر میں رعایت لفظی کا لطف ہے یعنی سودا، زلف، سلسلہ، مفہوم بھی پاکیزہ ہے۔

کے شعر میں خوبی بیان اور صفائی زبان کا لطف ہے۔ اور ایک نازک کنایہ بھی موجود ہے۔ وہ یہ کہ خود شاد نے ایک جگہ بتوں کے حسن کے متعلق کہا ہو کہ یہ حسن حقیقی کا استعارہ ہے" پس بتوں کی برائی کرنا خدا کے ساتھ گستاخی کرنا ہے۔

اکبر ؎ یہ سوز داغ دل یہ شدت رنج والم کب تک ہماری ہی لئے یہ جور گردوں ہے تو ہم کب تک
شاد ؎ بڑھے جاتے ہیں لیکن عمر جوں جوں گھٹتی جاتی ہے مگر میں سمجھ کر خوش ہوں کہ بیڑی کٹتی جاتی ہے

اکبر کہتے ہیں کہ اگر دنیا میں شدید مصائب والام کا سامنا ہے اور چرخ فلک میرے ہی ستانے پر کمر بستہ ہے تو اسکا غم بے سود ہے کیونکہ آخر میری زندگی یکدن ختم ہو جائیگی اور تکالیف دنیاوی سے نجات ابدی حاصل ہوگی۔ شاد کہتے ہیں کہ جیسے جیسے عمر کم ہوتی ہے مصائب زندگی اور زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ مگر مجھے اسکا مطلق غم نہیں بلکہ اطمینان و مسرت ہے کیونکہ اب عمر آخر ہے اور بہت جلد رنج والم کی بیڑی کٹنے والی ہے۔ مفہوم دونوں شعروں کا ایک ہے مگر شاد کا شعر زیادہ دلآویز اور کیف زا ہے۔ انداز بیان بھی نہایت پسندیدہ ہے۔ اکبر کا شعر بھی خوب ہے اور تاثیر سے لبریز ہے۔

اکبر ؎ سینہ کا زخم آہ کی سختی سے چھل گیا اچھا ہوا فزا تو محبت کا ل گیا
شاد ؎ یونہی راتوں کو تڑپینگے یونہی جان اپنی کھوئینگے تری مرضی نہیں اے درد دل اچھا نہ سوئینگے

مضمون دونوں شعروں کا بالکل جداگانہ ہے مگر چونکہ دونوں کا تعلق جذبات سے ہے اور طرز بیان و خوبی زبان کا لطف دونوں میں تقریباً یکساں ہے لہذا موازنہ کیلئے میں نے انہیں منتخب کر لیا ہے۔ اکبر کے شعر میں الم دوستی و ایذا طلبی کا مضمون ہے۔ دوسرے مصرعہ کی برجستگی نہایت پرکیف ہے۔ شاد کا شعر محاسن تغزل کا بہترین نمونہ ہے۔ اس بات کو کہ "درد دل کے ہاتھوں خواب و آرام حرام ہے" کس پرکیف و پرجوش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ میر کے نشتر کی کیفیت اس شعر میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

اکبر ؎ زندہ ہوں مگر زیست کی لذت نہیں باقی ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں
شاد ؎ پیری میں امنگیں وہ نہیں جوش نہیں ہے آپ اپنے کو سمجھوں مجھے یہ ہوش نہیں ہے

دونوں شعرا اپنے انداز میں خوب ہیں۔ گو مگر اور محاسن شعری دونوں میں تقریباً یکساں ہیں تاہم شاد کا مصرعۂ ثانی نہایت برجستہ و بے ساختہ اور پرجوش و پراثر ہے۔ یوں بھی انکا شعر بہر نوع جذبات سے لبریز ہے۔

اکبر ؎ امید دل میں نہیں سانس ہے سینہ میں مجھے تو اب کوئی لذت نہیں ہے جینے میں
شاد ؎ سمجھ رہا ہوں کہ ہر سانس ہو آخری سانس یہ کون جینے میں جینا ہے دم شماری ہے

میرے خیال میں دونوں شعر جذبات و کیفیات پیرانہ سالی کا آئینہ ہیں اور حسن تغزل کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہے۔ مگر اکبر کا مضمون چونکہ مطلع میں ادا ہوا ہے اسلئے شعر میں ترنم و کیف زیادہ پیدا ہو گیا ہے۔

اکبر ؎ علم ابتدا کا ہے نہ خبر انتہا کی ہے دور انقلاب کا ہے حکومت فنا کی ہے
شاد ؎ سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

دونوں شعروں میں جو فرق شعری و معنوی ہے ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ شاد کے شعر میں جو تاثیر و جوش،

ائق و اسرار، اور حسن تخیل موجود ہے اکبر کے شعر میں نہیں ۔ اکبر کے شعر کا مطمح نظر شاد سے جداگانہ ہے ۔ وہ دراصل دنیا کے انقلاب و فنا کا ذکر رہے ہیں۔ شاؔد کا شعر ایک وسیع تخیل پیش کرتا ہے اور حسن تغزل کا بہترین نمونہ ہے۔

اکبرؔ ؎ نہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اکبر ... بہت نزدیک ہے وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

شاؔد ؎ اجل سلادیگی سبکو آخر کسی بہانے تھپک تھپک کر ... نہ ہم رہینگے نہ تم رہوگے نہ شاؔد یہ بات ساتھ ہوگی

اکبر انقلاب دہر سے تنگ آکر دل کو تسکین دیتے ہیں کہ اسکا غم کرنا بے سود ہے کیونکہ بہت جلد زندگی ختم ہونے والی ہے اور اس ہم سا ہونگا سب کے تقاضے سے نجات ملنے والی ہے۔ شاد دنیا کی بے ثباتی کو بیان کرتے ہیں کہ حیات انسان اور اسکے تمام لوازمات کو ایکدن فنا ہونا ہے ر ہر فرد کو موت کی گہری نیند سونا ہے ۔ شاؔد کے شعر کا انداز بیان نہایت دلآویز ہے ۔ فنا ہونے کو کس لطیف پیرایہ مین بیان کرتے ہین کہ ۔ اجل سلادیگی سبکو آخر کسی بہانے تھپک تھپک کر۔

اکبر ؎ حسن بت ہے تو اب یاد خدا کی نہیں خبر ... یہ ادا ہے تو نمازون کی قضا آئی ہے

شاؔد ؎ اب تو جانے لگا مسجد کی طرف وہ کافر ... گر یہ سچ ہے تو شہادت ہے مسلمانونکی

اکبر کے دونوں مصرعوں کا تناسب و تقابل خوب ہے اور "ادا" کو "نمازون کی قضا" کا ذمہ دار ٹھہرانا نہایت پرلطف ہے ۔ شاؔد کا شعر بھی نہایت خوب ہے ۔ "مسجد"، "کافر"، "شہادت" اور "مسلمانون" کی رعایت لفظی نہایت پرلطف ہے ۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح نہین ی جاسکتی ۔

اکبر ؎ عجب فتنہ خرام ناز کِ قاتل نے اٹھا ہے ... سنبھلتا ہی نہین دامن قدم مشکل سے اٹھتا ہے

شاؔد ؎ خرام ناز مین ذورا ہی کہتا ہے گردن کا ... نہین اٹھتا مرے نازک بدن سے بوجھ دامن کا

اکبر کا شعر نہایت مستانہ اور شاندار ہے ۔ الفاظ کی نشست، فقرون کا دروبست، اتنا خوش اسلوب و پرکیف ہے کہ تعریف نہین ہوسکتی ۔ شاؔد کا شعر بھی اسکے مقابلہ مین کچھ کم پرلطف نہین ہے ۔ گردن کے "ڈورے" کا زبان حال سے یہ کہنا کہ "نہین اٹھتا مرے نازک بدن سے بوجھ دامن کا" کیف انداز ہے۔

اکبر ؎ اٹھتی ہیں تجھسے یہ آہین دل ناشاد عبث ... سننے والا نہین کوئی تو ہے فریاد عبث

شاؔد ؎ کس سے نازجی گلزار کی فریادی ہے ... مفت ای باد صبا وقت کی بربادی ہے

اکبر کے شعر کا مضمون معمولی ہے ۔ شاؔد کے شعر میں ایک وسیع معنی پوشیدہ ہین ۔ اسکا زور بیان چستی ترکیب، مصرعون کی بے ساختگی، بے حد پرجوش و پرتاثیر ہے ۔

اکبر ؎ سامنا جلوۂ معشوق کا اللہ اللہ ... ہوش ہی وقت کہیں آپ مین انسان نہ ہے

شاؔد ؎ جلوۂ حسن خدا ساز ستم ڈھاتا ہے ... کیا کہین دیکھ کے انسان سے رہا جاتا ہے

دونون شعرون مین حسن کی کرشمہ زائیون اور عشوہ طرازیون کے بے پناہ اثرات کا بیان ہے ۔ میرے خیال مین دونون شعر ہم

اپنی جگہ پر قابل داد ہیں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینی مشکل ہے۔

مذکورۂ بالا اشعار کو باہم موازنہ کرنے پر نظر آئیگا کہ بعض مضمون کو خوش اسلوبی سے باندھنے میں دونوں اساتذہ دوش بدوش ہیں بعض شعروں میں اکبر کی فوقیت نظر آئیگی، لیکن اکثر اشعار میں مولانا شاد کی چستی ترکیب، حسن بندش، زور بیان، جدت تخیل، جوش و اثر علانیہ ممتاز نظر آئیگا۔ حقیقت یہی ہے کہ شاد کا رنگ تغزل اتنا دلکش ہے کہ ہر قسم کا مضمون انکے طرز ادا اور انداز بیان کے سانچے میں ڈھل کر بے حد دلآویز اور احساس شعری سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اکبر کی غزلوں میں بھی جا بجا حسن تخیل، افشاء جذبات، اسالیب بلاغت، جوش بیان، خیالات عالیہ، بلندی مضامین وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر تغزل محض کے نقطۂ نظر سے دونوں اساتذہ کے کلام پر تنقید ڈالی جائے تو صاف نظر آئیگا کہ شاد کی نگاہ وہ بین جن جذبات و خیالات عالیہ کے نکات تک پہونچتی ہے اکبر کے تخیل کی وہاں تک رسائی نہیں۔ صرف اکبر پر کیا منحصر ہے میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ دور میں کوئی شاعر رنگ تغزل میں مولانا شاد کا حریف نہیں اور غزلیت کا یہ نمونہ نہیں پیش کر سکتا۔ شاد کے محاسن کلام پر بحث کرنے کیلئے یہ مختصر مضمون کافی نہیں۔ میں دو ہمطرح غزلیں دونوں اساتذہ کے کلام پر درج کرتا ہوں۔ اب ارباب نظر خود دیکھ لیں کہ بحیثیت خیالات جناب اکبر کو شاد سے کیا نسبت ہے۔

اکبر	شاد
یہ ابر زلف یہ برق نظر معاذ اللہ	وہ چشم مست وہ ترچھی نظر معاذ اللہ
اگرچہ سین ہے دلکش مگر معاذ اللہ	حیا ہزار بھری ہے مگر معاذ اللہ
طلسم حسن بتان کے نہ پوچھئے احوال	وہ رخ صبیح وہ کافر نگاہ توبہ ہے
دہن کا ذکر ہی کیا ہے کمر معاذ اللہ	وہ کاکلیں وہ لچکتی کمر معاذ اللہ
جناب شیخ پھر آخر بسر کرین کیونکر	جھپکے پیتے ہیں کیا انکا راز پوچھتے ہو
جدھر اٹھاتا ہوں آنکھیں ادھر معاذ اللہ	ادھر زبان پہ حینا ادھر معاذ اللہ
جو منہ لگائے وہ بت شیخ بھی پڑھیں الحمد	حمدوں کے کھولدئے منہ زہے کرم ساقی
یہ دور ہی سے ہے بس اسقدر معاذ اللہ	میں پی تو لونگا مگر اسقدر معاذ اللہ
میں کیا کہوں شب فرقت میں مجھپہ کیا گذری	ادھر اذان کی صدا آگئی اسطرف جھٹ
عجیب حال رہا رات بھر معاذ اللہ	خدا دکھائے نہ ایسی سحر معاذ اللہ
بتوں کے عشق میں کیا کچھ نہیں کیا میں نے	دلوں میں زخم تو سینوں میں پڑ گئے ناسور
صبت رہی ہے لب شیخ پر معاذ اللہ	جناب شیخ کا وعظ الحذر معاذ اللہ

اکبر — شاد

اکبر	شاد
×	فلک سحاب کی مشکون مین بھرکے لایا پانی
×	ہمارے نالۂ دل کے شرر معاذاللہ
×	مریض ہجر سے قاصد پیام یاس نہ کہہ
×	کہان وہ شوق کہان یہ خبر معاذاللہ
×	کہان اتار دیا تونے اپنے مہمان کو
×	نہین وہ نا بھیا نمک وہ گھر معاذاللہ
×	طریق عشق کی منزل تو ایک رستے لاکہہ
×	قدم قدم پہ بہکنے کا ڈر معاذاللہ
فریب چشم ہے خوان جہان کا رنگ اکبر	نہین ہے شاد سی شاعری پہ اپنی ناز
مزا زبان کا فتنہ اثر معاذاللہ	حسد کی جزہے تمہارا ہنر معاذاللہ

وصل جانان کی دل زار کو حسرت ہی رہی ۔ پہ میسر نہوا
عمر بھر جان پہ فرقت کی مصیبت ہی رہی ۔ تہا یہ قسمت کا لکہا
تم نے جو بات کہی مین نے دل و جان سے وہ قبول کیا عذر کبھی
تمکو اسپر بھی مگر مجہ سے شکایت ہی رہی ۔ چل یہ خدمت کا صلا
چشم حسرت سے اشکون کی ہی موجین نکلین ۔ ٹھنڈی سانسین بھی بہم
آتش غم کی مگر دل مین حرارت ہی رہی ۔ نہوا فرق ذرا

دل تو اک عمر سے بدنام ہو گیا اسکا گلا ۔ کیتے آتی ہے حیا
یا امیدین یہ تمنا جنہین برسون پالا ۔ یہ کب اپنی ہین بھلا
وہ تری کج روشی کج کلہی کینہ وری ۔ دلبری عشوہ گری
کون غش کہاکے سر راہ گرا کون مرا ۔ پھر کے دیکھا نہ ذرا
بان مارا تری آنکھون نے جو کی پھر کے نگاہ ۔ منہ ملی دلکو پناہ
یار کیا قہر ہے چلتا ہوا جادو تیرا ۔ لاکھ روکا نہ رکا

کہائین سو مرتبہ قسمین کہ ہون عاشق تجہپر ۔ نہین اور ون پہ نظر
بدگمانی مگر اس شوخ کی عادت ہی رہی ۔ صاف مجہسے نہوا
ایک تم ہو کہ ہزارون ہی کئے مجہ پہ ستم ۔ ملکے غیرون سے بہم
ایک مین ہون کہ مجہے تمسے محبت ہی رہی ۔ کبھی شکوہ نہ کیا
دشمنون نے تو بہت بات بنائی جاکر ۔ کہ وہ بگڑین مجہپر

رت بھری ساری بہری ڈالون مین پھونٹی کونپل ۔ آنکھو پہلین پہل
اک اپڑا ہوا دل ہو کہ نہ پہولا نہ پہلا ۔ اور سو کہا ہی کیا
کالی کالی وہ گھٹائین وہ پپیہون کی پکار ۔ دیکھی دیکھی وہ پہوار
انکے ساون بھی ہمارا یونہی رونے مین کٹا ۔ کیا کہین چپکے سوا
بوسہ لینے کا مری خاک کو بھی ہے ارمان تنا ہاتھ نہ ٹہنے کی کہان

حال پر میرے اگر انکی عنایت ہی رہی۔ کچھ کسی سے نہوا
ہو تمہاری ہی عجب سخت طبیعت بخدا۔ رحم دل میں نہ ذرا
ستم کرتے رہو ہم تمہیں وحشت ہی رہی بیٹھے نہ ذرا
منزل گور میں تنہا مجھے سب چھوڑ چلے۔ اپنی بیگانے جو تھے
ساتھ دینے کو اگر انکی عنایت ہی رہی۔ اور کوئی نہ رہا

ہمنشین اٹھ گئے اس بزم سے اپنے اکبر۔ تم بھی بس باندھو کمر
نہ وہ جلسے ہی رہے اب نہ وہ صحبت ہی رہی۔ کیا ہو جینے کا مزا

جامہ زیبی کا صلا او صنم تنگ قبا۔ کچھ تو دامن کو جھٹکا
فتنہ خو آفت جان سنگدل آشوب جہان۔ بت شیرین دہان
سرور کجکلاہان خسرو اقلیم جفا۔ بانی مکر و دغا
رس بھری ہائے وہ آنکھیں تری کالی کالی۔ بے پئے متوالی
سانولا رنگ نمک ریز جراحات جفا۔ آن کہاں دھیان کہاں
دیکھنا ہائے انکھیوں سے ترا آڑی ترچھی۔ یار اسکی نہ کہی
کب کوئی تیر ہے وہ کھاؤ جو اچھا سا لگا۔ پھر کے پھر دیکھو ذرا
آنکھیں روئی ہوئی آواز بھی بھرائی ہوئی۔ باتیں شرمائی ہوئی
اس سے تو اور کسی بھید کا ملتا ہے پتہ۔ شاد تمہیں تو نہ کھا

دونوں غزلوں کے مطالعہ سے ہر اہل ذوق سمجھ سکتا ہے کہ مولانا شاد کے رنگ تغزل میں جو جوش بیان، صداقت جذبات، حسن تخیل، بلندی مضامین، سوز و گداز، وغیرہ پائے جاتے ہیں اور جو غزلیات کی جان ہیں۔ اکبر کی غزلوں میں قطعاً مفقود ہیں۔ مستزاد مذکورہ کو دیکھئے، اس میں جو محشر خیالات و طوفان جذبات و تلاطم کیفیات پوشیدہ ہیں اردو زبان کے کسی مستزاد میں نظر نہیں آتے۔ مولانا شاد کے رنگ تغزل کے متعلق انہیں کا ایک شعر نقل کرکے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ ؎

نمک ہو فارسی کا درد ہندی شاعری کا ہے
یہ اردوئے معلی نکتہ سنجان عجم دیکھیں۔

سید شاہ ولی الرحمن ولی۔ بی۔ اے۔ کاکوی

ہندوستان کی معاشی زندگی

معاشی انسان قبل اسکے کہ ہم نفس مضمون سے بحث کریں معاشی انسان کی مختصر سی تعریف کردینی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ معاشی انسان سے مراد کاروباری انسان ہے یعنی یہ کہ وہ لین دین اور تجارتی کاموں میں بیجا رعایت نہ کرے اور اپنے کام کی انجام دہی میں غفلت سے کام نہ لے۔

مشرق و مغرب کا معاشی انسان اب دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستانی معاشی انسان ہیں یا نہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں معاشی انسان بہت کم ہیں۔ اور یورپ میں انکی کثرت ہے ہندوستانی اور یورپین کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اول الذکر میں اور باتوں کا تو کیا ذکر کاروبار میں بھی رعایت روا رکھی جاتی ہے اور بعض اوقات تو دوسروں کے خیال سے اپنا نقصان تک کرلیتے ہیں۔ انکے برعکس یورپین اپنے اصول کے بہت سخت ہیں انکے یہاں کاروبار میں کسی کی رعایت نہیں ہوتی، وہ "حساب جو جو" کے مقولے پر عمل کرتے ہیں اور اپنے وقت کے ہر لمحہ سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ہندوستانیوں میں کاہلی، دولت کی طرف سے قناعت اور مروت کیوجہ سے وقت کی بہت کم قدر ہے۔ وقت کی طرف سے اسقدر لاپروائی دیکھکر ایک امریکن نے یہ ریمارک کیا کہ "ہندوستان کا دن بجائے چوبیس گھنٹوں کے دوسو چوبیس گھنٹوں کا اور سال بجائے تین سو پینسٹھ دن کے تین ہزار پینسٹھ دنکا ہوتا ہے"

اسکے علاوہ ہندوستانی کچھ تو قدرتی اسباب یعنی آب و ہوائی ناموافقت موسم کی جلد جلد تبدیلی گرمی کی شدت اور آئے دن کی وبا پلیگ ہیضہ اور ملیریا سے کمزور ہوتے ہی ہیں "سپر سوئے پر دو رسے" یہ اُمحنتی بھی کم ہوتے ہیں۔ اگر کسی سے یہ سوال کیا جائے کہ مزدوروں کے اضافہ اجرت کا کیا نتیجہ ہوگا تو یقیناً وہی جواب دیگا کہ انکی حالت درست ہوجائیگی اور ان کے کام میں ترقی ہوگی مگر قسمتی سے ہندوستان میں ہمیشہ یہ صورت پیدا نہیں ہوتی یہاں بہت سے بداندیش ایسے بھی ہیں جو اپنی زیادتی اجرت یا تو اچھے کاموں میں صرف کرنے کے لغویات میں صرف کرتے ہیں اسکے علاوہ ایک حالت اور بھی نمودار ہوتی ہے جسکا وجود سوائے ہندوستان کے کسی دوسری جگہ مشکل سے ملیگا یعنی بعض مزدور ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جب انکی اجرت میں اضافہ ہوتا ہے تو بجائے اسکے کہ وہ اس فاضل اجرت کو اپنی اصلاح کارکردگی میں صرف کریں اور زیادہ اجرت کے لالچ سے زیادہ محنت کریں وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ اپنے کام میں کمی کردیتے ہیں اور بجائے آٹھ روز کام کرنے کے صرف چھ یا سات روز کام کرتے ہیں اور زیادہ آرام لینے لگتے ہیں، برخلاف اسکے اگر ہم یورپ کے کھیتی اور کارخانوں کی زندگی پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک روزانہ جتنی محنت کرتا ہے اتنے گھنٹے ہمارے یہاں کا معمولی مزدور بھی نہیں کرتا۔ ان میں سے ہر ایک عموماً آٹھ اور نو گھنٹے روزانہ کام کرتا ہے جتنی زیادہ دولت پیدا ہوتی ہے اتنی ہی انکی خواہش اور بڑھتی ہے اور وہ اور زیادہ دولت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ باشندگان یورپ مادی ترقی کے دلدادہ ہیں اور ہندوستانی اسکے برعکس یعنی جب کچھ دولت جمع کرلیتے ہیں تو تکلیف اٹھا کر اور محنت کرکے دولت حاصل کرنی نہیں چاہتے بلکہ اسی پر قناعت کرلیتے ہیں

محنت کی منتقلی ہندوستانی اور یورپی زندگی میں ایک دوسرا فرق یہ ہے کہ یورپ میں محنت منتقل ہونے والی چیز سمجھی جاتی ہے اور یہاں اس سے ہندوستانیوں کو کوئی تعلق نہیں۔ یہاں محنت گویا نقل پذیر نہیں ہے (واضح ہو کہ محنت سے مراد نہ صرف محنت ہے بلکہ اصطلاحاً مزدوروں کی

جماعت بھی مراد ہے) اسکی ایک بڑی وجہ طبائع اور خیالات کا اختلاف ہے۔ یورپی مزدور کو جہاں کہین مادی فائدہ نظر آتا ہے منتقل ہو جاتا ہے مگر ہندوستانی مین ایسا نہین یہان کے مزدور بہت قدامت پسند ہین یہ اپنا گھر بار عزیز و اقارب۔ بال بچے اور کھیتی باڑی چھوڑکر دوسری جگہ جانا نہین چاہتے۔ اب ان طبائع کا کسی ملک کی پیدائش دولت پر جسقدر گہرا اثر پڑتا ہے اسکے بیان کی ضرورت نہین۔ اس اختلاف طبائع کی وجہ سے کاروبار مین جسقدر دقتین اور سہولتین پیدا ہو جاتی ہین اُنسے ہر شخص واقف ہے۔ ایک طرف تو محنت کی نقل پذیری سے کاروبار مین معاشی توازن پیدا ہو جاتا ہے اور دوسری طرف عدم منتقلی سے پیدائش دولت مین سخت رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے جہان کام ہوتا ہے وہان مزدور نہین اور جہان مزدور ہین وہان کام نہین۔

طریق اُجرت ان دونون کی زندگی کا ایک تیسرا فرق یہ ہے کہ دونون کے ہان طریق اجرت مختلف ہے۔ مسئلہ اجرت مین یہ بات فرض کرلی گئی ہے کہ ہر شخص اپنی کارکردگی کے لحاظ سے پوری پوری اُجرت وصول کرلیتا ہے مگر ہندوستان کی حالت پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہان کی اجرت بہت کچھ پرانے طریقے پر رسم و رواج کے تابع چلی آرہی ہے۔ یہان ہر شخص اپنی کارکردگی کے لحاظ سے پوری پوری اجرت وصول نہین کرتا وہ اجرت مین صرف مادی چیز کو نظر نہین رکھتا بلکہ بہت سے کامون مین اُجرت کے علاوہ آخرت کا بھی خیال کرتا ہے ایسی صورت مین اگر یہان کی اجرت کا حساب کرکے یہان کارکردگی کے متعلق خیال کرلیا جائے تو یہ بالکل غلط ہوگا کیونکہ یہانکی کارکردگی کا صحیح معیار اُجرت نہین ہے۔ ہندوستان مین اسوقت بھی بڑے بڑے قابل موجود ہین جنکی قابلیت کا اندازہ اگر انکی اُجرت کے لحاظ سے کیا جائے تو وہ بالکل معمولی نظر آئینگے

رسم و رواج ہندوستان اور یورپ کے رسم و رواج مین بھی بڑا فرق ہے جو پیدائش اور صرف دولت پر اپنا مفید یا مضر اثر ڈالے بغیر نہین رہتے یورپ مین نہ نرالے رسم و رواج ہین اور نہ یہان کی سی ذات بندی جس کی وجہ سے ہر شخص اختیار پیشہ مین آزاد ہے اور اسلئے پیدائش دولت مین خاطر خواہ ترقی ہوتی ہے۔ برخلاف اسکے ہندوستان رسم و رواج اور ذات پات کی بندشون سے جکڑا ہوا ہے ذات بندی کی وجہ سے بہت سے پیشے والے دوسرا پیشہ اختیار نہین کرسکتے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض کام مین مزدور ضرورت سے زیادہ ہو جاتے ہین اور بعض مین بہت کم رہتے ہین غرض یہ دونون صورتین پیدائش دولت کیلئے نقصان دہ ہین رسم و رواج کی پابندی کی وجہ سے گو انکے پاس دولت نہ ہو مگر شادی بیاہ مین قرض لیکر خوب رنگ رلیان منائین گے خواہ اسمین تباہ ہی کیون نہ ہو جائین۔

معیار زندگی جس طرح ہندوستان اور یورپ کے طریق اُجرت مین فرق ہے اور ہم ہندوستان کی اُجرت کو دیکھ کر یہان کی کارکردگی کا صحیح اندازہ نہین لگا سکتے اسی طرح ہندوستان اور یورپ کے معیار زندگی مین بھی فرق ہے اور ہم یہان کے معیار زندگی کو دیکھکر یہان کی کارکردگی اور دولت کا صحیح اندازہ نہین کرسکتے۔ یورپ کا معیار زندگی بہ نسبت ہندوستان کے بہت اعلیٰ ہے یورپ مین ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق اپنا معیار زندگی رکھتا ہے مگر ہندوستان مین باوجود اعلیٰ کارکردگی موجود ہونے کے معیار کی بلندی کا خیال نہین اگر ہم مدراس اور میسور کی معیار زندگی پر نظر ڈالین تو معلوم ہوگا کہ یہان کا معیار زندگی کسقدر گرا ہوا ہے مدراس مین بیرسٹر اور ہائی کورٹ کے جج تک عموماً جوتا نہین پہنتے کپڑے بہت معمولی ہوتے ہین انکے مکانات بھی کچھ شاندار نہین ہوتے۔ میسور کی بھی یہی حالت ہے یہان کے بڑے بڑے لوگ معمولی زندگی بسر کرتے ہین خود وزیر ریاست نہایت سادہ مکان مین سادی وضع سے رہتے ہین۔

سرمایہ یورپ مین سرمایہ کی جسقدر بہتات ہے وہ وہانکی کاروباری ترقی اور مختلف قسم کے عظیم الشان کارخانون سے ظاہر ہے اسکے برخلاف

ہندوستان میں سرمایہ کی کمی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے جبکہ ریلوے جاری کرنے کی ضرورت ہوئی تو اسکے لئے سرمایہ کا بہت بڑا حصہ انگلستان نے فراہم کیا اب بھی ہندوستان میں جو بڑے بڑے کارخانے ہیں وہ غیر ملکی سرمایہ کے ہیں۔ آجکل بھی ہندوستان میں صنعتی ترقی کیلئے یہی روکاوٹ ہے کہ یہاں سرمایہ نہیں۔ ہندوستانی اپنی دولت کو سرمایہ بنانے کے عادی نہیں یورپ میں دولت کی زیادتی کے ساتھ ہی ساتھ وہانکے لوگ اسکو سرمایہ بنانے کے عادی ہیں اس فرق کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی اور بیچارہ ہندوستانی تباہ حالت میں پڑا ہے یہ زمانہ "زمانۂ سرمایہ" کہلاتا ہے اور بغیر اسکے ترقی محال ہے۔

تنظیم | یہ امر ہر شخص پر بخوبی روشن ہے کہ کسی چیز کی ترقی و تنزل میں تنظیم کی بھلائی اور برائی کو کسقدر دخل ہے۔ دور کیوں جائیں اگر ہم اپنے ہی رشتہ داروں اور گھروں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ جنمیں انتظامی قابلیت زیادہ ہے وہ دوسروں سے کم خرچ میں اپنی زندگی زیادہ آسائش سے گذارتے ہیں۔ یہی حال دیگر کاروبار کارخانوں اور بنکوں کا ہے بلکہ وہاں تو کاروبار کی ترقی اور تباہی کا دارومدار منتظم کی بھلائی اور برائی پر ہے۔ اگر کارخانہ کا منیجر ہوشیار ہے اور حالات بھی مساعد ہیں تو کارخانے کو چلتے پھولتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ اگر بدقسمتی سے منیجر خراب ہوا تو کارخانے کا نقصان لیکر بیٹھ رہا۔ یورپ میں تنظیمی مادہ بدرجۂ اتم موجود ہے برخلاف اسکے ہندوستان میں گویا نام کو نہیں کسقدر شرمناک امر ہے کہ جب ہندوستان میں کسی بڑے کارخانے یا بنک کے منیجر کی ضرورت ہوتی ہے تو یورپین کو بڑی بڑی تنخواہ دیکر لانا پڑتا ہے۔ اگر ہندوستان میں اس قابلیت کے آدمی مل جائیں تو زیادتی اجرت کی وجہ سے کارخانہ کا جو نقصان ہوتا ہے وہ دور ہو اور دوسرے ملک کی دولت ملک ہی میں رہے۔ یورپ میں آجروں اور بنک کے منیجروں کا کام ایک بہت اہم فن خیال کیا جاتا ہے اور وہاں اسکی باضابطہ تعلیم دیجاتی ہے۔ یورپ کے کاروبار کی ترقی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں آجر اور منیجر آسانی سے مل جاتے ہیں۔ اب ہندوستانی بھی اسکی طرف توجہ کر رہے ہیں اور اس شعبے میں بڑی پیش قدمیاں نظر آتے ہیں۔ ہندوستان میں تنظیم کی خرابی اور گرانی کی وجہ سے یہاں کے کاروبار کی حالت خراب ہے اور پیدائش دولت کی ترقی میں اس سے بہت رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔

خواہش مسابقت | ہم میں اور ان میں نہ صرف طبعی لحاظ سے بلکہ نصب العین کا بھی فرق ہے وہ مادی ترقی اور ذاتی منفعت کے دلدادہ ہیں اور ہم اسکے خلاف کاروبار اور تجارت کی ترقی کیلئے مقابلہ کی خواہش ایک ضروری چیز ہے۔ بغیر اسکے تجارت پھل پھول نہیں سکتی۔ طبائع میں مقابلہ کی خواہش نہ ہونے سے تجارتی اصولوں میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور ایک ہی شہر میں ایک ہی چیز کے مختلف بازار ہو سکتے ہیں۔ یورپ میں ایسا نہیں ہے وہاں خواہش مسابقت بہت بڑھی ہوئی ہے۔

یورپ کا قانون وراثت | ہماری اور انکی پیدائش دولت میں نہ صرف مدارج بلکہ نوعیت کا بھی فرق ہے ہمارے یہاں تفریق کم ہے اور وحدت زیادہ۔ انکے یہاں مرکزیت کا زیادہ خیال ہے تو ہمارے یہاں لامرکزیت کا۔ یورپ کا قانون وراثت بھی اسی قسم کا ہے یعنی باپ کی جائداد اور خطاب کا تنہا مالک بڑا لڑکا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کے یہاں قانون اشتراک ہے جسکی رو سے خاندانی جائداد میں خاندان کا ہر فرد حصہ دار ہے گرچہ ہر دو قوانین میں کچھ نہ کچھ فائدے ہیں مگر اب بجائے فائدے کے نقصان کا رنگ غالب ہوتا جا رہا ہے۔ یورپ کے قانون وراثت میں یہ فائدہ بتایا جاتا ہے کہ باپ کی جائداد کا ایک شخص مالک ہونے سے جائداد چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہونے نہیں پاتی اور ایک جگہ بڑی جائداد رہنے سے اسمیں آسانی سے ترقی ہو سکتی ہے اور دولت بہت جلد بڑھتی ہے۔ اگر جائداد مختلف لوگوں میں بانٹ دی جائے تو دولت

بڑے ذخیرے پیدا نہیں ہو سکتے۔ ایک طرف دولت محفوظ رہتی ہے اور دوسری طرف ایسے لوگ جو جائداد میں حصہ ملنے کی وجہ سے خود کوشش کر کے کماتے ہیں اور جائداد ملنے کی صورت میں نہیں کماتے۔ اسوجہ سے یہ دوسرے لوگ بھی گویا مزید دولت پیدا کرتے ہیں۔

قانون اشتراک | قانون اشتراک میں جہاں یہ فوائد ہیں کہ ہر کسی بلا وقت تعلیم پا سکتا ہے ضرورت کے وقت اسکی خاندانی جائداد موجود ہے جس سے اسکو کوئی محروم نہیں کر سکتا ایسے شخص جو کام کرنے سے دور ہوں اطمینان سے زندگی بسر کر سکتے ہیں انہیں کے ساتھ یہ خرابی بھی ہے کہ خاندانی جائداد موجود ہونے کی وجہ سے انمیں کاہلی پیدا ہو جاتی ہے اور محنت کم کرتے ہیں دوسرے اگر کوئی شخص اپنی محنت سے زیادہ کمائے تو وہ بھی خاندانی جائداد میں شریک ہو جاتی ہے اس وجہ سے محنتی شخص بد دل ہو جاتا ہے اور اپنی پوری کوشش سے نہیں کماتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو کچھ وہ کمائیگا اسمیں سب حصہ دار بن جائینگے تیسرے جائداد میں ہر فرد خاندان کی شرکت کی وجہ سے کوئی شخص جائداد پر خاص توجہ نہیں کرتا اور جائداد تباہ ہو جاتی ہے اگر اس میں ہر ایک کا حصہ علیحدہ کر دیا جائے تو سب انتظام ٹھیک ہو جائے کیونکہ ملکیت میں جادو کا سا اثر ہے اور لفظ "اپنا" ہر شخص کو پیارا ہے۔

اسلامی قانون وراثت | تیسری طرف مسلمانوں کا قانون وراثت ہے۔ دونوں کے بین بین نظر آتا ہے اگر اسمیں بہت بڑا فائدہ نہیں تو بڑا نقصان بھی نہیں۔ ہر شخص اپنی جائداد کا تمام و کمال مالک ہے جتنا کمائے وہ سب اسکا ہے جسطرح چاہے خرچ کرے۔ اپنی زندگی میں خواہ اپنی جائداد کو تلف کرے یا کسی دوسرے کو دیدے مگر مرتے ہی کل جائداد تمام حق داروں میں تقسیم ہو جاتی ہے اس سے فائدہ یہ ہے کہ اپنی جائداد ہونے کیوجہ سے ہر شخص پوری توجہ دہی سے کماتا ہے۔

صرف دولت | ہندوستان اور یورپ کے صرف دولت میں بھی بڑا فرق ہے۔ یورپ میں نمائش اور ظاہری وضعداری کی چیزوں فرنیچر اور آرائش کے سامان اور لباس وغیرہ میں بہت صرف کرتے ہیں مگر ہندوستان میں ایسا نہیں ہے یہاں ظاہری شان میں زیادہ خرچ نہیں ہوتا۔ اس قسم کے صرف کا اثر صنعت کی ترقی اور تنزل پر گہرا پڑتا ہے۔ یورپ میں فرنیچر۔ آرائش اور دوسری چیزوں کے شوق کی وجہ سے ان چیزوں کی صنعتوں کو جسقدر ترقی ہوئی ہے اسکے بیان کی ضرورت نہیں۔ اور ہندوستان میں اس قسم کا شوق اور ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے یہ صنعتیں مردہ ہیں۔

ابوالمنصور حمید (حیدرآباد دکن)

میر اور عشق

میری حیرت اور افسوس کی کوئی انتہا نہیں رہی جب میں نے ۲۳ء کے نگار میں فلسفۂ محبت کے زیر عنوان میر تقی میر مرحوم کے متعلق ابوالنظر طفیل حسن صاحب رضوی امروہوی کے یہ الفاظ پڑھے:-

"میر نے عشق کی کیفیت کو تین طریقہ پر سمجھانے کی کوشش کی ہے

چھاتی جلا کرے ہے سوز دروں بلا ہے　　اک آگ سی رہے ہے کیا جانیے کہ کیا ہے

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن　　سینے میں جیسے کوئی دلکو ملا کرے ہے

گو دوستی نہیں ہے پر تو یہ کیا ہے بھلا مجھکو　　جی خود بخود اے ہمدم! کاہے کو ڈھہا جاتا

گو ان تینوں شعروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کی جو دو قسمیں ہیں سرسری (سطحی) اور گہری (نظری) میر صاحب نے پہلی ہی تحقیق فرمائی ہے اور دوسری قسم کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا یا ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے چلے گئے ہیں کیونکہ یہ جذبات جنہیں میر صاحب نے بیان فرمایا ہے ان جذبات کی زبانی ترجمانی ہیں جو مختلف لوگوں یا مختلف صورتوں میں پیدا ہو کر تغیر پذیر ہو جایا کرتے ہیں اور یہ بہت ممکن ہے کہ کسی وقت میں پیدا ہوں یا نہ ہو سکتی ہے۔ یہ تغیر پذیر ہیں لہذا ہم ان کو فلسفۂ محبت کی ماہیت کا خطاب دئیے جانے کے واسطے تیار نہیں ہو سکتے (ابوالنظر صاحب کی عبارت ختم ہوئی)

یہ ارشاد اس بارہ میں ہے جو عشق اور شاعری میں فرق نہیں سمجھتا تھا ؎

مجھکو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے　　جمع کچھ درد و الم جب کئے دیوان ہوا

میر صاحب کے کمال کا اعتراف شعرائے ماضی و حال اپنے لئے باعث فخر سمجھے اور سمجھتے ہیں۔ میر صاحب کے سامنے خود غالب نے زانوئے ادب تہ کیا۔ میر صاحب کے ایک شعر کے مثل شعر کہنے کی مومن اور دیگر شعرائے نامور نے سعی کی اور عاجز آکر کہا کہ اس کا جواب لکھنا تو گویا اللہ کا جواب لکھنا ہے۔ معمار حقیقت عشق سے بے خبر۔ عجیب ثم العجب!!

ابوالنظر صاحب نے میر کے چھ دیوانوں سے صرف تین شعر انتخاب کر کے یہ رائے قائم کی ہے گویا انہی میں آپ کے خیالات عشق کا خلاصہ بیان ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ استدلال کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ شاعر اپنے محسوسات ذہنی و واردات قلبی کی الفاظ میں مصوری کرتا ہے اسے منطق و فلسفہ سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ عشق کی پیچیدگیوں کی کوئی انتہا نہیں پھر کسی شاعر سے یہ امید رکھنا کہ وہ ایک شعر میں عشق کا مکمل فلسفہ بیان کر دیگا ایک امر محال کی توقع ہے۔

ابو النظر صاحب نے جو اشعار میر کے نقل کئے ہیں اُن میں سوز و درد دل و کاہیدگی کا ذکر ہے اسکے علاوہ اُسنے عشق کے متعلق کیا کیا رموز بیان کئے ہیں اُسکے کلام کو بالاستیعاب پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے اُسپر بھی یہ شرط ہے کہ مبدء فیاض سے طبع سلیم و ذوق رسا ملا ہو ورنہ پورا لطف حاصل نہین ہو سکتا۔ آگے چلکر مین ان انمول موتیون کے خزانون سے کسی قدر بطور نمونہ پیش کرونگا۔ انہین سے اہل نظر کو اندازہ ہو جائیگا کہ میر نے عشق پر تعلق کیا لکھا ہے۔ اور کن الفاظ مین۔

ابو النظر صاحب نے غالب کے دو شعر لئے ہین

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا　　درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست　　ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

ارشاد فرماتے ہین کہ

"غالب کے نزدیک درد کا نام عشق ہے۔ غالب اس حقیقت نگاری کے ساتھ ہی ساتھ ایک دوسری بات بھی اسی شعر مین نہایت لطیف اشارے کے ساتھ بتا گیا ہے۔

سوال یہ کیا جاتا ہے کہ محبت لذت ہے یا غم؟ اکثر لوگ جواب دیتے ہین یہی کہا کرتے ہین کہ محبت لذت ہی کا نام ہے تو پھر غم ہونے کے کیا معنی؟ اور اگر بالفرض محبت کو غم تسلیم کر لیا جائے تو لذت کیسی؟ کیونکہ اجتماع نقیضین محال ہے۔ غالب اسکا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ محبت درد کا نام ہے اور درد لذت بھی ہے غم بھی۔ بالخاصہ تو لذت ہے اور بالکیفیت غم۔ اور میرے نزدیک غالب کا یہ جواب بہترین جواب ہے۔

ہان ابھی ایک سوال اور رہا جاتا ہے کہ درد بالخاصہ تو لذت ہو گیا اور ہمنے اسے تسلیم بھی کر لیا مگر یہ سمجھ مین نہین آیا کہ درد کے بالکیفیت غم ہونے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

غالب جواب دیتے ہوئے اپنے ایک دوسرے شعر مین درد کے بالکیفیت غم ہونے کو اس طرح سمجھانیکی کوشش کرتا ہے۔

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست　　ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

یعنی غم جو پیدا ہوتا ہے وہ لذت درد سے بالذات پیدا نہین ہوتا بلکہ اس لذت سے بخارات لطیفہ مین ہیجان اور آشفتگی پیدا ہوتی اور اس آشفتگی کی حدت سے بخارات اُٹھتے اور سینہ مین گشت کر کے غم کا باعث ہو جایا کرتے ہین پھر یہ غم سویدائے قلب کے داغ کو حسرتون کی تلخی سے خوب جلا دیتا ہے جیسے جلتا ہوا چراغ طاق کے سیاہ داغ (کالک) پر جب تک روشن رہتا ہے برابر سیاہی ترقی کرتی رہتی ہے اور یہی دھوان جو چراغ کی لو سے نکل رہا ہے اس سیاہ داغ کی جان ہے کیونکہ اسکا تمام نظام حیات صرف اسی پر موقوف ہے، تو لذت بمنزلہ چراغ کے ہوئی اور غم بمنزلہ چراغ کے دھوئین کے ـــ

اس سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ خود درد غم کا باعث نہین ہوا کرتا اس لئے کہ وہ بالخاصہ لذت ہے ہان اس جوش لذت سے جو گرم بخارات نکلا کرتے ہین وہی غم کا سرچشمہ ہین نہ کہ درد بالذات درد۔ لہذا اس پر اب کوئی اعتراض نہین رہتا۔

ایک دوسرا سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس مثال سے عشق کی تعریف درد کے بجائے آگ ہی معلوم ہوتی ہے جو خلاف واقعہ ہے

کا جواب دیتے ہوئے ہم عرض کریں گے کہ یہاں اعتراض میں یہ غلط فہمی ہوئی کہ لذت کو محبت سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ غالب کے نزدیک محبت درد کا نام ہے جو لذت نہیں بلکہ "دغن لذت" ہے اور روغن آگ نہیں ہوا کرتا لہذا محبت آگ ہو ہی نہیں سکتی (ابوالنظر صاحب کی عبارت ختم ہوئی)۔

ناظرین ابوالنظر صاحب کے ان جملوں کو پڑھیں اور انصاف کریں کہ آیا اُنہوں نے خود اپنے ہی دعوے کی تردید کی ہے یا نہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ محبت درد کا نام ہے اور درد ولذت بھی ہے اور غم بھی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ محبت لذت بھی ہے اور غم بھی اور اسکے بعد فرماتے ہیں کہ محبت درد کا نام ہے جو لذت نہیں بلکہ "روغن لذت" ہے۔ لیکن "روغن لذت" تو لذت کا جوہر ہے اور بالفرض یہ کسی ترکیب سے تیار بھی ہو گیا تو اس سے "لذت" جوہر کیونکر علیحدہ ہو گیا۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا جسے اصل مطلب سے بہت کم تعلق ہے۔ ابوالنظر صاحب کے نزدیک غالب نے عشق کو درد سے تعبیر کر کے آسمان کے تارے توڑ لیا۔ حالانکہ معمولی سے معمولی شاعر کا کلام پڑھیے تو آپ کو متعدد اشعار نظر آئیں گے جن میں عشق کو درد کہا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے خود غالب کا جو شعر ابوالنظر صاحب نے انتخاب کیا اور جس کی بنا پر اُسے عشق کا نبض شناس قرار دیا اُنکے دعوے کی تردید کرتا ہے۔ غالب نے اپنے شعر میں عشق اور زیست دونوں کو درد کا مرادف ٹھہرایا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ زندگی کو محض درد اور عشق کو درد بے دوا کہا ہے

ع درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

ابوالنظر صاحب نے اس امر کو بالکل نظر انداز کیا اور لفظ بے دوا کی اہمیت کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ موجودہ صورت میں یہ نتیجہ لینا کا نتیجہ ہے کہ سبب زندگی اور عشق دونوں درد ہیں تو غالب کا "بہترین جواب" کس شمار میں رہا۔

بات یہ ہے کہ ابوالنظر صاحب نے غالب کے اشعار کے متعلق جو کچھ فرمایا حسن عقیدت کی بنا پر ہے۔ اُنکے اشعار کا مطلب کچھ اور ہی ہے۔ انہوں نے لفظ درد کو بمعنی مرض استعمال کیا ہے۔ زندگی ایک آزار ہے جس میں طرح طرح کے مصائب و افکار و آلام پیش آتے ہیں۔ زیست میں اگر دلکشی پیدا ہوتی ہے تو عشق سے۔ لہذا عشق درد زندگی کی دوا ہوا مگر خود عشق ایک مرض ہے اور وہ بھی مرض لا دوا۔

میر کے یہاں بلا مبالغہ سیکڑوں شعر ملینگے جن میں عشق کو مرض یا درد لکھا یا کیا گیا ہے۔ جس غزل سے ابوالنظر صاحب نے میر کا یہ شعر لیا ہے ؎

چھاتی جلا کرے ہے سوز درون بلا ہے اک آگ سی رہے ہے کیا جانئے کہ کیا ہے

اسی میں یہ بھی ہے ؎

ہو جائے یاس جس میں وہ عاشقی ہے ورنہ ہر رنج کی دوا ہے ہر درد کو شفا ہے

غالب کے "بہترین جواب" کا مقابلہ میر کے اس بے مثل مطلع سے کیجئے ؎

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزہ جانا

جس عشق کو درد لا دوا قرار دیکر غالب شاکی ہیں اور صرف اسوجہ سے غنیمت سمجھتے ہیں کہ درد زیست کی دوا ہے اُسی عشق میں میر کو وہ لذت ملتی ہے کہ خضر و مسیحا کی طویل اور بے مزہ مدت حیات سادہ نظر آتی ہے یا یوں کہئے کہ غالب کے یہاں بیماری ہے اور چونکہ جینے میں عشق کے سبب لذت

نہ احتی گوارا ہے میر کے نزدیک عشق کا کمال جانوں کا کھپا دینا ہے اور اس قربانی میں وہ لذت ہے جسکے مقابل خضر و مسیحا کی زندگی بھی بے مزہ ہے۔

دونوں مطلعوں کو پڑھیئے اور ایک منطقی اور ایک سچے شاعر یا عاشق کے انداز بیان میں جو فرق ہے اسپر غور کیجئے۔ غالب کا شعر دماغ کو اپیل کرتا ہے اور میر کا شعر دل سے نکلکر تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جاتا ہے۔ بندش ایسی ہے کہ لفظ لفظ سے روحانی انبساط ظاہر ہوتا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ غالب بڑے پایہ کا شاعر تھا مگر میرا دعوا ہے کہ میر کے مقابل کچھ نہیں، جہاں اسی مضمون کو نظم کیا ہے جو میر کہہ چکا ہے اسکی گرد کو نہیں پہونچا اس سے غالب کی منقصت منظور نہیں (اگرچہ ناگزیر ہے) بلکہ اصل مقصود میر کی عظمت کا اظہار ہے کہ غالب سا جید شاعر اور مسلم الثبوت استاد بھی اسکے سامنے بے وقعت ہے۔ فی الحال صرف دو ایسے شعر درج کرتا ہوں اگر کسی صاحب نے اختلاف کیا تو اور متعدد مثالیں مع تنقید پیش کی جائینگی۔

غالب ؎ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

میر ؎ بیخودی لے گئی کہاں ہمکو　　دیر سے انتظار ہے اپنا

دونوں نے بیخودی عشق کی کیفیت دکھائی ہے مگر میر نے کس خوبی سے مطلب ادا کیا اور غالب بھٹکتے رہ گئے نہ زبان درست نہ بیان صاف۔ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم وہاں ہیں جہاں خود ہمیں اپنی خبر نہیں ہوتی اور کہتے ہیں کہ ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

یہ کیفیت کیا ہے اور کسوجہ سے طاری ہوئی۔ یہ آپ دو کیونکر ہوگئے۔ آپ ہیں کہاں؟ یہ سب باتیں انکے پیٹ میں ہیں۔ میر کا شعر ڈھلا ہوا اور مکمل ہے جسمیں استفہام نے عجب لطف پیدا کیا ہے۔ لفظ بیخودی جو اس مضمون کی جان ہے نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے "ہم وہاں ہیں" نہیں بلکہ "بیخودی لے گئی کہاں ہمکو" اب اپنی ذات سے جدائی اور اپنا انتظار ثابت ہوگیا۔

غالب ؎ نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

میر ؎ مرا یا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہمکو　　وگرنہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے

غالب کے یہاں پھر وہی منطقی دلیل ہے وہ بھی اصولاً غلط۔ جس سے ایک نتیجہ یہی مستنبط ہوتا ہے کہ معاذ اللہ کچھ ہے تو خدا نہیں ہے نفی سے اثبات کا استدلال ہمیشہ ناقابل اطمینان ہوتا ہے۔ علاوہ بریں شاعری کو استدلال سے بیر ہے جہاں منطقی زنجیرہ بندی ہوئی شعریت اڑ ذائل ہوا۔ کہنا وہی چاہتے ہیں جو میر کہہ چکا ہے مگر نہایت بھدے طریقہ سے اسپر یہ کہنے کی ہمت نہیں کہ میں نہ ہوتا تو خدا ہوتا سو دوسرے یہ کہنا کہ مجھے ہونے نے ڈبویا حقیقتاً غلط اور خدا کی مشیت پر حملہ ہے۔ میر جواب دیتا ہے کہ ہمیں ہمارے ہونے نے نہیں ڈبویا بلکہ اس احساس و ادعائے خودی نے کہ ہماری ہستی ہستی مطلق سے علیحدہ ہے۔ آرزو دلیل محتاجی و دوری ہے اس سے چھٹکارا ہو تو جز و کل میں قطرہ دریا میں شامل ہو جائے یعنی ہم خودی کو دل سے نکال دیں تو ہم خدا ہی خدا ہے۔ اور جہاں خدا ہے وہاں ماسوا کہاں۔

غالب کا شعر اسقدر ناقص ہے کہ اُس پر مختلف پہلوؤں سے اعتراض ہو سکتے ہیں۔ میرا وجود میرے خدا ہونے کے کا منافی ہے لہذا یہ مفہوم بیکار رکھ دیا مجھکو ہونے نے کیونکہ میرا بننا چہرہ جس میں مستقل ہو جائیگا۔ یہ نا ہونا فنا ہوتی۔ اور جب خدا یا وصل خدا حاصل نہیں ہو سکتا جب تک انسان زندگی میں اپنے آپ کو نہ مٹادے یہ گوشہ میر کے شعر میں موجود اور غالب کے یہاں مفقود ہے۔

اور ایک پہلو پر غور کیجئے کہ ایک وقت ایسا تھا کہ میں نہیں تھا کیونکہ کہہ چکے ہیں کہ نہ تھا کچھ تو خدا تھا لہذا میں اسوقت خدا تھا پھر خدا وجود میں آکر بندہ کیوں ہو گیا۔ خدا سے جدا کیوں ہو گیا؟ غالب کے یہاں اسکا بھی جواب غائب ہے۔ میر کے یہاں اسکا حل بھی موجود ہے۔ تمام آرزو میں اور آرزو میں کمی و نقص کا خیال مضمر ہے۔

میر نے اپنے ایک دوسرے شعر میں اس آرزو کا فلسفہ بھی بیان کیا ہے ؎

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر　　میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں

میں اس خیال اُس شوق کا پرتو ہوں جسنے شاہد حقیقی کو اپنے ہی جلووں کے مشاہدہ پر آمادہ کیا۔ میری تمام آرزوؤں اور خواہشوں کا منشا اولیں اپنے آپ کو اور اس ذریعہ سے خدا کو پہچاننا ہے اور جہاں یہ جوہر معرفت حاصل ہوا پھر انسان انسان نہیں رہ سکتا۔ اپنی اصل میں جذب ہو جائیگا۔

یہاں تک تو تخیل سے بحث تھی اب انداز بیان کو ملاحظہ کیجئے وہی منطقی اور فطری شاعر کا فرق نظر آئیگا۔ ایک کائنات ابتدائی دوسرا جذب کی حالت میں رموز فطرت کا انکشاف کرتا ہے۔ ایک مضمون کی عظمت سے خائف ہو کر کچھ کہنا چاہتا بھی ہے تو ڈرتے ڈرتے مبہم الفاظ میں تہ بندی کی چندی نکالتا ہے مگر جس نقطہ (آرزو) پر معنی کا مدار ہے نہیں سوجھتا۔ دوسرا دو ٹوک بات کہتا ہے اور ایسے پرتاثیر الفاظ میں جس سے ندرت اسکا تیقن ظاہر ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ ایک کا شعر کاغذ کے مصنوعی پھولوں کا اور دوسرے کا مہکتے ہوئے گلہائے سدا بہار کا گلدستہ ہے۔

اب دو شعروں پر اکتفا نہیں بلکہ اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست　　ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

ابو النظر صاحب نے اس شعر کے جو معنی بیان فرمائے اسقدر عجیب و غریب ہیں کہ اگر غالب زندہ ہوتے تو وہ بھی یقیناً شک میں ... دل کیا ہوا کاجل پارنے کی مشین یا کاجل کی کوٹھری ہوا جس میں چراغ روشن ہے اور سویدائے دل کی سیاہی کو ترقی دے رہا ہے ... صورت میں نقش سویدا جب صوفیائے کرام دیدار خدا کا ذریعہ سمجھتے ہیں کاجل کی تھیلی یا بوری ہو گیا! یہ اُس نقش سویدا کی گت ہے جسکے متعلق ذوق کہتا ہے ؎

دیکھ اگر دیکھنا ہے ذوق کو وہ پردہ نشین　　دیدۂ روزن دل سے ہے دکھائی دیتا

ابو النظر صاحب نے شعر کا مطلب سمجھنے میں غلطی کی اور ظاہر ہے کہ جو نتیجہ نکالا وہ ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔ میں جو معنی سمجھا ہوں عرض کرتا ہوں۔

شعر میں غالب نے نقش سویدا کی حقیقت بیان کرنا چاہی ہے۔

بد و خلقت سے دل عشق کا مرکز قرار پایا۔ اضطراب و التہاب و آشفتگی رونما ہوئی یہ حالت روز بروز ترقی کرتی گئی۔ ابتدائے عاشق نے ضبط سے کام لیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ضبط دشوار ہو گیا، در حالت اضطرار میں شعلہ آہ یا دود آہ بلند ہوا جس میں غضب کی گرمی تھی اُسنے دل میں داغ ڈال دیا اور یہی داغ نقش سویدا ہے۔

شعر سے عشق کے متعلق اتنی باتیں معلوم ہوئیں :-

۱۔ عشق طبیعت انسان میں داخل ہے ۲۔ اسکا خاصہ آشفتگی ہے ۳۔ اسکا معراج کمال معرفت ذات باری عز اسمہ ہے

اس مطلب کو بھی میر نے عجب دلکش اور نادر انداز میں بیان کیا ہے ؎

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا　　اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

اسی کے ساتھ غالب کا مطلع جو اسی زمین میں ہے لکھے دیتا ہوں مقابلہ اور انصاف کیجئے ؎

ذرہ کی میں مرگیا جو نہ باب نبرد تھا —　　عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا —

غالب کے مطلع میں "نہ باب نبرد" کا تنافر اور دوسرے مصرع میں اسی نبرد کی تکرار فصاحت کا گلا گھونٹ رہی ہیں۔

اب میر کے کلام سے کچھ ایسے اشعار نقل کرتا ہوں جن سے واضح ہو گا کہ اُنہوں نے عشق کے متعلق کیا کیا کہا ہے۔ یہ اشعار مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق ہیں تاہم انکی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ اہل ذوق تسلیم کرینگے کہ میرا قول مبالغہ سے پاک ہے افسوس اتنی فرصت نہیں کہ ان اشعار کی خوبیاں وضاحت سے بیان کی جائیں اور انکا موازنہ دوسرے شعرا کے کلام سے ہو یا یہ دکھایا جائے کہ فلسفہ تصوف والہیات نفسیات ما بعد الطبیعیات وغیرہ کے کیسے کیسے مسائل اور پھر کیسے کیسے انوکھے اور دلکش اسلوب سے حل کئے گئے ہیں۔ بعض اشارہ ہو گا۔

ابتدا میں ایک خاکہ اُن اصول کا قائم کئے دیتا ہوں جن پر عشقیہ شاعری کی عظیم الشان بنیاد ہے۔

جو کچھ ہے وہ عشق ہے۔ عشق خدا ہے اور خدا عشق ہے

عشق نور ظہور ہے۔ خدائے ذوالجلال کے اُس خیال کا پرتو ہے جو آفرینش عالم کا موجب ہوا۔

عشق ہی سے مقصد حیات کو دریافت کرنے اور اُسکی تکمیل کی

اسکے واسطے قربانیاں درکار ہیں

پہلی قربانی ترک خواہشات ولذات

آخری قربانی اپنی ہستی کو ہستی مطلق میں فنا کر دینا شعور ماذمن و امتیاز من و تو کو مٹا دینا اور خود مٹ جانا

ان میں بھی متعدد درمیانی مرحلے ہیں اور ہر ایک کیفیات وخیالات گوناگون سے لبریز ہے جسکی تفصیل میں طوالت ہے اور شاید ممکن بھی نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا جو فعل یا عمل یا ارادہ اُسے منزل عشق سے قریب کرتا ہے جزو عشق ہے اگر اس منزل سے دور کرتا ہے تو عشق نہیں بلکہ بوالہوسی و خود غرضی یا اور کچھ ہے۔

عشق ایک شدید مرض ہے

کیا کہوں تم سے میں کہ کیا ہے عشق • جان کا روگ ہے بلا ہے عشق

عشق تمام عالم پر چھایا ہوا ہے

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو • سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

عشق سے جا نہیں کوئی خالی   دل سے لے عرش تک بھرا ہے عشق

جو کچھ ہے وہ عشق ہے

عشق معشوق عشق عاشق ہے   یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

عشق خدا ہے اور خدا عشق ہے

کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق   حق شناسوں کا ہاں خدا ہے عشق

عشق پیام مرگ ہے یعنی دردلا دوا ہے مگر موت کو حسین بنا دیتا ہے

دل لگا ہو تو جی جہاں سے اٹھا   موت کا نام پیار کا ہے عشق

خود عشق مرض عشق کی دوا ہے

درد مند کو نہیں کچھ دخل   عشق کے درد کی دوا ہے عشق

عشق مدعا و کلید مدعا ہے

کون مقصد کو عشق بن پہونچا ——   آرزو عشق و مدعا ہے عشق ——

عشق سے انسان اپنے آپ کو پہچانتا ہے اور جس نے اپنے آپ کو پہچانا اُسنے خدا کو پہچانا۔

پہونچا جو آپکو تو میں پہونچا خدا کے تئیں   معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

عشق ایک تجلی ہے اور ظاہری جلووں سے بے نیاز کر دیتا ہے

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم   یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا

عشق میں سرور و مستی ہے

بیہوش ہے عشق ہوں کیا میر اعتبار   آیا جو بخود صبح تو پھر شام نہ آیا

عشق میں دل بر جا نہیں رہتا

کہاں بھی پریشانی خاطر سے قریں تھا   آنکھیں تو کہیں تھیں دل غمدیدہ کہیں تھا

جنبش نا وقت ہر ہستا ہوا دریا ٹہرا   صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

ظاہری علامات عشق

قامت خمیدہ رنگ شکستہ بدن نزار　　تیرا تو میر غم مین عجب حال ہوگیا

عشق خواہشات نفسانی کا دشمن ہے

دل جسم پونچا بدن مین تپ کے سا تن جلا　　آپڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا

عشق کبھی کم نہین ہوتا بلکہ ہمیشہ ترقی کیا جاتا ہے یہانتک کہ انسان کی حیات پر ساری وطاری ہو جاتا ہے الفنا فی العشق

بدر سان اب آخر آخر چھا گئی مجھ پر یہ آگ　　ورنہ پہلے تھا اجون ماہ نو دامن جلا

انسان عشق کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے گو یا عام رہتا ہے

اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار　　یاد ایام جب تحمل تھا

عشق ہی اس سے بھی غرض نہین ہوتی کہ معشوق مہربان ہو

وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ادھر کو رہا　　ہم سے ہی حال تباہ اپنا دکھایا گیا

عشق اور تسلیم و رضا

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا　　سر بھی تسلیم محبت مین ہلایا نہ گیا

عشق مذہب سے بیگانہ ہے

سر نشین روشنانہ ہون ہیچ جانون　　رسم مسجد کے تئین شیخ نہ آیا نہ گیا

اضطراب عشق و تجاذب

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب　　شمع تک ہمنے تو دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

رات بھر شمع سر کو دھنتی رہی　　کیا پتنگے نے التماس کیا

عشق مین استغنا ہے

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا　　آن بیٹھے جو تمنے پیار کیا

کیا مرے آنے پہ تو او بت مغرور گیا　　کبھی اس راہ سے نکلا تو تجھے گھور گیا

عشق صادق مین وصل و ہجر دونون یکسان ہین

وصل و ہجران یہ جو دو منزل ہین راہ عشق کی　　دل غریب انمین خدا جانے کہان مارا گیا

آداب عشق

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت مین بھی کم ہوئی ہے　　کوسون اسکی اور گئے پہ سجدہ ہر ہر گام کیا
(درت)
دور بیٹھا غبار میر اس سے　　عشق بن یہ ادب نہین آتا

عشق مین سخت ترین مصائب کا سامنا ایک عام بات ہے

ہم طور عشق مت پوچھو کہ ناحق — ابروں کی کمان کھینچی ابروں کو دار کھینچا

عشق سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے گداز دل حاصل ہوتا ہے

شاید کسو کے دل کو لگی اس گلی میں چوٹ — میری بغل میں شیشۂ دل چور ہو گیا

صدائے آہ جیسے تیر جی کے پار گزرے ہے — کسو بیدرد نے کھینچا کسو کے دل سے پیکان کو

عشق میں رشک بھی ہے

داغ ہوں رشک محبت سے کہ اتنا بیتاب — کس کی تسکین کے لیے گھر سے تو باہر نکلا

عشق کی ناکامیاں بھی باعث کامرانی ہیں سلیقہ شرط ہے

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں — تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ہمت عشق

ناکامی صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ — اب جی سے گزر جانا کچھ کام نہیں رکھتا

عشق کو خوشی سے نفرت ہے

شہر دل ایک مدت اجڑا بسا غموں میں — آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا

عشق انسان کو لاابالی بنا دیتا ہے اور دیوانگی عشق معمولی دیوانوں کی شوریدگی نہیں ہے

شہرۂ عالم اسے یمن محبت نے کیا — ورنہ مجنوں ایک خاک افتادۂ ویرانہ تھا

عشق غیر اختیاری ہے

کچھ میں نہیں ہوں دل کی پریشانی کا باعث — برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالہ

عشق تمام مذاہب سے بالا ہے

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا — ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا

عشق حقیقی

جس صیدگاہ عشق میں یاروں کا جی گیا — مرگ اس شکارگہ کا شکار رمیدہ تھا

عشق و ہوس میں امتیاز

بلبل نے پوچھا گلشن مشہد کا بوالہوس — یاں پھول ہر کسی درخت کا حلق بریدہ تھا

غلط ہے عشق میں اے بوالہوس اندیشہ راحت کا — رواج اس ملک میں ہے درد و داغ و رنج و کلفت کا

ضبط عشق

قائل ہیں ہم تو میر کے بھی ضبط عشق کے — دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

عشق بالذات ایک لذت ہے لہٰذا اسکی ہر ادا لذت ہے

نگنے کیلئے دل کے چھڑکا تھا نمک جئے | سو چھاتی کے زخموں نے کل دی مزا کیا

عشق نام ہے خاک ہو جانے کا

آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشان | مشتِ غبار لیکے صبا نے اڑا دیا

عشق تمام مخالفت پر غالب آتا ہے

قدرت تو دیکھ عشق کی مجھ سے ضعیف کو | رکھتا ہے شاد بے خور و بے خواب روز و شب

عشق مہر و کینہ سے بالا ہے

خدا جانے کہ کیا خواہش ہے جس کو | نظر اپنی میں ہے مہر و کین پر

حقیقت عشق کے اظہار کو الفاظ ناکافی ہیں

سیکڑوں حرف ہیں گرہ دل میں | پر کہاں پائے لب اظہار

عشق جلوۂ حقیقت ہے

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر | میں ورنہ وہی خلوتی رازِ نہاں ہوں
کب سے نظر لگی تھی دروازۂ حرم سے | پردہ اٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم سے

عشق جہادِ نفس ہے

آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں | تسپہ ہم جی کو مار رکھتے ہیں

عشق میں جان دینا مشکل نہیں بلکہ یہیں سے عشق کا حقیقی معنوں میں آغاز ہوتا ہے

گزر جان سے اور ڈر کچھ نہیں | رہِ عشق میں پھر خطر کچھ نہیں
قدم دشتِ محبت میں نہ رکھ میر | کہ سر جاتا ہے گام اولین پر

عشق میں جفا کا شکر بھی پوری طرح ادا کرنا دشوار ہے

شکر اُسکی جفا کا ہو نہ سکا | دل سے اپنے ہمیں گلہ ہے یہ
بس گنہ کا ہو بس از مرگ یہ عذرِ جانسوز | پاؤں پر شمع کے پاتے ہیں سر پروانہ

عشق میں وصل (قرب) و ہجر (بعد) یکساں ہے

عشق میں وصل و جدائی سے نہیں کچھ گفتگو | قرب و بعد اس جا برابر ہے محبت چاہیئے

عشق ودیعۂ معرفت ہے

شکر کر داغ دل کا اے غافل | کسکو دیتے ہیں دیدۂ بیدار

نہیں وسواس جی گنوانے کے | ہائے رے ذوق دل لگانے کے

بیخودی عشق

دکھائی دے یوں کہ بیخود کیا | ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

عشق کی سرمستی

دل پر خون کی اک گلابی سے | عمر بھر ہم رہے شرابی سے
کچھ نہ پوچھو بہکے رہتے ہیں ہم | عشق کی مے سے چھلکتے ہیں ہم

عشق میں نفع و ضرر پر نظر نہیں رہتی

یہی طرفہ ماجرا ہے کہ اسی کو چاہتا ہوں | مجھے چاہیے ہے جس سے بہت احتراز کرنا

اگر عشق نہیں تو زندگی بے مزہ ہے

نہیں رہتے عاشق کا سینہ بغیر | کہیں تیر کو دل دوانے لگا

عشق ایک امانت ہے جسکا اہل انسان کے سوا کوئی نہیں

جن و ملک زمین و فلک سب نکل گئے | بار گران عشق و دل ناتوان جناب

عشق اور شے ہے ہوس اور

کچھ ہو رہیگا عشق و ہوس میں بھی امتیاز | آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

عشق حقیقی و مجازی

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا | ہے عشق سے بتوں کا مدعا کچھ اور

غم عشق غیر متناہی ہے

کیا عشق کا جہد خلقت سے ہے | غم دل کی کچھ انتہا ہی نہیں

عشق میں ضبط دشوار ہے

ہر چند میں نے شوق کو پنہاں کیا ولے | اک آدھ حرف پیار کا منھ سے نکل گیا
عالم عالم عشق و جنون ہے دنیا دنیا تہمت ہے | دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

عشق کے کرشمے

چاہا جس نے کیا کیا تھا اپنا چاہا کچھ نہ ہوا | عزت کھوئی ذلت کھینچی عشق نے خوار و زار کیا

ناکامی عشق

گل تر روز کا نہیں ممنون | ہم اسیروں کا طرۂ دستار

افسوس ہے ذرا نہ اک عمر تک رہو　　پھر مر گئے ترے تئیں اک بار دیکھکر
یا آپ آسمان سے کوچہ یار کے　　آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھکر

ہائے عشق.

بزم میں منہ اودھر کریں کیونکر　　اونچی نظر کریں کیونکر
یوں بھی مشکل ہے وون بھی مشکل ہے　　سر جھکائے گزر کریں کیونکر
کسی کی شب وصل سوتے کٹے ہے　　کسی کی شب ہجر روتے کٹے ہے

جی نہیں چاہتا اگر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں عشق کا جذبہ ایسا کہ اور اسکا مفہوم اتنا وسیع اور پر تنوع ہے کہ اسکی جامع تعریف ناممکن ہے شاعر ان کیفیات کو دکھاتا ہے جو عشق سے مرتسم ہوتی ہیں۔ انکی رنگینی و دلکشی کی انتہا نہیں۔

آخر میں ایک شعر میر کا جو ہو بہو صاحب کے حسب حال ہے لکھکر رخصت ہوتا ہوں۔

خوں ہوا اک رقم شوق سے نپکے تھا دلے
وو نہ سمجھا کہ مرے نامہ کا مضمون کیا ہو

اختر لکھنوی

غزل

درفراقش کہ ندارم سر و سوداے بہار　　دیدگان را چہ دہد کیفِ تماشاے بہار
موسم گرمی از رنگین شود ست　　از تو بگذشتہ ندارم سر و سوداے بہار
چہ شگفتست اگر دامن صبرم بدرد　　کہ دوران کردہ ام از حسن تو گلہاے بہار
از گل تازہ کہ یادم دہد از روے کسے　　آتش انداختہ در سینہ تماشاے بہار
بین کہ از دست خزانم چہ رسد آخر کار　　دل خون گشتہ کہ دارم ز تقاضاے بہار
آہ آن دل کہ ندارد ز خزان بہرہ غم　　داغ آن دیدہ کہ سازد بتماشاے بہار
نتواند کہ ز کوے تو نہد گام بروں　　چون بیابد ہمہ افسردہ شود پاے بہار
آنچنان ہجر تو آتش بدل اندر زدہ است　　کہ بسوزد بنظر ذوقِ تماشاے بہار
بسکہ یادے بدل از رنگ سبیمش دارم　　بنظر تیرہ نماید رخ لیلاے بہار
آخر آلان نباشد ز وفایش بزند　　بہرہ یا میبرد از خون دلم واے بہار
گل کہ با صورت رنگین تو مانا نبود　　دل ناکام چہ سازد بتماشاے بہار
ہادیا خیز و بزن جام کہ ہنگام خوش است　　لذتے کن بدل از نشہ صہباے بہار

ہادی مچھلی شہری

فلسفۂ مسرت

شمالی ہندوستان کے اندر گزشتہ دو تین سال میں جو عجیب و غریب قصے مشہور ہوئے ہیں اُنہیں سے ایک کی بابت تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں افرخ نگر کے ایک بڑے مقدس مولوی صاحب کی زبانی مشہور ہوا

فرخ نگر کی بڑی سڑک پر جو محلہ کاکا خیل سے شرقی دروازہ کو جاتی ہے مولانا موصوف کی نذر عقیدت ایک سن رسیدہ آدمی سے ہوئی جو کچھ عرصہ تک صاحب فراش رہنے کے بعد اب چل پھر لیتا تھا۔ مولانا: "اخاہ! انہیں آج تندرست دیکھ کر کس قدر خوشی ہوئی ہے۔ کہو بھئی بالکل اچھے ہو"؟

شخص: "خدا کا شکر ہے مولانا اب میں بالکل چنگا ہوں۔"

مولانا: "بھوک تو خوب لگتی ہے"؟

شخص: "بھوک! اتنی عمر ہونے کو آئی کبھی آج تک میری اس قدر بھوک نہیں چمکی۔"

مولانا: "نیند تو خوب آتی ہے"؟

شخص: "جی ہاں اپنی عمر میں کبھی اس قدر آرام سے نہیں سویا۔ مولانا آپ کے لطف و کرم سے اب میں بالکل بھلا چنگا ہوں۔ البتہ میرا دل ٹوٹ گیا ہے مگر میں اسکی پروا نہیں کرتا۔"

اس قصے کو سنکر بڑے بڑے رقیق القلب لوگ بھی ہنستے ہیں غضب یہ ہے کہ اس ضعیف العمر شخص کے دوست احباب اور اُن مصائب کا علم رکھنے والے بھی باوجود اس کے رقت قلب ہنسنے سے باز نہیں رہتے۔ اُن کے خوش ہونے کے اسباب سے میں بھی واقف ہوں۔ وہ خوش ضرور ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی رقیق القلب بھی انتہا کے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا وجہ ہے کہ نیک دل اشخاص بھی بعض اوقات دوسروں کی مصیبت پر غمخواری کرنے کے بجائے خوش ہوتے ہیں؟ اور چونکہ نیک دل کسی ایسے واقعہ پر جو مصیبت سے تعبیر کیا جائے خوش نہیں ہو سکتے اس لئے اس سوال کی شکل یوں بدل جائیگی کہ ہم کب مصیبت کو مصیبت خیال نہیں کرتے؟ اسکے جواب کیلئے جگہ "خرابات" ہے جہاں "پیر خرابات" کی صدارت میں بڑے بڑے رندوں کا عقلا کا مجمع ہوتا ہے۔ اگر ناظرین فرخ نگر کے خرابات کی سیر سے لطف اندوز ہوں تو پتہ چلے کہ یہ رندان قدح خوار کیسے کیسے عقل آفرین اور حیرت افروز نکات بیان کرتے ہیں اور کیسے کیسے مشکل مسئلے سیدھی سیدھی باتوں میں حل کر دیتے ہیں۔ آخر کار اس سوال کے جواب کیلئے ہم نے خرابات کا رستہ لیا۔ اب سنئے:—

ایک مقبول وقت:— "حاجی تلو بھائی کو خدا رکھے دیکھو غریب نے برف بنانے کی مشین لگائی تھی اور ایک کوڑی کفن تک کو نہیں رکھی سب کا سب اسی میں لگا دیا اُسمیں آگ لگ گئی اور ایسی جلی کہ نشان تک نہیں ملا اب سوائے ایک گاڑی کے اُنکے پاس کچھ بھی نہیں اور وہ بھی کمقول۔ ستر برس کا اندوختہ عمر کی کمائی اُسمیں جھونک دی، جیسا ننگا دنیا میں آیا تھا ویسا ہی رہ گیا۔ اُسکی بیوی کی حالت زیادہ خراب ہے اور لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ہر وقت سر گھٹنوں میں دیے ہائے ہائے کرتی رہتی ہے اور تین دن سے اگر ایک کھیل بھی منہ میں اُڑ گئی ہو تو چاہے جیسی قسم لے لو۔ اُنکا خیال ہے کہ اُنکے اور اُنکے خاندان کیلئے مشین بڑھاپے کا سہارا تھی۔ اب بجز مر رہنے کے اور چارہ کار کیا ہے"۔

دوسرا مست الست:— "حاجی تلو بھائی کا بھی بہت افسوس ہے خیال تو کرو۔ سارے کنبے کے ایک ہی نوکر تھے اور نوکری گر جائے اور تمام اثاثے لوٹ جائیں سوائے افسوس کے اور کیا ہو سکتا ہے"۔

پہلا:— "حاجی تلو بھائی کا افسوس! کیا واقعی! جو کچھ ہوا اُسکا تو مجھے اتنا بھی افسوس نہیں جیسی اُلو پر مفیدی۔ اُسکی باتیں سنو تو حیران رہ جاؤ! سنا ہے پھر مشین لگا ذرنگا اور معلوم کیا کیا خیالات پکاتا ہے جیسا کوئی

گذشتہ میں طوفان باد و باران نے آگھیرا۔ بجلی کی چمک۔ رعد کی کڑک غرضکہ ایک قیامت صغریٰ برپا تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام فرخ نگر پر ایسی تباہی آئے گی کہ اینٹ سے اینٹ بج جائیگی۔ میں ... کی تابڑ توڑ بارش ہو رہی تھی کہ الامان۔ ایکدم بجلی کا زور سے کڑکا ہوا میں مارے ڈر کے لاحول کہتا ہوا خرابات میں داخل ہو گیا۔

پیر خرابات:۔ ”اسقدر کیوں ڈرتے ہو۔ ابھی تک تو تم مرے نہیں اچھے خاصے تندرست کھڑے ہو پھر یہ موت کا خطرہ کیسا؟“

میں:۔ ”دیکھتے نہیں ہو کس زور کی بجلی کوندی ہے۔ میں مرتے مرتے بچ گیا۔“

پیر خرابات:۔ ”مگر بجلی تمہارے اوپر تو نہیں گری۔“

میں:۔ ”گری تو نہیں مگر میں نے خیال“ ....

پیر خرابات:۔ ”(جلدی سے میری بات کاٹ کر) تم نے خیال کر لیا ... تم نے خیال کیا! یہ وقت تمہیں یہ معلوم تھا کہ تم مرے نہیں۔ اچھا تو پھر ناحق شور و شغب کیا فائدہ۔ جب کسی کو بجلی کی کڑک سے خوف کھاتے دیکھتا ہوں مجھے بہت ہی غصہ آتا ہے۔ ارے بھئی اگر تم پر بجلی گری تو بس تمہارا خاتمہ۔ اگر نہیں گری تو زندہ رہوگے۔ اور جب زندہ رہوگے تو ڈر کی وجہ سے ہائے دہائی مچانا فضول ہے۔“

میں:۔ ”لیکن بجلی اسقدر قریب کوندی معلوم ہوئی کہ مجھے یہ خیال ہوا کہ میں اسکی زد سے بچ گیا اور میں اس دھکے سے اچھی طرح نہ سنبھل سکا۔“

پیر خرابات:۔ ”بالکل درست۔ ابھی تمہاری ایسی حالت ہو گئی تھی۔ اب تک قوت تمیز باقی ہے تمکو یہ معلوم ہے کہ بجلی سے کوئی ضرر نہیں پہنچا لیکن اگر بجلی نے ضرر پہنچایا تو قوت تمیز جاتی رہی کسقدر مدلل بات ہے اور جب تمہارے اوپر بجلی گر گئی تو تمکو پریشان ہونے اور ڈرنے کیلئے وقت بھی نہیں ملیگا اور جب پریشان ہونے اور ڈرنے کا وقت ملا ہے تو سمجھو بجلی نہیں گری۔ اور جب بجلی نہیں گری تو پریشانی اور خوف فضول۔ یہ بات ہے کہ نہیں۔“

صرف میں ہی اسکا مخاطب نہیں تھا بلکہ تین چار رندان بادہ خوار بھی جو وہاں جمع تھے اسکے مخاطب تھے اور اسکی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے آپنے اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھا ”جانتے ہو کہ میں اپنی پہلی بیوی سے اس بجلی کی بابت کیا کہا کرتا تھا۔ وہ بجلی سے بہت ڈرتی تھی اور جب تک بجلی چمکتی رہتی اور بادل گرجتے رہتے تو وہ ایک ٹوکرا سامنے رکھے اور بھورے رنگ کی پوشاک اوڑھے ایک کونے میں بیٹھی کانپتی رہتی تھی۔ میں اس سے کہا کرتا تھا بجلی ایسی چیز نہیں ہے کہ اگر گرے تو ایک منٹ کی بھی فرصت پریشان ہونے اور ڈرنے کیلئے دیگی۔ ... وہی کہتا ہوں وہ کیوں نہیں کرتیں۔ اٹھو۔ آنکھیں کھولو اور اس آسمانی روشنی کے نظارہ سے لطف اٹھاؤ۔“

ایک رند:۔ ”استاد درست فرمایا۔ لیکن حال ہی میں میرا بھتیجا بجلی کے صدمے سے مرگیا مجھے اسکا بے انتہا رنج ہے۔ جوان تھا۔ ایک بیوی اور چار بچے چھوڑے۔ افسوس! افسوس!!“

پیر خرابات:۔ ”ہرگز نہیں تمہیں اسکے مرنے کا ذرا بھی رنج نہیں ہے یہ تمہارا خیال ہی خیال ہے کہ تمکو اسکا رنج ہے۔ اسکا نہیں بلکہ اسکے پس ماندگان کا رنج ہے۔ وہ کسی مصیبت میں مبتلا نہیں ہوا جو اسکا رنج ہو۔“

رند:۔ ”نہیں مجھے بھتیجہ کی موت کا رنج ہے۔ یہ ضرور ہے کہ رنج پس ماندگان کا بھی ہے۔ لیکن مرحوم کا ان سے زیادہ ہے۔ اُسنے بہت ترکہ چھوڑا ہے انکی حالت بھی بالکل اچھی ہے مگر وہ بیچارہ تو اپنی جان سے گیا ابھی تو اسکے منہ سے دودھ کی بو بھی نہیں گئی تھی۔ وہ میونسپل کمشنری کا امیدوار تھا اور یقیناً منتخب ہو جاتا اسکا نام آنریری مجسٹریٹی کیلئے جا چکا تھا دریا کے کنارے نئی کوٹھی بنائی تھی اسمیں رہنا بھی نصیب نہ ہوا۔ بہت خوش مزاج ہنس مکھ۔ اور سجیلا جوان تھا۔ مرشدی! کیا آپکا یہ خیال ہے کہ اسکی موت سے مجھے رنج نہیں ہوا؟“

پیر خرابات:۔ ”اسکی موت کا رنج نہیں ہوا۔ چونکہ وہ میونسپل کمشنر اور آنریری مجسٹریٹ ہونے والا تھا۔ بہت عزت پاتا۔ خطابات ملتے۔ حکام تک رسائی ہوتی۔ کچہری دربار میں بار پاتا۔ بس اسکا رنج ہے۔ میرا مطلب اچھی طرح سمجھو۔ جہاں تک اسکی نفس موت کا تعلق ہے تمہیں رنج نہیں ہے۔ اگر واقعی تمکو اسکا

اور تمہارے اوپر ہاتھ چھوڑ دیتا ہوں۔ تم مجھ سے زیادہ دعوی الجنہ ہو۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اگر میں نے ایک دفعہ تم کو مارا۔ کرم ہی ہیجا نہ چھوڑو گے تم بے تحاشا مجھ کو مارتے ہو۔ میرے نکسیر پھوٹ نکلتی ہے۔ لیکن میں تو پاگل ہوں۔ آگا پیچھا نہیں سوچتا۔ کیونکہ میں خوشی حاصل کرنے کیلئے کرتا ہوں ”

پیلا :۔ بلاشک تم اس لئے پاگل ہو جاتے ہو کہ مجھ پر حملہ کرنے کے نتائج کو برداشت کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ تم مجھ پر حملہ کرتے ہو کیونکہ تم جانتے ہو کہ تمہارے حملہ کرنے کی خوشی وزن میں اس تکلیف سے زیادہ ہوگی جو تمہارے اس حملہ کے جواب ملنے پر ہوگی۔ جبھی میں یہ کہتا ہوں کہ خوشی سے بھی بڑھکر کوئی چیز ہے تو میرا جواب یہ ہوتا ہے ”بالکل نہیں۔ کم از کم انسان کے لئے نہیں “

جب یہ گفتگو ختم ہوگئی اور پہلے بادہ خوار کی بات دوسرے بادہ خوار نے تسلیم کرلی تو بہتوں کا نظریۂ خوشی زیادہ وسیع ہوگیا۔ انسان کیلئے نہ صرف خوشی کا ضائع ہونا اصل نقصان ہے بلکہ تمام انسانی سعی و کوشش کی بنیاد ہی حصول خوشی ہے لیکن باوجود دانایان خرابات کی منطقی گفتگو کے مذکورۂ بالا اصول میں کچھ خامی سی نظر آتی ہے جس چیز کے تم متلاشی ہو یقیناً وہ چیز تمہارے پاس نہیں ہے اور اگر ہمیشہ خوشی کی تلاش میں ہو تو تمہارے پاس خوشی نہیں ہے اور جو چیز قبضہ میں نہیں اسکا ضائع ہونا کیا۔ لیکن یہ خامی حقیقی خامی نہیں ہے۔ یہ صرف سطحی ہے درحقیقت دانایان خرابات کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے پاس جس قدر خوشی ہے اسپر قناعت نہ کرکے ہم اور خوشی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ جو خوشی ہمارے قبضہ میں ہے اسکا ضائع ہونا اصل نقصان ہے۔ خواہش ہماری یہی رہتی ہے کہ اس خوشی میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی رہے۔ سلطنت کے قوانین بھی اس نظریہ کو سامنے رکھکر بنائے جاتے ہیں کہ تمام آدمی خوشی حاصل کرنے کیلئے پیدا ہوئے ہیں۔ اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام آدمی خوشی سے محروم ہیں بلکہ فطرت سے انہیں یہ حق عطا ہوا ہے کہ اس خوشی پر جو انکے قبضہ میں ہے اضافہ کرتے رہیں اسیطرح خوشی پر خوشی حاصل کرنے کے ذرائع کام میں لانا آزاد آدمی کا فطری

حق ہے اور اس بڑی سلطنت کے قوانین بھی فرخ نگر کے خراباتی مجذوب نما سالکوں کے بڑے مرہون منت ہیں۔ معلوم ہوا کہ قدرتی حق جو ہمیں عطا ہوا۔ خوشی حاصل کرنا ہے۔ اور چونکہ سلطنت اور خرابات اس نظریہ میں باہم مشترک ہیں ہمکو اسکے آگے سر تسلیم خم کردینا چاہئیے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کسطرح بہترین طریقہ سے اس حق کو کام میں لاسکتے ہیں ایک طرح پر تو ہم اسکے حاصل کرنے میں مشغول ہیں کیونکہ ہمارے تمام کام جو ایک ارادہ کے ماتحت ہوتے ہیں کامیابی کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ لیکن کوئی کام کیوں نہ ہو اگر سوچ سمجھکر اور دیکھ بھالکر کیا جائے تو اپنے اندر کامیابی اعلیٰ پیمانہ پر رکھتا ہے۔ اب اسکو ایک نظریہ حق سمجھکر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بہت کم آدمی ایسے ہیں جن کو کوئی خوشی میسر نہیں کیونکہ وہ آدمی جو خوشی نہیں رکھتا کسی رنجیدہ واقعہ سے ناخوش نہیں ہوسکتا سچ ہے بعض آدمی ایسے ہیں جنپر تابڑ توڑ مصیبتیں پڑتی ہیں اور انکا غم اس انتہا پر پہونچ جاتا ہے کہ کچھ عرصہ کیلئے کسی خوشی کا احساس ہی نہیں ہوتا اور اگر تمام بنی نوع انسان مصیبت میں تڑپنے لگیں تو انکے غم میں اضافہ ہونے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ لیکن یہ حالت عارضی ہوتی ہے اور یہ انتہائی رنج ختم ہو جاتا ہے کیونکہ قدرت جسکو یہ منظور ہے کہ وہ خوشی کی تلاش میں لگا رہے اسکو از سر نو اپنے نقصان کے پورا کرنے پر آمادہ کردیتی ہے قدرت خوشی کی ترقی میں ہر قسم کی مزاحمت کو نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔

پس عام طور سے ہمیشہ خوشی کی کچھ نہ کچھ مقدار کے ہم مالک رہتے ہیں یہی وہ خوشی ہے جو پہلے سے ہمارے پاس ہے۔ ایک بڑے شخص نے اسکی تردید کی ہے۔ وہ کہتا ہے ”تکالیف جو ہمیں پہونچتی ہیں انسے بے خبری کا نام خوشی ہے “ ہمارا وقتاً فوقتاً کچھ خوشیوں کو کھوکر بیٹھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ہم کچھ خوشیوں کے مالک ہیں۔ اور اسمیں ذرا شبہ نہیں کہ بعض آدمی اسقدر خوشی رکھتے ہیں کہ وہ اسکا اندازہ نہیں کرسکتے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خوشی کے ضائع ہوجانے کے بعد آدمی محسوس کرتا ہے کہ اُسے کسقدر خوشی حاصل تھی لیکن وہ جانتا نہیں تھا۔ یہ اکثر دنیا کے لفافوں کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ یہی حال بچہ کا بھی ہے وہ بھی کھلونوں کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے ہماری عمر کے ساتھ اس عادت میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن ان خوشیوں کے

ہے بڑھاپے کیلئے تم کچھ بچانا نہیں چاہتے"۔ اور تم جوانی میں محنت کرنا نہیں چاہتے

پہلے شخص نے فوراً بات کاٹکر کہا "میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں سب کچھ نہیں کرونگا۔ بلکہ یہ ہے کہ اسکی بابت پریشانی نہیں لگائے رکھونگا میں بھی گزشتہ زندگی پر ایک نظر ڈال رہا ہوں۔ کیونکہ اب وہ وقت آنے والا ہے جبکہ ہماری ٹانگیں لڑکھڑانے لگینگی۔ آنکھوں سے کم نظر آنے لگیگا کوئی بھی ہم سے باتیں کرنا پسند نہیں کریگا۔ اور ہم ٹھالی بیٹھے بیٹھے اپنے کارناموں پر غور کرتے رہا کرینگے۔ اب مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ میں نے فضول پریشانیوں میں سر کھپایا"

دوسرا :۔ تم ایسا خیال کرو لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسی سبب سے تمہیں فارغ البالی نصیب ہوئی۔ جوانی میں دوڑ دھوپ کی بڑھاپے میں بیٹھے مل چھرّے اڑا رہے ہو"

پہلا :۔ یہ ہر وقت فکر میں غرق رہنے سے یہ سب کچھ نہیں ہوا محنت سے یہ سب کچھ حاصل ہوا محنت بھی اور کفایت شعاری بھی۔ اب میں سمجھتا ہوں غلطی ہوئی کہ میں نے ہر وقت کام سے کام رکھا لیکن اس سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ کام کی وجہ سے پریشانیوں میں اُلجھا رہا۔ اگر میں از سر نو زندگی شروع کروں تو کبھی پریشانیوں کے پاس نہ پھٹکوں"

دوسرا :۔ یہ تو ممکن ہے ایسا وقت آتا ہے کہ کام خراب ہونے اور نقصان کا احتمال ہوتا ہے اگر فکر نہ کی جائے۔ پریشانی اپنے سر لئے بغیر محنت کرنا بہت مشکل ہے"

پہلا :۔ میں نے کام ٹھیک صورت سے چلنے پر بھی ایسے ہی خراب ہوتا دیکھا جس طرح عام لوگ بگڑنے پر کرتے ہیں۔ دو چار مرتبہ جب کام میں گڑبڑی معلوم ہوئی تو اسوقت میں بہت آسانی سے کام سنبھال لیتا اگر مجھ میں پریشانی میرے استقلال اور قوت فیصلہ کو ضائع نہ کر دیتے پریشانی سے ہونے والا کام انجام نہیں پاتا ہاں البتہ فضول باتیں اسکی وجہ سے بہت سی ہو جاتی ہیں۔ اگر مجھ میں ذرا بھی عقل ہوتی اور پریشانیوں سے علیحدہ رہکر کام کرتا تو خود کام میں ایک لطف آنے لگتا اور حقیقت میں ہر آدمی کو اسطرح کام کرنا چاہیئے جناب میں تو عرض کر چکا کہ اگر پھر جوان ہو کر کام کروں گا تو پریشانیوں کے پاس نہ پھٹکونگا"

دوسرا :۔ لیکن علاوہ کاروبار کے اور بھی تو باتیں ہیں جو پریشانی میں ڈالتی ہیں۔ مثلاً خطرہ۔ اچانک کوئی حادثہ۔ بیماری۔ موت وغیرہ

پہلا :۔ میں خوب جانتا ہوں میں جو کچھ پریشانیوں کی بابت کہتا ہوں ان سب باتوں کو پیش نظر رکھکر کہتا ہوں میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام کو آلام سے نجات مل جائیگی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں ان کو آنے کی دعوت نہیں دونگا پہلے ہی سے انکے استقبال کی تیاری نہیں کرونگا پیش از مرگ واویلا پر عمل پیرا نہیں ہونگا اور اپنے دماغ کو ان فرضی پریشانیوں کا جولانگاہ نہیں بناؤنگا میں پچھلے واقعات پر غور کر رہا ہوں اور کف افسوس مل رہا ہوں کہ بیش بہا جو میری عمر تھی وہ فضول پریشانیوں میں ضائع کی افسوس پر افسوس یہ کہ اطمینان قلب بھی انکی پریشانیوں کی نذر کر بیٹھا اب خیال کرتا ہوں کہ ننانوے فیصدی اصل پریشانیاں نہیں تھیں بلکہ اوہام اور خیالات باطل تھے۔ تاہم میں ان فرضی پریشانیوں کا انتہائی اثر لیتا تھا جتنا کہ ایک فیصدی اصل پریشانی کا۔ ستم تو یہ ہے کہ مجھ میں اصل اور فرضی پریشانیوں میں تمیز کرنے کی قوت نہ تھی۔ میں واقعی پریشانیوں کا بھی شکار رہتا تھا لیکن چونکہ ضروری نہیں تھا کہ پریشان ہونے اور دھن لگانے سے وہ واقعات میری حسب مرضی انجام پا جائیں اسلئے تمام واقعی اور غیر واقعی پریشانیوں نے مجھے بالکل تباہ کر دیا اگر یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو مجھے اتنا صبر تو رہتا کہ چلو بالی مفاد زیادہ نہیں ہوا نہ سہی زندگی تو مزہ میں گزار دی۔ ذرا سوچو اگر ننانوے فیصدی پریشانیاں غیر واقعی ہیں اور ایک فیصدی واقعی اور غیر واقعی اور واقعی میں تمیز ناممکن ہے اور وہ ایک فیصدی پریشانی کچھ چارہ سازی کرتی نظر نہیں آتی تو کیا یہ کہیں زیادہ بہتر نہیں ہے کہ تمام پریشانیوں کو بالائے طاق رکھکر آدمی خوش و خرمی کی زندگی بسر کرے یہ نہ سمجھ لینا کہ اگر از سر نو جوان ہو کر زندگی شروع کروں تو کسی واقعی خطرہ کے دفعیہ کی کوشش نہ کرونگا۔ یا بیمار پڑنے پر طبیب کو نہیں بلاؤنگا۔ بلکہ میں یہ سمجھا کہ

خوشی میں اضافہ ہونا تو درکنار اور کمی ہو جاتی ہے خوشی حاصل کرنے کیلئے ہم اپنی خواہشوں اپنے حوصلوں اور اپنی مفروضہ ضروریات بیانتک کہ اپنے ضمیر پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتے۔ اب کوئی رہنمائی کرے۔ اسکے لئے میں پھر خوابیکا ذکر کرتا ہوں

حسب معمول یہاں بھی قبرستان یا دواست کا بڑا ہجوم تھا لیکن ان میں سب سے زیادہ ممتاز دو شخصیتیں تھیں۔ ایک تو نو وارد تھا اور پیر خرابات سے بے میدان میں تھا اور دوسرا اس خرابات کے پرانے جاروب کشوں میں تھا ان دونوں کی آسانی کیلئے دل اللہ کر ہم چلاکش کے نام سے یاد کرینگے اور دوسرے کو نوش کے نام سے۔

چلاکش:۔ "ایسے آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھے تھے جیسے یہ خداداد اور اسکی بیوی ہیں۔ ناامیدی انکا اوڑھنا بچھونا ہے مطلب یہ ہے کہ ایسے آدمی ہی نظر نہیں گزرے۔ اچھی طرح سے محنت سے ان ہوں نے ایک کام شروع کرتے ہیں لیکن جب ہو جاتا ہے تو اس پڑ جاتی ہے جب ان دونوں کی شادی کے پیغام سلام ہو رہے تھے تو خداداد سمجھتا تھا کہ گلدستہ (خداداد کی منسوبہ کا نام ہے) نکاح ہوتے ہی کشمیر کی ریاست کا پٹہ میرے نام لکھ دیا جائے گا اور جب بات ٹھہر گئی تو گلدستہ نے اپنی سہیلیوں سے کہا کہ بس ابکیا تھا خداداد کے گھر پہنچتے ہی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں جب شادی ہو گئی تو گلدستہ بولیں میرا خاوند حقہ پینا چھوڑ دے تو خوب مزے سے گزران ہو۔ جب اسنے حقہ چھوڑ دیا تو پھر وہی ڈھاک کے تین پات ایک دوسرے کی شکایت اپنے اپنے دوستوں سے کرنے لگے۔ اب انہوں نے نیا مکان بنانا شروع کیا اور سمجھے کہ شاہجہان کو دلی کا لال قلعہ بنا کر وہ خوشی و مسرت حاصل نہیں ہوئی جو ہمیں ہو گی۔ لیکن جب مکان تیار ہو گیا اور رہنے لگے تو پھر وہی پریشان حالی۔ یہ کوئی ٹھیک نہیں بنا۔ یہ ویسا نہیں ہے۔ یہ ذات مضبوط نہیں لگی حالانکہ تمام کام بالکل انکی خواہش کے مطابق تھا۔ میں نے ایسے عجیب آدمی نہیں دیکھے۔"

نوش:۔ "اب انہیں کیا شکایتیں ہیں؟"

چلاکش:۔ "اب ولادت تک نت نا تیج کا سوال درپیش تھا ہر ایک سے کہتے پھرتے تھے کہ اگر ایک لڑکا ہو جائے تو اصل خوشی سمجھو۔ آخر مراد برآئی اور اولاد بھی ہو گئی۔ خداداد ہیں کہ پھر درشکوہ باز ہے کہتے ہیں کہ لڑکی ہوئی اگر لڑکا ہو تو اصل خوشی ہوتی۔ گلدستہ ہے کہ علیحدہ پریشان ہے کہ لڑکی کی پتلی ذرا ابھری ہے سیاہ ہوتی تو اچھا تھا۔ انکی حسب مرضی ہر کام انجام کو پہونچ جاتا ہے۔ ہر خواہش کی تکمیل ہو جاتی ہے لیکن ہر کام کا انجام اور ہر خواہش کی تکمیل ان کو اور زیادہ پریشان حال بنا دیتے ہیں۔"

نوش:۔ "اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے دل کو ٹھیک طور سے ارادہ پر قائم نہیں کرتے۔" (اس موقع پر یہ معلوم کر کے کہ چلاکش کی حرکات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ زیادہ وضاحت چاہتا ہے وہ یوں گویا ہوا) "خداداد اور اسکی بیوی ہر وقت ناامیدی کا وظیفہ پڑھتے رہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے زعم میں تمام خوشی دینے والے کاموں سے واقف ہیں حالانکہ بالکل ناواقف ہیں اور یہ اسطرح ثابت ہو سکتا ہے کہ اول انھوں نے خیال کیا کہ بس خوشی ہی خوشی ہے اگر:۔

۱۔ نکاح کی بات ٹھہر جائے۔ ٹھہر گئی۔ مگر خوشی میسر نہ ہوئی

۲۔ شادی ہو جائے۔ ہو گئی۔ مگر خوشی میسر نہ ہوئی

۳۔ نیا گھر بنجائے۔ بنگیا۔ مگر خوشی میسر نہ ہوئی

۴۔ بچہ ہو جائے۔ ہو گیا۔ مگر خوشی میسر نہ ہوئی

اب انہوں نے خیال کیا کہ گھر اور بچہ دونوں امید کے خلاف ہوئے (ایک میں بہت نقائص رہ گئے اور دوسرے میں بجائے لڑکے کے لڑکی پیدا ہوئی) اسوجہ سے وہ رنجیدہ ہوتے ہیں اور اپنی زندگی میں کبھی مسرت حاصل نہیں کر سکتے جب تک وہ اس خیال کو ترک نہ کر دیں کہ ہم مسرت دینے والی تمام باتوں سے واقف ہیں۔" (یہاں پھر چلاکش نے وضاحت چاہی)

چلڈکش:۔ "یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ پھر وہ کام کرنے کا کیا طریقہ نکالیں؟"

مے نوش:۔ "بہتر سے طریقے۔ کیا کوئی ایسا آدمی بھی ہے جو بلا مشورہ کے اپنی قوت فیصلہ پر مدار رکھ کر کام شروع کر دے؟ اور جب بھی کرے یہ کام مجھے تو حیرت سی تک لے جائیگا۔ نہیں ہرگز نہیں اگر میں یہ خیال کر کے کہ میں بہت عقلمند ہوں اور مسرت بخش کاموں سے خوب واقف ہوں صرف اپنی قوت فیصلہ پر بھروسہ کر کے کام شروع کر دیا کروں تو کل کسی محتاج خانہ کو آباد کروں گا۔ یا پاگل خانہ کی سیر کرنی پڑیگی یا کل جیل خانہ میں چکی پیسونگا۔ اس میں ذرا قوت امتیازی کو بھی دخل ہے جس طرح ہر کام کے لئے کچھ قوانین ہیں اسی طرح خوشی حاصل کرنے کیلئے قوانین بنا رکھے ہیں۔"

چلڈکش:۔ (طنز آمیز لہجہ میں) "تمہارا یہ مطلب ہے کہ یہ سب باتیں آدمی کسی اسکول میں سیکھے؟"

مے نوش:۔ "بے شک مذہبی تعلیم جہاں ہوتی ہے وہاں یہ سب باتیں سکھائی جاتی ہیں۔ کیا بچوں نے نہیں سیکھا انہیں نیک ہو کر خوش رہو یہ بالکل ٹھیک ہے لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ وہ کون سی نیکی ہے جو خوشی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ایک شخص مذہب کے پانچوں اصول مانتا ہے اور کوئی تکلیف نہیں اٹھاتا۔ لیکن اگر صرف اسی وجہ سے کہ وہ ان پانچوں اصول میں سے ایک کو بھی نہیں توڑتا کچھ زیادہ خوش نظر نہیں آتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ خوش رہنے کیلئے مجھے کسی خاص طریقہ کا پابند رہنا چاہیئے۔ جس چیز کو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں اسکے حاصل کرنے کے بہترین طریقہ کا ہم مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن ہم خوشی حاصل کرنے کے طریقہ کے مطالعہ کی طرف سے بے پروا ہیں۔"

چلڈکش:۔ (طنز سے) "اگر آدمی علم صحت۔ خوشحالی اور اخلاق حاصل کرے تو کیا وہ خوش نہیں ہے؟"

مے نوش:۔ "بالکل نہیں گو یہ سب باتیں اور اسکے علاوہ بھی کچھ حاصل کرے تب بھی وہ اتنا بھی خوش نہیں ہو سکتا جتنا کہ ایک بھوکا عرب کھجور کے ملنے سے یا جیسی مزدور کسی غیر ملک میں کمائی مزدوری کے ملنے سے۔ تم خود اس بات کو مانتے ہو۔"

چلڈکش:۔ "اچھا میں بھی کچھ دخل نہیں دیتا۔ بیان کیجئے کہ آپکا کیا مطلب ہے۔"

مے نوش:۔ "میرا یہ مطلب ہے۔ مثلاً جب ہم قوی الجثہ ہونا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے چاروں طرف نظر ڈالتے ہیں اور معلوم کرتے ہیں کہ عام طور سے آدمی کیسے قوی الجثہ ہو جاتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض تو پیدا ہی توانا ہوتے ہیں لیکن یہ ہمارے مطلب کے لوگ نہیں لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنکو ہم بطور نمونہ کے استعمال کر سکتے ہیں وہ قوی غذا کھاتے ہیں۔ صحت بخش اور کھلی ہوا میں سانس لیتے ہیں۔ وہ ورزش کرتے ہیں جسم کو کمزور کر دینے والے کام نہیں کرتے ہم بھی ایسا ہی کریں تاکہ مضبوط یا مضبوط تر ہو جائیں۔ ہم خوشی زیادہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے ورنہ اگر چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے" بہرحال "ہمہ وقت ہشاش بشاش دوستوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور ان کے ایسا ہونے کی وجہ معلوم کر سکتے ہیں۔"

چلڈکش:۔ (ذرا زور سے) "وہ کیوں ایسے ہیں؟ فرمائیے"

مے نوش:۔ "بہت سی وجوہات سے" یہاں چلڈکش مسکرایا لیکن مے نوش نے اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھا۔ "مجھے معلوم ہے جو کچھ میں نے کہا وہ ایک کلیہ قاعدہ ہے۔ لیکن میں کسی خاص واقعہ کو لونگا۔"

چلڈکش:۔ "اچھا منظور ہے بیان فرمائیے"

مے نوش:۔ "ایک تو مذہب ہی کو لو بہت سے آدمی پابند مذہب ہیں لیکن کیا اس سے انکار کر سکتے ہو کہ وہ خوش ہیں۔"

چلڈکش:۔ "نہیں میں انکار نہیں کر سکتا۔ اور فرمائیے۔"

مے نوش:۔ "کسی دلچسپ کام میں مشغولیت۔ اگر کسی شخص کو اپنے کام سے دلچسپی نہیں ہے تو وہ اس کام کے ساتھ ہی ساتھ کوئی اور کام کر کے اپنی دلچسپی کا سامان مہیا کر سکتا ہے اور خوش رہ سکتا ہے۔"

چلڈکش :- "فرض کو کہ کوئی دوسرا سامان مہیا نہیں کر سکتا اور جو کام اسکو طوعاً و کرہاً کرنا پڑتا ہے اسکا تمام وقت لے لیتا ہے"

ے نوخش :- "وہ خوش رہ سکتا ہے اگر وہ اس کام کو اچھے طور پر انجام دے خواہ وہ اسکو پسند نہ کرے کیونکہ وہ لوگ خوش رہتے ہیں جو اپنے کام کو اچھی طرح انجام دیں بہ نسبت ان لوگوں کے جو کام کو اچھی طرح نہیں کرتے۔ میں اسکا مدعی نہیں کرتا کہ وہ اس ترکیب پر پورے خوش ہو جائیں گے۔ یہی کامل خوشی کا باعث ہے۔ کوئی آدمی خواہ کتنا ہی طاقت ور ہو جائے اتنا طاقتور نہیں ہو سکتا کہ ہاتھی کو اٹھا لے لیکن معمولی آدمی جو طاقتور نہیں ہے مقابلۃً زیادہ طاقتور ہو سکتا ہے اگر وہ کوشش کرے"

چلڈکش :- "اچھا فرمائے جائیے"

ے نوخش :- "میرے خیال میں تمام آدمیوں پر جنکو تم جانتے ہو غور کی نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ کس کے چہرے سے آثار مسرت ہویدا ہیں معلوم کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہی ہے۔ میں جب اپنے واقف کاروں کے چہروں پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ خوش خاص قسم کے لوگ ہیں"

چلڈکش :- (مشتبہ نظروں سے دیکھکر) "وہ خاص قسم کے لوگ کون ہیں"

ے نوخش :- (سنجیدگی سے) "میں اور تم نہیں۔ میرا مطلب ان لوگوں سے ہے جو دوسروں کو خوش کرتے ہیں۔ تم نے اپنی زندگی میں جن دوستوں کو دیکھا ہے سب پر ایک غائبانہ نظر ڈال جاؤ اور پھر خیال کرو کہ خوشی کے آثار انہیں آدمیوں کے چہروں پر ظاہر ہوتے تھے جو دوسروں کو خوش رکھتے تھے"

چلڈکش :- (غصہ بمشکل ضبط کر کے) "لیکن تم کچھ نئی بات نہیں کر رہے ہو"

ے نوخش :- "میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا ہوں میں تو واقعہ نفس الامری بیان کر رہا ہوں"

چلڈکش :- "میرے اور تمہارے لئے واقعہ نفس الامری نہیں ہے میں اسطرح خوش رہنا نہیں سیکھ سکتا۔ وہ لوگ جو دوسرے کو خوش کر سکتے ہیں پیدائشی غیر خود غرض ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہی ایسے ہوتے ہیں"

ے نوخش :- "بالکل درست ہم میں پیدائشی چند ہی قوی الجثہ ہوتے ہیں۔ اسکا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ ہم طاقتور ہونیکی کوشش ہی نہ کریں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگ دنیا میں موجود ہیں جو خود بھی خوش رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی خوش رکھ سکتے ہیں تو پھر ہم بھی ان جیسا بننے کی کوشش کیوں نہ کریں۔

چلڈکش :- (ذرا غصہ سے) "اسکی تعلیم تو ہمکو ہزاروں برس سے ہو رہی ہے اور کوئی نیک نتیجہ ابھی تک برآمد نہیں ہوا"

ے نوخش :- "نہایت اطمینان سے گفتگو ہونی چاہیئے غصہ کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ تو یہ ہماری سرکشی اور کج فہمی پر دال ہے۔ ہم اپنی خوشی میں اضافہ کرنیکے خواہشمند ہیں اور ہزاروں سال سے ہمیں اسکی ترکیب بتائی جا رہی ہے اور پھر نہیں کرتے"

چلڈکش :- (ذرا زور سے) "ہم جتنا کرتے ہیں اسی کے قابل ہیں۔ تم نے جو کچھ کہا اس سے خوشی حاصل کرنیکی بابت میرے علم میں کچھ اضافہ نہیں ہوا میں پہلے ہی یہ سب باتیں جانتا ہوں"

ے نوخش :- "مگر تم اب بھی اسپر عمل پیرا نہیں ہوگے کیونکہ تم جانتے ہو کہ فطرت کے بتلائے ہوئے قانون سے بہتر قانون خوشی حاصل کرنیکا نہیں معلوم ہے۔ راستہ صاف ہے لیکن تم جیسے آدمی یاد جود ہزاروں برس سے اسکے متعلق علم ہونیکے اسپر گامزن نہیں ہوئے جب تک تم اپنی سرکشی کو زیر نہ کروگے اسوقت تک زندگی سے لطف نہیں اٹھا سکو گے"

یہاں پر چلڈکش کچھ تیز ہو گیا اور کہنے لگا۔ "لطف لطف ! کوئی بھی لطف نہیں اٹھاتا ہے

مے نوشں :۔ اطمینان اطمینان۔ تیزی کی ضرورت نہیں بہت سے لوگ لطف اٹھاتے ہیں۔

چلاکشں :۔ کون اٹھاتا ہے؟

مے نوشں :۔ کیونکہ خدا اقرار ہے کہ وہ جو دوسروں کو خوش کرتا ہے زندگی کا لطف اٹھاتا ہے۔ اور ایک دوسرا گروہ ہے وہ بھی اٹھاتا ہے۔

چلاکشں :۔ وہ کون گروہ ہے؟

مے نوشں :۔ میرا مطلب اُس گروہ سے ہے جسمیں خداداد اور اُسکی بیوی جیسے آدمی شامل نہیں ہیں۔ وہ گروہ جو خاندان کے مالک ہوتے ہیں۔ اور اُسکی پرورش کا سامان کرتے ہیں۔ میں اس گروہ میں شامل ہونے والوں پر عمر کی کوئی قید نہیں لگاتا ہوں بلکہ جو شخص بھی دوسروں کے واسطے کچھ دیکھ کرتا ہے وہ اسمیں شامل ہے۔ لیکن عام طور سے والدین اسمیں شامل ہیں جو کچھ نہ کچھ اپنے علم دماغی جسمانی محنت کو کام میں لاکر دنیا میں آہستہ آہستہ ترقی کر رہے ہیں۔ بعض دفعہ وہ اس دوڑ دھوپ میں پیچھے بھی رہ جاتے ہیں لیکن اپنے عزم میں مستقل ہیں۔ اور منزل مارے چلے جا رہے ہیں کبھی کبھی آگے پہنچ بھی جائیں گے۔ میرے خیال میں یہ لوگ سب سے زیادہ خوش کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔"

چلاکشں :۔ (مسکرا) "بے شک ہیں۔ تمام ملک میں سب سے زیادہ فکرمند طبقہ تم نے چھانٹا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہارا مطلب سمجھا نہیں سمجھا اور ضرور سمجھا۔ تمہارا مطلب متوسط طبقے سے ہے جسمیں والدین کا گروہ بھی شامل ہے جو ابھی تک اس منزل پر نہیں پہونچا جہاں انہیں پہونچنا ہے لیکن پہونچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ باپ تو سارے دن دفتر میں یا گودام میں یا کارخانہ میں یا دوکان میں یا کھیت پر کام کرتا ہے اور ماں گھر میں بچوں کی خور و پرداخت کرتی اور خانہ داری کے کاموں میں مشغول رہتی ہے تم لوگوں کے چہروں کو دیکھکر خوشی کا اندازہ کرنے کیلئے کیوں کہتے ہو۔ یہ لوگ تو وہ ہیں جو ہمیشہ متفکر اور پریشان نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کو دیکھکر جو تم خوش بتلاتے ہو تمہیں معلوم ہے کہ مجھے کیا یاد آجاتا ہے ان لوگوں کو دیکھکر مجھ ان آدمیوں کا خیال آجاتا ہے جو موٹر میں بیٹھے ہوں۔ اور کہیں پہونچنا چاہتے ہوں۔ ان کو صرف منزل مقصود پر پہنچنے کا ہی خیال لگا رہتا ہے اور وہاں پہنچنے کیلئے پریشان رہتے ہیں مگر ان کیلئے منزل مقصود کے سوائے عارضی اور کچھ نہیں۔ کیا ایسے لوگوں کو خوش کہو گے۔"

مے نوشں :۔ ضرور کہونگا۔ اگر وہ خوش نہیں ہیں تو یہ انکی نادانی ہے۔ وہ جانتے نہیں کہ وہ کسقدر خوش ہیں۔"

اسپر حاضرین کو کچھ ہنسی آئی۔ جو لوگ وہاں موجود تھے انھوں نے مے نوشں کی شکست کو تسلیم کرلیا۔

چلاکشں نے مے نوشں کے خوشحال لوگوں کو موٹر میں بیٹھنے والوں سے تشبیہ دی تھی۔ میں واپسی پر رستہ بھر اُسی پر غور کرتا رہا کیا واقعی چلاکشں اور مے نوشں دونوں صحیح راستہ پر نہیں ہیں اور خصوصاً مے نوشں گزشتہ۔ میں نے حال ہی میں کسی دلچسپ مقام پر ایک لمبا سفر موٹر میں کیا تھا اور جب آدھے سے زیادہ سفر طے ہو گیا تو خیال آیا کہ میں نے اس سفر سے کافی لطف نہیں اٹھایا۔ مجھے خیال ہوا کہ میں نے سوائے گاڑی کی تیز رفتاری کے اور شام کے وقت منزل مقصود پر پہونچنے کے خیال کے اور کسی بات کا خیال ہی نہیں رکھا۔ شام کے وقت جس قصبہ میں قیام ہوتا تھا وہاں نہ مجھے کچھ دیکھنا تھا اور نہ کچھ کرنا تھا۔ اور یہ جگہ کچھ ایسی دلچسپ بھی نہ ہوتی تھی جیسا کہ راستہ۔ تاہم سوائے شب باشی کے مقام پر پہونچنے کے خیال کے اور کوئی دوسرا خیال نہیں آتا تھا۔ ہر روز یہی حالت تھی اور اسمیں کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن جب رات کو سونے کیلئے لیٹتا تھا تو راستہ میں جو کچھ نظر پڑتا تھا اسپر بہت اطمینان کے ساتھ غور کرتا تھا۔ یہ سفر سو فی صدی صرف سیر و تفریح کیلئے کیا تھا نہ کہ منزلیں شمار کرنے کیلئے لیکن سفر میں منزل پر پہونچنے کیلئے پریشان رہتا تھا۔ مگر جلدی میں نے اپنی اصلاح کر لی جب میں سڑک پر چلتا تو اپنے دل میں کہتا "میں یہاں گھر سے اتنی دور صرف

اس لئے آیا ہون جاب کر رہا ہون یعنی قدرتی نظارون سے لطف اُٹھانے کیلئے نہ کہ سبز جانے کی جگہون کو شمار کرنے کیلئے بن سڑک کے اردگرد کے نظارونکا لطف اُٹھانے آیا ہون۔

میرے خیال مین میرے چہرے کی حالت ایسی بدل گئی کہ اگلے نوش دیکھ پاتا تو بہت خوش ہوتا۔ میرا فکر جاتا رہا اور خوش و خرم نظر آنے لگا۔ پس مین نے خرابات سے واپس آتے ہوئے خیال کیا کہ شب نوش زیادہ راستی پر تھا جبکہ اُسنے آخری بیان چلہ کش کی تقریر پر دیا وہ خوش اشخاص جو کہ متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہین اور ان مین والدین کی زیادہ تعداد شامل ہے اور جو ابھی اُس حالت پر نہین پہونچے ہین جہانکو وہ ترقی کر کے جانا چاہتے ہین "سنہ کہ" کے لطف کو بھول گئے ہین۔

ہم اگر یہ سمجھ جائین کہ ہم کسقدر خوش ہین تو اپنی خوشی مین بہت کچھ اضافہ کر سکتے ہین۔ کچھ عرصہ کے بعد نوش کے خوش باش آدمی جبکہ چلہ کش متفکر اور پریشان کے نام سے یاد کرتا ہے کہین گے کہ ہم تو پہلے ہی خوش تھے۔ وہ ایام جو تفکرات۔ ناامیدیون۔ نقصانات اور بیم و رجا سے بھرے تھے وہی اصل عیش و شادمانی کے تھے۔ وائے نادانی کہ اسوقت ہم نہین سمجھے اور پورا لطف نہین اٹھایا۔ مسرت منزل مقصود پر پہونچنے سے ہم خوش نہین کہلائے جا سکتے۔ ہم زندگی کی سڑک کا لطف اٹھانے کیلئے آئے ہین نہ کہ منزل پر پہونچنے کیلئے۔

(ماخوذ)

ریاض احمد (میرٹھ)

غزل

محبت نے اعجاز پیدا کیا ہے — مرے قلب کو طورِ سینا کیا ہے

شبِ غم کی ظلمت مین ای جانِ عالم — تبسم نے تیرے اجالا کیا ہے

منور کیا میرے سینہ کو تو نے — اُدھر چشمِ انجم کو بینا کیا ہے

مری چارہ سازی کوئی کیا کریگا — کہ یہ درد خود مین نے پیدا کیا ہے

کسی کے خیالِ جنون آفرین نے — مرے صفحۂ دل کو صحرا کیا ہے

طلسمِ سرور کی افسونگری نے — یہین بندۂ دے و فردا کیا ہے

ترے حسن کی خودنمائی نے آخر — زمانے کو محوِ تماشا کیا ہے

مرے دل نے پہلو سے آوارہ ہو کر — مجھے ساری دنیا مین رسوا کیا ہے

محبت نے ایثار نے خودگری نے — ہر اک قطرہ کو عین دریا کیا ہے

....

تری طبع موزون نے ای میر مجھکو
غمِ عاشقی سے شناسا کیا ہے

میر ولی اللہ بی۔ اے

حضرت شیخ نظام الدین چشتی کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ

سید نام، نظام الدین لقب، والد کا نام قیام الدین تھا، حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کی اولاد سے تھے۔ والد کی
سے سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا تھا اور والدہ کی طرف سے سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ سے۔ معین الاولیا
لکھا ہے:۔

"سلسلۂ نسب پاک او بحضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ منتہی می شود و از نبیرگان شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی"

بعض تذکرہ نویسوں نے آپ کو اورنگ آبادی لکھا ہے۔ لیکن اورنگ آباد آپکا مدفن ہے، مسقط الراس کاکوری ہے۔ کاکوری جا
ن سے آپکے بزرگوں کا وطن ومسکن تھا جہاں وہ نہایت عزت وحرمت سے رہتے تھے داداکے زمانہ میں امارت کے ساتھ فقر کی بھی آمیزش ہوئی،
ت سے آپکے زمانہ تک یہی کیفیت رہی۔ سلوک وامارت کی نہریں دونوں ایک ساتھ بہتی تھیں۔ لیکن آپنے اسطرف آتے ہی اس زمین کو آسمان
یا۔ دادا کا سلوک اپنی ذات کیلئے تھا۔ اور امارت کی وجہ سے یہی بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ اطراف ونواح میں شہرت ہوگئی تھی۔ مگر یہ تے کا سلوک
عام تھا۔ اسکے آوازۂ شہرت سے سارا ہندوستان گونج اٹھا۔

والدین نے تعلیم وتربیت کا انتظام سب اعلیٰ پیمانہ پر کیا تھا۔ ہر علم کو ان علماء سے پڑھوایا تھا جو اس میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ وہ خود بھی
ث وفقہ کے اچھے عالم تھے، کبھی کبھی درس دیتے، اور ہر ہفتہ امتحان لیتے تھے۔ عام نگرانی کی غرض سے ایک اتالیق بھی مقرر تھا۔

دستار فضیلت بندھ چکی تو والدین نے مندیل نکاح باندھنی چاہی۔ پوچھا کیا مرضی ہے؟ بولے اس کیلئے سرکہاں سے لاؤں، ایک کیا
ہ جو دوسروں کی فکر کروں۔ کہا آخر تجرد کی زندگی کب تک بسر کروگے، یہ تو بالکل بے کیف زندگی ہے۔ جواب دیا: دوستوں ایک جگہ جمع نہیں
ین، میری سرشاری کیلئے یہی صہبائے بے کیف کفایت کرتی ہے۔ غرض آپ کسی طرح نہ مانے، اور جتنا زمانہ اعتکاف میں گذارنا قسمت ہوچکا
استقلال وپاکدامنی سے اتنا زمانہ گذار کر شبستان خشر میں داخل ہوئے۔

آپکا مبلغ علم اب تک صرف منقولات تک محدود تھا۔ حدیث، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، ادب، معانی، بیان کی شناوری کرتے تھے۔
لات سے بالکل اجنبی تھے۔ اساتذہ کے اشارہ سے بارہا چاہا کہ اس شجر ممنوع کو بھی ہاتھ لگائیں۔ لیکن والد نے اسی وقت ٹوک دیا۔ وہ معقولات
بان کیلئے زہر ہلاہل سمجھتے تھے۔

لیکن مشیت کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ اسکو یہی منظور تھا کہ آپ اسکی بھی تکمیل کریں۔ آپنے اسکی تحصیل کا بھی عزم کیا۔ والد سے اجازت لینے گئے
ن نے پھر منع کیا۔ وہ بولے، معقولات کے حجرۂ قیل وقال میں جاکر کیا کروگے؟ وہاں سوائے تاریکی کے کچھ نہیں۔ یہاں قدم رکھتے ہی ایمان
یمان کو ترس جاؤگے۔ حق وصداقت کی روح، اور عمل صالح کے جذبات مردہ ہوجائیں گے، ظنون وشکوک کی آندھیاں چلینگی، اور بے اطمینانی
یقینی سے دل کی کلی پژمردہ ہوجائیگی۔ پھر اس سے کیا فائدہ؟ جو راز سربستہ میں سربستہ ہی رہیں گے، معقولات کی تفصیل سے طفلت از اہنہیں کھلے

ان حقیقتوں کا کشف تزکیہ و تصفیہ ہی سے ہو سکتا ہے، تمہیں اس ارادہ سے باز آنا چاہئے۔ ہر مسلمان کو قرآن حکیم بس کرتا ہے، اور ہر شعبۂ حیات کے لئے سنت و سیرت بہترین رہنما ہے۔ اسی کی روشنی میں چلنا چاہئے۔ باقی سب فضول و بیکار ہے۔ غور کروگے تو اصحاب حدیث و سنت کے مقالات طیبہ، رضا ربہ کے ماثورات عالیہ میں، اہل بیت رسالت کے اقوال حکیمہ میں وہ غوامض و اسرار اور نکات و معارف پاؤگے، جس سے یونانیات کے دفتر خالی ہیں، خواہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خودکشی کروگے"۔ تاہم آپ اس پر راضی نہ ہوئے۔ اور کیسے راضی ہو سکتے تھے۔ آپ کو اس راہ پر جس منزل کو پہنچنا تھا، وہاں تک رہبری وہ لیجاتی تھی۔ ناممکن تھا کہ بہتے دریا کی بات کی گرفت سے چھوٹ کر دانہ کے روکے رک جاتے۔ بولے "جو ایمان معقولات سے شکست ہو جائے، وہ اما منی کے قابل ہے۔ اسکے تار و پود کو بکھر جانا چاہئے، جو شخص مقدس کاموں میں تامل کرے وہ گنہگار ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا مذہب ایسا نہیں ہے۔ معقولات کی طرف سے آپکی بدگمانی حد سے گزر گئی ہے۔ اس سفر کی ابتدا آپ بہتر نہیں سمجھتے مگر یقین کیجئے انجام بہتر ہوگا۔ مستقبل کی سربلندیاں آپ کو بلاتی ہیں یقین و ایمان کی جہانتاب روشنی اسی خیمہ سے نکل رہی ہے"۔ یہ کہکر آپ رخصت ہوئے اور اپنے مرکز کی طرف روانہ ہوئے۔

صاحب اخبار الاولیاء اس ذوق و شوق کی وجہ ایک خواب بتلاتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے ایک رات آپنے خواب دیکھا کہ دہلی میں ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوں، دل و دماغ نور ایمان سے تابندہ ہے۔ تعلیمات و تحقیقات کے حجاب اٹھ گئے ہیں جس چیز کی تلاش تھی، وہ مل گئی ہے، اور قرآن مجید پڑھ رہا ہوں۔ یہ دیکھکر نماز شکرانہ ادا کی، اور والدہ سے گفتگو کرنے کا موقع نکالکر دہلی پہنچے۔

دہلی پہنچکر ان بزرگ کی تلاش کی، ڈھونڈتے ڈھونڈتے پتہ چلگیا۔ یہ بزرگ حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی تھے۔

شاہ صاحب کے تذکرہ میں تم پڑھ چکے ہو کہ وہ اپنے عہد کے علماء و فضلاء میں ایک خاص شان رکھتے تھے، اور امامت فی الدین کے درجۂ عالی پر ممتاز تھے۔ ان کے علم و فضل کا صفحۃ المقال رسوخ سنت و سیرت تھا، اور گو اس زمانہ کی دہلی ایسے لوگوں سے خالی نہ تھی جو عقل و نقل میں اعلیٰ درجہ رکھتے ہوں لیکن ان سب کی عملی و اعتقادی حالت دین قیم کے سلک تو بہت سرگشتہ تھی مگر ایک شاہ صاحب ہی ایسے تھے جو دونوں میں فضل و کمال رکھنے کے ساتھ عمل و اعتقاد میں بھی اپنے ہم عصروں کیلئے نمونہ تھے۔ اور دل ربا دست بکار" نے ان باتوں کے حسن و جمال میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا، ارادت و لوگ آتے تھے اور رشد کام ہو جاتے تھے۔ پنجاب، بنگال، سندھ، دکن، گجرات کے طالبان علم و تشنگان طریقت کا ہر وقت انبوہ لگا رہتا تھا۔

آپنے لوگوں سے پوچھ گچھ شروع کی، ہر سوال کے جواب میں یہی سنا کہ ہماری آنکھوں نے اسکا مثل نہیں دیکھا۔ بے تامل انکے در پر آئے، اور اپنے تئیں ان کے حوالہ کر دیا۔ اس وقت سہ پہر کا وقت تھا، مجلس سماع منعقد تھی اور دروازے سب بند تھے۔ آپنے خادم سے کہا، اس نے حاضر ہو کر کہا کہ نظام الدین نامی ایک شخص آیا ہے، فرمایا بلالو، اخوان مجلس نے کہا یہ خلاف قاعدہ ہے۔ فرمایا نام سے شناسائی کی بو آتی ہے، غیر نہیں دوست ہے۔ آدمی گیا اور بلا لایا۔ آپ اس سے پہلے کبھی اس قسم کی مجلسوں میں شریک نہ ہوئے تھے، دیکھکر اچنبھا کرنے لگے، اور ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ بعد سماع گفتگو ہوئی، جناب ممدوح محبت و شفقت سے پیش آئے، اور آپکی درخواست منظور کرکے اپنے ہی مکان کے ایک حصہ میں رہنے کا انتظام کر دیا۔ کھانا اپنے ساتھ کھلاتے، پڑھنا پڑھانا شروع کر دیا، اور تھوڑے عرصہ میں منقولات کے ساتھ معقولات کے دروازے آپ پر وا ہو گئے لیکن اسی کے ساتھ ایک اور کتاب بھی پڑھائی گئی تھی۔ اور اسکی خاموش آوازیں چپکے چپکے آپ کو کچھ اور بھی پڑھا رہی تھیں۔ سماع کی مجلسوں میں بھی آنے کی اجازت تھی، جاتے اور بیٹھ سکتے تھے، مجلسوں میں آپ کبھی کبھی شریک ہوتے، اور عشق کی شورشیں دیکھ دیکھکر اپنے اندر بھی ایک جذبۂ بیتابی پاتے تھے۔

یہ کام جاری ہی تھا، اور دل آہستہ آہستہ پرسوز ہو رہا تھا کہ شاہ صاحب کے ایک عزیز مدینہ منورہ سے آئے۔ اس تقریب میں مجلس سماع منعقد ہو گئی۔ اس روز کمال و بارعب کا جوش حد سے افزوں تھا۔ آپ بھی شریک مجلس تھے، اور ہمہ تن اثر میں ڈوبے بیٹھے تھے۔ مجلس برخاست ہوئی تو آپ جلدی سے اٹھکر بازار کی طرف گئے، اور شاہ صاحب کی جوتیاں صاف کرکے سیدھی کیں۔ انہوں نے تبسم کیا، فرمایا یہ باتیں عالمانہ شان سے بعید ہیں۔ تم یہاں تحصیل علم کیلئے آئے ہو، خدمت چاکری کیلئے نہیں آئے۔ مجھے یہ دیکھکر تکلیف ہوتی ہے، تم میرے مہمان ہو۔ آپکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، عرض کیا ؎

ملکا داویم دل و دیدہ بطوفان بلا　　گو بیا سیل غم و خانہ زبنیاد ببر

بعد ماہ بیعت شریعت کی، اور جب اس میں پوری طرح کامیاب ہوگئے تو داخل طریقت کیا، اور بفضل و کرم چند روز میں اعلیٰ مقامات سلوک تک سربلندی پائی۔ معین الاولیا میں لکھا ہے:

"بطلب علم بخدمت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی رحمۃ اللہ علیہ حاضر شدہ بعد از فراغ علوم ظاہری در تحصیل علوم باطن اکتساب کردہ و محنت و ریاضت شاقہ کشیدہ"

شاہ صاحب کی اجازت ملی، آپ نے شکر نعمت میں تین چلہ کا اعتکاف کیا۔ شاہ صاحب نے اس زمانہ میں خاص توجہ مبذول کی۔ زمانہ اعتکاف سے نکلے تو ملک دکن کی حکومت تفویض ہوئی، اور اورنگ آباد مستقر قرار پایا۔

دکن عرصے سے ایک ہادی شرع و طریق کیلئے مضطرب تھا، ہر طرف مذہبی طوائف الملوکی پھیل گئی تھی، اور دن بدن حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔ لیکن آپ کے جاتے ہی انقلاب کی ہوائیں چلنے لگیں، حالت بدلنی شروع ہوگئی، اور سارا دکن اس مقدس انقلابی کا پابوس ہوگیا۔ ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے لوگوں نے قدم بوسی کی، امرا، فقرا، علما بیعت ہوئے۔ جو شخص آتا بلا فرق و امتیاز حلقہ میں لے لیا جاتا، کسی کیلئے کوئی خصوصیت نہ تھی، شاہ و گدا کا ایک رتبہ تھا۔ بیعت کا سلسلہ اسقدر وسیع ہوا کہ مریدوں کی تعداد پانچ لاکھ سے زائد ہوگئی۔ عقیدت مند دکن کی کل آبادی تھی۔

فتوح و نذرانے بکثرت پیش ہوتے تھے، مگر وہ سب فقرا کا زاد، اور حاجت مندوں کی رفع ضروریات کا بیت المال تھا۔ آپ خود کچھ ریاضت رکھکے اپنی خورد و نوش کا انتظام کرتے تھے۔

لیکن کاکوری کا یہ امیر زادہ داعی طریقت ہی نہ تھا، بلکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی تھا۔ اس آفتاب کی شعاعیں صرف سلوک ہی پر نہیں چمکتی تھیں، بلکہ اسکی روشنی سے اصلاح اعمال کے گوشے بھی منور ہوتے تھے۔ انوار العارفین میں لکھا ہے:-

"در بلدہ اورنگ آباد سکونت اختیار کردہ ہنگامہ تعلیم و تلقین و اعلاء کلمۃ الحق گرم ساخت"

اخبار الاولیا میں لکھا ہے:-

"طالبان راہ یقین و اعیان و اشراف دین را تلقین و ترغیب بمنزل مقصود رسانید"

گاہ گاہ تصنیف و تالیف کا شغل بھی رہتا تھا۔ معین الاولیا میں لکھا ہے:-

"صاحب تصانیف بود، اشہر تصانیف او رسالہ نظام القلوب است"

اتباع سنت کی یہ کیفیت تھی کہ جب سے طریقت میں آئے پلنگ پر نہ سوئے، نرم نرم بستر دینا چھوڑ دیا، ہمیشہ بوریہ پر لیٹتے تھے۔

توجہ دلاتے کہ اس سے چشم پوشی کیجاتی ہے، تو فرماتے ان پریشانوں کے سوا میرے پاس اور کیا چیز ہے جو میں اپنے آقا کے سامنے پیش کرونگا۔ گیہوں کی روٹی گوشت کا سالن نہیں کھاتے تھے۔ ترکاری میں گھی کی بجائے تلیوں کا تیل ڈالا جاتا تھا۔ محبوب ترین غذا جو کی روٹی، ساگ، ثرید اور حلوا تھا۔ بچپن کے زمانے میں اکثر شہد کا استعمال کرتے تھے۔

لیکن اس شدت اتباع کے ساتھ عاشقانہ سرگرمیوں کا بھی یہ حال تھا کہ ہر وقت از خود رفتہ رہتے تھے۔ قریب قریب روزانہ سماع کی مجلسیں ہوتی تھیں، دور دور سے قوال بلائے جاتے تھے، ہر شخص کو شرکت کی اجازت تھی، جو روحانیت کے جام پیتے۔ کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی گویا شیخ دوسرے جام شریعت اور کف سندان عشق کا مجسم نمونہ تھے۔

ایک روز شام کا وقت تھا، یاران طریقت بزم افروز تھے، ایک آیا اور عرض کیا ابھی ایک رباب نواز لایا ہوں، حکم ہو تو حاضر کروں۔ کل ونیک معرب خادم تھے، وہ بولے: کیا صدائے رباب ستار کے بجائے نالوں سے بہتر ہے: فرمایا ؎

از کاسۂ رباب مرا فتنے رسید
شد آفتاب ہر کہ ازان ذرہ چشید

رباب کے ساتھ ہنگامۂ سماع گرم ہوا، اور ساری محفل کو ہلا دیا۔ مجلس برخاست ہوئی تو شیخ مترنم ہوئے ؎

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست
از کجا می آید این آواز دوست

نے ز تار و نے ز چوب و نے ز پوست
خود بخود می آید این آواز دوست

لیکن شاہ صاحب کی زندگی کا یہ رخ ان کی شان سے فروتر ہے۔ ان کا کام طریقت کی بادہ نوازی ہی نہ تھا شریعت کی نور آشامی بھی تھا، اور یہ کام پہلے کام سے مقدم تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ قیام شریعت کیلئے انہوں نے بہت کوششیں کیں، ان کی خانقاہ اعتصام سنت کی جلوہ گاہ تھی۔ مگر افسوس ہے کہ اس جلوہ گاہ کی ساری روشنیوں کو ان کے ایک کام نے دھندلا کر دیا۔ وہ سماع کے اتنے دلدادہ ہو گئے تھے کہ شب و روز اسمیں منہمک رہتے، آزادی و بے باکی سے مجلسیں منعقد کرتے، اور اہل و نااہل سب کو شریک کرتے۔ سماع ایک بہترین روحانی نعمت ہے، لیکن اس نعمت کا حصول چند شرائط پر منحصر ہے۔

اس سے پہلے سخت پابندیاں تھیں، سماع کے خاص اوقات تھے، اول و آخر قرآن حکیم کی تلاوت ہوتی تھی، ہر آغاز میں نعت کا پڑھا جانا ضروری تھا، اور نماز کے وقت مجلس برخاست ہو جاتی تھی۔ لیکن شیخ کی مجلسیں پابندیوں سے آزاد ہوتی تھیں۔ جو شخص چاہتا شریک ہوتا، اکثر نماز کے وقت بھی سماع جاری رہتا، آغاز و اختتام پر تلاوت اور درود و سلام بھی ضروری نہ تھا، اور گانے والوں کیلئے کسی قسم کی قید نہ تھی۔ شیخ کا تو کچھ نہ تھا، مگر عوام کیلئے یہ سماع خطرناک تھا۔ چنانچہ اسی وقت سے سماع میں ایک عظیم تغیر ہو گیا، اشرار و شیاطین کو شکار کھیلنے کا موقع مل گیا، ہر خود کام صوفی بن بیٹھا اور گزرتے آہستہ آہستہ صلاح نفوس سے بیگانہ ہو کر رندی و ہوسناکی کی پرستار بن گئیں۔ ایک صدی کے اندر ہی سماع کی صورت بالکل مسخ ہو گئی، چنانچہ صورتیں بگڑ گئیں اور برائیوں نے اپنے پنجے جما دئیے۔ روح سماع مردہ ہو گئی، اسکی ساری برکتوں اور فائدوں سے کچھ باقی نہ رہا، اور اس ایک چیز نے سلوک چشتی کے ہر خشک و تر کو برباد کر دیا۔

لیکن ایک غلطی ہو چکی اسپر بحث فضول ہے، اصل کام تلافی مافات ہے، طعن و اعتراض کی دریدہ دہنی نہیں ہے۔

سماع کا مقصد عشق الٰہی کے جذبات کو حرکت میں لاتا ہے، یہ نہ ہو تو سماع حرام ہے۔ شیخ یحییٰ منیری نے کہا ہے:

"اگر بود ن کہ محبت و عشق مخلوق بود کار کردن برمن حرام است۔ و ہر چہ شنود آنجا فرود آرد و سماع در حق چنین کسے حرام است"[۱]

خود یہ کہ آپ سنت ایسے لوگوں کی ہے جو عشق الٰہی سے بہت دور ہیں اور سماع کا مقصد بھی نہیں جانتے۔ بلکہ یہ لطف صحبت کا ایک سامان ہے جس میں چھوٹا ہو گا آپ و رنگ دیکر کہلے بندوں شیطانیوں کو پرورش کیا جاتا ہے۔ نفس کی فریب کاریاں گو یہ یقین دلاتی ہیں کہ یہ عشق حقیقی کی جنون انگیزیاں ہیں، مگر حقیقتہً ایسا نہیں ہے۔ انسان کے نفس کا یہ سب سے بڑا فریب ہے کہ وہ اپنی ذات کو بھی فریب دیتا ہے، اور خدا کو بھی اپنے مکر کے جال میں لانا چاہتا ہے۔ پس ایسی حالت میں جبکہ حق وصداقت نے ہر طرف سر اٹھایا ہے، نفس کی مکاریاں کھیل رہی ہیں، عشق الٰہی کا کوئی رکھوالا نہیں رہا، اور دنیا روحانی طیبوں سے خالی ہو گئی ہے۔ تو چاہئے کہ عہد اقبال کی ترانہ سنجیاں بند کر دی جائیں۔ زنانہ صحت و قوت کی غذائیں چھوڑ دی جائیں، اور صحت و اقبال لٹانے والے اخلاق پیدا کئے جائیں۔ ورنہ اس بد احتیاطی اور بے پرہیزی کا نتیجہ موت ہوگا۔ اور جب قویٰ بالکل کمزور ہو جائیں گے، جب زندگی کے عناصر میں اضمحلال اور کمی ہو جائیگی، جب مرض طبیعت پر غالب آ جائیگا، تو کوئی علاج، کوئی تدبیر، کوئی دوا کارگر نہ ہوگی۔ اور جو لوگ ان ان باتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں ان کا ٹھکانا دائمی مفارقت خداوندی اور روحانی کوفت کا جہنم ہوگا۔

آپ کو شاہ صاحب سے بہت محبت تھی، چنانچہ جب ان کے انتقال کی خبر سنی تو حالت غیر ہوگئی۔ معین الاولیاء میں لکھا ہے:۔

"او را با حضرت شیخ علیہ الرحمۃ محبت و موانست بمرتبہ عشق بود۔ چنانچہ بعد وفات شیخ در گوشہ خمول وحسرت، در کنج تنہائی و فراق چندے بسر برده بود و ازتقاضائے طلب از مطلوب حقیقی در رسید۔ علاوہ بریں زحمت مفارقت و مہاجرت ناپسندید۔ لاجرم بموجب اتمام حیات ظاہری بامراض متعدد عارض شدند، و قریب تر از زمان رحلت شیخ محمل زندگانی از یں سرائے فانی بعالم قدس و جاودانی بربستند"

تاریخ وصال ۱۲۔ ذی قعدہ ہے، عمر ۹۳ برس کی تھی۔ مزار اورنگ آباد میں ہے۔

اولاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ پانچ لڑکے تھے۔ لیکن مسند آرائے خلافت فخر الدین ہوئے، جو سلسلۂ نظامیہ کے آخری تاجدار تھے۔

ناظر دہلوی

قرون وسطیٰ میں مشرقی تجارت

تمہید | مشرق و مغرب ہمیشہ ترازو کے پلڑوں کی طرح رہے ہیں۔ جب مشرق مجد و ترقی کی بلندیوں پر جلوہ گر تھا تو مغرب جہالت و ادبار کے گڑھوں میں پڑا ہوا تھا۔ لیکن جب مغرب میں تمدن و تہذیب کا آفتاب طلوع ہوا تو مشرق کی تابناکیاں ظلمت سے بدل گئیں۔ اسی طرح اب جبکہ مشرق میں قرنوں اور صدیوں کے بعد آثار حیات پیدا ہونا شروع ہوئے تو مغربی تہذیب و تمدن میں بھی اسی کے ساتھ ساتھ گھن لگنا شروع ہو گیا اور جوں جوں مشرقی زندگی کے شواہد قوی ہوتے جائیں گے مغربی جسارت و عمران کی بنیاد کھوکھلی ہوتی جائیگی۔

یہ صرف ہمارا خیال و قیاس نہیں بلکہ خود علماء مغرب نے اپنے عالمانہ استدلال سے ثابت کر دیا ہے کہ مغرب روز بروز پستی اور ہلاکت کی طرف جا رہا ہے، اور مشرق کی بیداری بہت جلد مغرب کی موت کی شکل میں نمودار ہونے والی ہے۔

قرون وسطیٰ میں جبکہ مشرق کا آفتاب اقبال نصف النہار پر چمکیلا رہا تھا اور علوم، تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کی ترقی کے باعث چپہ چپہ دولت و فراغت آسائش و بے فکری کا گہوارہ بنا ہوا تھا مغرب پر انتشار و پراگندگی کا دور طاری تھا تمام یورپ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر مستبدانہ و جابرانہ ملوکیت کی غلامی کر رہا تھا، جہالت کی تاریکیوں سے عقل و ہواس خبط ہو رہے تھے۔ غرض کہ تمام مغربی قومیں اوہام و جہالت، تنگ نظری و تعصب کے عذاب الیم میں گرفتار تھیں۔

مغرب کی یہ حالت بدستور اس وقت تک قائم رہی جب تک مشرقی تمدن کا آفتاب مائل زوال نہیں ہوا لیکن بعد میں جوں جوں مشرق کے افق پر تاریکیاں پھیلتی گئیں مغرب میں تہذیب و تمدن کی شعاعیں تیز اور روشن ہوتی گئیں یہاں تک کہ آج وہی مشرق جس کی بسلطانی صدیوں مغرب نے ریزہ چینی کی تھی یورپ کے قدموں کے نیچے غلامانہ زندگی بسر کر رہا ہے اور خدا جانے ابھی کب تک یورپ کے غرور و نخوت کی ٹھوکروں سے مشرق کی پیشانی خون آلود رہے بہرحال یہ ایک جملہ معترضہ تھا جو زبان قلم سے بے اختیار نکل گیا۔ اصلی مقصود مشرق کی تجارت اور اسکے حدود وسعت و ترقی کا بیان ہے۔

فارس | زمانہ کی گردشوں نے جب سکندر اعظم کی عظیم الشان سلطنت کے ٹکڑے کر ڈالے اور یونانی عظمت و جلال کا پرچم سرنگوں ہو گیا تو فارس کو بھی یونانی حکومت کا کافی حصہ مل گیا اور رفتہ رفتہ ایران کی تجارت جو ہندوستان اور وادی فرات میں محدود تھی یونان ہندوستان اور چین تک پھیل گئی اور جب تک اسلام کی مقدس شعاعیں ضوفشاں نہ ہوئیں برابر چار سو سال تک ان ممالک پر ایرانی تجارت کا قبضہ رہا اور دارالسلطنت تونیہ تمدن و ثروت، فراغت و خوشحالی کا مرکز بنا رہا۔

مملکت شرقیہ | قسطنطین نے جب دارالسلطنت بدلنا چاہا اور روم جدید کی بنیاد ڈالنے کا اسکو خیال پیدا ہوا تو اس نے اس شہر کیلئے بیزنطہ کو پسند کیا جو تجارتی اور جنگی اہمیت کے اعتبار سے عدیم النظیر اور قابل رشک مقام تھا اور اسکی تعمیر و تکمیل میں بے انتہا اور بے حساب دولت خرچ کرنا پڑی اور یہی وہ روم جدید ہے جو اول روز سے آج تک دول اور سلاطین کا مطمح نظر بنا ہوا ہے اور تمام حکومتیں اس پر قبضہ و تسلط کے لئے بے چین نظر آتی ہیں۔ چونکہ قسطنطین کا منشاء تھا کہ روم جدید یعنی اس کا جدید دارالسلطنت باعتبار عظمت و شوکت قدیم روم سے بڑھ جائے اس لئے اس نے اس کی تعمیر و آرائش میں دل

قبول کر کے صرف خرچ کیا۔ اسکے بعد بھی اسکے جانشینوں نے بھی اسکے اس منشا کی تکمیل کی طرف سے بے اعتنائی برتی بلکہ اسی ذوق و شوق سے روم جدید کی رونق و عظمت دوبالا کرنے کیلئے فیاضی سے زر افشانیاں کرتے رہے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں لوگوں کیلئے اس امر کا فیصلہ کرنا دشوار ہوگیا کہ روم جدید کو ترجیح دیجائے یا روم قدیم کو۔

پھر جب جسٹینین کا زمانہ آیا تو اسنے اپنے ذوق کے مطابق ملک کی تجارتی اور صنعتی ترقی کی طرف توجہ مبذول کی اور ریشم کے کیڑے فراہم کرکے ریشم کی پیداوار میں اضافہ کرنا چاہا۔ اسے اپنی اس اسکیم میں منشا کے مطابق کامیابی ہوئی علی الخصوص قبرص و سسلیہ کے جزیروں میں ریشم کی پیداوار غیر معمولی ہونے لگی اور بہت جلد حریر و ریشم کی حیرت انگیز صنعت نے اہمیت حاصل کرلی۔ اور اسکی تجارت کے سبب ملکی دولت میں غیر معمولی اضافہ شروع ہوگیا۔

مشرقی یونان میں تجارتی بیڑہ کو خاص اہمیت حاصل تھی لیکن اسی بیڑہ کی بدولت بحر متوسط میں یونانی تجارت کا تسلط و قبضہ تھا۔ یونان کو نامساعد اسباب و حالات کی بنا پر ابتدا میں جو نقصانات برداشت کرنا پڑے تھے اسکی تلافی نہایت سرعت سے قسطنطنیہ (روم جدید) کے روز افزوں عروج و ترقی نے کردی۔ کیونکہ آبادی کی کثرت کے سبب سے ضروریات کی مقدار میں بھی اضافہ ہوگیا اور ان ضروریات کی فراہمی کیلئے ایک زبردست تجارتی بیڑا تیار کیا گیا جس کے باعث یونان کی تجارت نے غیر معمولی وسعت حاصل کرلی خصوصاً مشرقی قطعوں میں۔

یونانی ہندوستان میں تجارت کیلئے بحر قدیم سے اسکندریہ ہوتے ہوئے پہنچتے تھے مگر جب اسلامی اقتدار کی بہت اس راستہ سے آمد و رفت میں حائل ہوگئی تو ان کے قافلے اکثر بلاد فارس سے اور کبھی عرب ہوتے ہوئے اسکندریہ پہنچنے لگے لیکن اسکندریہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوجانے کے سبب سے بحر قدیم کا راستہ بالکل بند ہوگیا اور اب یونان کی تجارت خشکی کے دو راستوں سے ہونے لگی ایک راستہ شام کا تھا جو حلب انطاکیہ اور دمشق ہوتا ہوا جاتا تھا۔ دوسرا بحر اسود کا ساحلی راستہ تھا جو بلاد تتر سے گزرتا تھا بعد میں یونان کا تجارتی سلسلہ روس و وسط یورپ میں شروع ہوگیا جس نے قسطنطنیہ کی تجارت کو اور بھی فروغ دیدیا اور انہوں نے تجارت کا راستہ کیف نوو گراڈ سے ہوکر نیپر اور دریائے ڈنیوب کو باقاعدہ طور پر اختیار کرلیا اور نہر الا درک کی بندرگاہ کے قریب تجارتی مرکز قائم کرلیا چنانچہ نوو گراڈ اور کیف کی تجارت وادی ڈینوب اور جرمنی کی تجارت سے مل گئی۔

اسی زمانہ میں سالونیک اور ٹرابزون نے بھی تجارتی اہمیت حاصل کرلی تھی اور قسطنطنیہ کے بعد انکا شمار ہونے لگا۔ سالونیک کی شہرت اسکی صنعت و تجارت کی وسعت کے سبب سے تھی۔ اور ٹرابزون جو کہ یونانی اور اسلامی سرحد پر واقع تھا اس لئے وہ مسیحی اور مسلمان تاجروں کی منفعت بخش منڈی اور تجارتی نقطہ نظر سے مخصوص رتبہ حاصل کرلیا باقی طیبہ، کورنس اور بطراس بھی تجارت کے مشہور مقامات تھے۔

نہضت اسلامیہ۔ اسلامی تعلیم کا اثر تھا کہ عرب کی بدوی قوم میں دفعتہً تمدن و ترقی کی ناقابل تسخیر قوت پیدا ہوگئی اور اسکے فاتحانہ اقدامات نے تھوڑے سے عرصہ میں شمالی ایشیا، شمالی افریقہ، اسپانیا، اور بلاد سسلی کے ایک حصہ کو ان کے زیر نگین کردیا اور تمام شہروں میں تجارت کی عظیم منڈیاں قائم ہوگئیں اور بلاد اسلامیہ مشرقی تمدن اور علوم و فنون کا مرکز ہوگئے۔

اسلامی صنعت جسقدر جلد مشہور ہوئی اور خوبی و استحکام، صفائی و نزاکت کے اعتبار سے جو کمال حاصل ہوا حیرت انگیز تھا اسکے عالیشان محلات و مساجد اور دیگر تعمیرات نے وہ مقبولیت پیدا کی کہ بغداد کی مسیحی جماعت نے بھی گرجوں کی تعمیر میں انہیں کا اتباع کیا اور ان کی مصنوعات نفیس و زیبائش تکلف و تنعم بعید ترین ممالک میں بے انتہا مقبول ہوگئیں۔

بلاد اسلامیہ میں حسب ذیل مقامات کو تمدن و تہذیب علوم و فنون، تجارت و صنعت کے اعتبار سے اس وقت میں جو شہرت حاصل ہوئی قطعًا غیر فانی ہے۔

دمشق - چونکہ امیہ کا پایہ تخت تھا مختلف صناعیوں میں مشہور تھا علی الخصوص ریشم کا کام وہاں کی اعلیٰ و بہترین صنعت کا نمونہ تھا اور عرصہ دراز تک جب تک بغداد نے عروج نہ حاصل کر لیا دمشق ریشم کے کام کی عظیم الشان منڈی بنا رہا۔

بغداد - دمشق کے بعد بغداد کو عروج ہوا اور عباسی خلافت کا دار الخلافہ ہو گیا اور تین صدی تک اسکو دنیا کے سب سے زیادہ دولتمند و با ثروت شہر کی حیثیت حاصل رہی بغداد کی تجارتی منڈی دمشق کی منڈی سے زیادہ مہتم بالشان تھی کیونکہ وہ تجارت کے بری و بحری راستوں کے وسط میں واقع تھا اور اس کی وسعت کی آبادی میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جو زینت و آرائش کے اعتبار سے دلہن بنا ہوا نہ ہو چپہ چپہ پر تنعم و عیش کا طوفان موج زن تھا طلائی اور نقرئی جواہرات کے ظروف اور ریشم اور حسین و بیش قیمت پردوں کے لباس غرض عیش و تکلف کا وہ کونسا سامان تھا جس کی بغداد میں فراوانی نہیں تھی یہاں تک کشتی کے برتنوں اور چمڑے کے سامان میں بھی انھوں نے ایسی عجیب و غریب صنعت حیرت انگیز خوبصورتی و دلکشی پیدا کر دی تھی بغداد کی تجارت ہندوستان، چین، افریقہ، ایشیا، روس، اسپین اور بالٹک کے ساحلی مقامات تک پھیلی ہوئی تھی وہاں کی تجارت کی ترقی کے سبب سے بلاد تابعہ مثلاً موصل، شیراز، کابل، بخارا، سمرقند، اسکندریہ، قاہرہ، قیروان، فارس، اور بلاد اسپانیا کی صنعت کو بھی بہت ترقی ہوئی الغرض بغداد کی مثال یک یونیورسٹی کی تھی جہاں پر تمام اطراف و اکناف عالم کے علما و طلبہ علوم و فنون کے اکتساب کی غرض سے جمع تھے۔

اسکندریہ - عرصۂ دراز تک اسکندریہ مشرق اور ولایات غربیہ کا خاص مرکز تجارت رہا ہے لیکن فتح اسلامی کے بعد اسکی تجارتی مرکزیت سمٹ گئی۔ بنی طولون نے اپنی تجارت کو وادی النیل اور مشرقی وسط افریقہ میں پھیلا کر لی - اسکندریہ کی مخصوص تجارت سونا، ہاتھی دانت، اسپ اور پردوں کے قیمتی کپڑوں وغیرہ کی تھی جو بعد میں فاس اور قیروان کی منڈیاں قائم ہو جانے سے مسدود ہو گئی -

قاہرہ - قاہرہ حبشہ افریقہ اور ایشیا کے تجارتی قافلوں کا مرکز ہونے کے سبب سے بغداد کی تجارت میں مزاحم رہا ہے اور اسکی منڈیاں اور تجارت کو خاص عروج ہوا ہے قاہرہ کی تجارتی ترقی کا باعث وہاں کی زراعتی اور صنعتی ترقی تھی جس نے تجارت کو رواج دینے میں سہولتیں فراہم کر دی تھیں یہاں سے غلے، کپڑے، زردوزی سامان، چمڑا، اور چمڑے کی مختلف اشیا، پشمینہ اور آٹے وغیرہ کی بہت کثرت سے برآمد ہوتی تھیں۔

قیروان - ہر چند قیروان کو وہ تجارتی عظمت حاصل نہیں ہوئی جو قرطاجنہ نے پائی تھی لیکن پھر بھی اسلامی ممالک میں بہت کچھ نفوذ حاصل تھا اور عرصہ تک ممالک اسلامیہ طرابلس، الجزائر، ٹیونس، صقلیہ اور اسپین کی تجارتی منڈی قیروان ہی بنا رہا اور وسط افریقہ تک اس کی تجارت پھیل گئی -

فاس - یہاں تیز رو، پشمینے، معدنی سامان، اور صابن، کی مختلف مصنوعات کا رواج تھا جو اپنی نزاکت صنعت اور خوبصورتی کے اعتبار سے بہت مقبول تھیں۔ یہاں کے تاجر شمالی افریقہ، وسط افریقہ اور نہر نیجر تک پہنچتے تھے - فاس کی آبادی تقریبًا پانچ لاکھ تھی اور اسے شمالی افریقہ کے تمام بڑے شہروں پر تفوق حاصل تھا -

اندلس - اسپین میں عربی تمدن کے جو آثار و یادگاریں باقی ہیں ان کو دیکھ کر عربی تمدن کی ترقی اور کمال صناعی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے

اور جس طرح اسپین میں مدنیت اور یورپ کی بدویت کا واضح فرق معلوم ہوتا ہے کسی دوسری جگہ معلوم نہیں ہو سکتا قرطبہ دارالخلافہ اندلس کی عظمت و شان اور تجارتی و صنعتی ترقیاں اور اشبیلیہ غرناطہ، طلیطلہ، کے عروج مدنیت کی داستانیں آج تک افسانہ میں تجارتی حیثیت سے ان شہروں میں تمام مشہور ... تجارت کے مال کی درآمد ہوتی تھی اور چونکہ اندلس اپنی پیداوار کے لحاظ سے نہایت ہی آسودہ اور زرخیز ملک تھا اسلئے وہاں کے باشندے اپنی ضرورت کے مطابق غیر ملکی مصنوعات اور سامان کو تبادلہ میں بآسانی حاصل کر سکتے تھے لیکن خود قرطبہ کے چمڑے کی مصنوعات، طلیطلہ کے اسلحہ، اور مرسیہ کی صنعت ریشم و حریر کچھ کم مشہور و مقبول مصنوعات نہ تھیں اسپین اپنی زرعی حیثیت سے بھی نہایت سرسبز و شاداب ملک تھا نیشکر، چاول، کپاس، کھجور مختلف قسم کے پھل اور سبزترکاریاں وہاں کی خاص پیداوار تھی اور معدنی آمدنی اس کی غنا اور دولت میں غیر معمولی اضافہ کا باعث تھی۔

عربوں میں تجارتی آزادی عربی حکومت میں چنگی کے محکمے قائم تھے اور موجودہ دستور کے مطابق عہد اسلامی میں بھی تجارتی ٹیکس کا رواج تھا لیکن محصول کی شرح اسقدر کم اور اسکے حصول کے ذرائع اسقدر آسان تھے کہ تاجروں کو اسکی ادائیگی میں کسی قسم کی دقت اور دشواری پیش نہ آتی تھی۔ نہایت سادی ٹیکس اور اکے تجارتی کاروبار کو قائم رکھ سکتے تھے اور یہی وہ راز تھا جس کے سبب سے عربوں کی تجارت ترقی کے معراج کمال پر پہنچی ہوئی تھی اور اسلامی ممالک تمول اور دولت کی برکات سے متمتع ہو رہے تھے۔

عرب اور مغربی تجارت اس عنوان سے ہمارا یہ مقصد نہیں کہ عربوں کی ترقی کی غیر واقعی حمایت کریں یا ایسے واقعات عربوں کی طرف منسوب کریں جن کے وہ فی الحقیقت مستحق نہیں ہمارا مقصد عربی تمدن نے موجودہ تمدن کی جو کچھ خدمت انجام دی ہے اسکا مختصر تذکرہ تاریخی پیش کرنا ہے حقیقت یہ ہے کہ اندلس میں عربوں کی زرعی و صنعتی ترقی کا ہی نتیجہ تھا جس نے ممالک یورپ میں بیداری کی حرکت پیدا کر دی اور انکو ترقی کی طرف مائل کر دیا جن لوگوں نے تاریخ کے اوراق الٹے ہیں ان کو معلوم ہے کہ عربوں نے زراعت و صنعت کو کسقدر عروج پر پہنچا دیا تھا پارچوں اور معدنیات کی صنعت میں انھوں نے کیسی حیرت انگیز ذہانت و ذکاوت کا دنیا کے سامنے ثبوت پیش کیا ہے علی الخصوص سونے چاندی مسی، برنجی، لوہا، ہڈی، چمڑے، شیشے، مٹی، نگرزی، شکرسازی، اور رنگ بنانے کی صنعت میں اعلیٰ ترقی حاصل کی تھی اور عرب کی یہ تمام مصنوعات ازمنۂ وسطیٰ میں بہرطور قابل فخر خیال کی جاتی تھیں یورپ جو آج تمدنی و حضارتی انتہائی بلندیوں پر چمک زن ہے اس نے عربوں ہی سے ابتداً یہ تمام صنعتیں حاصل کی تھیں اور مغربی تمدن کے آغاز میں عرب ہی مغربی اقوام کے استاد تھے حقیقت یہ ہے کہ اگر یورپ اسلامی تمدن کی غلامی نہ کرتا اور عربوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کرتا تو مغربی تمدن کو معراج پر پہنچنے میں اسقدر جلد کامیابی نہ ہوتی وہ عرب ہی تھے جنھوں نے زراعت اور کاشت کے طریقوں پر علمی حیثیت سے غور کیا اور آب پاشی اور کھاد دینے کے اصول معلوم کئے ان کی آبپاشی کے طریقے نہایت صحیح اور اصولی تھے وہ کھاد دینے اور کھاد کے منافع اور کیمیاوی اصول کے مطابق عمل کرنے سے باخبر تھے انھوں نے اپنی کوششوں سے بعض ایسے زراعتی تجربے حاصل کئے جو کاشت میں ان کے واسطے غیر معمولی طور پر مفید ثابت ہوئے اسکے علاوہ اس زمانہ کی تجارتی دنیا دستگاہ ہی کے ہاتھوں میں تھی اور انھوں نے علمی و جغرافی معلومات سے تجارت کو فروغ دینے میں بہت کچھ آسانیاں حاصل کر لی تھیں تجارتی قافلوں کیلئے راستے تلاش کئے ملکوں اور حکومتوں سے تجارتی تعلقات پیدا کئے مبادلت کے کاروبار میں آسانیاں پیدا کیں راستوں کی حفاظت و مرمت پلوں کا بنانا کنووں کا کھودنا اور آنے جانے والوں کے قیام، آسائش اور امور مہ کے متعلق تمام ذمہ داریاں عرب ہی انجام دیتے تھے۔ یہی وہ امور ہیں جن سے ازمنۂ وسطیٰ میں عربوں کی تجارتی سیادت اور عالم اقتدار کے متعلق ثبوت قطعی پیش کی جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے موجودہ تمدن و ترقی میں عربوں کا خاص حصہ ہے

فریب خیال

(افسانہ)

بسلسلۂ سابق

(۲)

نسیم کو کلکتہ سے آئے ہوئے چار دن ہو چکے ہیں اور رشید کا مکان کا شانۂ حسن بنا ہوا جگمگا رہا ہے۔ میوزک کانفرنس کے جلسوں میں باقاعدہ سب کی شرکت ہو رہی ہے اور منجملہ دیگر حیرت انگیز انکشافات کے یہ حقیقت بھی رشید پر ظاہر ہو گئی ہے کہ نسیم میں جہاں اور صفات تکمیل تک پائی جاتی ہیں، وہیں ایک صفت یہ بھی موجود ہے کہ موسیقی سے اچھی طرح واقف ہے اور ستار نہایت اچھا بجاتی ہے۔ چونکہ رشید خود بھی فطرتاً موسیقی کا دلدادہ تھا اسلئے اس علم نے اسکے جذبات کو نسیم کے حضور میں کسیر نیائش و عبودیت بنا دیا اور اسکی بیقراریاں اس حد سے گزر گئیں کہ ان میں کوئی اور اضافہ ہو سکتا۔

جس حد تک طرح خطوط، تناسب و نقوش کا تعلق ہے، نسیم ایک معمولی عورت تھی، لیکن چونکہ عورت نام جلد و رنگ کا نہیں بلکہ اس فن دلربائی کا ہے جو اسکی نسائی خصوصیات کو نہایت دلفریب رنگ میں پیش کرتا ہے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ نسیم بہت مکمل عورت تھی۔

وہ اسکی پاکیزہ معاشرت، وہ فن تزئین و آرائش میں اس کی غیر معمولی مہارت، وہ رفتار و گفتار میں اسکی صناعانہ تکمیل، وہ موقع محل کے لحاظ سے اسکا صرف تبسم، وہ حجابی کے ساتھ ساتھ اسکا سکوت انفعال، وہ عنفوان شباب کی تمام توانائیوں کے ساتھ اسکا یکسر نزاکت بنا رہنا، وہ اسکا علم مجلس کے تمام رموز و نکات سے باخبر ہونا اور وہ اسکا تہذیب و متانت کے ساتھ علمی و ادبی صحبتوں میں ایک صاحب بصیرت انسان کی طرح حصہ لینا ــــ یہ تمام باتیں اسقدر حسن کے ساتھ نسیم میں جمع تھیں کہ مشکل سے کوئی شخص اسکو دیکھنے کے بعد اپنی جان سلامت لیجا سکتا تھا، چہ جائیکہ رشید، جسکی روح ان میں سے ایک ایک ادا کیلئے مدتوں سے گرسنہ چلی آ رہی تھی ـ اُسے جو قریب سے اس تمام کاروبار برق و تجلی کا نظارہ کیا تو اسکی حالت بالکل وہی ہو گئی جس کو غالب نے "جلوہ ریزی باد کے سامنے پرفشانی شمع" سے تعبیر کیا ہے۔ یا بیدل کے الفاظ میں شمع کے سامنے جو "تمہ داغ و نیمہ خاکستر" حالت پروانہ کی ہوتی ہے۔

ایک رات مختصر صحبت قائم تھی عباس بھی شریک تھا، موسیقی و نسائیت موضوع بحث تھی اور باہم تبادلہ خیالات ہو رہا تھا۔

نسیم نے میوزک کانفرنس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "چونکہ موسیقی سے لکھنؤ کو بہت تازہ نسبت حاصل ہے، اسلئے میرا خیال تھا کہ یہاں کی کانفرنس بہت زیادہ کامیاب ثابت ہوگی، لیکن یہ معلوم کر کے مجھے صدمہ ہوا کہ یہاں کا ذوق موسیقی بہت گر گیا ہے حالانکہ اودھ کی سلطنت کو مٹے ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا، کسقدر حیرتناک امر ہے کہ لکھنؤ میں کوئی ایک ماہر فن بھی ایسا نہیں جو اس میں شریک ہوتا اور اونچے طبقہ کے جو تماشائی تھے ان کی بد ذوقی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے سب سے زیادہ جس چیز کو پسند کیا وہ مہر بند تھا۔ یقیناً ہم آہنگی پر لطف چیز ہے اور ستار کے تمام ساز کو یکجا کر کے انھیں آواز کے ایک مرکز پر لے آنا دلکش امر ضرور ہے لیکن کسی کمال کا مظہر نہیں ہو سکتا۔ اور اہل لکھنؤ کی طرف سے اسکی اسقدر پرجوش پزیرائی سخت تعجب

کی تجربہ تھا۔ سرود بجانے میں فدا حسین خان ستار نوازوں میں عنایت خان جیسے فنکاروں میں الہ کا جیسا کار صرف یہ تھا حاصل اس آل انڈیا میوزک کانفرنس اور اسکے تمام اہتمامات کرنے والوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جسکا ذکر کیا جائے۔ کسقدر سخت غلطی ہے کہ آواز کے حسن کو فن موسیقی سے علیحدہ سمجھ لیا گیا ہے میرے نزدیک یہی خیال اور دیگر مظالم ہیں جو عورت پر مرد کی جانب سے روا رکھے گئے ہیں۔ چونکہ خوش گلوئی میں مرد عورت پر کسی طرح فائق نہیں ہو سکتا تھا اسلئے اسنے موسیقی سے اسکو علیحدہ ہی کر دیا تاکہ عورت مقابلہ میں نہ آسکے۔ مانا کہ دھرپد اصولی چیز ہے لیکن اسکی حیثیت اس خاکہ سے زیادہ نہیں ہے جسے ایک مصور رنگ بھرنے سے پہلے کاغذ پر بناتا ہے۔ یقیناً خاکہ نقش کی بنیاد ہے لیکن نقش تو نہیں۔ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں کچھ لوگوں نے اس حقیقت کو سمجھا اور اسمیں کچھ رنگ آمیزی پیدا کر کے خیال کو رواج دیا۔ لیکن قبل اسکے کہ وہ تکمیل کو پہونچتا سلطنت کا زوال ہو گیا۔ بعد کو شاہان اودھ اور خصوصیت کے ساتھ واجد علی شاہ نے اس میں اور زیادہ رنگینی پیدا کرنے ٹھمری کی بنیاد ڈالی لیکن یہی انجام کو نہ پہونچی تھی کہ یہ سلطنت بھی الٹ گئی اور موسیقی ایک عام دور کس مپرسی سے گزرنے لگی۔ اب پھر اس طرف توجہ ہوئی ہے۔ لیکن جس طرح ہندوستان کی قدامت پرستی نے اسے اور بہت سی ترقیوں سے محروم کر رکھا ہے، اسی طرح موسیقی میں بھی ابتک وہ دھرپد و خیال کی ترقی کو کمال فن سمجھتی ہے ورنہ ضرورت یہ ہے کہ اس خاکہ میں گلکاری کی جائے اور اسمیں عام سامعہ کیلئے جاذبیت پیدا کی جائے۔

مشہور ہے کہ موسیقی سحر ہے اور اس میں کلام نہیں کہ حقیقت یہی ہے۔ لیکن کیا کوئی شخص ان دھرپد گانے والوں کی کریہہ آواز کو سنکر خوش ہو سکتا ہے اور کیا ان استادوں کی بدنما حرکات دیکھنے کے بعد ہنسی ضبط ہو سکتی ہے۔ موسیقی جادو ہے لیکن وہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب آواز، حرکات اور اصول فن سب حسن کے ساتھ مجتمع ہو جائیں، اور چونکہ انکا اجتماع صرف عورت ہی میں ہو سکتا ہے اسلئے فن کے اصلی خط و خال کو دیکھنا ہے تو عورتوں میں اسکو رائج کرنا چاہئے جو قدرتاً اسی کیلئے وضع کی گئی ہیں اور جن کے اعصاب و عضلات کی نرمی آواز کے ہر ممکن لوچ کو قبول کر سکتی ہے۔ ہمارے صوبہ بنگال میں شریف خاندان کی عورتیں اس طرف بہت مائل ہیں اور اپنے اپنے گھروں میں تفریحاً اس کی مشق کرتی ہیں۔ لیکن یوپی میں چونکہ اس کو معیوب فن قرار دے دیا گیا ہے اسلئے میرا خیال ہے کہ ہندوستان کا یہ حصہ جو ہر لحاظ سے ملک کا قلب کہلائے جانے کے قابل ہے۔ اس میں بھی دو صوبوں سے پیچھے رہ گیا۔

عباس۔ "چونکہ آپنے موسیقی کا ذکر کرتے کرتے اس کی تان مسئلہ "نسائیات" پر توڑی ہے، اسلئے قبل اسکے کہ "عورت اور فنون لطیفہ" کے موضوع پر گفتگو کیجائے، "عورت اور نسائیت" کے متعلق بعض مسائل کا فیصلہ ضروری ہے۔

سب سے پہلا سوال جو غالباً مسئلہ تعلیم و آزادی سے بھی مقدم ہے، یہ ہے کہ عورت کے پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، چونکہ دنیا کے تمام مسائل آخر میں اصلاح نظام تمدن پر جا کر قائم ہوتے ہیں۔ اسلئے غور سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورت صرف اسلئے پیدا کی گئی ہے کہ وہ مشاغل حیات میں مرد کی معاون و مددگار ثابت ہو اور تجربہ نے ہمکو یہ بات بتائی ہے کہ اسکی یہ اعانت و امداد ہمیشہ اس ماحول کے تابع رہی ہے جس میں رہکر مرد اپنے اسباب ترقی تلاش کرتا ہے۔ مثلاً عہد وحشت کو لیجئے جب مرد صرف شکار پر زندگی بسر کرتا تھا تو عورت اسکی معاون اس حیثیت سے تھی کہ وہ شکار کو صاف کرتی تھی، گوشت پکاتی تھی اور کھالوں کے ملبوس طیار کرتی تھی، جب عہد زراعت آیا تو اسنے کاشت میں مدد دی، غلہ صاف کیا، پیسا اور مرد کو کھلایا۔ اب اس میکانکی عہد میں اسکی اعانت کا طریق یہ ہے کہ وہ تجربہ گاہوں میں مردوں کے ساتھ رہتی ہے، جیسا کہ

دکھیا کے مسائل میں مرد کو مشورہ دیتی ہے اور اسکے ساتھ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر اسکی مدد کرتی ہے۔

اس لئے قبل اسکے کہ ہندوستان کی عورت کیلئے کوئی طریق عمل مقرر کیا جائے، غور طلب امر یہ ہے کہ یہاں کا مرد کس دور سے گزر رہا ہے اور اسکے حالات کا اقتضا کیا ہے۔ کیا ایسے ملک میں جہاں مردوں میں بھی ایک فی صدی تعلیم یافتہ ہوں، عورتوں کی تعلیم و آزادی کا سوال کوئی برمحل سوال ہو سکتا ہے۔ تعلیم یافتہ شخصوں کیلئے یقیناً ایک جماعت ایسی عورتوں کی ہونی چاہئے جو ان کے ذوق کے لحاظ سے ضروریات ازدواج کو پوری کرنے والی ہو، لیکن اس مسئلہ میں بھی سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ تعلیم جدید سے جو خواہشات ہندوستان کے مردوں میں پیدا ہوتی ہیں وہ کس حد تک درست ہیں اور عورتوں کیلئے انکا پورا کرنا ضروری بھی ہے یا نہیں۔ اولین معیار جس سے نتیجۂ تعلیم کی صحت و عدم صحت پر حکم لگایا جا سکتا ہے، اقتصادی حالت ہے۔ اگر ایک شخص تعلیم مکمل کرنے کے بعد صرف شاعر بن سکتا ہے اور قوت عمل اس کی حرکت میں نہیں آتی تو کہا جائے گا کہ تعلیم بیکار رہی، اسی طرح اگر ایک عورت بیوی بننے کے بعد صرف مرد کے ذوق شعری کو پورا کرنے والی ثابت ہوگی تو ہم کہیں گے اسکی تربیت ناقص ہے اسلئے جس طرح مردوں میں شاعرانہ کیفیات سے پہلے قوت عمل پیدا ہونے کی ضرورت ہے اسی طرح عورت کو موسیقی داں ہونے سے قبل ایک اچھی منتظمہ، ایک سلیقہ مند ماں بننا چاہئے۔

جس طرح دنیا کو ایک فاقہ مست شاعر کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح وہ اہل زندگی کے فرائض سے ناآشنا ہوکر گانے والی سے بھی بے نیاز ہے۔ آپ کو شاید اچھا معلوم ہو لیکن مجھے تو یہ نظر پسند نہیں آسکتا کہ بچہ خراب و سقیم حالت میں رو رہا ہے اور ماں بیٹھی ہوئی الاپ رہی ہے جو جس طرح ہمارے ہاں کے مردوں کو فنون لطیفہ سے پہلے فنون کاسبہ کی ضرورت ہے اسی طرح عورتوں کو مغنیہ بننے سے پہلے مدبرہ بننا ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ بنگال کی پبلک ترقی کے ان ابتدائی مدارج سے گزر گئی ہو، لیکن ہمارے ہاں تو ابھی ان کی ابتدا بھی نہیں ہوئی اور اسی لئے شرفا کی [illegible]توں میں گانے بجانے کو معیوب خیال کیا جاتا ہے جو میرے نزدیک بالکل مناسب ہے، اب یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر [illegible] کوئی شخص واقعی اپنے تمام مشاغل و اکتسابات کے لحاظ سے ایسا ہے جسکو ایک ایسی ہی بیوی درکار ہے جو اپنی تمام خصوصیات نسائی کے لحاظ سے مکمل ہو، جیسے ہمارے رشید صاحب، سو اسکے لئے بین الاقوامی شادی عمدہ چیز ہے یا پھر توکل کہ اس طرح بھی کبھی کوئی بھولی بھٹکی عورت قسمت سے مل جاتی ہے"

عباس کے اس آخری فقرہ کو سنکر نسیم کچھ مسکرائی اور رشید اس خیال سے کہ کہیں نسیم کو ناگوار نہ ہو چین بر جبین ہوا۔ لیکن قبل اسکے کہ عباس کو اسکی تقریر کی داد یا سزا کسی طرف سے ملتی، مرزا عسکری آگئے جو رشید کے مخلص دوستوں میں سے تھے اور گھوڑ دوڑ کے بیحد شائق ہونا گھوڑ دوڑ میں شرکت کا پروگرام انہیں کے سپرد تھا، اسلئے انھوں نے آتے ہی، مختلف خبریں، مختلف معلومات، گھوڑوں کے حالات [illegible] بابت کے متعلق پیشین گوئیوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا اور چونکہ نسیم ہی کی غرض سے رشید نے مرزا عسکری کی خدمات حاصل کی تھیں، اس لئے [illegible] نہایت انہماک کے ساتھ سننے لگی اور آدھی رات کے بعد جب تنہائی ہوئی تو رشید کی ان تمام خاطر داریوں کا اور نیازمندیوں کا صلہ بارگاہ [illegible] حسن سے صرف اسقدر ملا کہ نسیم نے خوابگاہ میں داخل ہوتے وقت اس سے ہاتھ ملایا اور حسیمہ میں ایک برقی رو دوڑا کر پس پردہ غائب ہو گئی۔

---

(۴)

نسیم لکھنؤ سے رخصت ہو چکی ہے اور رشید پر جو ایک عالم اضطراب طاری ہے، اسکی نوعیت پہلے سے زیادہ مختلف ہے۔ اس سے قبل اسکی بے چینیوں کا تعلق صرف کاوش جستجو سے تھا، لیکن اب نسیم سے مل لینے اور اپنی قربانیوں سے اسکو بڑی حد تک مائل سمجھ لینے کے بعد، اسکے اضطراب نے حریصانہ صورت اختیار کر لی تھی اور نسیم کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم ہونے میں ایک لمحہ کی دیر اسے گوارا نہ تھی وہ سمجھتا تھا کہ حصول کامیابی کیلئے جسقدر استحقاق ہونا چاہئے وہ پیدا کر چکا ہے اور اسلئے اب تعویق اسے بیکار تھی۔

لکھنؤ کے قیام میں نسیم نے اپنی اداؤں سے اسکو جس حد تک مغلوب کیا اسکا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ رشید نے اپنے تمام پوست کندہ حالات سے اسکو آگاہ کر دیا اور اسکے عوض میں باوجود اسکے کہ رشید کو اسکی محبت کا یقین ہو گیا تھا، نسیم نے بااصرار کے اپنے متعلق سوائے اسکے اور کچھ نہ کہا کہ "لوگ کہتے ہیں کہ میں مرشدآباد کے شاہی خاندان سے وابستہ ہوں، لیکن اب اس نسبت کا اظہار مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا کیا کسی کا صرف انسان ہونا کافی سبب ہمدردی حاصل کرنے کیلئے نہیں ہو سکتا"،

خاندانی تفوق کے متعلق انکار کے ساتھ ہی، انتہا درجہ درس انسانیت، ایسی معمولی بات نہ تھی کہ رشید اس سے مرعوب نہ ہو جاتا، چنانچہ وہ مرعوب ہو گیا اور بغیر اسکے کہ وہ نسیم کے موجودہ حالات زندگی، اور دیگر افراد خاندان کے متعلق جستجو کرتا، وہ اسی طرح قانع ہو گیا جس طرح بنی اسرائیل اول اول من وسلویٰ پر ہو گئے تھے۔

چلتے وقت رشید نے نہایت دبی زبان سے جب اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ نکاح جسقدر جلد ممکن ہو ہو جانا چاہئے تو نسیم نے اپنی نگاہ منفعل اور محجوب رنگ رخسار سے اسکی منظوری تو دیدی تھی لیکن رشید تعیین وقت چاہتا تھا اور اسکے بابت وہاں بالکل سکوت تھا۔

....

نسیم کو گئے ہوئے بیس دن کا زمانہ گزر گیا ہے اور اسکے دو خطابھی آچکے ہیں لیکن سوائے شاعری کے ان میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے رشید کی آتش شوق تو ضرور مشتعل ہو جاتی ہے، لیکن ساحل کا پتہ اسے کہیں نہیں چلتا۔

وہ اسی فکر میں مبتلا تھا کہ محرر حساب کے کاغذات سامنے لایا اور جسوقت اسکی نگاہ ذیل کے اندراج پر پڑی۔

عطیہ میوزک کانفرنس منجانب مس نسیم و مسٹر رشید	۵۰۰ روپیہ
مہمانداری مس نسیم	۲۲۵ روپیہ
مصارف موٹر	۲۱۰ روپیہ
ٹکٹ گھوڑ دوڑ	۴۰ روپیہ
گھوڑ دوڑ کی قماربازی میں نسیم کو دئے گئے	۲۰۰۰ روپیہ
ٹکٹ ریل از لکھنؤ تا کلکتہ فرسٹ کلاس مع دیگر فروعی مصارف	۱۵۰ روپیہ

تحائف برائے مس نسیم	ساڑی بنارسی	آویزہ جڑاؤ	کڑا طلائی	
	۳۰۰ روپیہ	۲۰۰ روپیہ	۱۰۰۰ روپیہ	۱۵۰۰ روپیہ

اور اسکی مجموعی رقم ۳۰۰۰ سامنے آئی تو دماغ چکرا گیا کیونکہ اسکا کاروبار اتنا بڑھا ہوا نہ تھا کہ اسکا چوتھائی حصہ بھی محض مسیحر دفتر تحائف میں صرف کر سکتا۔ اس نے محرر کو رخصت کر دیا اور دیر تک سر پکڑ کر سوچتا رہا کہ اس کمی کو کیونکر پورا کرے وہ ابھی اسی عذاب میں مبتلا تھا کہ محرر معاً پھر آیا اور اس نے ایک کاغذ پیش کر کے کہا کہ "اس ہنڈی کا روپیہ کل ادا کرنا ہے، میں نے کہا کہ آج ہی آپ کو یاد دلا دوں"

رشید۔ "ہنڈی! کس کی ہنڈی ہے اور کتنی رقم کی ہے"۔ یہ کہکر اس نے کاغذ محرر کے ہاتھ سے لیا اور دیکھا تو اسپر ہندسہ ۲ کے ساتھ بڑے بڑے تین صفر اسکو گھور رہے تھے اور ہنڈی اس کا رخانہ کی تھی جس کے ساتھ خوش معاملگی قائم رکھنے پر اسکے سارے کاروبار کا انحصار تھا۔ میز کی دراز سے اس نے بنک کی پاس بک نکالی پھر سیف کھولکر اسکی رقم کی جانچ کی اور نہایت پریشان صورت کے ساتھ چنخ اٹھا کہ:۔

اگر میں اس ہنڈی کا روپیہ ادا کر دوں تو اسکے یہ معنی ہونگے کہ پرسوں میں بازار سے ایک پیسہ کا بھی مال نہیں خرید سکتا، جن لوگوں سے مجھے روپیہ وصول ہونا ہے وہ اول تو اسقدر جلد ادا نہیں کر سکتے اور اگر ادا کریں بھی تو زیادہ سے زیادہ میں ایک مہینہ تک اور اپنی موجودہ ساکھ قائم رکھ سکتا ہوں۔ اس طرف بے پروائی کا یہ عالم ہے کہ کوئی صاف جواب ہی نہیں ملتا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر ان تمام قربانیوں کے بعد بھی نسیم مجھے مل جائے تو میں کسی طرح خسارہ میں نہیں رہ سکتا، زیادہ سے زیادہ یہ کہ موجودہ تجارت نہ رہے گی نہ رہے، بقدر ضرورت میں اپنی جنبش قلم سے بھی کما سکتا ہوں، مگر کچھ ہو تو سہی، کوئی نتیجہ تو نکلے۔ کیا تار دوں؟ لیکن تار میں لکھوں کیا عباس کی رائے تھی کہ میں بھی کلکتہ ساتھ چلا جاؤں اور وہاں پہونچکر تمام باتیں تحقیق کر لوں، میں نہیں گیا، واقعی غلطی ہوئی۔ کیا اب چلا جاؤں۔ لیکن یہاں کا کاروبار کس کے سپرد کروں، خاصکر ایسی حالت میں جبکہ مالی حالت اچھی نہیں ہے......

وہ اسی فکر میں مبتلا تھا کہ ڈاک آئی جس میں نسیم کا بھی ایک خط تھا۔ اس نے لکھا تھا:۔

"آپ خیال فرماتے ہونگے کہ میں نے قصداً آپ کو زحمت انتظار میں مبتلا رکھا، حالانکہ آپ چاہتے، تو یہ بھی سمجھ سکتے تھے کہ ممکن ہے کوئی مجبوری ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نے لکھنؤ جا کر اپنے اوپر بڑا ظلم کیا۔ ملنے سے پہلے تو میں اپنے دل و دماغ کو دھوکہ دے بھی سکتی تھی، لیکن اب کہ آپکی محبتوں اور غیر معمولی قربانیوں کے گہرے نقوش اک تسلیم شدہ حقیقت کی صورت اختیار کر چکے ہیں، باوجود کوشش کے بھی آپکی ہستی کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتی۔

اس درمیان میں ایک سخت آزمائش کا سامنا ہوا۔ میرے والد ہر چند بہت روشن خیال ہیں، تاہم ابھی ان میں

محبت سے آثار قدامت کے پائے جاتے ہیں اور شادی کے متعلق ان کے اصول مجھ سے کچھ مختلف ہیں انکے نزدیک زندگی کی حقیقی راحت عبارت ہے صرف دولت و امارت سے اور میرے ہاں صرف محبت و صداقت سے۔ عرصہ سے وہ میری شادی کی فکر کر رہے ہیں۔ حال ہی میں ایک پیغام صوبۂ بہار کے ایک ایسے شخص کی طرف سے آیا جو میرے والد کے ذوق کے مطابق تمام تر ہیں۔ حضرت کونسل کے ممبر ہیں، بیرسٹر ہیں۔ لاکھوں کی جائداد رکھتے ہیں اور خاندانی ہیں۔

مجھ سے ذکر آیا تو میں خاموش ہو گئی۔ لیکن میں نے یہ محسوس کر کے کہ ابا دا وہ میری خاموشی کو رضامندی سمجھیں، میں نے انسے کہا کہ فی الحال اس مسئلہ کو ملتوی کر دیا جائے، کیونکہ میری صحت ابھی اچھی نہیں ہے اور میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی، لیکن اسکو معقول عذر تسلیم نہیں کیا گیا اور مجھ پر زور دیا جا رہا ہے کہ جلدی راضی ہو جاؤں۔

اس میں شک نہیں کہ عام نقطۂ نظر سے یہ بہترین پیغام ہے، لیکن میرے لئے وہ بالکل بیکار ہے اور ایک لمحہ کیلئے بھی اپنے آپ کو میں اسکے قبول کرنے کیلئے آمادہ نہیں پاتی۔ بہرحال میں نے بڑی کوشش سے چند ماہ کیلئے اسکو ٹال دیا ہے اور آئندہ مہینے کشمیر کا عزم کر رہی ہوں، بہانہ تبدیل آب و ہوا کا ہے لیکن مدعا یہ ہے کہ آپکی معیت حاصل ہو جائے اور اگر مناسب ہو تو وہیں وہ مسئلہ بھی طے ہو جائے جس کیلئے آپ مضطر ہیں اور میں بیتاب۔

اگر آپ جا سکیں تو مجھے اطلاع دیجئے تاکہ بجائے کشمیر کے کسی اور جگہ چلی جاؤں، کیونکہ میرا یہاں سے چند دن کیلئے باہر چلا جانا ضروری ہے اور اگر آپ آمادہ ہوں تو لکھئے کہ کس تاریخ تک آپ طیار ہو سکیں گے، تاکہ میں اسی دن لکھنؤ پہونچ جاؤں۔

آپکی نسیم

اس خط کے مطالعہ کے بعد جو بات رشید کی ہوئی چاہئے، اسکا اندازہ مشکل ہے۔ ایک طرف تو جذبۂ رشک کہ نسیم کا خواہاں ایک [illegible] جو مالی حالت اور ذاتی وجاہت کے لحاظ سے کہیں اس سے زیادہ ہے۔ دوسری طرف مالی مشکلات جن کے دور کرنیکی کوئی تدبیر نظر نہ آتی تھی، چونکہ کشمیر جانے کا سب کے لئے کم از کم دو تین ہزار روپیہ کی ضرورت تھی۔ کیونکہ کشمیر کے سفر کا ٹالدینا سب سے زیادہ مشکل تھا کہ اسپر ساری امیدوں کی کامیابی کا انحصار تھا۔ وہ دیر تک ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہئے آخر کار اسنے فیصلہ کیا کہ کشمیر کا جانا ضروری ہے اور اسکے لئے سب سے پہلے روپیہ کی فکر کرنا چاہئے۔ ممکن تھا کہ وہ اپنے احباب و اعزہ سے کچھ روپیہ قرض لے سکتا، لیکن ضرورت ایک بڑی رقم کی تھی اسلئے وہ فوراً آگرہ روانہ ہو گیا اور وہاں اپنے مکان مسکونہ کو دس ہزار میں ایک مہندو ابل محلہ کے پاس رہن کر کے چوتھے دن لکھنؤ واپس آگیا اور نسیم کو تار دیدیا کہ "میں [illegible] آپکا انتظار کرونگا"۔

(باقی)

نیاز فتحپوری

ہندو مسلمانوں کے دور حکومتیں

مسلمان سلاطین ہند کے دورِ حکومت میں ہندوؤں کی تعلیمی و مذہبی آزادی اور ملک کے انتظامی محکموں میں انکی اکثریت کی داستان اگرچہ بہت طویل ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ پر از معلومات اور دلچسپ بھی ہے آج نہ صرف ہند بلکہ یورپین مورخین بھی اہل اسلام کی ... نامی اور گزشتہ کارناموں پر جہالت و گمنامی کا پردہ ڈالنے کی فکر میں نہایت بیباکی اور ناجائز جرأت سے کام لے رہے ہیں، قوم کی ادبی محفل سیاسی ڈراموں اور شب و روز کے پبلک جلسوں میں غرضکہ ہر جگہ ہمارے قدیم خصائل حسنہ اور شاہانِ اسلام کے علمی و سیاسی فیوض و برکات اور اسلام کے تمدنی اثرات پر حملہ کر کے تاریخ کے ان واقعات اور حقائق سے عمداً انکار کیا جا رہا ہے جو روز روشن کی طرح ہر خاص و عام پر ظاہر ہیں کبھی ہم پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم نے مذہبی تعصب میں آکر بت شکنی اور انہدام معابد کو اپنا خاص مطمح نظر بنا لیا، اہل ہنود کی مذہبی آزادی کو سلب کر لیا اور انتظام مملکت میں ہندوؤں کو کوئی حصہ نہ دیا، غرضکہ کوئی ایسا وحشت انگیز واقعہ نہیں جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کیا جاتا ہو، ہم اس مسئلہ پر مفصل بحث کر کے یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ انکے اعتراضات کہاں تک معیار صحت پر پورے اتر سکتے ہیں اور اہل ہند کی طرز معاشرت انکے اخلاق و علمی مذاق پر اسلامی تمدن کا کسقدر اچھا اور خوشگوار اثر پڑا ؟ اور اس حیثیت سے ہندوستان کی قدیم تہذیب مسلمانوں کی کہاں تک ممنون ہے، میرے خیال میں صحیح اور سچے واقعات و اسرار کے سرچشمہ تک پہونچنے میں زیادہ تر تنگ دلی اور تعصب مذہبی کے علاوہ جو شئے مانع ہوتی ہے وہ موجودہ زمانہ کی ان تاریخی کتابوں کا وجود ہے جو برٹش گورنمنٹ کے اہتمام میں شائع ہو رہی ہیں اور جن تک عوام الناس کے ایک بہت بڑے طبقہ کی نگاہیں محدود ہو کر رہ جاتی ہیں لیکن حقائق آشنا ارباب اور نکتہ رس نگاہوں کو اسکا خوب احساس ہے کہ ان فرضی افسانوں میں اصلیت اور حقیقت کی جھلک کہاں تک نمایاں ہے اور وہ داستانیں جنکو ہم آئے دن ایک خود فراموشانہ محویت اور استغراق کے ساتھ پڑھ لیا کرتے ہیں وہ پایۂ اعتبار سے کس حد تک ساقط ہیں اس موقع پر جبکہ ہم ایک مسئلہ کی تحقیق کے لئے نکلے ہیں اور ہماری نگاہیں بار بار گردوپیش کے واقعات، تغیرات دہر اور انقلابات زمانہ پر پڑ رہی ہیں علمی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہو کہ تعصب قومی کو ترک کرتے ہوئے واقعیت اور حقیقت کے چہرہ سے پردۂ جہالت کو چاک کرنے کی کوشش کریں اور تھوڑی دیر کیلئے باہمی مخاصمت اور بغض و عناد کو نظر انداز کر کے جو تجربۃً آئینِ معدلت پروری اور انصاف کے سراسر خلاف و منافی ہے، صحابۂ کرام کے زمانہ میں ایران و خراسان کے فتح ہو جانے کے بعد اگرچہ اہل عرب کا کاروان تجارت ہندوستان کے مغربی ساحل پر برابر آتا رہتا تھا مگر سیاست و حکمرانی کے لحاظ سے عربوں کو ہندوستان سے کچھ تعلق و ربط نہ تھا، لیکن زمانہ کی مساعدت اور تائید آسمانی کی پیہم امداد و چارہ جوئی نے اہل اسلام کی عالمگیر مادی ترقی اور انکی شہرت میں چار چاند لگا دیئے اسلامی رقبہ کی وسعت انتہا کو پہونچ گئی قتیبہ بن مسلم باہلی، مسلمہ بن عبد الملک، موسیٰ بن نصیر اور محمد بن قاسم ثقفی جیسے اسلام کے نامور بہادروں اور مشہور سپہ سالاروں نے ایک عالم کو زیر و زبر کر دیا، اناطولیہ کے قلعے و ... اور فتح شمالی افریقہ اندلس، مرو، بخارا، اور سندھ کا ایک بہت بڑا حصہ اسلامی حکومت کے تحت میں آگیا، محمد قاسم کو مشہور اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک نے سندھ کے

پرامن دور حکومت میں حملہ آور ہونے کا فخر حاصل ہوا، یہ اہم واقعہ جیسا کہ بیکم و کاست تاریخوں میں مذکور ہے وہ یہ ہے کہ سرندیپ کے راجہ نے وقتی ضرورت کی بنا پر جزیرہ کے یتیم اور بے خانماں مسلم عورتوں اور بچوں کو کچھ تحفہ و تحائف دیکر حجاج گورنر عراق کے پاس بھیجنا چاہا، جہاز جبوقت سندھ کے ساحل پر پہونچا ہے موجودہ حکومت کی بدترتیبی اور بدنظمی کے باعث شاہی سپاہیوں نے دست درازی کی جرأت کی اور سارے مال و متاع و اسباب معیشت کو ضبط کرلیا، اس وحشتناک خبر کی اطلاع جسوقت حجاج بن یوسف ثقفی کے پاس پہونچی، اسنے راجہ داہر والی سندھ کی خدمت میں کئی عرضداشتیں روانہ کیں مگر یہ ساری کارروائی بے سود اور لاحاصل رہی بالآخر حجاج نے دربار خلافت کے ایماء سے اپنے عزیز محمد قاسم کو ایک لشکر دیکر راجہ داہر سے انتقام لینے کیلئے روانہ کیا، عربوں کی اس مختصر فوج نے ۷۱۲ء میں راجہ کو شکست فاش دیدی، راجہ مارا گیا اور ایک قلیل مدت میں برہمن آباد اور ملتان عربی علم کے نیچے آگئے، سرکش اور متمردوں نے اطاعت و انقیاد کو پسند کیا لیکن ملک سندھ کی ساری تاریخ پڑھ جانے کے بعد آپکو یہ کہیں نظر نہ آئیگا کہ اس عربی سپہ سالار نے کوئی ایسی بیجا حرکت کی ہو جو اصول سیادت شہنشاہیت کے خلاف ہو، اسمیں کوئی شک نہیں کہ دوران جنگ میں کہیں کہیں انہدام معابد کے واقعات رونما ہوگئے مگر یہ ویسا ہی ہے جیسا کہ آج انتہائی عروج و ترقی کے زمانہ میں متمدن سے متمدن قوم کا بحالت جنگ دستور العمل رہا ہے، اگرچہ اضطراری حالت میں محمد قاسم کو ان افعال قبیحہ سے دوچار ہونا پڑا مگر اسکے بعد اس نے اپنی اس غلطی کا فراخدلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ازالہ بھی کردیا چنانچہ ملک کے مسمار شدہ مندروں کی تعمیر کی برہمنوں کو عام اجازت دیدی[1]، سندھ کے قدیم راجاؤں کے زمانہ سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ ملک کے محاصل سے فی صدی تین روپیہ مندروں کی تعمیر اور برہمنوں اور پجاریوں کے مصارف ذاتی کے واسطے شاہی خزانہ سے جدا کرلیا جاتا تھا، اسکی وجہ سے کہیں نئی نئی عبادت گاہیں تعمیر ہوتی تھیں اور برہمنوں اور پنڈتوں کو کسب معاش اور طلب رزق کی جانب سے بالکل دلجمعی و اطمینان ہوجاتا تھا محمد قاسم نے بھی اس اصول کو جاری رکھکر سندھ کے قدیم شاہانہ ہنود کی تقلید اور اتباع کی چنانچہ اسکی وجہ سے ایک کثیر آمدنی جمع ہوگئی اور مسمار شدہ مندروں کی تعمیر میں اس سے خاص امداد و اعانت ملی، کیا یہ اسلام کی شرافت رعیت پروری اور بے تعصبی کی مثال نہیں؟ محمد قاسم نے برہمنوں کی حفاظت کا ذمہ لیا اور اعلان عام کے ذریعہ پبلک کو متنبہ کردیا کہ انکے معابد اور مذہبی مقامات کی ویسی ہی حفاظت کیجائیگی جیسا کہ آج شام و عراق میں یہودیوں اور عیسائیوں کے معابد اور مجوسیوں کے آتشکدوں کی کیجاتی ہے، فاتح اور مفتوح قوم کے درمیان جو شے مایۂ شرافت انسانی اور کرم و عدل گستری کی بہترین مثال قائم کیجاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ بادشاہ اپنی رعیت کو ہر قسم کے حقوق عطا کرے اور اسکے بہترین اور قابل افراد کو مناصب جلیلہ پر سرفراز و ممتاز کرے، محمد قاسم نے اس اصول جہانبانی پر جسطرح عمل کرکے دنیا کو دکھلا دیا اسکی نظیر غالباً آپکو غوری، غلام، خلجی اور تغلق خاندان کے امرا و سلاطین کے صحیفۂ حیات میں بھی نہیں ملسکتی، قبضۂ سندھ کے بعد عربوں کو ملکی تنظیم و تنسیق کی حاجت پڑی اور انہوں نے نہایت شد و مد کے ساتھ برہمنوں کو جنپر انہیں کامل اعتماد تھا ملک کے مختلف عہدوں پر مقرر کرنا شروع کردیا، محمد قاسم نے ایک اعلان کے ذریعہ انکو مطلع کیا کہ ملک کے مشہور و قابل افراد سے مجھے آگاہی ہونا چاہیئے تاکہ میں انہیں حکومت کے کاموں میں لگادوں اور ملک کا سارا انتظام انکے ہاتھ میں دیدوں

[1] تاریخ ہند لطیف جلد اول

اعلان مین یہ بھی تھا کہ یہ عہدے جو انھین دئے جائین گے ان سے چھین کر پھر ہرگز کسی دوسرے کو سپرد نہ کئے جائین گے اس اعلان پر جس سختی کے ساتھ عمل کیا گیا اسکی تفصیل آگے آتی ہے برہمن آباد صوبہ سندھ کا ایک بہت ہی اور متبرک شہر تھا جسوقت وہ مسلمانون کے ہاتھ آیا تو محمد قاسم نے وہان کا سارا انتظام برہمن شرفا کے اختیار مین دیدیا اور قبائل اور جاندیہ اشخاص کو مجلس شوری کا ممبر مقرر کیا، ملک کے وصول مالگواری کے محکمون مین چونکہ حساب دانی کی از بس ضرورت تھی اور اہل عرب اس سے ناواقف تھے اسلئے یہ سارا محکمہ قریب قریب برہمنون ہی کے ہاتھون مین تھا قبول اسلام کیلئے محمد قاسم نے کبھی بھی جبر و اکراہ سے کام نہین لینا پسند نہ کیا، پنچ ذاتون میں سے مثلاً شہ بجات وغیرہ جنہین ہند کی قومیت کے مطابق برہمنون کے مقابلہ مین نہایت حقارت آمیز نگاہون سے دیکھا جاتا تھا وہ اسلام کی مساوات، حریت کو دیکھکر کثرت سے اسلام لائے اور عربی لشکر مین بھرتی ہوکر بلاد اسلامیہ کے اکثر حصون مین سکونت پذیر ہوگئے، بہت سے نومسلم جو شام و عراق مین جاکر آباد ہوئے انہین سے بعض ایسے بھی گزرے ہین جو اپنے وقت کے فن رجال و حدیث کے امام تھے بعضون نے عربی شاعری مین کمال پیدا کیا چنانچہ ابوعطا سندہی سندھ کا ایک مشہور شاعر گزرا ہے جسکے چند اشعار ابو تمام نے حماسہ مین درج کئے ہین، چنانچہ وہ یہ ہین،

الا ان عینا لم تجد یوم واسط	علیک بجاری دمعہا لجمود
عشیۃ قام النائحات وشققت	جیوب بایدی ماتم وخدود
فانک لم تبعد علی متعہد	بلی کل من تحت التراب بعید

دیار سندھ کے امرائے ہنود نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی دعوت پر اسلام قبول کیا جنہین جیشیا اور جے سیہ خاص شہرت رکھتے ہین، تبدیل مذہب کی غرض سے ان پر کوئی دباؤ نہین ڈالا گیا بلکہ یہ انکی اس فطرت سلیما ور عقل و دانش کا اقتضا تھا جو توفیق ایزدی سے انکے حصہ مین آئی

عربون نے ہندوؤن کے قدیمی قانون کی حفاظت مین کچھ کوتاہی نہین کی، راجہ چچ کے زمانہ سے یہ قانون چلا آتا تھا کہ نیچی ذات کے جاٹون کو اسپ سواری اور ریشمی لباس زیب بدن کرنیکی سخت ممانعت کردی گئی تھی، محمد قاسم نے بھی اس اصول کو باوجود اسکے کہ اسلام مساوات کا عام حکم دیتا ہے محض ہنود و شرفا اور امرا کی خاطر برقرار رکھا، سندھ مین ہندوؤنکی اقتصادی و مالی حالت قریب قریب ابتری کو پہونچ چلی تھی، ساحلی مقامات پر قزاقون اور حملہ آورون کی شورش و ہنگامہ خیزی نے بحری تجارت اور اسکی فروغ کو سخت صدمہ پہونچایا تھا، حکومت اس فتنہ کے انسداد سے جیسا کہ تاریخ شہادت دیتی ہے بالکل عاجز تھی، فوج کا کچھ باقاعدہ انتظام نہ تھا، نہ انکے لئے عمدہ تفریحی مقامات تھے جس سے انکی صحت جسمانی برقرار رہتی، نہ قلعے تھے، نہ فوجی چھاؤنیان تھین، نہ عمدہ تجارتی شہر و قصبات آباد تھے جس سے انکے طرز حکومت و سیاست و تمدن اور تمدن و شائستگی کا پتہ لگایا جاسکتا، وحشت و بربریت کے آثار ہر جگہ نمودار تھے کوئی ایسا نظام موجود نہ تھا جس سے قومی تنظیم مین اعانت ملتی، لیکن مسلمانون نے سندھ کی تجارت کو بہت فروغ دیا چنانچہ تھوڑی مدت مین بری و بحری تجارت کا دروازہ کھل گیا، خراسان، زابلستان، سیستان، اور کابل سے بیشمار کاروان

تجارت سندھ مین آنے لگے، اسکی وجہ سے ہندؤن کی اقتصادی حالت مین بہ نسبت پہلے کے ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا ابن خردادبہ مشہور عباسی مدبر اعظم نے اپنی کتاب مین سندھ کا ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے سندھ مین چین روس افریقہ اور یورپ کے کاروان تجارت برابر آتے تھے بری وبحری تجارت کا بازار ہمیشہ گرم رہتا تھا مختلف چیزین جنکا پہلے سندھ مین وجود تک نہ تھا اب بکثرت بازارون مین دستیاب ہونے لگین [1]

ابن حوقل واصطخری کا جغرافیہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دو صدی کی عربی حکومت نے سندھ کی حالت بالکل بدلدی تھی، قندابیل، جندور، الور، شہرستان، نیرون، قصدار، تجارت کے خاص مقامات تھے جہان فوجی چھاؤنیان، شاہی دفاتر کی عدالت اور شفاخانے بنے ہوئے تھے، ہندون کے باہمی مناقشات طے کرنیکے لئے ملک کے گوشون مین پنچایتین مقرر تھین، ان تمام باتون سے بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ محمد قاسم کے زمانہ مین مذہبی آزادی، رعیت پروری اور معدلت گستری کا کس قدر اعلیٰ اور بہتر انتظام کیا گیا تھا۔ محمد قاسم کے مرجانے کے بعد اگرچہ عالم اسلامی مین بہت کچھ انقلابات رونما ہوئے اور ابومسلم خراسانی کی امداد واعانت سے بنی عباس بنی امیہ پر غالب ہوگئے، لیکن پھر بھی خلیفہ المعتضد باللہ کے زمانہ تک عربون کا تعلق سندھ سے بہت کچھ باقی رہا، متعدد امراء وعمال سندھ مین بھیجے گئے، اور انھون نے بھی آخر وقت تک محمد قاسم کے قائم کردہ اصول کو دستور العمل بنانا اپنا فرض منصبی خیال کیا، اسکے بعد شہنشاہ اکبر کے زمانہ تک ملک سندھ مین مختلف خاندان مثلاً جام، چوپان، سمہ، ارغون اور ترخان کے امراء خود مختارانہ حکومت کرتے رہے مگر انکی حالت کو قیام واستقلال حاصل نہ تھا، اسوجہ سے یہ پتہ لگانا سخت دشوار ہے کہ انھون نے اپنون اور بیگانون کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ رکھا اور اصول جہانبانی کو کس حد تک نباہا، اسکے تقریباً پونے تین صدی بعد ہندوستان مین محمود غزنوی کی شمشیر بے پناہ چمکنے لگتی ہے بت توڑے جاتے ہین، عام قتل ہوتی ہے اور مذہبی مقامات اور مندرون کے زر وجواہر لوٹ لئے جاتے ہین، بادی النظر مین محمود کی یہ تمام حرکتین ایک فاتح کی شان کے بالکل خلاف نظر آتی ہین، یہی وجہ ہے کہ مخالفین کی طرف سے محمود پر تعصب مذہبی کا الزام رکھا جاتا ہے، لیکن عدل وانصاف کا یہ تقاضا ہے کہ دنیا کی کسی شے پر دفعتاً ایک نگاہ غلط انداز ڈالکر اسکے حسن وقبح کے متعلق قطعی فیصلہ کر دیا جائے۔ واقعہ اور نفس الامر یہ ہے کہ دنیا مین اس قسم کے جتنے فاتحین گزرے ہین اور جنھون نے اقوام مفتوحہ پر اس قسم کے مظالم ڈھائے ہین انکا اصل مقصد دولت وثروت کو حاصل کرنا تھا، تعصب مذہبی سے انھین کچھ سروکار نہ تھا مگر بعض وقت انکے سلسلے مین وہ اس قسم کا کام کرجاتے تھے جس سے کمزور اقوام کے مذہبی جذبات کو سخت ٹھیس لگتی تھی۔ یورپ جو آج تہذیب وتمدن کا مدعی ہے خود اس عالمگیر مرض مین گرفتار نظر آتا ہے اسکی تازہ مثال دیکھنے کیلئے جنگ عظیم کے عبرت انگیز واقعات کو بغور پڑھنا چاہئے، جرمنی نے ہوس عالمگیری اور جاہ پرستی مین خود اپنے ہم مذہب بلجیم کے بیشمار گرجون اور عبادتگاہون کو صفحہ ہستی سے ناپید کر دیا۔ اور لاکھون انسانون ذی روح ہستیون کو موت کے گھاٹ اتار دیا، لیکن کیا مین آپ سے پوچھ سکتا ہون کہ جرمنی کی یہ انسانیت سوز حرکتین تعصب مذہبی کی بنا پر تھین؟ کیا تاریخ اور حقائق کے لحاظ سے اسکا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے؟ جب دنیا کی مہذب سوسائٹی طمع پرستی اور

[1] کتاب المسالک والممالک صفحہ ۶۳ اور ۱۵۶

کشت و خون سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ آج سے آٹھ صدی پیشتر جب تمام تر یورپ جہالت و گمنامی کے ظلمات میں پڑے ہوئے تھے اور تمدن و شائستگی سے قطعاً نا آشنا تھے محمود و علاء الدین ان افعال قبیحہ کے دستبرد سے آزاد رہتے، واقعہ یہ ہے کہ حملوں کی اصلی محرک ہند کی تجارت و دولت کا فروغ تھا اور اکثر یہ مال و متاع پوجاریوں کے ہاتھ مندروں میں اکٹھا ہوتا رہا چنانچہ پہلی آفت ان مندروں پر گرتی تھی، یہ نہایت دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے مندر اور بت خانے اگر مساجد کی طرح زر و سیم سے خالی رہتے تو محمود شہاب اور علاء الدین دکن پر کبھی حملہ آور نہ ہوتا، علاوہ بریں انہدام معابد مفتوحین کی جنگی اسکیم کا ایک جزو تھا چنانچہ وسط ایشیا کی اسلامی حکومتوں کے ساتھ انکا وہی برتاؤ کیا جو ہندوؤں کے ساتھ کچھ دنوں بعد پیش آنے والا تھا، غرضکہ محمود کا یہ حملہ اقتصادی طمع کی بنا پر تھا تعصب مذہبی کو اسکے مزاج میں کچھ دخل نہ تھا، اور اگر محض دنیاوی طمع و حرص پرستی کا محمود کو ملزم ٹھہرایا جا سکتا ہے تو پھر دنیا کا محمود جیسا فاتح اس الزام سے بری نہیں ہے پھر بھی محمود نے جو کچھ کیا بحالت جنگ کیا امن و آشتی کے زمانہ میں درندگی و بربریت کا کوئی واقعہ اسکی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا، حکومت کی حیثیت سے محمود کا تعلق ہندوستان کے ساتھ بہت ہی قلیل رہا مگر اس حالت میں وہ عدل و انصاف کا سچا پرستار بنکر رہا مورخ البیرونی مشہور ہیئت دان عالم جو محمود کے ساتھ ہندوستان کی سیر کو نکلا تھا اس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ محمود کے عہد میں امن و امان کا کافی دور دورہ تھا غیر اقوام کے ساتھ حتی الامکان انصاف سے کام لیا جاتا تھا، رعایا فارغ البال اور خوشحال تھی، محمود کے بعد اسکے بیٹے سلطان مسعود نے باپ کی قائم کی ہوئی روش پر عمل کیا بلکہ اپنی ہندو رعایا کے ساتھ بہت کچھ بہتر سلوک کیا جس سے اسکی رعیت پروری شرافت نفس کا کافی ثبوت ملتا ہے، اسکے زمانہ میں احمد نیال تگین ہندوستان کا سپہ سالار تھا یہ وزیر کی طمع نے اسے بنارس جیسے ہندوؤں کے متبرک شہر پر غارتگری کرنے پر آمادہ کر دیا سلطان نے اس موقع پر اسکی گوشمالی کیلئے جس شخص کو مقرر کیا اور اسکی بجائے جسکو سپہ سالار بنایا اسکی مثال آجتک ہندوستان میں نہیں پائی گئی، وہ تلک نامی ایک ہندو تھا قاضی ابوالحسن شیرازی جیسے اساتذۂ فن کی فیض صحبت کا تربیت یافتہ تھا، اس نے احمد کو شکست دی اور اسکا سر کاٹکر دربار شاہی میں روانہ کیا سلطان تلک کی اس خدمت کا دل سے ممنون ہوا، اس واقعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کو ہندو رعایا کے مذہبی جذبات کی کسقدر پاسداری منظور تھی غوری خاندان کے بعد تخت دہلی پر غلام خلجی تغلق سید لودھی اور سور خاندان کے مختلف امرا و سلاطین نے کئی صدی تک نہایت کر و فر کے ساتھ حکومت کی لیکن انکی حکومت ہمیشہ جنگی حالت پر رہی کبھی ایک حالت پر قیام نہ رہا، طوائف الملوکی اور خانہ جنگیوں سے کبھی فرصت نہ ملی مسٹر گوبند لائل صاحب لکھتے ہیں :-

جو فاتحین اسلام شمالی ہند میں شاہی خاندانوں کے بانی ہوئے یا جنہوں نے دکن میں اسلامی سلطنتیں قائم کیں انکو مذہب کی کچھ پرواہ نہ تھی، ان میں اکثر ایسے تھے جنکو تبلیغ مذہب کی مہلت نہ ملی کیونکہ یا تو ملک کے فتح کرنے میں انکا وقت صرف ہو گیا یا خانہ جنگیوں نے ان کو فرصت نہ دی، یہ مسلمان فاتح اکثر وحشی مغل یا تاتاری ہوتے تھے پیغمبر عرب کے دین پر خود انکو استحکام نہ تھا اور وہ جوش اور ولولہ جو سام بن نوح کی اولاد کا خاصہ ہے اور جسکا نمونہ عرب کے برادران اسلام نے دکھایا ہے چھو بھی نہ گیا تھا، جو سلطنت انھوں نے قائم کی اسکی حیثیت ہمیشہ جنگی رہی سلہ"

مگر باوجود ان باتوں کے اکثروں کے عہد میں ملک سرسبز و شاداب رہا ہندو رعایا مذہبی رسوم کے ادا کرنے میں بالکل آزاد و خود مختار تھی، ان کے مذہبی جذبات کا ہر طرح لحاظ کیا جاتا تھا، اس موقع پر ہم انکی چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں، خسرو خان جو سلطان مبارک کو قتل کر کے تخت دہلی پر

تھا اس نے ہندوؤں کے ساتھ بہت سی رعائتیں کیں۔ اسکا دربار ہمیشہ ہندو سپاہیوں سے بھرا رہتا تھا خلجی اور تغلق خاندان کے امراء و سلاطین کے عہد میں شاہی دفتروں میں تقریبًا مسلمان ہی کام کرتے تھے، اسکی وجہ یہ تھی کہ دفتروں کی زبان فارسی تھی اور ہندو چونکہ اس سے ناواقف تھے اس لئے وہ اس سے محروم رہ جاتے تھے، لیکن سلطان سکندر لودھی نے ہندوؤں کی جانب توجہ کی اور انہیں فارسی عربی کی تعلیم دینی شروع کی، اس تدبیر سے چند ہی دنوں میں ملک کے انتظامی محکموں میں ان کی کافی تعداد نظر آنے لگی بعض فارسی کے شاعر بن گئے اور دربار شاہی سے وظائف پانے لگے۔ شیرشاہ کے زمانہ میں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان سب امن و خاموشی کی زندگی بسر کرتے تھے اور اگرچہ اسکے اکثر ایام زندگی جنگ و جدال میں بسر ہوگئے لیکن اپنے ملک کا جس حسن و خوبی کے ساتھ انتظام کیا تھا اسکو مدنظر رکھکر اسکی خداداد انتظامی قابلیت کی ستائش کرنی پڑتی ہے اسکا عدل و انصاف مشہور ہے یہ خود اسکا قول ہے کہ عدل تمام فضایل میں ایسا محمود ہے کہ وہ سب کو پسند ہے کوئی طاعت عدل کے برابر نہیں ہوسکتی کفر و اسلام دونوں عدل کے مستحق ہیں اگر اسکا سایہ خلائق کے سر سے اٹھ جائے تو اسکی جمعیت کا سررشتہ ٹوٹ جائے، اپنے رفاہ عام کے سیکڑوں کام کئے پل و پختہ سڑکیں بنوائیں، سرائے و اسپتال تعمیر کروائے۔ لیکن اسکی بے تعصبی اور عدل پروری کا جو مشہور واقعہ ہے وہ یہ ہے کہ شاہزادہ عادل خان جو شیرشاہ کا بڑا لڑکا تھا، وہ آگرہ کے ایک کوچے سے ہاتھی پر سوار ہوکر گزرا ایک ہندو بقال کی عورت برہنہ ہوکر نہا رہی تھی جسکی [illegible] دیوار پست تھیں نہا رہی تھی شاہزادہ کی نظر اس پر پڑی تو وہ برافروختہ ہوا اور پان کا بیڑہ کھینچکر مارا، عورت کی طبیعت غیور تھی اس نے اس دھکے کو بھی پسند نہ کیا چنانچہ وہ خودکشی پر آمادہ ہوگئی، شوہر کو جب اسکا علم ہوا تو اسی وقت تمام ماجرا کہا اور اس معاملہ کو دربار تک لے گیا، شیرشاہ نے حکم دیا کہ بقال ہاتھی پر سوار ہو اور شاہزادہ عادل کی بیگم سامنے آئے اور وہ اسے پان کے بیڑے کھینچکر مارے،

شاہزادہ کے خلاف اس قسم کا فیصلہ کرنا کچھ آسان کام نہ تھا مگر عدل و انصاف پرستی کا سچا جذبہ جو ہر ایک انسان کے دل میں ہونا چاہئیے و شفقت اولاد پر غالب آگیا، دربار کے امراء نے یہ دیکھکر شاہزادہ کی بریت کیلئے اپنی انتہائی کوششوں کا اظہار کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا آخر خود بقال نے شاہزادہ کے قصور کو معاف کر دیا، ان تمام جھگڑوں سے اسقدر ہوا کہ اہل نظر زاچشم بصیرت سے انصاف کام لیں شیرشاہ نے اس معمولی سی قوم ہر ایک غیر جانبدارانہ فیصلہ کر کے جو اپنی شرافت نفس اور عدالت کا ثبوت پیش کیا ہے اس سے اسکے دل میں ہندو رعایا کے خیالات اور احساسات کی پاسداری کا بین ثبوت ملتا ہے یورپ جو آج اپنے انصاف و عدالت پر نازاں ہے کیا اس منصفانہ فیصلہ کی کوئی نظیر اپنی عدالت عالیہ کے تازہ اور قدیم نظائر میں پیش کر سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر یورپین مورخین اور وقائع نگاروں کا سلاطین اسلام پر الزام رکھنا تعصب و عداوت سے کسی طرح خالی نہیں ہو سکتا۔ غرضکہ ترک و افغانوں کی مدتہائے دراز حکومت میں شاید ہی کسی حکمران کے ہاتھوں ہندوؤں کو تکلیف پہونچی ہو التمش، رضیہ بیگم، غیاث الدین بلبن، ابراہیم، سکندر لودھی، نے غیر اقوام کے ساتھ اصول صحت پر ہوکر آخری وقت تک نبھایا، اس میں [illegible] سلاطین کی طرف سے ہندوؤں کو خاص شکایت ہے خصوصًا علاء الدین خلجی سے اس نے دکن کی ہندو ریاستوں کو پامال و برباد کر کے بڑی لوٹ [illegible] دولت [illegible] بتوں اور مندروں کو توڑ ڈالا اور ہندو راجاؤں سے کثیر تعداد میں نقد جواہر وصول کیا، لیکن [illegible] تو سکا دبی ہوا یہی جو ہم محمود غزنوی کے حملہ ہند کا سبب بیان کرتے ہیں یعنی اس حملہ کی اصلی علت [illegible] اور یہ ایک عالمگیر مرض ہے جسکا ازالہ انسانی دسترس سے باہر ہے۔

اصغر علی محمد علی کی یک شاخ گلزار حوض حیدرآباد دکن میں ہے

بالکل باہر ہے، ہندوستان کی قدیم تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ علاؤ الدین کا بدترین اور انسانیت سوز فعل حملۂ چتوڑ ہے، وہ یہ کہ بادشاہ پدمنی کے حسن و جمال کا واقعہ سنکر غائبانہ عشق و محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اسکے دیکھنے کا مشتاق نظر آتا ہے، راجہ سے اسے دیکھنے کی اجازت طلب کرتا ہے راجپوتوں کی غیرت قومی اس بدنامی کو کبھی بھی پسند نہیں کرتی، چنانچہ جنگ ہوتی ہے، راجپوت مارے جاتے ہیں اور پدمنی مع اپنی سہیلیوں کے چتا میں گر کر خاک کا ایک ڈھیر بن جاتی ہے، لیکن تاریخی واقعات اور حقائق کی تحقیق کا آجتک دنیا میں جو دستور چلا آیا ہے اسکے لحاظ سے جب اس زمانہ کی معتبر اور صحیح تاریخ کو اٹھا کر دیکھا جاتا ہے کہ اس میں سب سے اس واقعہ کا وجود ہی نظر نہیں آتا، تاریخ فیروز شاہی جو اس زمانہ کی تنہا اور صحیح تاریخ ہے وہ اس واقعہ سے بالکل خالی ہے، یہ دیکھکر کہنا پڑتا ہے کہ یہ ساری داستان ایک شاعرانہ افسانہ طرازی ہے جس میں اصلیت اور واقعیت کا ذرہ برابر نام نہیں، بالفرض اگر ہم تھوڑی دیر کیلئے اس واقعہ کو تسلیم بھی کرلیں تو شاہان اسلام کے عظیم الشان محامد اور اوصاف کے مقابلہ میں اس کو کسی طرح اہمیت نہیں دیجا سکتی، کہا جاتا ہے کہ محمد تغلق کے عہد میں سلطان کے مظالم نے رعایا کو ایک عام اضطراب و پریشانی میں ڈال رکھا تھا، لاکھوں انسان جنگل دریا بان میں انکی نگاہ خشم آلود کے شکار ہو گئے، ملک تباہ ہوا، اور امن عامہ میں کچھ ایسا خلل پیدا ہوا جس سے ایک مدت تک لوگوں کے دلوں سے خطرات دور نہ ہو سکے، بغاوتوں کا دروازہ کھل گیا اور نظام سیاست میں جسپر ملک استحکام و بقاء کا انحصار ہے انتشار و پراگندگی کا دور شروع ہوا، واقعہ یہ ہے کہ یہ سب سلطان کی ہوس عالمگیری کا نتیجہ تھا جس سے سلطان کے دلمیں دور دراز کے ملکوں کے فتح کرنیکا ایک بیہودہ خیال پیدا ہو گیا تھا، مگر میرے خیال میں یہ ظلم و جفا یہ جور و تعدی محض ہندوؤں کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ ان پر بھی تھا جو اسکے ہم مذہب ہم مشرب تھے ان پر تھا جنہوں نے اسے خلیفہ کا خطاب دے رکھا تھا اور ان پر بھی تھا جو اسلامی حیثیت سے اسکے عطاء و کرم، شفقت و مہربانی کا بہ نسبت دوسروں کے اپنے کو زیادہ مستحق سمجھتے تھے،

محمد تغلق کے زمانہ میں جب فتنہ و فساد کی لہر ہر جگہ دوڑنے لگی تو امراء دکن بھی سلطنت دہلی سے قطع تعلق کرکے خود مختار بن بیٹھے اور بہمنی کے نام سے دکن میں پانچ عظیم الشان حکومتوں کی بنیاد ڈالی، دکن میں اول اول اسلامی سلاطین ہندو راجاؤں سے برسر پیکار رہیں، مذہبی بغض و کینہ جو چند دنوں کیلئے پژمردہ ہو گیا تھا پھر از سر نو تازہ ہو گیا لیکن امتداد زمانہ کے بعد ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے سخت رویہ بہت کم ہو گئے اور انہوں نے انکو کثرت کے ساتھ ملک کے انتظامی محکموں اور فوج میں داخل کرنا شروع کیا، چنانچہ فیروز شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں ہندو اکثر بیشتر امور ملکی پر قابض ہو گئے ....

.... ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور سے پیشتر جتنے حکمران گذرے انکے عہد میں شاہی دفتروں کی زبان بالکل فارسی تھی ہندو چونکہ فارسی ادب اور عربی علم سے بالکل نابلد تھے اسلئے ان کے اختیارات محدود سے ہو کر رہ گئے اور گورنمنٹ کی نگاہ میں وقعت نہ حاصل کر سکے مگر ابراہیم عادل شاہ نے برہمنوں کی حالت زار پر رحم کرکے شاہی دفتروں سے فارسی نکالکر اسکے بجائے ہندی رائج کر دی چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے،

"دفتر فارسی برطرف ساختہ ہندوی کرد و برہمنان را صاحب دخل گردانید"[۵۱]

---

[۵۱] تاریخ فرشتہ صفحہ ۲ جلد دوم،

دکن میں سلطنت کے آخر وقت تک وصول مالگزاری کے محکموں پر اکثر برہمن ہی حکومت کرتے رہے، اسی طرح احمد نگر کی عادل شاہی حکومت نے کثرت کے ساتھ مرہٹہ سرداروں کو بھرتی کرنا شروع کیا، سیواجی اور اسکے خاندان کے اکثر افراد کو ممتاز عہدے دئے گئے چنانچہ عادل شاہی حکومت کی غفلت شعاری نے آخر وقت میں سیواجی کا اسقدر اقتدار بڑھا دیا کہ مسلمانوں کی اس ناعاقبت اندیشانہ فیاضی و کرم گستری کا جو مآل ہوا وہ تاریخ کے صفحوں سے ہویدا ہے۔ کشمیر میں مسلمانوں کا قیام بحیثیت ایک حکمران قوم کے مدتوں رہا ہے اور انہوں نے رعایا کی بہبود و فلاح کی اور تمدنی ترقی کے اسباب مہیا کرنے کی تلاش و جستجو میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، تاریخ اس بات کی عینی شہادت کیلئے موجود ہے کہ بجز دو ایک ناپسندیدہ واقعات کے جو ناگہانی طور پر پیش آگئے تھے کوئی ایسا واقعہ موجود نہیں جو مسلمان سلاطین کی ہمت افزا کوششوں کو رد کر دیتا ہو، سب سے زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ مخالفین بھی ہمیشہ چند ناقابل التفات باتوں کو لیکر مسلمانوں کی طرف سے اپنے دلوں میں ایک نئے ظن پیدا کر لیتے ہیں اور ان حالات اور ضروری واقعات کو قصداً فراموش کر دیتے ہیں جو اہل اسلام کی بہترین فضائل، صفات حمیدہ اور بے تعصبی کی اعلیٰ ترین شان ہیں، اس میں شک نہیں کہ سلطان سکندر بت شکن کے عہد میں سہبت نامی وزیر کی بد خوئیوں اور تند مزاجی نے کاشمیر کے ہندوؤں پر ظلم کے پہاڑ گرا دئے، ان کے مذہبی مقامات برباد کر دئے گئے ہیں اور کثیر تعداد میں ہندو جلا وطن کر کے اپنے آبائی وطن سے نکال دئے گئے مگر سلطان زین العابدین کشمیری نے سکندر بت شکن کی تمام بیجا رسمیں جو بدقسمتی سے ملک میں جاری ہو گئی تھیں اٹھا دیں ایک ایک کر کے انسداد کیا، برباد شدہ عبادتوں اور اجڑے ہوئے دیار کی اصلاح کی، برہمن اور ہندو فضلا جو غریب الوطن ہو کر ہندوستان کے مختلف مقامات پر جا بسے تھے انکو دور دور سے طلب کیا، جزیہ معاف کیا، گاؤکشی کی قطعاً ممانعت کر دی اور تمام ہندوؤں کو بالکل مذہبی آزادی کا اعلان کر دیا چنانچہ فارسی کے ایک مستند تذکرہ نویس کی شہادت ہے:

"ہندوان و براہمہ کہ در عہد سلطان سکندر از تعدی سہبت جلا وطن شدہ بودند باوطان خود باز آمدند و در مقامات معابد خود بر آسودند و سلطان از برہمنان عہد گرفت کہ آنچہ در کتاب ایشان مسطور است خلاف آن نقل نکنند، بعد ازاں آنچہ رسوم ایشان کہ قشقہ کشیدن و سوختن زنان زندہ (ستی) ہمراہ شوہران و غیر آن کہ سلطان سکندر برانداختہ بود ہمہ را از سر احیا نمود و جرمانہ و پیشکش و سائر حبوب از رعایا معاف داشت و زندانیان عہد سابق را آزاد کرد۔" [1]

کیا ان حالات کے پڑھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا صفحہ صفحہ مظالم و ستم آرائیوں کی داستان سے لبریز ہے؟ تجربہ و احساس کی اگر دنیا میں کچھ وقعت ہے تو واقعات کے بار بار مطالعہ کرنے سے آپ دیکھ لیں گے کہ مسلمانوں نے غیر اقوام کی اخلاقی، معاشرتی اور علمی اصلاح میں کس حد تک اپنی جانفشانیوں کا اظہار کیا ہے۔

(باقی آئندہ)

(محمد یوسف اعظمی متعلم ندوہ لکھنؤ)

---

[1] تذکرہ آثار رحیمی صفحہ ۳۰۹

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(بسلسلۂ ماہ فروری [illegible])

(حیدرآباد)

"۲۸ - نومبر — علی الصباح حیدرآباد پہنچ گئے - سیموسکی کی گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی - مسٹر کارڈوری Cordery کا دعوت نامہ بھی ہمارا منتظر تھا جس میں ہمیں ریزیڈنسی میں قیام کرنے کی دعوت دی گئی تھی - ہم نے دعوت نامہ اور گاڑی دونوں کو منظور کر لیا اور ایسا کرنے سے مجھے خوشی ہوئی کیونکہ جب ہم انگلستان میں تھے تو ہم نے کی Key اور ان کی بیوی کے ساتھ ٹھہرنے کا نصف وعدہ کر لیا تھا - بلارم میں بھی مجھے یہی مشورہ دیا گیا تھا کہ میں ریزیڈنسی میں ٹھہروں اسلئے واقعی دلکش ہونے سے حیدرآباد کے حکام سے واقفیت حاصل کرنے کا زیادہ موقع مل سکیگا -

" یہ نہایت شاندار مقام ہے - اسکی تعمیر ابتدائی صدی میں ہوئی تھی - نہایت خوبصورت اور آرامدہ ہے - ہم نے اس کا ایک حصہ اپنے لئے وقف کر لیا ہے اور ہماری رہائش کا انتظام اس سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا - شام کو ہم کی سے ملنے گئے ان کی پوزیشن حیدرآباد میں مشتبہ سی ہے - کی صاحب ہی اور سر سالار جنگ کیلئے کئی طریقوں سے مفید کام انجام دے چکے ہیں - صوبجات برار کے بارے میں سیاسی دعاوی مرتب کرنے میں انہوں نے سر سالار کو تیسی .. دی تھی لیکن سابق ریزیڈنٹ سر رچرڈ میڈ Sir Richard Meade سے ان کا جھگڑا ہو گیا کیونکہ انہوں نے کھلم کھلا مو خر الذکر پر رشوت لینے کا الزام لگایا تھا - شملہ کی گورنمنٹ ان سے ناراض ہے - مسٹر کارڈوری نے رات کو جو ضیافت کی اسمیں کی کو بھی مدعو کیا گیا تھا - ان کی موجودگی کے باعث سیاسی معاملات خود بخود زیر بحث آ گئے"۔ (نوٹ) کی سالار جنگ سے تعلقات رکھنے کے باعث اس بے شرمانہ ظلم سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے جو گورنمنٹ ہند ان پر کرتی تھی اور اس واقفیت کو انہوں نے دیسی باشندوں کے مفاد میں صرف کرنے سے کبھی تامل نہیں کیا - اس وجہ سے کلکتہ کے دفتر خارجہ کی نظر میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے [illegible] میں وہ بہت سی دولت جمع کر کے انگلستان چلے گئے اور پارلیمنٹ کے ممبر بن گئے - میری ان سے ملاقات انگلستان میں ہوئی جبکہ انہوں نے "مصریوں کو خراب کرنے" کے عنوان سے ایک فاضلانہ رسالہ لکھا تھا -

" ۲۹ - نومبر - مسٹر کارڈوری کی عمر ۵۰ سال کی ہے اور وہ انڈین سول سروس کے چراغ سمجھے جاتے ہیں - شروع شروع میں وہ کچھ جھجھکے لیکن چونکہ میں نے اپنے خیالات صاف صاف بیان کر دئے ہیں اسلئے ان کا انداز بھی قدرتی ہو گیا ہے اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وسیع معلومات رکھتے ہیں اور کسی قدر دیر خلق بھی ہیں اور یقیناً غیر ہمدرد نہیں معلوم ہوتے - یہ ظاہر ہے کہ یہاں ہم زیر نگرانی ہیں اور میرا خیال یہ ہے کہ ریزیڈنسی میں ہمیں رکھنے کا منشا یہی تھا کہ ہم ہر قسم کی شرارت کرنے سے محفوظ رہیں - بہر حال میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ خواہ میرے الفاظ ٹھیک بالکل ہی کیوں نہ پہنچائے جائیں تمام ہر ملنے والے سے صفائی کے ساتھ بات چیت کرونگا - غالباً جو عرب ہیں اور یہاں سرکاری افسر ہیں ، ریزیڈنسی کے منشی کی معیت میں ملنے کیلئے آئے - میرے خیال میں منشی ہماری گفتگو معلوم کرنے کی غرض سے بھیجا گیا تھا - لیکن ہم نے عربی میں گفتگو کی جو منشی کو بہت کم آتی ہے - ہم نے مصری معاملات اور عربی کے دوبارہ بحال ہونے کے امکانات پر گفتگو کی بنالب

سلطان لاگی کے رشتہ دار ہیں اور چند نسلوں سے یہیں مقیم ہیں ۔ عربی بولنے میں انہیں تکلف ہوتا ہے ۔

" ان سے زیادہ دلچسپ لائق علی (نوجوان سالار جنگ) کی شخصیت تھی جنہیں اپنے والد کا خطاب ملگیا ہے انکی عمر صرف ۲۲ سال کی ہے لیکن اپنے اوضاع و اطوار سے بہترین تربیت یافتہ انگریز معلوم ہوتے ہیں ۔ ان کے قد کو دیکھکر ہمیں Pendennis کی یادگار تازہ ہو جاتی ہے ان کا خیال تھا کہ انگریزوں نے مصر میں سخت غلطی کا ارتکاب کیا ہے ۔ عرابی کی واپسی کے خیال سے خوش ہوئے ۔ میں نے شیخ جمال الدین کے تعارفی خط کا ذکر کیا جو نواب رسول یار خان کے نام تھا ۔ انہوں نے کہا کہ شیخ میرے والد کے بھی دوست رہ چکے ہیں اور ایک مرتبہ انہوں نے ہم دونوں کی دو نواب ممدوح کی دعوت بھی کی تھی تاکہ گفتگو زیادہ آزادی کے ساتھ ہو سکے ۔ مجھے یہ نوجوان بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے اور اسے دیکھکر مجھے اسکے والد سے انکی زندگی میں نہ ملنے کا رنج جاتا رہا ۔ سر سالار جنگ ہماری حکومت کیلئے ہمیشہ ملامت تھے اور بقول لٹن Lytton ایک مستقل خطرہ ۔ نوجوان سالار جنگ کو ہندوستانی آزادی کی تاریخ میں نمایاں حصہ لینا چاہیئے ۔

ریزیڈنسی میں کارڈری کے ساتھ ایک اور شخص مسمی تریور ہے Trevor بہت ہوشیار آدمی ہے اور انڈین سول سروس کا اچھا نمونہ پیش کرتا ہے ۔ اسکے امحت سیلویل ہے ان دونوں نے ابتدا میں مجھے شک وشبہ کی نظر سے دیکھا تھا ۔ لیکن جب سے میں نے انسے یہ کہدیا ہے کہ جس سول سروس سے تمہارا تعلق ہے میں اسے بالکل موقوف کر دئے جانے کی تمنا رکھتا ہوں ، اسوقت سے ہم دونوں دوست ہو گئے ہیں ۔

" نظام کے اتالیق میجر کلارک Clerk ہمیں ہاتھیوں پر بٹھا کر شہر کی سیر کیلئے لیگئے ۔ یہ شہر قاہرہ کی طرح نہایت خوشنما اور مدراس کے مقابلہ میں بالکل پیرس کی شان رکھتا ہے ۔ لوگوں کے چہروں سے آزادی کی خوشنما جھلک صاف دکھائی دیتی ہے ۔ وہ بظاہر عرب معلوم ہوتے ہیں ۔ اکثر اہل ہند کی طرح اپنے ہاتھ میں تلوار رکھتے ہیں ۔ بازاروں میں گاڑیوں کے علاوہ اونٹ اور ہاتھی بھی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ لوگ انگریزی عہد حکومت کے زیر اثر شہروں سے کہیں زیادہ خوش نہ ہوں ۔ اور مجھے تو اس بات کا یقین ہے کہ وہ زیادہ خوش ہیں ۔ ہم آج بشیر الدولہ کے محل میں گئے جسکی چھت پر سے جو نظارہ دیکھنے میں آتا ہے وہ دنیا کے عمدہ ترین نظاروں میں سے ہے ۔ اسکے بعد سر سالار جنگ کا تالاب دیکھنے کیلئے گئے ۔ وہاں سے ریزیڈنسی باغ کی سیر کی ۔

" ۳۰ ۔ نومبر ۔ صبح کا کھانا کھانے سے پیشتر ہم نظام کا اصطبل دیکھنے گئے ۔ ایک میں بہ صورت ولیر ہیں اور دوسرے میں عربی گھوڑے موخر الذکر قد میں چھوٹے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ نجد میں پرورش پائی تھی ۔ گھوڑ دوڑ کا انتظام محمد علی بلبت کے ہاتھ میں ہے جو ایرانی النسل ہیں اور اچھے سوار ہیں ۔

" الفیلی (جس نے انگریزوں کی مدد سے مقلا کی بادشاہت حاصل کی) کے بھائی اور سید علی بلگرامی سے بھی صحبت رہی موخر الذکر ان نفوس میں سے ہیں جنہیں عام رائے کو بیدار کرنے کی غرض سے حیدر آباد بلایا تھا ۔ یہ یہاں سول انجینیر ہیں ۔ انکے بھائی سید حسین سر سالار جنگ کے پرائیوٹ سیکرٹری تھے ۔ انہوں نے یہاں کی پارٹیوں کی حالت بیان کی ۔ سالار جنگ کی وفات پر وزیر کے بیٹے لائق علی اور منصب پیشکار کو جو کمیشن کے مقرر کر دیا کیونکہ نظام نابالغ تھے ۔ پیشکار معاملات سلطنت کی جانب بہت کم توجہ کرسکتے اور نوجوان سالار جنگ کو

حتی الامکان نظرانداز کرنیکے عادی تھے۔ سب سے زیادہ با اثر ایک تیسرے افسر شمس الامرا کا تھا جو سر سالار جنگ کا دشمن تھا۔ معاملات سلطنت اس طرح سے دن بدن زیادہ خراب ہوتے گئے۔ ریزیڈنسی کی اس عرصہ میں یہی کوشش رہی کہ وہ یہ ظاہر کرتی رہے کہ دیسی حکومت امن قائم رکھنے کے قابل نہیں ہے۔ سر سالار جنگ کے زمانہ میں ریاست حیدرآباد کی حالت اتنی ہی محفوظ و مضبوط تھی جتنی ہندوستان کے کسی اور حصہ کی ہوسکتی تھی۔

"۱- دسمبر- سالار جنگ کے ساتھ صبح کا کھانا کھایا۔ سالار جنگ کے ایک طرف میں بیٹھا اور دوسری جانب سید علی بلگرامی۔ ان سے مستقبل اسلام کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ انہوں نے میری کتاب کا مطالعہ کیا تھا لیکن وہ بہت زیادہ مایوسی کا اظہار کر رہے تھے۔ اس بارے میں وہ میرے ہم خیال تھے کہ اگر ہم عربی اور جامعہ ازہر کے دوسرے روشن خیال اشخاص کا اقتدار مصر میں از سر نو قائم کرائیں تو ہندوستان میں اس کا اثر بے انتہا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ قسطنطنیہ کے بجائے مصر اور مکہ کی جانب ہماری نگاہیں زیادہ اٹھتی ہیں (سید علی شیعہ ہیں) لیکن ہم سب ہندوستان میں پست حالت میں ہیں۔ اصلاح کیلئے مذہبی بنیاد کی سخت ضرورت ہے۔ اسکے بعد انہوں نے حج کا ذکر کیا اور کہا کہ برٹش گورنمنٹ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ اسکے انتظامات کو بہتر بنانے کیلئے کیا کرنا چاہئے۔ میں نے آپ کی کتاب کا حوالہ دیدیا ہے۔ شیعہ ہونے کی حیثیت سے انہیں سلطان المعظم سے کوئی عقیدت نہیں ہوسکتی۔ شیخ جمال الدین کے متعلق انہوں نے کہا کہ وہ مونسٹ ہیں اور اسقدر جوشیلے کہ ان سے کسی اصلاح کا کام نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے مہدی کا ذکر کیا اور کہا کہ میری دعا ہے کہ اسے کامیابی نصیب ہو۔ انہوں نے کہا کہ اگر اسے کامیابی ہوگئی تو چھٹی صدی ہجری کی عبداسد کی تاریخ کا اعادہ ہو جائیگا۔

شام کو نواب رسول یار جنگ آئے۔ ازہر کے نمونہ کے عالم ہیں، روشن خیال، سوشلسٹ اور جمال الدین کے پرجوش مرید وہ انگریزی نہیں جانتے۔ مگر فارسی میں ماہر ہیں اور عربی سے بھی کسی قدر آشنا ہیں۔ ہم نے آخری زبان میں گفتگو کی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں زیادہ تر لوگ سنی ہیں مگر سنیوں اور شیعوں کے درمیان کسی قسم کی رنجش نہیں پائی جاتی۔ عام لوگ دکن کے باہر کے واقعات سے نابلد ہیں لیکن انہیں مصری جنگ کا حال معلوم ہوگیا ہے اور وہ مہدی سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ لارڈ ڈفرن کے متعلق خود ان کی معلومات محدود تھی ان کا خیال ہے کہ ہندوستان میں جمال الدین جیسا شخص نہیں ملے گا۔ انہوں نے نہایت احترام کے ساتھ اپنی جیب میں سے افغانی شیخ کا فوٹو نکالا۔ میں نے پوچھا کہ یہاں اسلامی اخبارات شائع ہوتے ہیں یا نہیں تو انہوں نے اسکا جواب نفی میں دیا۔ مجھے یہ چھوٹا سا آدمی بہت اچھا معلوم ہوا۔ پیر کے دن آنے کا وعدہ کر گئے ہیں۔

"۲- دسمبر- اقبال الدولہ (وقار الامرا) آئے۔ یہ سالار جنگ کے جانبدار ہیں، وہ روشن خیال ہیں۔ اپنے بھائی خورشید جاہ کے مخالف ہیں جو قدامت پسند ہیں اور پیشکار کی پارٹی کی روح رواں ہیں۔ ریزیڈنسی بلاشبہ پیشکار کی جماعت کی حمایت کرتی ہے اسلئے اصلاحات کے مخالفین کے ذریعہ کام کرنے میں انگریزوں کا فائدہ ہے بعینہ یہی حالت مصر کی ہے۔ کارڈرے ان تمام نوجوان مسلمانوں کو نکالنے کی کوشش کر رہا ہے جنہیں مرحوم سالار جنگ نے بلایا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ قابل سید حسین بلگرامی ہیں۔ کارڈرے نے انہیں اسی کے وقت بلایا اور کہا کہ جسقدر جلد ممکن ہو، حیدرآباد سے چلے جاؤ۔ ریزیڈنٹ کو جو مطلق العنان طاقت یہاں حاصل ہے، باہر والوں کو

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ گلزار حوض حیدرآباد دکن میں ہے

اس کا مشکل سے یقین آئیگا ۔ اقبال الدولہ اس چھوٹے سے منہ چہرے کے آدمی کا رڈری سے بچے کی طرح تھر تھر کانپتے ہیں ۔ مہدی حسین تھرتھراتے تو نہیں لیکن وہ حیدرآباد سے چلے جانے پر مجبور کئے جائیں گے ۔ آج ان کے اور ان کے بھائیوں کے ساتھ چائے پی ۔ مولوی چراغ علی بھی تھے جنہیں ہمارے خیال کے مسلمان "نیچری" کے لقب سے یاد کرتے ہیں اسلئے کہ "مستقبل اسلام" میں جن سیاسی، معاشرتی اور مذہبی اصلاحات کا خاکہ کھینچا گیا ہے وہ ان کی تائید کرتے ہیں ۔ ان کا خیال یہ ہے کہ موجودہ سلطان المعظم اور خلیفۃ المسلمین ان کو عملی جامہ پہنائیں ۔ ان کی موجودہ رائے اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے قسطنطنیہ کی کبھی سیاحت نہیں کی ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ توقع کسقدر ناامیدی سے بھری ہوئی ہے ۔ ان نوجوانوں سے انسان اسی آزادی سے گفتگو کر سکتا ہے جس آزادی کے ساتھ کسی انگریز سے گفتگو کیجا سکتی ہے اور مجھے یہ معلوم کر کے کچھ بھی اچنبھا نہیں ہوا کہ کارڈری ان سے خائف رہتا ہے ۔

" ہم نے میجر کلرک کے ساتھ کھانا کھایا ۔ کارڈری انہیں بھی نکالنے کی فکر میں ہیں کیونکہ وہ آزاد آدمی ہیں اور کلکتہ کے دفتر خارجہ کے مقابلہ میں نظام کے مفاد کا زیادہ خیال رکھتے ہیں ۔

" ۳ ۔ دسمبر ۔ سلطان نواز جنگ کے ساتھ کھانا کھایا ۔ یہ شہر مکلا کے سلطان ہیں ۔ حیدرآباد کے اکثر عرب لوگ عرب کے جنوب مشرقی ساحل سے آئے ہیں انہوں نے نہایت شان و شوکت کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور گاڑی کے ساتھ لانسرز کا ایک دستہ بھیجا ۔ ان کا مکان شہر میں ہے اور خوشنما ہے ۔ کھانا اچھا نہ تھا اسلئے کہ وہ اینگلو انڈین طرز کا تھا جس سے زیادہ بری اور کوئی چیز دنیا میں نہیں ہو سکتی ۔ عرب میں سلطان عواض القیطی کے نام سے مشہور ہیں وہ وہاں کچھ زیادہ نیک نام نہیں ہیں کیونکہ انہیں موجودہ دولت اور سلطنت انگریزی وسیلے سے روپیہ قرض دینے کے باعث ملی ہے ۔ یہاں بھی وہ روپیہ قرض دیتے ہیں اور ریذیڈنسی کے آدمی کہتے ہیں کہ حیدرآباد کے ذمہ ان کے ۳۰ لاکھ روپے نکلتے ہیں ۔ وہ پیشکار کی جماعت کے آدمی ہیں اور آج کھانے کے موقع پر برطانوی حکومت سے اپنی وفاداری کا اظہار کر رہے تھے ۔ ایسا کرنا انہیں زیب دیتا ہے کیونکہ انگریزی حکومت نے ان کے دوسرے دعویدار کو جلا وطن کر کے زنجبار بھیج دیا ہے ۔ ان کی پرورش عرب میں نہیں ہوئی اور اسلئے عربی بدقت بولتے ہیں ۔

" سہ پہر کو کارڈری ہمیں گھوڑدوڑ میں لے گئے وہاں ہمیں نظام کے حضور میں پیش کیا گیا ۔ ان کی عمر ۱۹ برس کی ہے اور نہ ذرا شرمیلے ہیں ۔ سالار جنگ جنکی عمر ۲۲ سال کی ہے اور قد چھ فٹ سے اونچا ہے ، نہایت شان کے ساتھ ان کے برابر کھڑے تھے ۔

" ۴ ۔ دسمبر ۔ ہمیں اکاؤنٹنے اور شہر سو دیسی کی نمائش دیکھنے کیلئے گئے ۔ وہاں پیشکار سے ملاقات ہوئی جنکی پیٹھ عمر سے دوہری ہو گئی ہے ۔ وہ باوجود ہندو ہونے کے عربی بول لیتے ہیں ۔ گھر آنے کے بعد مسز کلرک نے حیدرآباد کی سیاسیات کا دلچسپ حال بیان کیا ۔ وہ کہتی ہیں کہ نظام کا شرمیلا پن اور ڈرا ڈرا رہنا ایک واقعہ کی وجہ سے ہے جو زنان خانہ سے تعلق رکھتا ہے ۔ پستول کے ساتھ کھیلتے ہوئے اتفاقاً کسی بچے کے گولی لگ گئی اور اب انہیں یقین دلا دیا گیا ہے کہ انگریز ریذیڈنٹ اس حرکت کے باعث انہیں ہر وقت قید کر سکتا ہے ۔ وہ میرے ساتھ بہت باتیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تخت پر بیٹھتے ہی میں تمام انتظام اپنے ہاتھ میں لونگا سالار جنگ سے انہیں محبت ہے لیکن کارڈری سے خائف رہتے ہیں جو خورشید جاہ کی حمایت میں ہے جو سالار جنگ کے ایک لڑکے کو ہر وقت

...ساتھ رکھتا ہے - کارڈوری یہ جرکرک سے اس لئے ناراض ہے کہ اس نے ناردرن ریلوے کی مخالفت کی ہے جسے گورنمنٹ ہند جنگی
...یہ خیال کمزوری تصور کرتی ہے - کارڈوری کرک اور سر سالار مرحوم کے دوستوں کو نکال دینا چاہتا ہے تاکہ نوجوان سالار جنگ
...حسین بلگرامی جیسے قابل مشیروں سے محروم ہو جائے - اس پالیسی کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآبادی امرا کو دنیا کی تحریکوں
...بے خبر رکھا جائے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہند دیدہ و دانستہ حیدرآباد کے خراب انتظام کو ترقی دینا چاہتی ہے - بعینہٖ یہی کام مصر میں
...کیا جا رہا ہے -

" ۵ - دسمبر - علی عبداللہ کے ساتھ صبح کا کھانا کھایا - سالار جنگ اور سید حسین بلگرامی بھی وہاں موجود تھے - ہم نے مسئلہ شراب
...سی پر بحث کی جس کا حیدرآباد کے مسلمانوں میں عام رواج ہے - میں نے کہا کہ انگلستان میں ہم شرابی مسلمان کا احترام نہیں کرتے اور
...ساتھ ہی ان سے یہ کہا کہ مصر میں بہت کم مسلمان شراب پیتے ہیں اور عرب میں ایک بھی نہیں پیتا - میں نے بمنت سید حسین سے کہا
...سالار جنگ کو مشورہ دیجئے کہ جب لارڈ رپن کلکتہ میں ہوں تو ان سے یہاں کی حالت من و عن بیان کریں -

" شیعی علماء کے مجتہد سید علی شوستری سے ملاقات کی - ان سے عربی میں بات چیت رہی - یہ بھی جمال الدین کے دوست
...مگر انہیں " متعصب " سمجھتے ہیں - یہ پکے عراقی ہیں اور مجھے اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مجھے کچھ بھی نہیں جچے -

" وقار الامراء کے یہاں کھانا کھایا - وہ آج کل ریذیڈنسی کے معتوب ہیں اسلئے کہ ان کے اپنے بھائی خورشید جاہ سے اچھے
...تعلقات نہیں - کارڈوری بھی ضیافت میں موجود تھے میجر گف Gough نے جو نظام کے آدمیوں میں سے ہیں ، مجھ سے درخواست
...کی ہے کہ جب آپ لارڈ رپن سے کلکتہ میں ملیں تو سالار جنگ کی تائید میں جو کچھ کہ سکیں کہیں -

" ۷ - دسمبر - مسلم اسکول کے ایک استاد ملنے کے لئے آئے - کہتے تھے کہ مسلمان حالت سکون میں نہیں ہیں انہیں
...بالکل خبر نہیں کہ بیرونی دنیا میں کیا ہو رہا ہے - انہیں علم اور تعلیم کی ضرورت ہے - ان کیلئے مدارس تو ہیں لیکن اعلےٰ تعلیم کا کوئی
...انتظام نہیں ہے - ان کا بہترین وزیر سر سالار جنگ تھا لیکن ان کا انتقال ہو گیا ہے - موجودہ افسر انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے
...ہوئے ہیں اور سر سالار جنگ کے بہترین کاموں کو بگاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں - مرحوم سر سالار جنگ کے صاحبزادے چونکہ سیر و
...سیاحت کر چکے ہیں اسلئے وہ بھی بہت روشن خیال ہیں - میں نے خورشید جاہ کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ حکومت دو تین جاہل آدمیوں کے
...ہاتھ میں ہے - قابل آدمیوں کو ریاست سے نکالا جا رہا ہے - مسلم ٹیچر کے ساتھ ایک ایرانی بھی تھا - دونوں یہ سنکر بیحد خوش ہوئے کہ لیڈی
...بلنٹ قران شریف کو تین مرتبہ ختم کر چکی ہے - یہ پرانے خیال کا مسلمان بظاہر دل سے انگریزوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے
...ان کے خیالات کا مجھ پر خاص اثر ہوا - حیدرآباد کے مسلمان خواہ وہ شیعہ ہوں یا سنی ، اصلاحات کیلئے بالکل تیار ہیں - چراغ علی سے
...ان کی کتاب کے متعلق گفتگو رہی - انہوں نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے قاہرہ کا ہر روشن خیال عالم اتفاق کر سکتا ہے - میں نے
...ان سے کہدیا ہے کہ اگر آپ اصلاحات کے نفاذ کیلئے قسطنطنیہ پر اعتماد کریں گے تو فضول کام کرینگے -

" سالار جنگ نے اپنی سے وعدہ کیا ہے کہ میں اپنے والد کی تمام خط و کتابت آپ کے سپرد کر دونگا - میں بھی اتوار

کے دن کھانے پر بلایا ہے تاکہ ملاقات اطمینان کے ساتھ ہو سکے۔ وہ پورے طور پر مجھ سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ بڑی بڑی ضیافتوں میں جب تک تم پاس نہ بیٹھو تم کسی شخص سے گفتگو نہیں کر سکتے۔ خواہ یورپین موجود ہوں یا نہ ہوں ہر شخص خائف رہتا ہے کہ کہیں ریزیڈنسی کے ملازم اسکی بات نہ سن لیں۔ سید علی شوستری اور رسول یار خان بھی موجود تھے اور چونکہ ہماری گفتگو عربی میں ہو رہی تھی اسلئے ہمیں کسی قسم کا اندیشہ نہ تھا۔ شوستری کا خیال ہے کہ ہندو موجودہ نظام حکومت سے خوش اور مسلمان سخت ناخوش ہیں۔ چھتیکاری نے بھی ہماری دعوت کی ہے لیکن اسوقت تک ہم حیدرآباد سے جا چکیں گے۔

"۸۔ دسمبر۔ سید عبداللہ مکی سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ سوداگر ہے۔ اس نے ترکوں کے خلاف شریف کہ عبدالمطلب کی بغاوتوں کا حال بیان کیا۔ وہ کہتا ہے کہ شریف عربوں کو ترکوں کی طرف سے اسلئے بھڑکاتے رہتے ہیں کہ کہیں وہ ترکوں سے نہ مل جائیں۔ آخر عمر میں عبدالمطلب افیون کا عادی ہو گیا تھا اسلئے اپنے عہدہ سے برطرف کر دیا گیا۔

"اسی عرب نے حیدرآباد کی سیاسیات پر بھی روشنی ڈالی۔ سالار جنگ مرحوم کا نہایت مداح ہے جو خود عربی النسل تھا۔ اس نے بیان کیا کہ جب میں ۴۰ سال قبل یہاں آیا تھا تو کھلم کھلا بازاروں میں ایک دوسرے کو قتل کر دیتے تھے۔ اسکے بعد سالار جنگ مرحوم نے امن و امان قائم کیا۔ میں نے شیعوں کے متعلق سوال کیا تو اس نے کہا کہ سنیوں اور شیعوں میں بالکل اختلافات موجود نہیں۔ میں خود سنی ہوں لیکن ہم سب ایک ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ ہندوؤں سے بھی ہمارے تعلقات اچھے ہیں۔ نواب لائق علی خان کی بہت تعریف کی اور کہا کہ یہ شخص اپنے باپ کی طرح ایک دن وزیر بن جائیگا۔ سب لوگ اس سے محبت کرتے ہیں۔ نظام کے متعلق اس نے کہا کہ وہ بادشاہ کی طرح رہتے ہیں۔ امرا انہیں پبلک میں بولنے نہیں دیتے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ بیوقوف ہیں۔ اپنے آدمیوں کے ساتھ وہ بہت دلخوش کن طریقہ سے گفتگو کیا کرتے ہیں۔ میں اس مکی سوداگر کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے شبہ ہے کہ آیا لندن کے سوداگر اپنے ملک کی سیاسیات پر اسکی طرح گفتگو کرنے کے لائق ہو سکتے ہیں۔

"نظام ریزیڈنسی میں کھانے پر آئے۔ اپنے ساتھ اپنی کو بھی لے آئے تھے۔ بہت سے اعیان سلطنت اور امرا بھی موجود تھے۔ نظام حسب معمول خاموش تھے لیکن یہ آداب میں داخل ہے۔ ٹریور نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ نظام کے والد کبھی انگریزی حکام سے گفتگو نہیں کرتے تھے اور نہ انکی طرف دیکھتے تھے۔

"۹۔ دسمبر۔ ماسٹر صاحب دوبارہ ملاقات کو آئے کہتے تھے کہ مسلمان دن بدن زیادہ غریب ہوتے جاتے ہیں، گورنمنٹ نے ان کی زمینوں پر بہت ٹیکس لگا رکھے ہیں اور شہروں میں ان کیلئے کوئی دھندا نہیں۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ انہیں اپنی حالت کو بہتر بنانے کیلئے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ میں نے کہا کہ انہیں تجارت کی جانب متوجہ ہونا چاہئے۔ انگریزی سیکھکر ہندوؤں سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ وہ شاکی ہیں کہ جہاں جہاں مسلمانوں نے انگریزی سیکھی ہے وہاں وہ کافر کہلائے جاتے ہیں۔ حیدرآباد میں ٹیکس زیادہ نہیں ہیں لیکن انگریزی حکومت کا انتظام انہیں گھیرے ہوئے ہے اور انگریزی سامان تجارت ہندوستانی مصنوعات کو مارے ڈالتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ان کی امداد نہ کی گئی تو ہر مسلمان انگریزی حکومت کا دشمن ہو جائیگا۔

" ماسٹر صاحب نے انگریزی افسروں کے مظالم اور وحشیانہ اطوار کی سختی سے شکایت کی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ باقی اور انگریزوں سے کیوں مختلف ہیں کیونکہ آپ مجھے اپنی چارپائی پر بیٹھنے کی اجازت دیتے ہیں، مجھ سے خوش خلقی سے بات چیت کرتے ہیں اور غلاموں کی طرح سلوک نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا کہ افسرانِ برطانیہ اپنی کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے بات کرتے ہیں، ہمیں کھڑا رکھتے ہیں، سلام کا جواب دئے بغیر احکام دینے لگ جاتے ہیں۔ آپ ہم کیچڑ سے ساوی حد ر چلتے ہیں۔ اسکی وجہ کیا ہے ہمیں نے جواباً کہا کہ ہم میں تربیت کے مختلف مدارج ہیں اور جتنی زیادہ تعلیم و تربیت کسی شخص میں ہوگی اتنی ہی اسکے خلق میں وسعت پائی جائے گی ہندوستان میں سرکاری ملازمتوں کے لئے جو انگریز آتے ہیں ان میں سے اکثر ادنیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور چونکہ وہ شستہ سوسائٹی کے خوگر نہیں ہوتے اسلئے جب وہ ہندوستان میں آتے ہی اپنے تئیں با اختیار پاتے ہیں تو ان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ مگر میں نے امید ظاہر کی کہ یہ حالت جلد بہتر ہو جائیگی۔ انہوں نے کہا کہ افسران خود اپنی قوم کی جانب سے نفرت کے جذبات پیدا کراتے ہیں بہت سے لوگ جو انگریزی حکومت کو اچھا سمجھتے ہیں، حکام کے اطوار دیکھکر اس سے کشیدہ و متنفر ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد مجھ سے پوچھا کہ آپ اتنی دور کا سفر کر کے کیوں آئے ہیں اور یہ کہ آپ ہماری امداد کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میری جوانی کے دن تمام میں بسر ہوئے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پیشتر کچھ نیکی کر جاؤں۔ چونکہ مسلمانوں نے مجھ سے نہایت مہربانی آمیز سلوک کیا ہو اور انہیں سے میں نے خدا پر یقین کرنا سیکھا ہے اس لئے میں سال کا کچھ حصہ ان میں بسر کر لیتا ہوں۔

" صبح کے ۱۰ بجے سالار جنگ کے یہاں کھانے کیلئے گئے۔ ہم نے پہلے سے طے کر لیا تھا کہ دعوت میں کسی انگریز کو مدعو نہ کیا جائیگا سیاسی صورت حالات پر نہایت آزادی سے گفتگو رہی اور وہ یہ ہے کہ چند ہفتے میں نظام بالغ ہو جائیں گے اور یہ کہ ریزیڈنسی کی طرف سے اس امر کی کوشش ہو رہی ہے کہ ایسے عہد نامہ پر ان سے دستخط کر والئے جائیں جو نظام اور گورنمنٹ ہند کے مابین تجدید اتحاد کے ساتھ سابقہ تمام عہد ناموں کو کالعدم کر دیگا۔ اس طرح سے صوبجات برار ہمیشہ کیلئے انگریزی قبضہ و تصرف میں آجائینگے "۔

مسئلہ برار کی اصلیت یہ ہے کہ کئی سال ہوئے (اور وہ زمانہ سر سالار جنگ سے پیشتر کا تھا) ریاست حیدرآباد کا انتظام حکومت خراب حالت میں تھا اور اسکی مالی حالت تو اسدرجہ ناقص ہو گئی تھی کہ نظام کو کلکتہ کی حکومت سے کئی کروڑ روپیہ قرض لینا پڑا۔ گورنمنٹ نے اس قرضہ کے عوض میں صوبجات زیر بحث کو کفول کر لیا۔ یہ علاقہ نظام کی سلطنت کا زرخیز ترین جزو تھا۔ شرط یہ قرار پائی تھی کہ جب تک قرض نہ ادا ہو جائے گورنمنٹ ہند ان علاقوں کا انتظام کریگی۔ اس انتظام کی وجہ سے قدرتاً بہت سے انگریزوں کو ملازم رکھنا پڑا بالخصوص انڈین سول سروس کے بہت سے ممبروں کو اعلےٰ اعلےٰ تنخواہیں دی گئیں۔ اسوقت سے گورنمنٹ کی یہ کوشش رہی ہے کہ علاقہ جات کی واپسی کو ناممکن کر دیا جائے۔ اس غرض کیلئے صوبجات مذکورہ کا انتظام نہایت اچھا کیا گیا ہے ٹیکس بھی مقابلتہً ہلکے ہیں اور کسانوں کو انگریزی عہد حکومت سے مانوس کرنے کے ارادہ سے کوئی ایسی کوشش نہیں جو نہ کی گئی ہو۔ درآنحالیکہ برطانوی ہند کے اکثر حصوں کی حکومت اس زمانہ میں اس سے بدرجہا خراب تھی۔ یہ

کبھی امید نہیں کی گئی تھی کہ نظام قرض ادا کرسکینگے لیکن یہ خیال کرلیا گیا تھا کہ اگر یہ روپیہ واپس دے بھی دیا گیا تو اس صورت میں صوبجات کی خوشحالی انکار کر دینے کیلئے وجہ قرار دیدی جائیگی۔ سر سالار جنگ چونکہ غیر معمولی طبیعت کے شخص تھے۔ اسلئے انہوں نے نہ صرف دکن میں امن وامان بحال کردیا بلکہ حیدرآباد کی مالیات کو ایسی حالت پر پہونچا دیا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ روپیہ لیکر پہنچے اور صوبجات کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ان کا مسئلہ مذکور پر اصرار کرنا تھا کہ امپیریل گورنمنٹ کے ہاتھوں ان پر مظالم کا سلسلہ شروع کردیا گیا جو بے رحمانہ طریقہ سے ان کی وفات تک جاری رہا۔ ان کا دعوی بدستور قائم ہے اسلئے کہ اس کی بنیاد اس معاہدہ پر ہے جو دو سلطنتوں کے درمیان ہو چکا ہے۔ اور اب نظام کی خوردسالی اور انکے طاقتور وزیر کی موت سے فائدہ اٹھا کر اس معاہدہ کو کالعدم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔"

"سید حسین کو پورا وثوق ہے کہ جدید معاہدہ کا مسودہ ریزیڈنسی میں موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس کی نقل یا خلاصہ دیکھا ہے اور یہ کہ نوجوان نظام سے جونہی کہ وہ بالغ ہو جائینگے تخت نشینی کی شرط کے طور پر ریزیڈنسی دستخط کرانے جائینگے یا ان کے تخت نشین ہونے سے پیشتر پیشکار کے دستخط لے لئے جائینگے۔ کونسل پیشکار اور کمزور پیشکار، سید خورشید جاہ (ریزیڈنسی کے زیر اثر ہیں) اور بشیر الدولہ پر مشتمل ہے۔ موخر الذکر میں کوئی سکت نہیں۔ نوجوان سالار جنگ کونسل کے سکریٹری ہیں اور اسلئے آخری فیصلہ پر ان کی آواز کا زیادہ اثر نہیں پڑسکتا۔ مگر مجھے یہ بات مشکل معلوم ہوتی ہے کہ لارڈ ڈفرن کی حکومت ایسے اہم عہدنامہ کو ایجنسی کے آخری ایام میں انجام تک پہنچانے میں جلد بازی سے کام لیگی۔ میرا خیال یہ ہے کہ نوجوان سالار جنگ پر دباؤ ڈالا جائیگا خواہ خوشامد سے خواہ دھمکیوں کے ذریعہ، اور نظام کے تخت پر متمکن ہوتے ہی دستخط کروالئے جائینگے۔ برخلاف اسکے ایک اور معاملہ جسپر حکومت ہند کو اصرار تھا یعنی معاہدہ ریلوے، اسے بعینہ اسی طریقہ سے پیشکار کے ذریعہ طے کرلیا گیا ہے۔ یہ بات خود کارڈری نے ہم سے بیان کی ہے اور ممکن ہے کہ سید حسین نے جو کچھ کہا ہے، وہ ٹھیک ہو۔ اسی وجہ سے میں کلکتہ جانے میں عجلت کر رہا ہوں تاکہ لارڈ ڈفرن کے روبرو سارا مسئلہ پیش کروں اور دفتر خارجہ کی چالبازیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر دوں۔

"ریزیڈنسی میں مسودۂ معاہدہ کی موجودگی سے مجھے بہت سی باتوں کی حقیقت معلوم ہوگئی، ایک تو یہ کہ بادجہ بدنظمی کے پیشکار کی حمایت کی جاتی تھی، دوسرے سالار جنگ کو ان کے والد کے بہترین آدمیوں کو برخاست کر کے تن تنہا چھوڑ دیا گیا، تیسرے جو لوگ واپسی برار کی تائید میں تھے ان کے چال چلن کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلائی گئیں، چوتھے کارڈری کا یہ کہنا کہ لائق علی بہت مغرور ہے اور اسکے لئے واحد چارۂ کار یہ ہے کہ پیشکار کے ساتھ ملکر کام کرے۔ پانچویں خورشید جاہ کے ساتھ بہ حیثیت ولیعہد مراعات کا کیا جانا اور نوجوان نظام سے جھگڑا ہو جانے کی صورت میں اسکو امیدوار تخت کے طور پر موجود رکھنا، ساتھ ہی کارڈری کا یہ مشہور کرنا کہ نظام کا چال چلن بگڑا ہوا ہے اور اسی قسم کی دوسری باتوں کا اعادہ کرنا۔ کھانے کے موقع پر کارڈری نے اپنی سے ان تمام باتوں پر گفتگو کی۔ اسس سے

ایک اور اہم واقعہ پر روشنی پڑتی ہے اور وہ یہ ہے کہ چند دن ہوئے کارڈوری لائق علی سے سختی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اور جب گفتگو ختم ہو چکی تو اس نے لائق علی کے کندھے پر ہاتھ رکھکر معافی مانگی اور کہا کہ سخت گفتگو کرتے وقت میں صرف حکام بالا کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔ اسی طرح اسنے سید حسین سے بھی معافی مانگی جنہیں اس نے حیدرآباد سے چھ مہینے کیلئے چلے جانے کا حکم دیدیا تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے کہ میں آپ پے نا انصافی کر رہا ہوں لیکن پبلک کے مفاد کیلئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ میں نے لائق علی سے کہدیا ہے کہ کلکتہ میں جب آپ لارڈ رپن سے ملیں تو ان تمام باتوں کو صاف صاف بیان کریں۔ ساتھ ہی میں نے لارڈ رپن کی توجہ اس مسئلہ کی جانب مبذول کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ جب وہ نظام کے ساتھ کلکتہ آئینگے تو میں لائق علی کو ضرور تی مشورہ دونگا اس لئے کہ ان کے دوستوں کو ہمراہ آنے کی اجازت نہیں ہے ان نے مجھے مسئلہ برار کے متعلق اپنے والد کی مطبوعہ خط وکتابت دیدی ہے اور اس پر اپنے والد کی رائے بھی بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ واقعہ ہندوستانی حکومت کی انگریزی حکومت پر بے اعتمادی کی زبردست دلیل ہے کہ وہ اس رائے کو بذریعہ ڈاک نہیں بھیجنا چاہتے تھے بلکہ اسے اپنے نمائندہ کے ہاتھ ارسال کرینگے۔

"سلطنت کے معاملات کے متعلق تبادلہ خیالات کرتے ہوئے لائق علی نے کہا کہ نظام بطور خود ملک پر حکمرانی کرنے کے قابل نہیں ہیں جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں، لیکن ملک موجودہ حالت میں سلف گورنمنٹ کے بالکل قابل نہیں ہے۔ اب تک یہ رسم رہی ہے کہ حکومت وزیر کے ذریعہ کی جائے اور غالباً یہ وہ وزیر کی حیثیت منتخبہ کرنا چاہتے ہیں۔ بہرحال جو کچھ مجھ سے میں پڑیگا میں ان کے لئے کرونگا ان کی واحد کمزوری ان کی کم عمری ہے اسلئے کہ وہ ۲۰ سال سے زیادہ عمر کے ہیں۔ میں نے جب اسکے متعلق خصوصیت سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں اگست سنہ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن وہ زیادہ عمر کے ہوتے ہیں۔ نظام کی تخت نشینی کے موقع پر مجھے لائق علی نے حیدرآباد آنے کی دعوت دی ہے۔ بظاہر پیشکار کے زمانۂ حکومت میں لوٹ مار کا بازار خوب گرم رہا ہے۔ ہر شخص سے یہی داستان سننے میں آتی ہے۔ جب سالار جنگ کا انتقال ہوا تو اسوقت سر اسٹوارٹ بیلی Sir Stewart Bayley بعض معاملات کے تصفیہ کے لئے کلکتہ سے بھیجے گئے تھے اور لائق علی پیشکار کے ساتھ انتظام سلطنت کرنے کے لئے مقرر کئے گئے تھے اور اس لحاظ سے انہیں انتظام حکومت میں حصہ ملنا چاہئے مگر انہیں روکدیا گیا ہے۔ یہاں کوئی ایسا سرکاری دفتر نہیں جہاں معاملات مشورہ سے انجام پاتے ہوں۔ پیشکار نہ تو ان سے رائے لیتا ہے اور نہ غور وخوض کرنے کیلئے پابندی اوقات کے ساتھ انہیں اپنے گھر آنے کی اجازت دیتا ہے۔ نہ وہ کاغذات کو ان کے دستخطوں کیلئے بھیجتا ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ لائق علی کسی کام کو کرنے کیلئے محض بے اختیار ہیں اور وہ اب یہ کہتے ہیں کہ اگر کلکتہ جانے کے بعد بھی حالات میں کوئی تغیر نہ ہوا تو میں اپنے عہدہ سے دست بردار ہو جاؤنگا۔ اب بغیر اختیارات کے ان کے سر ذمہ داری ہے اور وہ اس حالت کو جاری رکھنے سے انکار کرتے ہیں۔

"ہم رفتہ رفتہ ریزیڈنسی کی نظروں سے گرتے جاتے ہیں۔ گر کارڈوری ہمارے آزادانہ شہر میں جانے سے خوف زدہ ہے اس نے سالار جنگ سے بھی اس کا ذکر کیا تھا۔ شاید اسکا یہ اعلان کر کہ میں کلکتہ جا رہا ہوں، اس شبہ سے تعلق رکھتا ہے کہ ہم اس کی ساری تجاویز سے آگاہ ہیں۔ چار بجے رسول یار خان ہمیں کھانے کیلئے لینے آئے نواز جنگ، چراغ علی، سید حسین اور مولوی مہدی حسن

بھی موجود تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ جب ۱۰ سال پیشتر لارڈ میکنفیلڈ Lord Brecknfield برسر حکومت تھے تو اسوقت ہندوستان کا ہر ایک مسلمان کنسرویٹیو پارٹی کو اپنا دوست سمجھتا تھا۔ لیکن لارڈ ڈلسن کی پالیسی نے اصلی حقیقت عیاں کر دی ہے۔ افغانستان کی جنگ نے بہت سے اشخاص کو ناراض کر دیا ہے اور اب مسلمانوں کی ہمدردی باقی نہیں رہی ہے یہانتک کہ کسی انگریزی پارٹی پر ان کا اعتماد نہیں رہا۔ انھوں نے لارڈ ڈلسن کی چھٹی کا بھی ذکر کیا جو لارڈ سالسبری Lord Salisbury کے نام بھیجی گئی تھی اور جو شائع ہو چکی ہے جسمیں اس امر کی تشریح کی گئی ہے کہ سرکاری ملازمتوں سے مسلمانوں کو کس طرح سے خارج کیا جا سکتا ہے۔

"محمدی حسن مہربند لیڈر بیٹھے تھے۔ وہ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں اور مجھے یقین دلاتے ہیں کہ وہاں کے مسلمان آپکا خیر مقدم کرینگے انھوں نے چند تجارتی خطوط بھی دینے کا وعدہ کیا ہے۔ مصری جنگ کے متعلق وہ اصل حقیقت معلوم کرنے کے خواہشمند ہیں اسلئے کہ چند عرصہ پیشتر تک ان سب کا خیال تھا کہ انگریز سلطان اعظم کے اتحادی ہیں کہ مصر میں داخل ہوئے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ کلکتہ میں آپ اس مسئلہ پر تقریر کریں لیکن تعجب ہے مسلمانوں سے جنگ کرنے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں اس سبب سے دقت ہوگی (اگرچہ عام اسے بہت اچھی نظر سے دیکھینگے) کہ جو لوگ اس میں حصہ لینگے وہ ہمیشہ نظروں میں کھٹکا کرینگے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ ہندوستان میں جس قسم کی مطلق العنان حکومت کی جا رہی ہے اسکا آپ کو اندازہ نہیں ہو سکتا اور نہ آپ کو اس خطرہ کا علم ہے جو سیاسیات میں پڑنے کے بعد ہوتا ہے۔ جمال الدین نے مذہبی شیوخ کی جلاوطنی کے جو حالات بیان کئے تھے وہ سب کے سب سچ نکلے۔

"۱۰ دسمبر۔ صبح کی گاڑی سے ہم حیدرآباد سے روانہ ہوگئے۔ ہمارے کئی دوست۔ مورس اور سلطان نواز جنگ کے صاحبزادے پہونچانے آئے تھے۔ میں نے ان تینوں کو اپنے ساتھ بینچ پر بٹھایا حالانکہ پہلے زیور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ کارروائی وہ ہے جسکے انگریزی حکام عادی نہیں ہیں۔ سید حسین بلگرامی اور رسول یار جنگ بھی آئے تھے۔ موخر الذکر کو اصرار تھا کہ میں دو گھنٹے کی مسافت انکی معیت میں طے کروں گا۔ انھوں نے چند تحائف دئیے ہیں جن میں ایک نہایت خوبصورت شال بھی ہے۔ کئی سے اپنی بیوی کے زیور بھی جنکے متعلق مجھے اندیشہ ہے کہ وہ ہندوستانی دوستوں کے نام معلوم کرنا چاہتے تھے۔

"رات بھر سفر کرنے کے بعد ہم علی الصباح پونہ پہونچے۔ پونہ بالکل غیر دلچسپ مقام ہے اور مشرقیت سے بالکل معرا ہے۔ صحت بخش جگہ ہے اور سطح سمندر سے ۲ ہزار فٹ اونچی ہے۔ مس ڈلن Miss D... Allen جنکے ساتھ ہم ٹھہرے ہوئے ہیں ہمیں دکن کالج دکھانے لے گئیں۔ نہایت بے معنی عمارت ہے۔ ۱۲۰ بورڈروں میں سے صرف ایک مسلمان تھا۔

۱۲ تاریخ کو ہم بمبئی گئے جہاں ہمارا وقت ایک یورپین خیالات کے مسلمان کے ساتھ بسر ہوا۔ مسٹر محمد ودھے مالہ روشن خیال مسلمان ہیں اور اسلامی جماعت کے لیڈر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے خیالات بالکل جدید ہیں اور بعض امور میں وہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ انڈین اسپکٹیٹر Indian Spectator کے ایڈیٹر مالاباری سے بھی صحبت رہی۔ یہ کرنل اوسبورن Colonel Osborne کے دوست ہیں۔ وہ ہیں تو پارسی مگر ان کی ہمدردی ہندوؤں کے ساتھ ہے وہ بہت سمجھدار شخص ہیں اور ہر وقت حب الوطنی کے کاموں اور سیاسی مشاغل میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ زراعتی مصائب جنکا ذکر ہم ہر جگہ سنتے آئے ہیں تصدیق کرتے ہیں اور تقریر

کہ جب تک ہندوستان دیوالیہ نہ ہوجائیگا اسوقت تک صورت حال بہتر نہ ہوگی۔ دیوالیہ پن یا انقلاب جیسا کہ گارڈن Gordon نے بیان کیا ہے۔ انہون نے بتایا کہ ان انگریزی افسرون پر جو زیادتی ٹیکس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہین، کس کس طریقے سے ظلم کیا جاتا ہے۔ اگر ان مین سے کوئی شخص ہندوستانیون کی شکایات کی طرفداری و حمایت کرتا ہے تو اسے ملازمت سے علیحدہ کردیتے ہین۔ کرنل اوسبورن کے ساتھ ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ وہ لارڈ رپن کے مداح ہین اور مجھے دوراندیشی کے ساتھ ان کا ساتھ دینے کا مشورہ دیا ہے۔

۱۵ - دسمبر۔ کلکتہ روانہ ہوگئے گورسٹ Sir John Gorst بھی ہم سفر تھے جن سے خوب باتین رہین یہ ہندوستان اس لئے آئے ہین کہ نظام کو صوبجات برار کی دوبارہ واپسی کے متعلق مشورہ دین۔ "ہندوستانیون کو اب نہ کنسرویٹیو پارٹی پر اعتماد ہے اور نہ گلیڈاسٹون پر، البتہ وہ لارڈ رپن کے شکر گزار ہین کہ انہون نے اظہار ہمدردی کیا ہے لیکن وہ اچھی طرح سے سمجھتے ہین کہ وہ ہندوستانیون کیلئے کچھ بھی نہین کرسکینگے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پٹنے مین گورسٹ نے لارڈ سالسبری کی توجہ مسئلہ برار کی جانب مبذول کرائی اور انہین راہ راست پر رہنے کا مشورہ دیا۔ لیکن نتیجہ ندارد۔" بعد مین گورسٹ ہی نے اخبار "اسٹیٹسمین" پر گورنمنٹ کی جانب سے مقدمہ چلایا کہ اس نے سر سالار جنگ کو گرفتار کرنے کی کوشش کرنے اور سر رچرڈ میڈ Sir Richard Meade کے رشوت لینے کے بارے مین واقعات کی اشاعت کی ہے۔ انہون نے مجھ سے بیان کیا کہ کلکتہ کے دفتر خارجہ کے کہنے سننے پر مقدمہ کا خیال چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان کی خود اپنی رائے یہ تھی کہ اگر مقدمہ ہوا تو سر رچرڈ میڈ عہدہ برآ نہ ہوسکینگے۔

۱۶ - دسمبر۔ ابھی تک ٹرین مین ہون۔ حیدرآباد کی بلو بکس Blue Books (لائق علی نے مجھے یہ مطبوعات دی تھین) کا مطالعہ کیا۔ ان کا پڑھنا حقیقتہً سبق آموز ہے۔

(باقی)

ضیاالدین احمد برنی

بی۔ اے

سنہ ۱۸۸۲ء کے آخر مین جو گفتگو مین نے جنرل سی جی گارڈن C. G. Gordon سے کی تھی، یہ اسکی طرف اشارہ ہے انہون نے نہایت وثوق سے مجھے اس امر کا یقین دلایا تھا کہ "ہندوستان مین انقلاب کے بغیر کوئی بہتری ممکن نہین" گارڈن سنہ ۱۸۸۰ء مین لارڈ رپن کے پرائیویٹ سکریٹری بن کر آئے، لیکن بمبئی پہنچنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد انہون نے استعفا داخل کردیا۔ انڈین سول سروس نے اصلاحاتِ نفاذ کے خلاف جو جدوجہد کی تھی، اسے دیکھنے کے بعد موصوف کو یقین ہوگیا تھا کہ ناممکن العمل کام مین لارڈ رپن کا ساتھ دینا بالکل بے سود ہے۔

چند گوشت خور درخت

یہ امر مسلم ہے کہ گوشت بلحاظ غذائیت ترکاریوں اور اناج وغیرہ سے زیادہ افضل اور مقوی ہے قدرت نے اس غذا کو نہ صرف حیوانات ہی کے لئے مفید بنایا ہے بلکہ بعض پودوں کی بہترین نشوونما کے لئے بھی اس قسم کی غذا لازمی رکھی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ گوشت خوری کی عادت ہرگز قانون قدرت کے خلاف نہیں ہے۔ قدرت نے جہاں انسان کو گوشت کا دلدادہ بنایا ہے وہاں چند ایسے درخت بھی پیدا کئے ہیں جنکے لئے گوشت بہترین غذا ثابت ہوا ہے۔ اور اگر ہم ان کو گوشت خور درختوں کے نام سے موسوم کریں تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ درخت بلا گوشت کے بھی زندہ رہ سکتے ہیں لیکن اگر کسی جانور کا گوشت تھوڑی مقدار میں دیدیا جاتا ہے تو ان میں زیادہ اور اچھے قسم کے پھل اور بیج پیدا ہوتے ہیں۔ گوشت خور درختوں میں چھوٹے کیڑوں یا پتنگوں کے قید کرنے کی ترکیبیں موجود ہوتی ہیں۔ غالباً اس طریقہ سے یہ درخت غذا ئے نائٹروجن (Nitrogen) حاصل کرتے ہیں۔ اور خصوصاً وہ نائٹروجن جو گوشت کا خاص جزو ہے پودوں کے لئے مفید ہوتی ہے۔

ذیل میں چند ایسے درختوں کا بیان کیا جائیگا جن میں قدرت نے خاص خاص طریقے اور ذرائع پتنگوں اور دیگر چھوٹے چھوٹے جانوروں کی گرفتاری کے لئے بنائے ہیں۔ میرے خیال میں ان درختوں کا بیان غیر سائنس دان لوگوں کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اور ان کے دلوں میں قدرت کے عجیب و غریب کرشموں کے مشاہدہ کا شوق پیدا ہوگا۔

(الف)

اس قسم کے درخت کی پہلی مثال ڈروسیرا (Drosera) ہے۔ اس درخت کی پتیوں (نقشہ نمبر الف) پر بہت باریک باریک اور لمبے ڈنٹھل موجود ہوتے ہیں۔ ان ڈنٹھلوں کی نوکوں سے ایک قسم کا لس دار مادہ خارج ہوتا ہے۔ اگر کوئی قسمت کا مارا کیڑا یا پتنگا اپنی غذا کی تلاش میں ان ڈنٹھلوں سے چھو جاتا ہے تو فوراً اس لس دار مادہ میں پھنس جاتا ہے اور اس کے پر وغیرہ اس مادہ سے ایسے آلودہ ہو جاتے ہیں کہ وہ پھڑ پھڑا نہیں سکتا۔ جتنا کہ غریب قیدی رہائی کے لئے پھڑپھڑاتا ہے اور زور لگاتا ہے اتنا ہی وہ زیادہ اور ننھے ڈنٹھلوں کے جال میں گرفتار ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ لس دار مادہ کے ساتھ ایک قسم کا تیزاب بھی نکلنا شروع ہو جاتا ہے جس سے غریب جانور ختم ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ درخت اسکو ہضم کر لیتا ہے۔ ڈروسیرا کی پتیاں کیڑوں کے جسم کو باسانی اسطرح حل اور جذب کر لیتی ہیں۔ جسطرح کہ ہم لوگ معدہ کے ذریعہ سے گوشت اور دیگر غذاؤں کو ہضم کر لیتے ہیں۔

دوسری مثال گوشت خور درخت کی نیپنتھس (Nepenthes) ہے۔ یہ پودا شمالی امریکہ کا باشندہ ہے اور جنوبی ایشیا میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس درخت کی پتیاں چھوٹے کیڑوں کے گرفتار کرنے کی غرض سے صراحی نما شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

ہر پتی کی نوک پر نہایت خوشنما لمبی لمبی صراحیاں لٹکی نظر آتی ہیں جنکے منہ چھوٹے چھوٹے سبز ڈھکنوں سے بند رہتے ہیں (نقشہ نمبر ب) رات کے وقت یہ ڈھکنے صراحی کے منہ کو بالکل بند کر لیتے ہیں۔ اس حالت میں جو لعاب ان صراحیوں کی اندرونی سطح سے نکلتی ہے وہ پانی کے قطروں میں مبدل ہو کر صراحی کے تہ میں جمع ہوتی جاتی ہے۔

یہاں تک کہ صبح یہ جام صاف و شفاف پانی سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ دن کے وقت صراحیوں کے ڈھکنے خود بخود کھل جاتے ہیں اور ہر ایک نقیس نمو ساقی کی طرح ہوا کے جھونکوں سے جھوم جھوم کر ان چھلکتے ہوئے پیمانوں کو اپنی ہتھیلی پر رکھے تشنہ لب ریگستانی مسافروں کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر پیش کرتا ہے۔ لیکن یہی صاف و شفاف پانی جو پیتے ہوئے ریگستان کے مسافروں کے لئے آب حیات ہے دوسرے چھوٹے کیڑوں کے حق میں زہر ہلاہل کا کام کرتا ہے۔

(ب)

چھوٹے چھوٹے کیڑے شہد کی لالچ میں ان خوشنما صراحیوں کے دہانے پر آ کر بیٹھتے ہی خوفناک موت کے منہ میں آ جاتے ہیں اور صراحی کی اندرونی چکنی سطح سے پھسل کر اس پانی میں گر جاتے ہیں جو صراحی کی تہ میں بھرا ہوا ہے۔ کیڑے کے گرتے ہی اس پانی میں ایک قسم کا تیزاب بھی شامل ہو جاتا ہے جو تھوڑے ہی عرصہ میں کیڑوں کو حل کر کے پودے کا جزو بدن بنا دیتا ہے۔

ڈائینا Dionaea or (Venus Flytrap.)

(ج)

ڈائینا کی پتی

Nepenthes سے بھی زیادہ حیرت انگیز ایک اور گوشت خور درخت ہے جس کی پتیاں ہر وقت کھیوں اور پتنگوں کے شکار کے لئے جال پھیلائے رہتی ہیں اس درخت کو Dionaea کہتے ہیں اور یہ زیادہ تر N Carolina میں پایا جاتا ہے۔ اس درخت کی پتیوں کی نوکوں پر دو بیضاوی پنکھڑیاں ہوتی ہیں جو کتاب کے اوراق کی طرح کھولی اور بند کیجا سکتی ہیں (نقشہ نمبر ج) ان پنکھڑیوں کے کنارے دندانہ دار ہوتے ہیں اور ہر پنکھڑی کے وسط میں تین نوکدار کانٹے ہوتے ہیں جنکے چاروں طرف ایک میٹھا شربت رس رس کر جمع ہوتا رہتا ہے۔ اس شیرین شہد کی لالچ میں کھیاں اور کیڑے ان پنکھڑیوں پر آ کر بیٹھتے ہیں۔ کیڑوں کا جسم چھوتے ہی دفعتاً یہ پنکھڑیاں متاثر ہو کر ایک دوسرے سے مل کر بند ہو جاتی ہیں۔ اور قیدی کے جسم میں اپنے نیز خار چبھا دیتی ہیں۔ قیدی کے پھڑ پھڑانے سے یہ پنکھڑیاں اور بھی سختی کے ساتھ اسے دبا لیتی ہیں۔ حتیٰ کہ اگر ایسی حالت میں ہم ان کو کھولنا چاہیں تو پتیاں ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں۔ جب قیدی

تھک کر بالکل بیدم اور ساکت ہو جاتا ہے تو یہ پنکھڑیاں خود بخود کھل جاتی ہیں لیکن اس وقت تک اس غریب قیدی کا کام تمام ہو چکا ہے
ایک انگریز سائنس دان کا قول ہے کہ اس قسم کی غذا اس پودے کی بقائے زندگی کے لئے لابدی ہے۔ کیونکہ اس نے بچشم خود
مشاہدہ کر کے دیکھا کہ اگر یہ پودہ تاروں کے جال کے اندر رکھا جاتا ہے (جس میں کیڑوں اور پتنگوں کا گذر نا ممکن ہے) تو وہ رفتہ رفتہ
مرجھا کر سوکھ جاتا ہے۔ برخلاف اسکے اگر وقتاً فوقتاً اسکو گوشت کے ٹکڑے دئے جائیں تو نہایت تندرست اور تازہ رہتا ہے۔

ایک اور عجیب و غریب گوشت خور درخت اکثر تالابوں کے گندے پانی میں پایا جاتا ہے اسکو اٹریکولیریا Utricularia کہتے ہیں۔ یہ پودہ ہندوستان میں بھی کثرت سے پایا جاتا

اٹریکولیریا Utricularia

ہے میں نے اور میرے طالبعلموں نے اس کو فیض آباد سے سات میل کے فاصلہ پر بھرت کنڈ کے تالاب میں بکثرت پایا۔ جس
زمانہ میں ہم لوگ وہاں گئے تھے وہ اس درخت کے پھولنے پھلنے کا موسم تھا۔ سطح آب پر اس کے زرد زرد پھول ہری ہری باریک
پتیوں پر تیرتے ہوئے نہایت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ ہم لوگوں نے اس درخت کی بہت سی ٹہنیاں اکٹھا کیں اور خوردبین
کے ذریعے اس درخت کی عجیب و غریب پتیوں کا مشاہدہ کیا

اس درخت کی پتیاں نہایت باریک نوکدار چھوٹی چھوٹی
شاخوں میں منقسم ہوتی ہیں۔ ان چھوٹی شاخوں میں سے چند پھولے
ہوئے پھکنوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ (نقشہ نمبر ۸) ہر پھکنے
میں ایک چھوٹا سا منہ ہوتا ہے جو ایک ڈھکنے سے بند رہتا ہے
یہ ڈھکنے پھکنے کے اندر کی طرف بآسانی کھل جاتے ہیں اور
چھوٹے چھوٹے آبی کیڑے ان کو ہٹا کر پھکنوں کے اندر داخل
ہو جاتے ہیں۔ اسکے بعد ہی فوراً دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اور
ان قیدیوں کے باہر نکلنے کی صورت نہیں رہتی کیونکہ پھکنوں کا دروازہ باہر کی جانب نہیں کھل سکتا۔ غرض یہ کہ اندر داخل ہوتے ہی
غریب قیدی زندہ درگور ہو جاتے ہیں اور ایک وقت میں ایک ایک پھکنے کے اندر بارہ بارہ چھوٹے کیڑے مقید نظر آتے ہیں۔
یہ تمام کیڑے رفتہ رفتہ گل کر پودے کا جزو بدن بن جاتے ہیں۔

یہ پودہ ایک زمانہ میں تو سطح آب پر رہتا ہے اور دوسرے زمانہ میں تالاب کی تلی میں بیٹھ جاتا ہے۔ یہ عجیب و غریب نقل و
حرکت بھی انہیں چھوٹے چھوٹے پھکنوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ جبتک کہ پودا اپنی غذا حاصل کرنے میں مصروف رہتا ہے
اسوقت تک یہ پھکنے ایک قسم کے وزنی رقیق مادہ سے لبریز رہتے ہیں جسکی وجہ سے کل پودہ تالاب کی تلی میں بیٹھا رہتا ہے
اس پودہ کا قطعی تعلق زمین سے نہیں ہوتا لیکن اس میں جڑیں وغیرہ مطلق نہیں ہوتیں۔ ایک عرصہ کے بعد جبکہ درخت

سکے پھولنے کا زمانہ آتا ہے تو پتوں کا اندرونی مادہ غائب ہو جاتا ہے - اور ان کے اندر اسکے بجائے ایک قسم کی گیس جمع ہو جاتی ہے - اس صورت میں پودہ پانی سے ہلکا ہو کر سطح آب پر تیرنے لگتا ہے جہاں اس کے خوبصورت زرین پھول کھلتے اور بار آور ہوتے ہیں پھل آ جانے کے بعد ان پتوں سے پھر گیس خارج ہو جاتا ہے اور وہی پہلا سا مادہ ان کے اندر بھر جاتا ہے جسکی وجہ سے یہ پودہ پھر زیر آب داخل ہو جاتا ہے -

احتشام علی ایم. ایس. سی

جذبات محمود

میں اور سوزشِ الم عشق و گداز — تو اور دل فریبیِ صد جلوہ ہائے ناز
اک جنبشِ نگاہ میں لاکھوں ہیں التفات — اللہ رے لطف پرسشِ چشمِ وفا نواز
ترکش سے اپنے تیرِ نظر کی ہے بے خبر — مشقِ حیا میں محو ہے وہ چشمِ نیم باز
برپا ہوں حشر اور میں مر مر کے جی اٹھوں — قدموں ہی پر رہے ترے اپنا سرِ نیاز
مرنا مریضِ عشق کو آسان اب کہاں — کچھ دل سے کہہ گئی ہے تیری چشمِ جاں نواز

یہ بدگمانیاں تجھے زیبا نہیں کہ ہے
محمود غم پرست تو پروردۂ نیاز

محمود اسرائیلی

استفسارات

مثنوی کا ایک شعر

جناب قاضی علیم ضیا صاحب وکیل (فیض آباد)

فروری کے نگار میں بہ سلسلۂ استفسارات سید عبدالمبین صاحب نے آپ سے مثنوی کے ایک شعر کا مطلب تحریر کرنے کی فرمائش کی ہے۔ شعر یہ ہے

کورکورانہ مرو در کربلا   تا نیفتی چون حسین اندر بلا

آپ نے جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ لفظ "تا" کے معنے "تاکہ" نہ لینا چاہئے بلکہ اسکے معنی اگر "جب تک" لئے جائیں تو مطلب بدل جاتا ہے اور شعر کا مفہوم یہ ہو جاتا ہے کہ "کربلا میں اندھوں کی طرح نہ چلے جاؤ، جب تک حسین کی طرح بلا میں پڑ کر مجبور نہ ہو جاؤ، یعنی تا وقتیکہ تم حسین کی طرح بلا میں پڑ کر مجبور نہ ہو جاؤ اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو"

اگر آپ میری جسارت کو معاف فرمائیں تو میں بھی اس باب میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، ممکن ہے کہ آپ میری ناچیز رائے سے اتفاق کریں۔ اس شعر کے ظاہری معنی تو ایسے ہیں کہ مولانا روم کے متعلق یہ خیال ہو سکتا ہے کہ انھوں نے معاذ اللہ حضرت امام حسین پر ایک قسم کا حملہ کیا ہے، لہٰذا مولانا روم کی تقدس مآب شخصیت کا لحاظ کرتے ہوئے تو یہ ظاہری معنی کسی حالت میں صحیح نہیں ہو سکتے۔ پھر اگر یہ معنے نہیں ہیں تو کیا ہیں؟ ۔ آپ نے جو معنے تحریر فرمائے ہیں اس سے گو مولانا روم پر کوئی الزام عاید نہیں ہوتا، مگر شعر گر جاتا ہے۔ علاوہ اسکے کربلا کے معنی اگر مقام کربلا کے لئے جائیں تو شعر مہمل ہو جاتا ہے اور اگر بطور استعارہ کے لیجئے تو اولاً۔ فارسی کلام میں اس کی کوئی سند نہیں کہ کربلا بمعنی ہلاکت کبھی استعمال ہوا ہو اور گو اُردو میں کربلا اس مقام کیلئے استعمال ہوتا ہے جہاں پانی نہ ہو لیکن بمعنی ہلاکت اردو میں بھی استعمال نہیں ہوتا۔ تیسرا اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت امام حسین کربلا میں جانے کے بعد بلا میں پڑے تھے نہ کہ قبل اور جو معنی آپ نے تحریر فرمائے ہیں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت امام حسین کربلا میں جانے کے پیشتر ہی بلا میں پڑ گئے تھے اور مجبور ہو گئے تھے کیونکہ آپ نے جو مفہوم بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ جب تک حسین کی طرح بلا میں پڑ کر مجبور نہ ہو جاؤ کربلا میں اندھوں

کی طرح نہ چلے جاؤ یعنی پہلے بلا میں پڑیں پھر کربلا میں جائیں۔ یہ مطلب واقعات کے برعکس ہو کیونکہ حضرت امام حسین کربلا میں جاکر بلا میں جاکر بلا میں پڑے تھے، لہذا بہر صورت کربلا کا مفہوم نہ تو مقتل کربلا ہو سکتا ہے اور نہ ہلاکت۔

میری ناچیز رائے میں جس طرح مولانا روم کے اشعار تمام تر تصوف میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اکثر ان کے دو مفہوم ہوتے ہیں، ایک ظاہری دوسرے سنوی۔ اسی طرح یہ شعر بھی اسی رنگ کا ہے اس شعر کو اگر یوں پڑھیے :-

کور تو راز مرہ در کرب لا — تا بیفتی چون حسین اندر بلا

تو اس کا صوفیانہ مفہوم صاف جھلکنے لگتا ہے۔

اہل تصوف کے ہاں ایک درجہ ہے جسے وہ درجۂ لَا کہتے ہیں اور لَا مخفف ہے لا الٰہ الا اللہ کا خدا کے وجود کا اثبات اور ماسوا اللہ کے وجود کی نفی یہی درجۂ لَا ہے اور اسی کو بالفاظ دیگر مسئلہ "ہمہ اوست" بھی کہتے ہیں اور یہ درجہ بہت خطرناک خیال کیا جاتا ہے اور اکثر درویش اس درجۂ لَا یا درجۂ فنا میں آکر بہک جاتے ہیں یا مجذوب ہو جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی آئندہ ترقی مسدود ہو جاتی ہے کیونکہ مسئلہ "ہمہ اوست" غلط ہے اور خلاف اسلام ہے اور "ہمہ از وست" صحیح ہے اور موافق اسلام ہے۔ فلسفۂ فنا ہندوؤں کا فلسفہ ہے اور فلسفۂ بقا اہل اسلام کا فلسفہ ہے اور بقا کا درجہ فنا کے بعد حاصل ہوتا ہے

مولانا روم نے اس کی ایک نہایت دلچسپ مثال بھی دی ہے وہ یہ کہ لوہے کو آگ میں ڈال دو کچھ دیر کے بعد وہ بھی مثل انگارے کے ہو جائے گا، یہی درجۂ فنا یا درجۂ لَا ہے، یعنی انسان خدا میں اس قدر محو ہو جائے کہ اپنے آپ کو بھول جائے اور یہ خیال کرے کہ بجز خدا کے کسی کا وجود ہی نہیں ہے تو میرا بھی وجود نہیں ہے، اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگے، بجنسہ جیسے دہکتا ہوا لوہا آگ میں پڑ کر یہ سمجھنے لگے کہ میں بھی انگارا ہوں، حالانکہ یہ اس کی غلطی ہے۔ اسی طرح اگر درجۂ لَا میں آکر انسان یہ سمجھنے لگے کہ میں خدا ہوں تو یہ اس کی غلطی ہے، لہذا صحیح مسلک یہی ہے کہ درجۂ لَا میں پڑ کر نہ رہ جائے بلکہ اس سے جلد گزر کر درجۂ بقا میں پہونچ جائے، یعنی اس کو یہ احساس ہو جائے کہ بندہ بھی ہے اور خدا بھی۔ درجۂ ہمہ اوست سے گزر کر درجۂ ہمہ از وست میں پہونچنا فلسفۂ اسلام کے بموجب سخت ضروری ہے، غالب درجۂ فنا کی غلطی کو تنگ نظری کہتے ہیں۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلید تنگ ظرفی منصور نہیں

گر درجۂ فنا میں آکر اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگنا ایک گونہ غلطی اور بہت بڑی لغزش ہے۔ منصور ہمہ اوست

کارخانہ اصغر علی محمد علی کا ٹیلیفون نمبر ۱۳۱ ہے

(دوجہ لا) میں رہتے، ہمہ از دوست تک نہیں پہنچے تھے کہ مجذوب ہوگئے اور انا الحق پکار اٹھے،
لہذا پہلے مصرع کے معنے یہ ہیں کہ درجہ لا کے کرب دائمی آتش میں تو اندھوں کی طرح
نہ پڑ جاؤ، دوسرے مصرع میں حسین سے مراد حضرت امام حسین نہیں ہیں بلکہ حسین ابن منصور ہیں۔
منصور دراصل ان کے والد کا نام تھا اور خود انکا نام حسین تھا مگر وہ ابن منصور کہلاتے کہلاتے۔
منصور مشہور ہوگئے اور اب ان کا اصلی نام کوئی نہیں جانتا۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کی آپ
تصدیق کر سکتے ہیں، لہذا دوسرے مصرع کے معنے یہ ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ تو حسین ابن منصور کی طرح
بلا میں پھنس جائے۔ اور منصور جس بلا میں پھنسے تھے وہ ظاہری و معنوی دونوں قسم کی تھی معنوی
بلا یہ تھی کہ [illegible] ورجہ لا ہی میں رہ گئے، درجہ بقا میں نہ آسکے اور ظاہری بلا یہ تھی کہ وہ سنگسار کئے گئے
دار پر چڑھائے گئے: اب کل شعر کے معنے لیجئے تو اسکا مفہوم بہت صاف ہو جاتا ہے اور شعر بھی بہت
بلند اور پر معنی نظر آنے لگتا ہے۔ رہی یہ بات کہ شعر میں الفاظ کربلا و حسین کیوں آئے تو یہ محض رعایت
لفظی ہے جس سے شعر کی خوبی اور چمک جاتی ہے۔

میری ناقص رائے میں شعر مذکور کے معنے یہی ہیں اور مجھے امید ہے کہ آپ بھی میری اس
رائے سے اتفاق کر کے مجھے ممنون فرمائیں گے، میری جسارت معاف فرمائیے گا، مگر چونکہ یہ ایک ادبی
نکتہ تھا میں نے بھی اس میں رائے زنی کی ہمت کی۔

(نگار) آپ نے جس تردد و کاوش سے کام لیکر اس شعر کی وضاحت فرمائی ہے وہ یقیناً قابل داد ہے، لیکن معاف فرمائیے مجھے
آپکی تحریر پڑھنے کے بعد بے اختیار یہ شعر یاد آگیا:۔

مرا بماتند خرم را نیز جا شد   زن دہقان بزاید یا نزاید

یعنی آپ نے تو ہر ممکن تاویل سے کام لیکر اپنی بات بنا ہی لی، بعد کو اگر منتقد اسکو غلط ٹھیرا دے یا آپکی تحریر میں
مجموعہ اضداد نظر آئے تو آیا کرے۔

آپ نے اپنی اس تحریر میں ضمناً بعض ایسے عجیب و غریب مسائل تحریر فرمائے ہیں کہ ان پر مستقل بحث کی ضرورت ہے
لیکن میں اسوقت ان کی طرف اعتنا نہیں کرونگا اور صرف مسئلہ مابہ النزاع سے جو امور متعلق ہیں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے دیکھونگا
کہ آپنے جو مفہوم اس شعر کا ظاہر فرمایا ہے وہ کس حد تک تسلیم کئے جانے کے قابل ہے۔

سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ میرے بیان کئے ہوئے مفہوم میں آپ نے کیا غلطی پائی؟ آپ کی تحریر
سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آپکو دو غلطیاں نظر آتی ہیں تو ایک تو یہ کہ لفظ کربلا بہ معنی ہلاکت کبھی استعمال نہیں ہوا اور کربلا کے معنے

اگر مقام کربلا لے لیا جائیں تو یہ شعر مہمل ہو جاتا ہے) دوسرے یہ کہ میرے بیان کئے ہوئے مفہوم کے مطابق امام حسین کا کربلا جانے سے پہلے ہی بلا میں پڑ جانا ثابت ہوتا ہے حالانکہ وہ کربلا میں جانے کے بعد بلا میں پڑے تھے۔ شاید اسی لحاظ سے آپ نے یوں فرمایا ہے کہ اس مفہوم سے شعر گر جاتا ہے۔ یہ آپ نے رعایت کی ورنہ اگر میرا بیان کیا ہوا مفہوم واقعی صحیح نہ تھا تو آپ کو صاف صاف لکھ دینا چاہیے تھا کہ اس مفہوم کے لحاظ سے شعر مہمل ہو جاتا ہے۔ بہرحال چونکہ اعتراض آپ کے صرف یہی دو ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اگر انکا معقول جواب دیدیا جائے تو پھر آپ کو بھی اس مفہوم کے تسلیم کرنے میں عذر نہ ہوگا۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ کربلا کے معنی ہلاکت کے نہیں ہیں لیکن لفظ کربلا بول کر استعارۃً ہلاکت کے معنے لینے میں بھی کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی۔ اول مصرعہ میں لفظ کربلا سے معنے مقام کربلا ہی کے ہیں لیکن استعارۃً اس کا مفہوم ہلاکت و تباہی کا ہے اور فارسی میں اس نوع کا استعمال کثرت سے پایا جاتا ہے۔ مثلاً "تو مرو در دہان اژدہا" کہ اژدہا بولکر جائے ہلاکت مراد لی گئی یا "بر توکل زانوئے اشتر ببند" کہ اشتر سے مراد یہاں کا روبار دنیا اور اسباب دنیا ہیں، ورنہ اگر آپ کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق عمل کیا جائے تو یہ معنے ہونگے کہ اژدر کے علاوہ اور تمام درندوں کے منہ میں چلے جانے کی اجازت ہے اور توکل علی اللہ علاوہ اونٹ کے اور تمام چوپایوں کے ہاتھ پاؤں باندھنا ممنوع نہیں ہے۔

آپ کا دوسرا اعتراض اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ امام حسین کربلا میں جانے کے بعد بلا و مصیبت میں مبتلا ہوئے نہ کہ قبل۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جناب حسین کا [illegible] مقابلہ یزید سے قبل ہی شروع ہو گیا تھا اور اسی کی جانب علامہ مدوح نے اشارہ کیا ہے۔ آپ نے شاید تاریخی نقطۂ نظر سے واقعۂ کربلا پر غور نہیں فرمایا ورنہ ایسا نہ فرماتے۔ اس جنگ کو سیاسی یا دنیاوی جنگ نہیں کہتے، تو لا محالہ اس کو حق و باطل، صداقت و کذب کا مقابلہ تسلیم کرنا پڑیگا اور امام حسین کا یزید پر فوجکشی کرنا صرف اس مجبوری کی بنا پر تھا کہ آپ حق و صداقت کو زیادہ پامال ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے اور آپ کا جذبۂ ایمانی مجبور کر رہا تھا کہ خواہ نتیجہ کچھ ہو وہ فسق و بغاوت کا مقابلہ کریں۔ کیا اس سے زیادہ کوئی صورت ابتلا کی ہو سکتی تھی اور کیا یزید کے مستبدانہ دور حکومت سے زیادہ کسی اور باطل و فاسق کی ضرورت تھی کہ امام حسین اس کے مقابلہ میں اپنے جوش ایمان کا مظاہرہ فرماتے۔ پھر اسی کے ساتھ جب آپ اس حقیقت پر بھی غور فرمائیں گے کہ کوفہ سے واپس آنے کے بعد امام حسینؑ نے بالکل مراجعت کا قصد فرما لیا تھا لیکن یزید کی فوج نے انہیں جانے نہیں دیا اور ان کے لئے کوئی صورت مفر کی باقی نہ رہی تو آپ کو یوں بھی اُن کی مجبوری و پریشانی کو تسلیم کرنا پڑیگا جو واقعۂ کربلا سے قبل ہی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے اس شعر کا مفہوم یہ ہوا کہ "بلا سمجھے بوجھے کسی شخص کو مصیبت میں نہ پڑ جانا چاہیے تا وقتیکہ وہ ان کی طرح مجبور نہ ہو جائے"۔

آپ نے جو مطلب بیان کیا ہے اس کو صحیح نہ سمجھنے کی وجوہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) مثنوی کے جتنے قدیم قلمی و معتبر نسخے موجود ہیں ان میں پہلا مصرع اسی طرح لکھا ہوا پایا گیا ہے:-

ع کور کورانہ مرو در کربلا

اگر مراد وہ ہوتی جو آپ کہتے ہیں تو بجائے کربلا کے کرب لا تحریر ہوتا کیونکہ حسب قاعدہ رسم خط کرب لا کو کربلا کی طرح نہیں لکھ سکتے۔

(۲) چونکہ بظاہر شعر میں ردیف بلا اور قافیہ کر ما قبل حرف ساکن معلوم ہوتا ہے اس لئے کرب لا پڑھنا فن شعر کے لحاظ سے غلط قرار پاتا ہے۔ پہلے مصرع میں کر اور دوسرے میں ادر قافیہ ہے اور ردیف بلا فتح با ہے اس لئے اس کو کسرہ نہیں دیا جا سکتا ہے۔

(۳) آپ نے جو توجیہہ و تصریح لفظ لا کی فرمائی ہے وہ ساقط الاعتبار ہے کیونکہ یہ کوئی نہ مسلم الثبوت علمی توجیہہ ہے اور نہ تاریخ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ اصطلاح اس معنے میں کبھی استعمال کی گئی تھی اگر کسی مخصوص جماعت نے صوفیا اس کے یہ معنے ([illegible]) کے انداز سے متعین کر لئے ہیں تو اسکا اطلاق عام نہیں ہو سکتا۔

(۴) اگر لا اس جگہ لا الہ الا اللہ کا مخفف ہے جیسا کہ آپ کا خیال ہے تو پھر یہ عین اسلام کا مسلک ہے، اس کو کرب و مصیبت سے کیونکر تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے لفظ لا کے اصطلاحی معنے پہلے، اثبات وجود باری اور نفی ماسوا اللہ بیان کئے ہیں، لیکن اسکے بعد آپ فرماتے ہیں کہ ہمہ اوست بھی یہی ہے حالانکہ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ الغرض آپ نے تین جداگانہ تعبیریں کی ہیں اور تینوں کو آپ ایک کہتے ہیں حالانکہ تینوں ایک دوسرے سے علحدہ ہیں۔ اگر لا کلمۂ توحید کا مخفف ہے تو اسکو نفی ماسوا اللہ سے کوئی واسطہ نہیں اور اگر اس سے مراد نفی ماسوا اللہ ہے تو آپ اسے ہمہ اوست نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ شخص جو نفی ماسوا اللہ کا قائل ہے اسکے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہمہ اوست کا بھی قائل ہو ان دونوں میں فرق ہے۔

اسکے بعد آپ نے لا کے مقابلہ میں ایک اصطلاحی لفظ بقا کا استعمال کیا ہے اور دعوے کیا ہے کہ یہ فلسفۂ اسلام ہے۔ لیکن آپ نے بقا کی کوئی صراحت نہیں فرمائی اور نہ یہ ثابت کیا کہ فنا کیونکر فلسفۂ ہنود ہے اور اسکا کیا مطلب ہے۔

(۵) میں جانتا ہوں کہ حسین نام منصور کا تھا لیکن چونکہ یہاں کوئی ضرورت اس امر کی نالشی نہیں ہوتی کہ بجائے حسینؓ کے اسکو مراد لیا جائے اس لئے میں اس بحث کو نہیں چھیڑتا کہ حسین بن منصور حقیقتاً ایک بیدین شخص تھا اور وہ اپنے افعال و اعمال کے لحاظ سے اس قابل نہ تھا کہ مولانا روم اس کا ذکر کرتے اور وہ بھی اسقدر اہتمام کے ساتھ کہ بعد کو کربلا کے ٹکڑے کرکے کرب لا بنانے کی ضرورت دنیا کو لاحق ہوتی۔

(۶) آپ نے درجۂ فنا کی غلطی غالب کے کلام سے بھی ثابت کی ہے، حالانکہ جو شعر آپ نے نقل کیا ہے اسی سے درجۂ فنا کی اہمیت و صداقت ثابت ہوتی ہے، غالب کو اگر احتراز ہے تو صرف اس امر سے کہ وہ اسکا اعلان نہیں کرنا چاہتا وہ کہتا ہے کہ" حقیقتاً اپنا قطرہ بھی دریا ہے، یعنی میری ہستی بھی وہی چیز اصلی ہے (جسے دریا سے تعبیر کیا ہے) لیکن میں منصور کیطرح تنگ ظرف ہو کر اسکا اعلان کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

کارخانہ اصغر علی محمد علی کی ایک شاخ گلزار حوض حیدرآباد دکن ہے

(۷) سوائے اس کلام کے جس کو ہم وحی متلو یا وحی غیر متلو کہتے ہیں، ہمکو کسی اور کلام میں تاویل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ کلام پاک اور حدیث نبوی کے متعلق ہمارا اعتقاد ہے کہ وہ وحی خداوندی ہے اور اس میں کوئی سقم نہیں ہوسکتا، اس لئے انسان اپنی ناچیز فہم کے مطابق اگر ان میں کوئی بات خلاف عقل پاتا ہے تو قدرتاً تاویل پر مجبور ہوتا ہے اور اسے تاویل کرنی چاہئے تاوقتیکہ اصل حقیقت کا انکشاف اس پر ہوجائے، لیکن کسی انسانی کلام کے متبادر معنے چھوڑ کر دور از کار تاویلوں سے کام لینا اسی طرح جائز نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی شاعر کا شعر یا کسی مصنف کی تصنیف کسی مروجہ انسانی زبان میں لکھی گئی ہے، تو ہمارا فرض ہے کہ اسی زبان کے مقررہ اصول و اصطلاحات مسلمہ کی رو سے اسکو سمجھیں اور اسپر تنقید کریں اور اگر اس لحاظ سے کوئی نقص اس میں پایا جائے، یا یہ کہ مصنف کسی غلط نظریہ کا مقلد دیکھا جائے تو اس نقص و غلطی کو وہی سمجھیں جو اس کی حقیقت ہے۔ ہمکو کوئی حق حاصل نہیں کہ خواہ مخواہ اس کی تاویل کرکے اپنی مزعومات و قیاسات کے مطابق اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں۔ مثلاً کلام حافظ کو لیجئے کہ اسکے کلام کی تاویل حضرات صوفیہ نے کس کس طرح کی ہے، لیکن اگر انصاف سے کام لیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ تاویل اس کے کلام کی نہیں ہے بلکہ صرف اس خیال کی پاسداری ہے جو حافظ کے متعلق قائم کرلیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ آج مشکل سے کوئی شخص ایسا ملیگا جو بادہ کو صرف بادہ سمجھکر کلام حافظ سے لطف اٹھاتا ہو۔

اسی طرح مثنوی کے بھی بہت سے اشعار کی لوگوں نے عجیب و غریب تاویل کی ہے۔ حالانکہ بعض شعر تو ایسے ہیں جنکی تاویل کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی (جیسا کہ یہ کربلا والا شعر) اور بعض کی تاویل اسوجہ سے کی گئی ہے کہ ان کا مفہوم مولانا روم کی شخصیت سے بہت بعید نظر آتا ہے۔ حالانکہ میری رائے میں بجائے تاویل کرنے کے کہیں زیادہ مستحسن امر یہ ہے کہ اس شعر کو غلط قرار دیا جائے اور مولانا روم سے منسوب ہی نہ کیا جائے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت جتنی کتابیں نظر آتی ہیں وہ بعینہ مصنف کے اصل مسودہ کی نقلیں ہیں اور ان میں کوئی حذف و اضافہ نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ اکابر علماء و صوفیہ کی تصانیف میں جو بعض باتیں ایسی نظر آتی ہیں وہ بعد کا اضافہ ہوں اور انھوں نے اسکو لکھا ہی نہ ہو۔ یہ مختصر سی بحث میں نے اس لئے کی تاکہ تاویل وغیرہ کے متعلق کم از کم میں اپنے اصول کو آپ پر واضح کردوں۔

(۸) مثنوی کی مستند شرحیں موجود ہیں اور ہرچند مجھے اس وقت تک ان میں سے کسی کے مطالعہ کا شرف حاصل نہیں ہوا اور نہ اسکی ضرورت سمجھتا ہوں، لیکن کم از کم اس شعر کے معاملہ میں میرا بھی جی چاہتا ہے کہ شارحین کی رائے معلوم کروں۔ اگر آپ کے پاس کوئی شرح ہو تو ملاحظہ کرکے مجھے اطلاع دیجئے۔ ممنون ہونگا

بقیہ ملاحظات

گزشتہ ماہ سے نگار میں، ماہیرو کی چٹنی کا اشتہار شائع ہو رہا ہے جس میں برسبیل "اضافہ قبل الفکر" میری رائے کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔
میں نے اس چٹنی کو عرصہ تک استعمال کیا اور اسقدر لذیذ پایا کہ آخر کار چھوڑنا پڑا کیونکہ میں ڈرتا تھا کہیں اس کا استعمال میری ضروریات حیات میں شامل نہ ہو جائے۔ میں امید کرتا ہوں کہ جو حضرات طلب فرمائیں گے انکو افسوس ناک نتائج تجربہ کبھی نہ ہوگا اور وہ اس کارخانہ کو بہت امین و دیانتدار پائیں گے۔

جس وقت آخری کاپی پریس کو جا رہی تھی مسٹر عبدالرحمن چغتائی کی یہ مسرت خیز تحریر آئی کہ انھوں نے نئی تمثال "شعلہ رسا، عالم انتظار اور "اسیری" کی دو نہایت دلکش تصویریں طیار کرائی ہیں جو ۱۲ اپریل تک یہاں پہونچ جائیں گی۔ ممکن تھا کہ اس ماہ کے رسالہ میں بھی ایک تصویر ان میں سے دیدیجاتی، لیکن اشاعت میں کچھ تعویق ہو جاتی۔ جناب چغتائی کی عنایت اگر شامل حال رہی تو امید ہے کہ آئندہ ماہ سے نگار میں تصویر بالالتزام شائع ہوگی۔

صرف نوردنی خضاب لگائیے

سارٹیفکیٹ ملاحظہ ہو

نگار
ایک علمی ادبی رسالہ
نیاز فتحپوری

تاریخ اشاعت　　　　بسم اللہ　　　　ہر ماہ کی پندرہ

نگار

ایڈیٹر! نیاز فتحپوری

قیمت سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ　　　　ہندوستان سے باہر علاوہ محصول چھ روپیہ

جلد (۹)	مئی ۱۹۲۶ء	شمار (۵)

ملاحظات

انسانی زندگی کے سب سے زیادہ تکلیف دہ، لیکن اسی کے ساتھ نہایت دلچسپ لمحات وہ ہوا کرتے ہیں جب حوادث روزگار کسی کو اپنا نشانہ بنانا شروع کر دیں، یہی وہ ہے جسے مذہب تصوف کی زبان میں "آزمائش و ابتلا" کہتے ہیں، اور ادبی ذوق رکھنے والے فطرت کی شوخیوں سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن کاروباری دنیا اور مادی عالم میں جان کا خدا "سلسلۂ علت و معلول" کے سوا اور کچھ نہیں، "طبیعیات" کی یہ ستم رانیاں اسقدر حوصلہ فرسا اور دل شکن ثابت ہوتی ہیں کہ نہ مذہب کی تاویل اس کا مداوا کر سکتی ہے اور نہ شاعرانہ تصورات کے نتائج کی تلخیوں میں کوئی کمی۔

ہر شخص اپنی اپنی جگہ امن و سکون کی جستجو میں سرگرداں ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ قدرت کا محبوب ترین مشغلہ یہی ہے کہ وہ تدابیر کے اضمحلال کو برابر ہم پر ثابت کرتی رہے، عمارتوں کو ڈھائے اور نقوش کو مٹائے، پھر اکثر و بیشتر اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی "تعمیری" جد و جہد کو چھوڑ بیٹھتا ہے اور اپنے آپ کو "سیل زمانہ" کے حوالہ کر دیتا ہے، لیکن کچھ سخت جان ایسے بھی ہوتے ہیں جو آخیر وقت تک ہاتھ پاؤں چلاتے رہتے ہیں، جو میرے نزدیک صرف برسبیل عادت ہوتا ہے، اگر کامیابی ہو گئی تو خیر پند و نصائح کے لئے ایک مثال و نمونہ بن گئے ورنہ "شہادت" تو قسمت میں لکھی ہی ہے۔

قدرت کی یہ عنایتیں مجھ پر اگست ۱۹۳۲ء سے شروع ہوتی ہیں اور اُسوقت سے لیکر تا این دم، ایک لمحہ بھی فارغ البالی و [illegible] بسر نہیں ہوا، مسرت و نشاط کا کیا ذکر ہے لیکن میں نے ان تمام روحانی کلفتوں کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا کیونکہ یہ بیکار سی بات ہے اور نہ اس وقت میں ان کی تفصیل آپ کو سنانا چاہتا ہوں کیونکہ اول تو کسی کو میرے ساتھ ہمدردی کیوں ہونے لگی اور اگر ہو بھی تو کیا نتیجہ کہ غم و الم کی تقسیم ممکن نہیں

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں مختصراً میں نے ان حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احباب سے معذرت چاہی تھی کہ اگر میرے اس دورِ حیات میں کوئی فروگذاشت نظر آئے تو اس کو میری مجبوری پر محمول فرمائیں اور اب بلا تفصیل پھر اسی کی تکرار کر رہا ہوں۔ نگار کے قیام و اجراء کی طرف سے تو مطمئن رہیے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ آئندہ چند ماہ تک میں ان تدابیر پر عمل نہ کر سکوں جو نگار کو بہتر اسلوب میں پیش کرنے کے لیے استوار ہو چکی ہیں۔ اس لیے ناظرین سے صرف استدعا التجا ہے کہ وہ اپنی موجودہ ہمدردی کو بدستور قائم رکھیں اور اپنی بے اعتنائی سے میری تکالیف میں اضافہ نہ فرمائیں کیونکہ یوں بھی مجھے حزین و ملول رکھنے کے لیے کسی چیز کی کمی نہیں ہے ؎

ستارہ و فلک و بخت و روزگار بہت

ماہ اپریل کے رسالہ تجلی میں اس کے فاضل اڈیٹر نے اصغر گونڈوی کے متعلق اظہار رائے کیا ہے کہ:-

”وہ بہت معمولی علمی لیاقت رکھنے کے باوجود اکثر ایسا اچھا شعر کہتے ہیں کہ روح وجد کرتی ہے لیکن ذہانت سے اچھا شعر کہنا ممکن ہے، بے عیب شعر کہنا ناممکن ہے۔ حال ہی میں اصغر صاحب کی غزل جوبلی علی گڑھ کے مشاعرہ میں سب سے بہتر قرار دی گئی اور انھیں ایک طلائی تمغہ پیش کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ غزل میں چند اشعار قابل داد ہیں لیکن مقطع میں ایک ایسی فاش اور ناقابل تاویل غلطی موجود ہے جس کی بنا پر اہل نظر انھیں تمغہ تو کجا قابل شعرا کی صف میں جگہ دیے جانے کو بھی پسند نہ کریں گے۔ وہ مقطع یہ ہے۔ ؎

نہیں دیوانہ ہوں اصغرؔ سمجھ میں خوش عملی   کوئی کھینچے لیے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

اصغر صاحب اور ان کے تمغہ دہندوں کو یہ خبر نہیں کہ جیب و گریبان ایک ہی مسمّیٰ کے دو نام ہیں جیب عربی ہے گریبان فارسی ہے“

معلوم نہیں حضرت وحشتی شاہجہانپوری کا اصل مقصود اس تحریر سے اصغر صاحب کی کم علمی کو ثابت کرنا ہے یا صرف جیب و گریبان کی غلطی کو نمایاں کرنا۔ اگر مقصود صرف اس شعر کی اصلاح تھا تو ان کی کم علمی کا ذکر غیر ضروری تھا اور وہ بغیر اس دل آزاری کے بھی پورا ہو سکتا تھا اور اگر مقصود حقیقتاً یہی تھا کہ ان کی کم علمی کو ظاہر کیا جائے تو افسوس ہے کہ اس کے ثبوت میں جس شعر کو پیش کیا گیا ہے وہ کافی دلیل نہیں ہو سکتا۔

یہ درست ہے کہ لفظ ”جیب“ کا مفہوم عربی میں وہی ہے جو گریبان کا فارسی میں ہے، لیکن فاضل نکتہ چیں کو شاید اس حقیقت سے بھی انکار نہ ہوگا کہ مجازاً لفظ جیب، کیسہ کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور اس کا وہی مفہوم ہوتا ہے جو پاکٹ کا ہے۔

اگر اسپر یہ اعتراض کیا جائے کہ اُردو میں کسی لفظ کے غلط مفہوم کا رائج ہوجانا سند، پیش نہیں ہوسکتا، تو میں کہونگا کہ لفظ جیب نہ صرف اُردو بلکہ خود عربی زبان میں بھی پاکٹ کے معنی میں کثرت سے رائج ہے:

حال ہی میں مصر کے ایک مشہور فاضل نے عربی زبان کا ایک پاکٹ سائز لغت مرتب کیا ہے اور اس کا نام قاموس الجیب رکھا ہے۔ اسی طرح قاموس العصری میں لفظ جیب کے معنی پاکٹ کے بھی لکھے ہیں اور مثالاً "وضعہ فی الجیب" کا فقرہ درج کیا ہے۔ پھر جب اصل زبان میں اس لفظ کے معنی مجازاً یہ لیے جاتے ہیں تو اُردو میں جہاں عموماً لفظ جیب کے معنی صرف کیسہ کے لیے جاتے ہیں، کیونکر ناجائز و ممنوع قرار دیا جاسکتا ہے۔

اصغر صاحب نے کبھی اپنے علم و فضل کا دعویٰ نہیں کیا کہ مولانا وحشی کو اس کی تردید ضروری ہوتی، وہ صرف ایک شاعر کی حیثیت سے روشناس ہوئے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے کلام پر تنقید کرنی چاہیے۔ اگر ان کے اکثر اشعار سے وحشی صاحب کی روح وجد کرنے لگتی ہے تو کیا یہ کافی ثبوت اصغر کے شاعر ہونے کا نہیں ہے۔ رہی قابل و ناقابل شعراء کی تفریق و صف بندی سو یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ ایک شاعر کا کلام کلیتہً اغلاط سے پاک ہوسکتا ہے اور محض زبان یا فن کی بعض غلطیوں کی وجہ سے کس طرح ایک حقیقی شاعر کو قابل شعراء کی صف سے نکال کر ناقابل شعراء کی صف میں جگہ ملنی چاہیے۔ اگر ایک شخص اچھا شاعر پیدا ہوا ہے تو وہ اپنی فطرت گوئی کے لحاظ سے قابل ہی شاعر شمار ہوگا خواہ وہ جاہل ہی کیوں نہ ہو اور اگر کوئی شخص فطرتاً شاعر نہیں ہے تو کوشش سے اس کو ناقابل شعراء کی صف میں جگہ نہیں مل سکتی خواہ کتنی ہی زبردست سند فضیلت اس کے پاس موجود ہو۔

مجھے افسوس ہوا کہ وحشی صاحب نے اصغر کی کم علمی کا ذکر کرکے ایک ایسے جذبہ کا اظہار کیا جو اُن جیسے سنجیدہ و متین انسان کے لیے کبھی موزوں نہیں ہوسکتا کم از کم وحشی صاحب کے متعلق میں کبھی یہ خیال نہیں کرسکتا کہ انکا شمار بھی اُن لوگوں میں ہے جن کے متعلق ایک شاعر لکھ گیا ہے۔ کہ:

خانہ در شرع خراب است کہ ارباب صلاح

در عمارت گری گنبد دستار خودند

صوبہ بہار کے ایک معاصر نے یو۔پی کے ایک سالہ کی روداد ان الفاظ میں دی ہے۔ وہ کسی کے لیے باعث فخر ہو یا سبب رسوائی ہمیں اس سے واسطہ نہیں، لیکن اس میں کلام نہیں کہ ان کو دیکھکر ہمیں وہ منظر ضرور یاد آگیا جب کوئی نصرانی دم واپسیں کسی راہب کے سامنے اعتراف معاصی کرتا ہے اور چونکہ اُسے یقین ہوتا ہے کہ اب دُنیا میں رہنا ہے، اس لیے دل کھولکر بغیر کسی شرم و حجاب کے اپنے ماضی کو بے نقاب کردیتا ہے۔

ہمارے معاصر کو اگر یہ یقین ہوگیا تھا کہ وہ کسی کا باطن بنگاہ قلم نعین کی بُرائیوں فواحش زندگی کو پیش کررہا ہے اور ان ہی کی سیہ کاریوں کو طشت از بام کر رہا ہے" تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کے اعلان کی کیا ضرورت تھی جب کہ ایک انسان اس سے

بھی زیادہ ناپاک و مکروہ معاصی کے ارتکاب کے لیے آمادہ ہو سکتا ہے بعض حضرات کو اندیشہ ہے کہ کہیں یہ داد "نتیجہ بعد از ملاقات" تو نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمارے نزدیک اس مدح سرائی کو "عرض تمنا" کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ایسی گفتار کے لیے ایسے ہی کردار کا دعویٰ توجہ کو جلب کر سکتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ امر کس قدر حیرت ناک ہے کہ ساقی کو یہ بھی خبر نہیں کہ:۔

مے خانہ سبیل و در مقال بازست

اس دوران میں جو کتابیں ریویو کے لیے موصول ہوئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہم "نظریۂ اضافیت" ہے جسے سراج الدین صاحب ایم۔ اس۔ سی۔ پروفیسر طبیعیات اسلامیہ کالج پشاور نے مرتب کیا ہے۔

نظریۂ اضافیت (Relativity) موجودہ زمانہ حال کا جدید ترین نظریہ ہے جسے جرمنی کے ایک ماہر طبیعیات آئن اسٹین نے پیش کیا ہے۔ یہ نظریہ کیا ہے، اس سے طبیعیات کے اصول میں کیا انقلاب پیدا ہوتا ہے، اور ہم اس کے ذریعہ سے کائنات کا کس قدر علم حاصل کر سکتے ہیں، یہ وہ مسائل ہیں جنھیں فاضل پروفیسر نے نہایت سہل آسان زبان میں پیش کیا ہے۔ چونکہ نظریۂ اضافیت کے سمجھنے کے لیے طبیعیات کے بعض ابتدائی مسائل علی الخصوص علم حرکات کا سمجھنا ضروری ہے، اس لیے اس کتاب میں سب سے پہلے طبیعیات کے بعض ایسے ضروری مسائل کو سمجھایا گیا ہے کہ اگر ان کو پڑھ لیا جائے تو ذہن نشین ہونے میں آسانی ہو جائے۔

علاوہ دیباچہ اور مقدمہ کے یہ کتاب چار مقالوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلے مقالہ میں "مابعد الطبیعیات"، "ریاضیات"، "علم الحرکت"، "مادہ"، "فضائے مطلق"، "نظام عالم"، "نیوٹن کا قانون تجاذب"، "کثافت اجسام"، "نور و اثیر" اور "نظریۂ برقیہ" سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے اور تیسرے مقالہ میں "نظریۂ اضافیت" کی تشریح ہے اور مختلف ابواب قائم کر کے اس کو سمجھایا گیا ہے۔ چوتھے مقالہ میں اہمیت علم ... بیان کیا گیا ہے جس میں رد نظریۂ اضافیت پر جو اعتراض کیے گئے ہیں ان کا جواب دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اصطلاحات کا ترجمہ ہے اور پھر جدید اصول کے مطابق ایک مفصل انڈکس یا فہرست ہے۔

"نظریۂ اضافیت" چونکہ نیوٹن کے "قانون تجاذب" کو شکست دینا چاہتا ہے اس لیے اب ساری علمی دنیا اس طرف متوجہ ہے اور یورپ میں کثرت سے اس موضوع پر کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اردو میں اس وقت تک کوئی مفصل مضمون بھی اس بحث پر شائع نہیں ہوا تھا، چہ جائیکہ کوئی تصنیف، اس لیے ملک کو پروفیسر سراج الدین صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انھوں نے اس معرکۃ الآرا نظریہ پر بے مثل تصنیف کر کے اردو داں طبقہ کے لیے اس علمی موضوع کو قابل فہم بنا دیا۔

فاضل مؤلف کی محنت و کاوش کی داد حقیقتاً وہی شخص دے سکتا ہے جس نے کبھی اس نوع کی علمی مضامین کا ترجمہ کیا ہے۔ چونکہ میں نے گزشتہ سال نگار میں ایک مضمون اس موضوع پر لکھا تھا اس لیے میں اس کتاب کی اہمیت اور مؤلف کی غیر معمولی عرق ریزی و جانفشانی کا اندازہ کر سکتا ہوں۔

اصطلاحات کے ترجمہ میں بہت کم مجھے کہیں کہیں اختلاف ہے۔ ذیل میں چند الفاظ کی فہرست ملاحظہ ہو۔

---

(۱) Aberration of light اس کا ترجمہ "اعوجاج شعاع" کیا گیا ہے میری رائے میں "انحراف نور" زیادہ فصیح ہے۔

(۲) Axiom. امر بدیہی سے بہتر میرے نزدیک بدیہیہ ہے، مختصر بھی ہے اور اصطلاحی شان بھی رکھتا ہے

(۳) Convergence استدقاق۔ بہت ثقیل لفظ ہے۔ اتجاہ یا تقارب زیادہ مناسب ہے۔

(۴) Coordinates خطوط مرتبہ صحیح نہیں ہم مراتب ہونا چاہیے۔

(۵) Common-Sense عقل عام عقل عامہ یا حس مشترک کے بجائے ذوق سلیم یا ذوق فطری بہتر معلوم ہوتا ہے

(۶) Election. برقیہ درست ہے لیکن عربی میں اس کے لیے اصطلاحی لفظ کہربائی موجود ہے۔ اس لفظ کے استعمال میں یہ فائدہ ہے کہ نسبت کی صورت میں اس کو کہربائی کر سکتے ہیں اور برقیہ محدود ہے۔

(۷) Ellipse. ہلیجی لکھا ہے غالباً کتابت کی غلطی ہے اس کو اہلیلجی ہونا چاہیے۔

(۸) Energy. توانائی بالکل غیر علمی لفظ ہے۔ میری رائے میں قوت بہتر ہے۔

(۹) Focus ماسکہ کے بجائے اگر نقطۂ احتراق ہو تو زیادہ مناسب ہے

(۱۰) Inertia اس کا ترجمہ جمود میری سمجھ میں نہیں آیا استمرار ہونا چاہیے

(۱۱) Latent Energy مخفی توانائی۔ اچھا ترجمہ نہیں ہے قوت کامنہ ہونا چاہیے۔ یہی اصطلاحی لفظ ہے

(۱۲) Natural. قدرتی سے زیادہ مناسب فطری ہے۔

(۱۳) Nebula ہیولائے سحابی، کی کیا ضرورت ہے جب کہ لفظ سدیم موجود ہے۔

(۱۴) Object glass عدسۂ خارجہ دہانہ۔ نہایت اُلجھا ہوا ترجمہ ہے عدسۂ ایجابیہ کافی ہے۔

(۱۵) Photography عکسی تصویر کشی کے بجائے صرف تصویر شمسی کافی ہے۔

(۱۶) Plate حساس تختی۔ کی جگہ صرف لوح ہونا چاہیے۔

(۱۷) Psycho-Physiology علم تسریح دماغ۔ اچھا ترجمہ نہیں وظائف نفسی میں کیا حرج ہے۔

(۱۸) Quantum theory نظریۂ قدر سے نظریۂ مقادیر زیادہ فصیح ہے۔

(۱۹) Radial motion منظاری حرکت۔ کی جگہ حرکت شعاعی استعمال کیا جائے تو اچھا ہے۔

(۲۰) Reaction اس کا ترجمہ جواب عمل کی جگہ ردّ عمل زیادہ مناسب ہے۔

(۲۱) Refraction انعطاف شعاع کے بجائے انکسار نور میرے خیال میں بہتر ہے۔

(۲۲) Retardation ابطاء بہت ثقیل ہے تعویق یا تاخیر سے بھی یہی مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

(۲۳) Rotating bodies اس کا ترجمہ گھومنے والے اجسام کیا گیا ہے۔ چونکہ تمام اصطلاحوں کا ترجمہ عربی الفاظ میں کیا گیا ہے اس لیے برا معلوم ہوتا ہے اجسام دوّارہ ہونا چاہیے

(۲۴)	Spectroscope	طیف نما یا منظار اللون کی کیا ضرورت ہے جبکہ اصطلاحی لفظ موشور موجود ہے
(۲۵)	Temperature	بجائے تپش کے حرارت کیا جائے تو بہتر ہے۔
(۲۶)	Transformation	استحالہ کے بجائے۔ تحویل ہونا چاہیے۔
(۲۷)	Ultra violet	ماورائی ابنفشی کے بجائے ماورا ابنفسجی ہونا چاہیے۔
(۲۸)	Work	اس کا ترجمہ کام۔ غیر اصطلاحی ہے عمل ہونا چاہیے۔
(۲۹)	X-rays	شعاع رانجی کے بجائے شعاع رانجنی ہونا چاہیے۔

یہ کتاب تقریباً ۵۰۰ صفحات پر نہایت عمدہ طباعت وکتابت کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور مجلد کی قیمت للعہ اور غیر مجلد کی للعہ رکھی گئی ہے جو کسی طرح زیادہ نہیں ہے۔ براہ راست مصنف سے طلب کی جائے۔

دوسری کتاب مولانا اسلم جیراجپوری کی تاریخ نجد ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں اہل نجد کے غلبہ سے عام لوگوں میں ان کے حالات معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوگئی ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تالیف نہایت برمحل ہے اور بالکل اقتضائے وقت کے مطابق۔ فاضل مؤلف نے اس رسالہ میں پہلے نجد کے جغرافی و تاریخی حالات لکھے ہیں (جو ضروری تھے) اور بعد شیخ محمد عبدالوہاب کے زمانہ سے شروع کرکے محمد بن سعود، عبدالعزیز اول، سعود بن عبدالعزیز، عبداللہ بن عبدالعزیز، عبداللہ بن سعود، ترکی بن عبداللہ، فیصل بن ترکی۔ عبداللہ بن فیصل اور موجودہ سلطان نجد تک کے حالات درج کیے ہیں۔

عام مسلمانوں میں نجدیوں کی بابت جو بدگمانی عرصہ سے چلی آرہی ہے وہ بھی اس کتاب کے مطالعہ سے دور ہو سکتی ہے، کیونکہ اس بدگمانی کا بہت بڑا سبب صحیح حالات سے بے خبر ہونا ہے اور یہ بے خبری اس کتاب کے دیکھنے سے رفع ہو جاتی ہے۔ اُردو میں اس موضوع پر اس وقت تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ لوگ جو اہل نجد کے حالات سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں، انھیں اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ قیمت ایک روپیہ ہے اور مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی سے مل سکتی ہے۔

تیسری قابل ذکر کتاب مفتی سید عبدالقیوم صاحب وکیل جالندھر کی دین کامل (جلد اول) ہے۔ اس کتاب میں مذہب اسلام کی حقیقت اور اُس کی حقیقی روح سے بحث کی گئی ہے پہلے باب میں مذہب کا مفہوم بتایا ہے۔ دوسرے میں اس کی ضرورت سے بحث کی ہے، تیسرے باب میں مذہب و فطرت انسانی کے تعلق کو دکھایا ہے، چوتھے میں شناخت مذہب کے معیار بتائے ہیں اور آیندہ چھ ابواب میں اسلام کی تین قسمیں فطری۔ عقلی اور الہامی کرکے اختلاف مذاہب کے اسباب

بحث کرکے اسلامی اسلام کے چودہ ابدی اصول بتائے ہیں اور اسلام مکمل کا خاکہ پیش کرکے پہلی جلد کو ختم کردیا گیا ہے۔ ہرچند اس موضوع پر یہ پہلی کتاب نہیں ہے لیکن یہ بحث اسقدر وسیع ہے کہ جتنی کتابیں بھی اسپر لکھی جائیں کم ہیں۔ مذہب کا مطالعہ مختلف لوگوں کے نقطہ ہائے نظر سے، بجائے خود ایک ایسا دلچسپ مشغلہ ہے کہ اس میں کبھی فرسودگی پیدا ہی نہیں ہوسکتی اور ہر کتاب سے کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور معلوم ہوجاتی ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ مفتی سید عبدالقیوم صاحب نے اس کتاب کی تالیف میں کافی محنت سے کام لیا ہے اور طریق استدلال و اسلوب بیان نہایت سلیس و پاکیزہ ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ملک میں مقبول ہوگی اور اس کی باقی جلدیں بھی فاضل مؤلف کو جلد شائع کرنی پڑیں گی۔ یہ کتاب عیہ میں مصنف سے جالندھر کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

"تحریم الخمر فی الاسلام" ایک رسالہ ہے جس میں مولانا سید احمد (مجتہد العصر لکھنوی) نے مولانا شبلی کی تحقیق حرمت خمر کے خلاف بحث کی ہے۔ اس بحث کا آغاز نگار کے اس مضمون سے ہوا تھا جو "ملک خدائے شہزادے" کے عنوان سے ستمبر و اکتوبر سنہ ۱۹۲۵ء میں شایع ہوا تھا۔ اس مضمون میں مولانا شبلی پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ انھوں نے آیۂ لاتقربوا الصلوٰۃ کی شان نزول بیان کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا اور حضرت علی کے واقعۂ شراب نوشی کو درج کردیا جو صحیح نہیں ہے

اس مسئلہ پر ہم خود نگار میں ایک مضمون لکھ چکے ہیں لیکن اس رسالہ میں زیادہ شرح و بسط کے ساتھ اس روایت کے ضعف کو ثابت کیا گیا ہے۔ اور راویوں پر بھی جرح کرکے زیادہ تنقیح سے کام لیا ہے۔ چار آنے میں یہ کتاب نادری پریس جبلپور سے مل سکتی ہے۔

آج ۲۳ - اپریل کو میں ملاحظات کی آخیری کاپی لکھ رہا ہوں اور اسوقت تک جناب چغتائی کی تصاویر موصول نہیں ہوئیں اگر رسالہ کی اشاعت تک کوئی تصویر مل گئی تو شایع ہوجائیگی۔ آیندہ کے لیے کیا عرض کرسکتا ہوں جبکہ یہ میرے اختیار سے باہر ہے، میں زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتا تھا کہ ان کو اس پر آمادہ کردوں۔ لیکن وعدہ کرنے کے بعد بھی اگر وہ کسی وجہ سے اس کا ایفاء نہ کرسکیں تو میں کیا کرسکتا ہوں۔

"نیاز فتحپوری"

منصب	تعداد	منصب	تعداد
ششش ہزاری	۰	چہار ہزاری	۴
سہ ہزاری	۱	دو ہزاری	۷
پانصدی	۲۰		

علاوہ برین دوصدی سے لیکر چارصدی تک کے منصب پر بیشمار ہندو مقرر تھے۔

جہانگیر کے عہد مین ہندوؤن کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل تھی جہانگیر نے اعلان کر دیا تھا کہ کوئی ہندو زبردستی مسلمان نہ بنایا جائے تخت بیٹھنے کے بعد جہانگیر نے جو کام کیا وہ زنجیر عدل کی طیاری تھی فریادی کے لئے ہر قوم و مذہب کے مظلوم آکر اسکو ہلاتے تھے اور بادشاہ خود انکا انصاف کرتا تھا۔ اس کے عہد مین بڑے بڑے مندر تعمیر ہوئے جنمین گوبند دیوی کا عالیشان مندر بھی ہے جو متھرا کے قریب بندرابن سنسان جنگل مین آجتک نظر آتا ہے جہانگیر کا دربار جہان طالب آملی جیسے ملک الشعرا سے رونق افروز ہو رہا تھا وہان [illegible] جیسا شاعر مذہب سیاسی اور [illegible] جیسے فرزانۂ روزگار کا فیض بھی حاصل کر رہا تھا عہد جہانگیری کے ہندو منصب دارون مین راجہ بکر موہن داس، راجہ مان سنگھ اور راجہ بخشتمل وغیرہ کے نام بہت مشہور ہین۔

شاہجہان کی بابت تقریباً تمام مورخون کا خیال ہے کہ اس جیسا انتظام کرنیوالا سلطنت تیموریہ مین کوئی بادشاہ نہین ہوا مسیو [illegible] لکھتے ہین کہ شاہجہان اپنی رعایا پر مثل بادشاہ کے حکومت نہین کرتا بلکہ ایسا برتاؤ کرتا ہے جیسا کہ باپ بیٹون کے ساتھ کیا کرتا ہے اور گو اس کی حکومت مین کچھ سختی معلوم ہوتی ہے مگر عام طور سے رعایا کے جان و مال کی بڑی حفاظت کیجاتی ہے۔

شاہجہان کے عہد مین بڑے بڑے عہدے ہندوؤن کو دیے گئے تھے چنانچہ ذیل مین ہم ہندو عہدہ دارون کی ایک مکمل فہرست درج کرتے ہین جس سے معلوم ہوگا کہ ملکی اختیارات پر وہ کسقدر قابض ہو چکے تھے۔

منصب	تعداد	منصب	تعداد	منصب	تعداد
ہفت ہزاری	۲	پنج ہزاری	۱۱	چہار ہزاری	۸
۳½ ہزاری	۲	سہ ہزاری	۱۹	ڈھائی ہزاری	۳
دو ہزاری	۱۷	ڈیڑھ ہزاری	۲۱	یک ہزاری	[illegible]

اس فہرست کو عہد اکبری کی فہرست سے مقابلہ کرنیکے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہان کے عہد مین ہندو امراء کی تعداد اکبر کے زمانہ سے چہار چند ہو گئی تھی۔ عالمگیر نے شاہجہان کی مجددی اور حسن و لیاقت کیساتھ ملک کا انتظام کیا وہ ارباب حل و عقد کی نگاہون سے مخفی نہین اس نے کسی ہندو کو تبدیل مذہب پر مجبور نہین کیا اور جو کچھ کیا اسلامی شریعت اور عزیز رعایا کے مذہبی جذبات کی پاسداری کو ملحوظ رکھکر کیا اسکے دربار مین بڑے بڑے دیندار مسلمان ہمکو نظر آتے ہین تھے وہین ہندوؤن کو بھی جگہ دیجاتی تھی۔ چنانچہ چندر نامی ایک فاضل برہمن خطاب ملک الشعراء سے بہرہ

عہ تذکرہ عبدالحمید لاہوری دفتر دوم صفحہ ۷۰۹

سرائیں تعمیر کرائیں اور انواع و اقسام کے میوہ دار درخت سڑکوں کے دونوں جانب لگوا دئے چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے :-

شیر شاہ آثار پسندیدہ بسیار گذاشت چنانچہ از بنگالہ و سنار گانو تا آب سند کہ بآب نیلاب اشتہار دارد یکہزار و پانصد کروہ است در ہر یک کروہ سرائی ساختہ چاہ و مسجد از خشت پختہ در آنجا پرداختہ موذن و مقری و امامی مقرر نمودہ آنہا را وظیفہ کرد و در ہر سرا یک دروازہ طعام پختہ و خام برائے مسلمانان و دروازہ دیگر برائے ہندوان مقرر نمودہ کہ دائم مہیا شدید تا مسافران عسرت نکشیدہ باشند و در ہر سرا دو اسپ بام کردہ که آنرا در ہندی ڈاک چوکی گویند نگاہ داشتہ کہ ہر روز خبر نیلاب و واقعات بنگالہ بوی میرسید و در این راہ از ہر دو جانب خیابانہا از درختان میوہ دار از قسم کھرنی و جامون و غیرہ نہال نشانیدہ بود کہ خلائق در سایہ اش آمد و شد میکردند و ہمین طریق از آگرہ تا مندو کہ سی صد کروہ است درخت میوہ دار برپا کردہ بود و سرا و مسجد ساختہ و در عہدش عافیت بمرتبہ بود کہ مترددین در صحرا و بیابان ہر جا میرسیدند از کالای خود اندیشہ نکردہ بفراغت می غنودند گویند اگر زالی یا سبدی پر از طلا در صحرا شبہا خواب کردی حاجت پاسبان اصلاً نبودی۔ [1]

شیر شاہ نے بہت سے آثار چھوڑے ہیں چنانچہ بنگالہ و سنار گانوں سے لیکر دریائے سندھ تک جو کہ آب نیلاب کے نام سے مشہور ہے اور جس کا فاصلہ پندرہ سو کروہ ہے پختہ سڑکیں تعمیر کرائیں ہر ایک کروہ میں سرائے بنوائی کنواں اور پختہ مسجد تیار کرائی موذن اور امام مقرر کیا اور انکا وظیفہ مقرر کیا اور ہر ایک سرائے میں ہندو و مسلمانوں کے لئے پختہ اور خام ہر قسم کا کھانا مہیا کیا گیا تاکہ مسافروں کو تکلیف نہ ہو اور ہر سرائے میں ایک ڈاک چوکی ہوتی تھی جس کے ذریعے بنگالہ و دریائے سندھ کی خبریں روزانہ آسکیں اور سڑکوں کے ہر دو جانب میوہ دار درخت مثلاً کھرنی جامون وغیرہ لگا دئے گئے تھے تاکہ مسافر ان کے سایہ میں ہو کر آرام سے سفر کریں اسطرح آگرہ سے لیکر مندو تک جسکا فاصلہ تین ہزار (۳۰۰۰) کروہ ہے پختہ سڑک بنوائی اور اس پر میوہ دار درخت لگوائے مسجد و سرائیں تعمیر کیں شیر شاہ کے ایام حکومت میں امن و امان کا یہ حال تھا کہ لوگ بلا خوف و خطر چٹیل میدانوں اور جنگلوں میں گھومتے رہتے تھے اور بے پروا ہو کر زمین پر جہاں جی چاہتے تھے لیٹ جاتے تھے حتیٰ کہ اگر کوئی بڑھی عورت جو سونے سے لدی ہوئی ہو صحرا میں جاکر سو جاتی تھی تو اسے اپنے مال کی حفاظت کیلئے کسی پاسبان کی ہرگز ضرورت نہ ہوتی تھی۔

شیر شاہ کے وقت میں اس قسم کی سڑکوں پر تیرہ سو سرائیں تعمیر کی گئی تھیں اور تقریباً ۳۴۰۰ گھوڑوں کا انتظام کیا گیا تھا جن میں سے ہر سرائے میں دو گھوڑے ڈاک لیجانے کے لئے ہر وقت موجود رہتے تھے۔ مشہور عربی سیاح ابن بطوطہ نے اسلامی ڈاک کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے اسکا بیان ہے " ہندوستان میں قاصد دو قسم کے ہوتے ہیں پیادہ۔ سوار " موخر الذکر کو عموماً "ولاق" کہتے ہیں سوار چار میل پر قیام کرتے ہیں اور پیادہ کو ہر میل پر ٹھہرنا ہوتا ہے۔ شیر شاہ کے علاوہ مغلیہ سلاطین نے خبر رسانی کا کچھ اس قدر اعلیٰ اور عمدہ انتظام کیا تھا کہ تمدن کے ان آثار کو دیکھکر سولہویں صدی کے ایک فرانسیسی سیاح کو کہنا پڑتا ہے کہ عہد مغلیہ میں ہندوستان کے راستے فرانس کے راستوں سے کہیں بہتر تھے جہانگیر کے وقت میں اس قسم کی بیشمار سڑکیں تیار کی گئی تھیں اکبر نے اپنے وقت میں اول اول اونٹ کی ڈاک جاری کی تھی۔ نامہ بر کبوتر کا بھی اچھا خاصا انتظام کیا گیا تھا چنانچہ ایک یورپین سیاح کا بیان ہے :-

[1] تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۲۸ مطبوعہ نولکشور۔

تمدنوں کی حکومت میں ڈاک بہت جلد جاتی ہے کیونکہ ان تمام علاقوں میں جوکہ ہر بڑی سڑک پر دو تین میل کے فاصلہ پر بنے ہوئے ہیں بہت تیز رو آدمی مقرر ہیں"۔ ؎۱

فن تعمیر تمدن کے سینکڑوں اجزا میں سے فن تعمیر نقاشی اور صناعی کا بھی خاص طور پر نام لیا جاتا ہے۔ اسکی وجہ سے قوموں کی ہنر مندی اور فطری استعداد کا امتحان ہوتا ہے اور اسی کے ذریعہ سے قوموں کے فنا ہو جانیکے بعد ان کی گزشتہ تہذیب و شائستگی کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ بابل و نینوا کے کھنڈر آج بھی زبان حال سے اپنے گزشتہ تمدن کا پتہ دیتے ہیں ہندوؤں کے فن تعمیر اور نقاشی کی بھی بہت کچھ تعریف و مدح سرائی کیجاتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوؤں کے مذہبی مقامات بنارس پریاگ متھرا اور دیوبند کے سنگی مکانات مندروں اور اودنگ آباد کے قریب غار اجنتا اور ایلورا کی سنگی عمارتوں اور ان کے دیواروں کی منقش تصویروں کو دیکھکر آج بھی انسان حیرت زدہ رہجاتا ہے۔ لیکن واقعہ اور انصاف یہ ہے کہ ان کے مکانات کی عمارتیں کچھ ایسے تنگ و تاریک واقع ہوئی ہیں کہ رہنے والوں کے حق میں کنج قفس سے کسی طرح کم نہیں کشادگی صفائی کا نام تک نہیں ہوتا اور عموماً بادی النظر میں عمارت سے بھدا پن معلوم ہوتا ہے یہ بات مسلم ہے کہ اسلامی تمدن نے فن تعمیر کی حیثیت سے ہندوستان پر اتنا اثر نہیں ڈالا جتنا کہ مصر و اندلس کے شہروں پر تاہم یہاں مسجد قوت الاسلام اور غرناطہ میں قصر الحمرا کی بنیاد ڈالنے والے عربوں نے ایک عالم کو محو حیرت کر دیا لیکن پھر بھی شاہان مغلیہ کے ابتدائی دور جہانگیر و شاہجہان کے زمانہ میں آگرہ دہلی۔ آگرہ اور فتحپور سیکری میں جو بے نظیر و عالیشان عمارتیں تعمیر ہوئیں وہ اپنی عام صفائی کشادگی لطافت اور خوشنمائی کی وجہ سے ہندوؤں کی تمام سنگین تنگ و تاریک اور بے ڈھنگی عمارتوں سے کہیں بڑھکر دلفریب اور عمدہ ہیں۔ دہلی کا شاہی قصر موتی مسجد اور آگرہ کا تاج محل اور دہلی کی جامع مسجد یہ وہ چیزیں ہیں جن پر اسلامی تمدن جسقدر ناز کرے بجا ہے۔ ایک انگریز سیاح کا مقولہ ہے کہ محض تاج محل آگرہ کی سیر کے لئے یورپ سے ہندوستان کا سفر کرنا جائز ہے۔ غرضکہ ملک کے گوشہ گوشہ میں شاہان مغلیہ کے آثار اور ان کے عالیشان کھنڈر اسلامی تمدن کا ثبوت دے رہے ہیں۔

علاوہ بریں ترک بادشاہوں کو بھی اس قسم کا بیحد شوق تھا چنانچہ علاء الدین نے دہلی میں اپنے نام سے ایک دروازہ تعمیر کرایا جسکو دیکھنے کیلئے آج بھی بہت سے یورپین سیاح دور دراز سے آتے رہتے ہیں چنانچہ ایک فرانسیسی محقق کی رائے ہے:—

"آج عربوں کی یادگاروں میں اس عمارت سے بڑھکر کوئی عمارت نہیں اور باستثنائے چند دروازوں کے جو قصر الحمرا (اندلس) کے اندر واقع ہوئے ہیں میں نے کوئی چیز اس کے مقابلہ کی نہیں دیکھی" ؎۲

ہندوؤں نے اسلامی طرز تعمیر سے بہت کچھ استفادہ کیا، گوالیار۔ مہوبہ۔ کھجورا۔ متھرا۔ نیپال اور دکن کی بعض ہندو عمارتوں میں اسلامی طرز بہت غالب ہے مورخ لیبان کا قول ہے کہ اسلامی اثر ہند میں ہر جگہ نمایاں ہے حتیٰ کہ نیپال کی بعض عمارتوں

؎۱ سفرنامہ سر الیگزنڈر برنس۔

؎۲ تمدن ہند صفحہ ۳۸۷ ڈاکٹر لیبان۔

میں بھی جہاں فاتحین اسلام کبھی نہیں پہونچے یہی اثر ہے دکن کی بھی یہی حالت ہے ۔ ڈوداکے ہندو مصر کو اگر آپ بنظر احتیاط دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ عمارت کسی مسلمان کی صنعت کاریوں کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے ؟

فن نقاشی میں ہندوستان سلاطین مغلیہ کا بہت بڑا احسان مند ہے ، یہ سب کو معلوم ہے کہ اجنتا اور ایلورا قدیم ہندوستان کی ہنر و صنعت گری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں مگر ان مشہور مصوروں اور نقاشوں کی اولادیں ہمت افزائی اور قدردانوں کے مفقود ہوجانیکی وجہ سے تقریباً اپنے آبائی پیشہ کو فراموش کر چکی تھیں ۔ اکبر اعظم کو چونکہ نقاشی اور سنگتراشی سے بڑا شوق تھا اسلئے انہیں بلاکر ان کی کافی ہمت افزائی کی اور انہیں پھر ایک مرتبہ اپنی ذاتی لیاقت اور جوہر کو چمکانے کا موقع ملا ۔

عہد اکبری کے مشہور مصوروں میں سے تارا ، لعل چند ، رام داس اور بساون نے اکبر کے دامن تربیت میں بلکہ بہت کچھ شہرت حاصل کی خصوصاً موخر الذکر اپنے فن کا اسقدر ماہر نکلا کہ مغلوں کے زمانہ میں ہندوستان کی خاک اسکی نظیر پیدا نہ کرسکی ۔ اسی طرح بشن داس دربار جہانگیری کا ایک نامور مصور گزرا ہے جس نے اپنی لیاقت و دانائی کے سیکڑوں آثار دنیا میں چھوڑ رکھے ہیں ؟

پیمائش زمین ہندوؤں کے عہد میں مالگزاری کے جمع کرنیکا صرف یہ ایک طریقہ تھا کہ پیداوار کا ایک خاص حصہ حکومت کو ملتا تھا ۔ پیمائش زمین کے لحاظ سے جمع کرنیکا طریقہ انہیں معلوم نہ تھا اکبر نے ملک کی باقاعدہ پیمائش کرائی قابل زراعت اور ناقابل زراعت زمین کی تفریق کی اور اسکے لحاظ سے محصول مقرر کیا ۔ بندوبست اور پیمائش کا سارا کام ایک ہندو ٹوڈرمل وزیر محکمۂ مالگزاری کے ہاتھوں انجام کو پہونچا ۔ ہمارے بعض اہل وطن نے اسکا مفہوم غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ بندوبست اراضی کا یہ کام محض ہندو وزیر کی جدت پسندی و اختراع کا ایک کرشمہ تھا مسلمانوں سے اسکا کچھ تعلق نہیں ۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اسمیں ٹوڈرمل سے کہیں زیادہ اکبر اعظم کی سرپرستی کا ہاتھ کام کر رہا تھا ۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ ہندوؤں کی علمی قابلیت اور انکا جدت پسند دماغ عقلائے فرنگ کے دماغ سے کسی طرح کم نہیں تھا لیکن انہیں عملی قوت کی بہت کمی تھی وہ کسی علمی نظریہ کو قائم کرسکتے تھے مگر اسکو عملی صورت میں کر دکھانا ان کا کام نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ وہ ایجادات و اختراعات کے میدان میں بہ نسبت دوسری قوموں کے بہت پیچھے رہ گئے چنانچہ ایک فرانسیسی محقق لکھتا ہے ۔

"ہنود کی دماغی قوتیں کسی طرح یورپین اقوام کی دماغی قوتوں سے کم نہیں لیکن انہیں عملی قوت کی سخت کمی ہے ۔ اور یہی کمی انہیں ہمیشہ اقوام مغربی کا محکوم رکھیگی میں ہمیشہ کا لفظ استعمال کرتا ہوں کیونکہ جو شخص دستان تاریخ عالم کا مطالعہ کریگا اور ترقی اور تنزل کے نتائج پر نظر ڈالیگا اسیقدر یہ ثابت ہوگا کہ بنی نوع انسان کی تمام تاریخ میں عملی استقلال اور عملی قوت کو بہت زیادہ دخل ہے" [1]

اس سے بخوبی ظاہر ہے کہ عملی اسپرٹ کے معدوم ہوجانیکی وجہ سے ہندو اپنے تخیلات اور دلی رازوں کو عملی صورت میں جلوہ گر کرکے دنیا کے سامنے پیش کرنے سے کسطرح عاجز و قاصر تھے ۔ اسلامی عہد میں علمی اختراعی تمدنی اور پولٹیکل حیثیت سے جن ہندوؤں نے عملی دنیا میں اپنے قابل قدر خدمات اور دماغ سوزی کی قوم سے داد لی ۔ درحقیقت انہیں خود ان کی عملی کوششوں اور اجتہادی قوت سے تعبیر کرنا چاہیے

[1] تمدن ہند ڈاکٹر لیبان صفحہ ۱۲۹ ۔

بلکہ یہ بنا سکے کہ نباتات دیادہ تر مسلمان سلاطین کی سرپرستی اور ذوقی یا دوائی کے نتائج ہیں جنہوں نے ان کے ساکت و جامد ان اطمینان کو حرکت میں لاکے انہیں بنایا اور کوششوں سے کبھی دریغ نہ کیا ایران کی از کار رفتہ عملی طاقت میں از سر نو زندگانی کی روح پھونک دی۔ چنانچہ ہم پہلے کہ چکے ہیں کہ ہند کے صناعوں کی اولادیں اپنے آبائی ہنر کو بھول چکی تھیں مگر اکبر اعظم کی ہمت افزائی نے انہیں اپنے قدیمی پیشہ کو یاد دلا دیا۔ کیا مسلمانوں کی یہ کوشش غیر اقوام کے حق میں نفع بخش کہی جا سکتی ہے۔؟

پیداوار زمین ہندوستان چونکہ قدرتاً ایک سرسبز و شاداب ملک ہے اس لئے ہندوؤں کے عہد میں بھی یہاں بکثرت آم جامن وغیرہ دیگر اقسام کے پھول پھل پائے جاتے تھے مگر ان کی سادہ پسند طبیعت چونکہ خوشنمائی اور دلفریبی کی خوگر نہ تھی اس لئے پھولوں اور باغوں کی نفاست کا نہ کچھ احساس تھا بابر اپنے تزک میں لکھتا ہے۔

"ہندوستان میں اچھے گھوڑے نہیں اچھا گوشت نہیں انگور نہیں خربوزہ نہیں برف نہیں .... باغوں اور عمارتوں میں آب رواں نہیں عمارتوں میں صفائی نہیں .... مرد لنگوٹی اور عورتیں لنگی باندھتی ہیں"[1]

بابر کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ مغل ہندوستان میں آئے تھے باوجود اسکے کہ ہندو خلجی۔ تغلق اور سید خاندان کی حکومت ایران کے تمدن سے مستفید ہو چکے تھے مگر یہ بھی قدیمی وحشت و جہالت کی ابھی کچھ اسقدر ہوا لگی ہوئی تھی کہ ہند باوجود معاشرت سیر و تفریح کے سامان اور اصول کاشت سے وہ قطعاً بیگانہ و ناآشنا تھے لیکن سلاطین مغلیہ کا تخت دلی پر جلوہ افروز ہوا تھا کہ انواع و اقسام کے ولایتی میوؤں درختوں اور پھولوں سے انہوں نے ہندوستان کو ایک چمن زار بنا دیا۔ جہانگیر اکبر اور شاہجہان کے عہد میں خود دلی اور آگرہ کی حدود سرزمین میں سیکڑوں ایسے خوشنما باغ لگائے گئے تھے جو اپنی دلفریبی اور وسعت داری میں یورپ کے باغوں سے کسی طرح کم نہ تھے باغوں میں فوارہ تختہ بندی جدول اور خیابان کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ ایران اور خراسان کے قسم قسم کے پھول مثلاً نرگس و سوسن بنفشہ و یاسمن بجائے خطی ہنگو اگر باغوں میں لگائے گئے انگور و ناشپاتی۔ انناس و صندل سرو صنوبر چنار و بید مولا جو ہندوستان کے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتے وہ کثرت سے شاہی باغوں میں دیکھے جاتے تھے۔ جہانگیر نے آگرہ میں ایک باغ لگوایا جسکا نام گل افشاں رکھا تھا وہ ہندوستان کے دیگر شاہی باغوں سے بدرجہا بہتر اور اپنی امتیازی خصوصیت کے لحاظ سے کہیں زیادہ دلفریب و خوشنما تھا اسکے علاوہ شاہی بیگمات کی نزاکت پسندی نے سلاطین ہند کو اس قسم کے تفریحی سامان کے مہیا کرنے پر اور مجبور کر دیا یہی وجہ تھی کہ جہانگیر اور شاہجہان کو نور جہان اور ممتاز محل کی بدولت بکثرت عمدہ باغات اور عالیشان عمارتوں کا سامان کرنا پڑا مگر نور جہان کی جدت و اختراع پسند طبیعت نے عطر گلاب ایجاد کیا۔ جہانگیر کو بھی اپنے بیٹے کی طرح زیبائش اور ہر چیز میں وضعداری و نفاست کا بڑا خیال تھا۔ چنانچہ سنہ جلوس میں اس نے شاہجہان کو لکھا کہ کاشمیر میں ایک شاہی باغ تعمیر کرایا جائے چنانچہ نہایت تزک و احتشام کیا تھا۔ باغ شالامار کے نام سے لگایا گیا مگر چند دنوں بعد قدیم نام بدلکر "فرح بخش" رکھا گیا۔ بعض شعرا نے اسکی دلفریبی و دلکش مناظر کو دیکھکر اسکی بہت کچھ مدح کی ہے چنانچہ اسوقت کے مشہور شاعروں میں سے مرزا عبدالغنی نے اسکی تعریف

---

[1] تزک بابری بحوالہ مقالات شبلی نعمانی۔

میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

> بباغ وزیر مدح یار دادہ است فروغ کہ سنبل سیہش کم از خار ارسنا نشد

مغلوں کے علاوہ تغلق اور خلجی بادشاہوں کو بھی اس قسم کا شوق تھا چنانچہ محمد تغلق نے دہلی کے قریب ۱۲۰۰ اور فیروز تغلق نے ۱۲۰۰ کے قریب ۸۰ اور چتوڑ کے قریب گرد و نواح میں ۴۴ باغ لگوائے ان باغوں میں چند انگور نا شپاتی اور کابلی انار اور رنگ برنگ کے خوشبودار پھول لگے ہوتے تھے غرضیکہ اس قسم کے تفریحی سامان کی بہم رسانی اور ارضی پیداوار کو ترقی دینے میں شاہان اسلام نے بہت کچھ کوششیں کیں اور خصوصاً بیرونی دنیا سے نئے قسم کے پھلوں اور عجیب و غریب سدا بہار پھولوں کو منگا کر ہندوستان میں ان کی کثرت سے کاشت کرائی جو ہندوؤں کے عہد میں بالکل نہ پیدا تھیں۔

ترقی حیوانات متمدن اقوام کا دستور ہے کہ وہ دنیا کے بہترین حیوانات کی نسل کو اپنے ملک میں ترقی دیتے ہیں اور عجائب خانہ کھولتے ہیں یورپین اور مسلمان سیاحوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے پیشتر ہندوستان میں اچھی نسل کے گھوڑے اور اونٹوں کی بہت قلت تھی مغل جب آئے تو انہوں نے ان کے لئے ایک خاص محکمہ طیار کیا۔ ترکستان عرب۔ عراق اور روم کے نجیب الطرفین گھوڑے کثرت کے ساتھ ہندوستان میں لائے گئے ان کی پرورش کا خاص انتظام کیا گیا چنانچہ قلیل مدت میں بیکانیر، اجمیر اور جودھپور میں ان کی نسلیں کثرت کے ساتھ پھیلیں ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ ایک ایک آدمی کے پاس دس دس ہزار اونٹ تھے۔ شاہان تیموریہ میں جانوروں کا اکبر کو جو شوق تھا وہ کسی کو نہ تھا اردو کے مشہور انشا پرداز محمد حسین آزاد نے اکبر کی سواری کا حال اپنے مخصوص طرز میں یوں دکھلایا ہے۔

" اب دولہا کے سامنے سے عروس دولت کی برات گزرتی ہے۔ نشان کے آگے ہاتھی اس کے بعد اور ہاتھیوں کی قطار پھر ہاتھی مراتب اور نشانوں کے ہاتھی جنگی ہاتھیوں پر فولادی پاکھریں پیشانیوں پر ڈھالیں بعض کی مستکوں پر دیوزادی نقش و نگار بعضوں کے چہرے گینڈوں اور ارنے بھینسوں اور شیروں کی کھالیں کلوں سمیت چڑھی ہوئی۔ ہیبت ناک صورت ڈراونی صورت سونڈوں میں گرز برچھیاں تلواریں لئے سانڈنیوں کا سلسلہ جن کے سوسو کوس کے دم گردن کھینچی۔ سینے تنے جیسے تھا کبوتر۔ پھر گھوڑوں کی قطاریں عربی ایرانی۔ ترکی۔ ہندوستانی آراستہ پیراستہ ساز یراق میں غرق۔ چالاکی میں برق اچھلتے کودتے شوخیاں کرتے چلے جاتے تھے"[1]

جانوروں اور سواروں کے لئے ایک متمدن قوم کے نزدیک جس قسم کے ساز و سامان کی حاجت ہوا کرتی ہے مغلوں نے بھی اس کی فراہمی محسوس کی اور اصطبل فیل خانہ اور عجائب خانہ کا انتظام کیا اسی طرح جانوروں کی زیبائش کے لئے سنہری زین ہودج فولادی پاکھر ڈھال وغیرہ کا ان کے یہاں ہر وقت کافی ذخیرہ موجود رہتا تھا۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہان مغلیہ ترقی حیوانات کے کس قدر شائق تھے جہانگیر نے اسکے لئے ایک حدیقہ حیوانات طیار کرایا تھا اس میں دنیا کے عجیب الخلقت جانور لاکر رکھے گئے تھے۔ اسکے چڑیا خانہ میں ایک مرتبہ ایک عجیب و غریب پرند لاکر رکھا گیا جس کی کیفیت وہ اپنے ان الفاظ میں لکھتا ہے۔

" یکے از خصوصیات این جانور آن ست کہ تمام شب پائے خود را بر شاخ درختے یا چوبی کہ او را بران نشانیدہ باشند بند کردہ خود

---

[1] دربار اکبری صفحہ ۱۲۳ و ۱۲۴

سبب ہی سادہ و باقوف نزمیں کی کتاب خلق کی خود وہ طبیعت اور کار ربوبی کہہ ۔ آن کو بنانے جیلات بہ ہاست ہے

اور وہ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کو بھی اسکا بڑا شوق تھا چنانچہ اودھ میں انھوں نے اسکے لئے خاص اہتمام کیا اور اپنے عجائب خانہ کو حتی الامکان کامیاب بنانے کے لئے تگ و دو میں صرف کیں غرض کہ مسلمانوں نے ایسے جانوروں اور پرندوں کے اعلیٰ نسل حیوانات اور خوش الحان پرندوں کو جو قدیم ہندوستان میں بالکل مفقود نظر آتے تھے بڑی قدر دانی اور اعتبار کے ساتھ غیر ملکوں سے منگا کر کثرت سے انکی نسلیں پھیلائیں اور چند دنوں بعد انہوں نے ہندوستان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اس معاملہ میں کسی غیر ملک کا محتاج نہ رہ گیا۔

اسلامی عہد میں سکوں کا رواج

کسی ملک میں مختلف قسم کے سکوں کا رواج وہاں کی تمدنی اور اقتصادی حالت کی بہترین دلیل ہے ہندوؤں کے عہد میں محض چند سکوں کا رواج تھا صدیوں کے بعد شاید ہی کبھی کوئی راجہ اپنا مخصوص سکہ جاری کرتا تھا لیکن مسلمانوں میں ہر بادشاہ کے لئے ضروری تھا کہ خطبۂ جمعہ میں اسکا نام پڑھا جائے اور اسکے نام کا سکہ جاری کیا جائے اس طرح سے مسلمانوں کی ہفت صد سالہ حکومت کے دوران میں سیکڑوں قسم کے سکے جاری ہوئے مسٹر ایڈورڈ ٹامس نے اپنی لاجواب کتاب میں اسلامی سکوں کو تول کر انکا وزن گرین میں لکھا ہے چنانچہ مختصراً ہم اسکی فہرست ذیل میں نقل کرتے ہیں

قطب الدین ایبک کے عہد میں سونے کے سکوں کا وزن ۹۶، ۶۱، ۳۲ گرین چاندی کے سکے ۶۸، ۴۰، ۱۳۳، ۶۶، ۱۰۸ گرین تانبے کے مخلوط سکے ۴۹، ۴۰، ۵۵ گرین۔

آرام شاہ کے عہد میں تانبے کے سکے کا وزن ۵۴ گرین۔

شمس الدین التمش۔ سونے کا سکہ ۱۶۰ گرین۔ چاندی کا سکہ ۴۵، ۱۵۱، ۱۶۵ گرین تانبے کا سکہ ۵۴، ۴۲، ۳۸ گرین مخلوط سکہ ۴۰ گرین۔

سلطان رضیہ بیگم۔ چاندی کے سکے ۱۲۵، ۱۶۷، ۴۹ گرین۔

غیاث الدین بلبن سونے کا سکہ ۱۶۳ چاندی کا سکہ ۱۶۷ تانبے کا سکہ ۲۱، ۶۶ مخلوط ۴۶ گرین۔

ہمایوں۔ سونے کا سکہ ۸، ۱۰، ۱۳ گرین چاندی کا سکہ ۱۷ گرین۔

شیر شاہ۔ سونے کا سکہ ۱۶۵ گرین چاندی ۱۷۶ گرین تانبا ۳۲۹ گرین۔

ان اقتباسات سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ اسلامی ہند میں اقتصادی ترقی اور تجارت کی گرم بازاری نے کس حد تک اپنا سکہ قائم کر لیا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ صنعتی و حرفتی کاروبار نے کہاں تک رواج پایا تھا۔

اسلامی صنعت

قدیم ہندوستان میں ہندوؤں نے اپنے لباس و پوشاک کا ایک حد تک کافی انتظام کر لیا تھا باریک منقش کپڑوں کے بننے پر وہ بہت کچھ قادر ہو چکے تھے چنانچہ ڈھاکہ اور بنارس کی گزی گاڑھا وغیرہ ململ پر انہیں بڑا ناز تھا۔ مگر چونکہ سادہ پسندی کی طرف انکا فطری میلان زیادہ تھا اس لئے بجز ان چیزوں کے اور کچھ بنانا جانتے تھے خصوصاً اطلس کمخواب زربفت مخمل تو دیکھنا تو درکنار ان کے نام تک سے واقف نہ تھے مسلمان

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۳۳۔ [illegible]

فائقین نے ہندوستان میں آکر ایرانی صنعت دستکاری کا دروازہ کھول دیا اور کثرت کے ساتھ ایرانی کپڑے بنے جانے لگے۔ سلطان اکبر کے وقت میں احمد آباد (گجرات) و لاہور میں ہزاروں عیارہ کارخانے جاری کئے گئے۔ کاغذی شال کو اکبر نے اور ترقی دیا اور اس میں خاص جدت پیدا کی سا
پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ بابر نے ہندوستان کی سوسائٹی ان کی طرز معاشرت لباس اور غذا کی اپنے سفرنامہ میں سخت ہجو کی ہے اور لکھا ہے کہ اس زمانہ میں لنگوٹی اور عورتیں لنگی باندھتی تھیں لیکن آج ہندوؤں کے لباس و پوشاک میں جو عظیم الشان انقلاب اور تغیر پیدا ہو گیا ہے محض اسلامی تمدن کا فیض اثر ہے جس نے ہندوؤں کو ایک مہذب قوم کے برابر پہونچا دیا۔ اسکے علاوہ انہوں نے رسم و رواج کھانے پکانے شکار اور تفریح طبع کے عمدہ طریقے بھی مسلمانوں ہی سے اخذ کئے۔ چنانچہ اسکی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس فن میں جتنے الفاظ ہیں ان کی اصل عربی فارسی یا ترکی ہے مثلاً

کھانے کے نام ـ باقرخانی ـ قورمہ ـ پلاؤ ـ زردہ ـ متنجن وغیرہ ـ
تفریحی اشیاء کے نام ـ تاش ـ شطرنج ـ حقہ ـ چوگان وغیرہ ـ
کپڑوں کے نام ـ اطلس ـ کمخواب ـ زربفت ـ تن زیب ـ مخمل ـ گلبدن وغیرہ ـ

ان چیزوں کو دیکھ کر ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ اسلامی طرز معاشرت نے نوع انسان کے لوازمات زندگی کیلئے کن نفیس اور عمدہ چیزوں کو مہیا کیا تھا وہ آج تک اپنے اصلی نام کے ساتھ ہندوستان میں موسوم کیجاتی ہیں۔

فنون جنگ صدیوں کے جنگ و جدال سے ہندو اگرچہ فنون جنگ میں بہت کچھ ماہر و تجربہ کار ہو چلے تھے مگر مغلوں اور ترکوں کے مقابلہ میں وہ بھی ناتجربہ کار اور نوآموز تھے چنانچہ اسکی بہترین شہادت یہ ہے کہ ہندوؤں کو جب کبھی مغربی قوموں سے جو وسط ایشیا کی راہ وقتاً فوقتاً ہندوستان میں آتی رہیں مقابلہ کرنا پڑا ہے تو حملہ آور ہمیشہ غالب اور فتحمند نکلے۔ محمد تغلق کے عہد میں جب بیجانگر کے راجہ بکا دیو کا حملہ ہوا ہے تو راجہ ہر لڑائی میں برابر شکست کھاتا رہا چنانچہ جوتشیوں کو بلاکر راجہ نے اسکی وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ مسلمان تیر اندازوں سے کہیں بہتر ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب ہندو راجاؤں نے کثرت کے ساتھ دکن میں مسلمانوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا اور اسکے بعد پھر جب انہیں مسلمانوں سے لڑنا پڑا تو وہ ہمیشہ غالب رہے مگر آخیر وقت میں مسلمانوں کے باہمی اتحاد سے پھر انکو فتح و نصرت کا منہ دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوا۔ آلات حرب و اسلحہ جات میں بھی مسلمانوں نے بہت کچھ اپنی ایجادات اور اختراعات کا کرشمہ دکھایا تھا۔ مغلوں کی فوج میں ہر قسم کے توپ خانے اور سیکڑوں قسم کے جدید آلات حرب یقیناً موجود رہتے تھے جو ہندو عہد حکومت میں بالکل مفقود اور ناپید تھے۔

مسلمانوں کی علمی فیاضیاں علمی حیثیت سے اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو مغلوں کے دامن تربیت میں پلکر ہندوؤں نے اسلامی لٹریچر اور علوم معارف کی بہت کچھ خوشہ چینی کی ہے۔ اپنے جمود و ساکت دماغوں سے غفلت و خاموشی کا پردہ چاک کیا ہے اور ہر قسم کی تعلیمی

۱؎ مقالات شبلی صفحہ ۹۴۔

کی ادبی اور علمی سہولتین حاصل کر کے اپنی ذہنی اور دماغی طاقت کو ترقی دینے مین ایک حیرت انگیز طریقہ پر کامیابی حاصل کی تھی لیکن قبل اسکے کہ اس اہم داستان کی تفصیل کیجائے ترکون افغانون اور مغلون کی قدیم تہذیب کے متعلق مخالفین کے دلون مین جو عام غلط فہمیان داخل ہوگئی ہین اور جنکی وجہ سے وہ ان کے زمانہ حکومت کی علمی فیاضیون اور محبت کے تسلیم کرنے سے عمداً انکار کر رہے ہین انکا ازالہ کرنا بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔

محمود - ہلاکو اور نادرشاہ کے ہیبت ناک حملون اور ان کے وحشت آمیز تاریخی حالات نے ان کے اسلاف کی ہمہ گیر تمدنی اور پولیٹکل طاقت کی اہمیت کو عام کوتہ بین نگاہون سے بہت کچھ گرا دیا ہے اور اس سلسلہ مین محمود کے تبعین اور چنگیز کی اولاد نے شاہانہ حیثیت سے ہندوستان مین رہکر جو علمی اخلاقی اور تمدنی خدمتین انجام دی ہین وہ اعداے اسلام کی نظرون مین بالکل حقیر شمار کیجاتی ہین لیکن چند ناگزیر واقعات کو سامنے دیکھکر محض ایک وہم اور سوء ظنی کے باعث بنی نوع انسان کی سرتوڑ کوششون اور انکی ہزار سالہ خدمتگذاریون کو پس پشت ڈالدینا میرے خیال مین اپنی انتہائی نادانی اور جہالت کا ثبوت پیش کرنا ہے۔ قوم کی ہنگامہ آرائی نے عالم کائنات مین بہت کچھ انقلاب پیدا کئے ہین اور بڑی بڑی صاحب جبروت ہستیون کو غربا اور مساکین کے سایہ عاطفت مین پناہ لینا پڑا ہے مگر مجموعی حیثیت سے قوم کی مادی کارگزاریون اور دیگر اقوام کے ساتھ انکے حسن سلوک فیاضی اور دریا دلی کی داستانین صاحب فہم طبقہ مین نہایت عزت سے سنی جاتی ہین اور جزئی واقعات اور ناگزیر حالات کو ایک افسانہ سے زیادہ وقعت نہین دی جاتی بدظنی اور غلط فہمی کا مرض کچھ اسقدر مہلک ہوتا ہے کہ جسکی وجہ سے انسان کے اوصاف اور محامد پر خود بخود پردہ پڑجاتا ہے اور تاوقتیکہ یہ پردہ بالکل ہٹا نہ لیا جائے انسان کا دماغ کسی شخص کی اصلی قدر و منزلت کے معلوم کرنے سے قطعاً محروم اور ناآشنا رہجاتا ہے ترکون اور مغلون کے آبا و اجداد کے متعلق تقریباً تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ انہون نے باوجودیکہ ان مین وحشت اور بربریت کے آثار بہت زیادہ نمایان تھے دنیا مین بہت سے تمدنی اور علمی کام انجام دئے ہین اور اسیطرح یہ مسئلہ اب روز روشن کی طرح واضح ہوچکا ہے۔ کہ مغربی ایشیا مین جو قومین مثلاً ترک افغان وغیرہ آباد تھین وہ مشرقی اقوام بعداد آریون سے کہین زیادہ مہذب تمدن و شائستگی علوم و فنون کے زیور سے مزین و آراستہ تھین ترکستان اور خراسان کے شہرون مین علم و ہنر کی شمع صدیون تک جلتی رہی ہے بخارا اور سمرقند کو علمی درسگاہ ہونیکی حیثیت سے بہت کچھ شہرت حاصل ہے اور ان کے فارغ التحصیل طلبہ نے علمی دنیا مین بہت کچھ شہرت پیدا کی ہے بلخ کے تعلیم شدہ طلبہ مین محمد بن عمر خاوند شاہ مصنف تاریخ ایران کے نام سے یورپ آج بخوبی روشناس ہوچکا ہے انوری اور رشیدی کو ادبی دنیا مین بہت زیادہ امتیاز حاصل ہے۔ بخارا کو شیخ بو علی سینا جیسا حکمت و ریاضی دان فرزند پیدا کرنے پر ناز ہے سمرقند کا کاغذ ریشم سے بنایا جاتا تھا اور تیار کر کے دور دراز ملکون مین بطور تحفہ کے روانہ کیا جاسکتا تھا اور کثرت سے اسکی مانگ تھی تمدن کے آثار ہر جگہ ظاہر تھے ملک مین ہر طرف پختہ نہرین بنی ہوئی تھین بسیسہ کے نلون کے ذریعہ دریا سے شہر مین پانی لایا جاتا تھا۔ تیمور لنگ نے سمرقند کو اپنا دار السلطنت بناکر اسے ایک متمدن اور ترقی یافتہ شہر بنادیا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہلاکو خان جو تاریخی دنیا مین بہت بدنام ہوچکا ہے اور جسکا نام وحشت و درندگی کی ضمانت ہے۔ اس کا علمی و ادبی ذوق اس پایہ کا تھا کہ جسکو دیکھکر انسان کی عقلین ششدر و پریشان ہوکر رہجاتی ہین۔ اس نے مراغہ مین [illegible] منجمین کو طلب کر کے فن ریاضی و ہیئت کی ایک زبردست شاخ کی تکمیل اور اسکے لئے اپنی تمام کوششون کو صرف کردیا محمود غزنوی جیسے بت شکن کا دربار فردوسی جیسے باکمال شاعر اور البیرونی جیسے ہیئت دان علما اور فضلائے عصر سے ہمیشہ بھرا رہتا تھا۔ کیا ان حالات اور علمی قابلیت کے معلوم کرنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانون اور مغلون نے جس وقت ہندوستان پر حملہ کیا اور سلطنت دہلی پر قابض ہوئے وہ ایک جاہل اور وحشی

قوم تھے اور کیا علوم و فنون سپہگری اور انتظامی قابلیت کے لحاظ سے مسلمان ہندوؤن سے ممتاز و برتر تھے ؟

اسکے ساتھ ساتھ تاریخ سے یہ بات بھی بالکل ظاہر ہے کہ ہندوستان مین آنے کے بعد مسلمان سلاطین نے علوم معارف تمدن اور سیاست کو جنکو وہ مغربی ایشیا سے اپنے ساتھ لیکر آئے تھے فراموش نہیں کیا بلکہ آپ دیکھیں گے کہ اسلامی ہند مین شاید ہی کوئی حکمران ایسا گذرا ہو جسکو علم و ہنر سے کچھ دلچسپی نہ رہی ہو بلکہ سب سے تعجب انگیز امر یہ ہے کہ خاندان مغلیہ کا سب سے بڑا بادشاہ اکبر اعظم جو خود جاہل مطلق تھا مگر علم دوست اسقدر تھا کہ بڑے بڑے پڑھے لکھے انسان کو اس جیسا علمی ذوق بہت کم نصیب ہوا ہوگا مسلمانون کے ہندوستان مین آنے کے بعد ایک مدت تک ہندو ان کے دفترون اور انتظامی محکمون مین داخل ہوکر کام کرنا یا اسلامی علوم سے استفادہ حاصل کرنا اپنے لئے باعث ننگ سمجھتے تھے چنانچہ اس وہم و خیال کو از تقلید نے ہندوؤن کو صدیون تک اسلامی تمدن کی حقیقت شناسی سے بے بہرہ اور محروم رکھا اور قدرت نے کارساز غیب سے ان کے مشاغل زندگی کے لئے جو سامان بہم پہونچایا تھا اس سے وہ قطعًا نا آشنا رہے مگر رفتہ رفتہ ہندو مسلمانون کے باہمی اختلاط و میل جول نے دلون کی اس بعد مسافت کو کم کرنا شروع کیا اور چند دنون بعد ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا سا تعلق ہوگیا مسلمان سلاطین مین سے سب سے پہلے سکندر لودھی کو ہندوؤن کی اس حرمان نصیبی پر ترس آیا اور چونکہ شاہی دفترون کی زبان عام طور پر فارسی تھی اس لئے کثرت کے ساتھ ان کو فارسی کی تعلیم دینی شروع کی ۔ ہندوؤن کی تمام قومون مین سے کھتری قوم کا تستھ اسطرف متوجہ ہوئی چنانچہ قلیل مدت مین بہتیرے اسلامی علوم حاصل کرکے ناظم وقت بن گئے اور شاہی دربار مین وظائف پانے لگے بعضون نے شعر و سخن کو جو اس زمانہ کے تعلیم یافتہ نوجوانون کا عام شیوہ تھا اپنا مشغلہ بنایا ان مین سے پنڈت چندر بھان — نے شعر گوئی مین خاص ملکہ حاصل کیا تھا چنانچہ انکی ایک غزل کا مطلع یہ ہے :-

دل خون شد ای چشم تو خنجر نشدہ گر ۔۔۔ رہ گم نشدہ در زلف تو اختر نشدہ گر

اسکے بعد سور خاندان کے امراء و سلاطین نے ہندوؤن کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کیا شیر شاہ کے دربار مین ہندو پنڈتون کا ایک جم غفیر ہمیشہ موجود رہتا تھا اور وہ ان کو عظمت و قدردانی کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا ۔ کاشمیر مین سلطان زین العابدین نے قدیم ہندو لٹریچر کی اشاعت اور ہندوؤن کی تعلیم مین اپنی عزیز عمر کا ایک بیشتر حصہ صرف کیا اسکے دربار مین سوم رشاعر اور زین حرب اپنے وقت کے ماہرین فن تصور کئے جاتے تھے جو عربی فارسی اور سنسکرت سے بخوبی واقف تھے بودی بہت نامی ایک ادیب شاہنامہ فردوسی کا حافظ تھا اسکے عہد مین ایک ہندو نے راج ترنگنی کے نام سے گذشتہ شاہان کشمیر کی تاریخ لکھی جسکا فارسی ترجمہ شاہ محمد کشمیری نے اکبر اعظم کے وقت مین کیا سری بھٹ دربار کا نامور طبیب تھا جو ویدک اور یونانی طرز علاج سے بخوبی آگاہ تھا نیز بادشاہ کی کوشش سے مہابھارت کو فارسی زبان مین ترجمہ کیا گیا اور کثرت کے ساتھ ملک مین اسکی اشاعت کا اہتمام کیا گیا ۔ بنگال مین مسلمان بادشاہون نے ملکی زبان کی ترقی اور اشاعت مین اپنی انتہائی جانفشانیون کا اظہار کیا ۔ اور ہندو مذہب کی مذہبی کتابون اور متبرک صحیفون کا دیسی زبان مین ترجمہ شائع کرایا ۔ اس حیثیت سے ناصر شاہ سلطان غیاث الدین اور حسین شاہ نے علمی دنیا مین بہت بڑی شہرت حاصل کی ۔ ناصر شاہ کے وقت مین وید رامائن اور حسین شاہ کے ایام حکومت مین مہابھارت قرآن مجید اور تذکرۃ الاولیاء وغیرہ مذہبی کتابون کا بنگالی زبان مین حکومت کیجانب سے ترجمہ ہوا اسلامی دربار مین ہندو پنڈتون کی عزت افزائی اور ہر ممکن طریقہ سے ان کی اعانت و امداد کیجاتی تھی بنگال کے عربی و فارسی علوم کے مربی خاندان مین سے سدا ہو رام موہن داسے اور چندر سین کا ہمیشہ و عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے جو مسلمانون کی علمی فیاضی اور کرم گستری کی مانند مثال تھے ۔

علاوہ عطر خانہ کے امیر علی محمد حسن ناہر عطر لکھنؤ کے یہان ہر قسم کا عطر بھی بے نظیر تیار ہوتے ہین

فرماتے ہیں :-

بزم میں رات بہت بادہ و پر فن تھے بھلے | گرمیٔ بزم کہاں پاس بہت عیار بغیر
دیکھ بیمار کو تیرے یہ طبیبوں نے کہا | ہوگی اسکو شفا شربت دیدار بغیر
جسکی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے | کیونکر دیوانہ بھلا ہے اُس یار بغیر [1]

لالہ کنور سنگھ مضطر مصحفی کے تلامذہ میں سے تھے مصحفی نے اپنے تذکرہ میں ان کے چند چیدہ اشعار درج کر کے کلام کی داد دی ہے :-

دشمن بنا ہیں تم مجھ سے ہوا اور غیر کو دوست | ہم نے بس دیکھ لیا آپکی دارائی کو
اسکے خال لب شاہد پہ مجھے آتا ہے رشک | کیسے بیٹھا ہے وہ کیا گوشۂ تنہائی کو
رشک سے رنگ حنا پر کہ یہ کس پردے میں | بوسہ دیتی ہے ترے ہاتھ کی زیبائی کو

منشی بندرابن راقم - حضرت میر سے اصلاح لیتے تھے - بعد ازاں سودا کو کلام دکھانے لگے - انشا پردازی اور عبارت آرائی میں بے نظیر تھے نکات الشعراء میں میر صاحب نے ان کے اشعار نقل کئے ہیں - مثلاً

دیکھا نہو جسے میں کوئی سبزہ میں نہیں | پر تخم دل ہو سبز جہاں سو کہیں نہیں

اے باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض | مجکو قسم ہے چھیڑوں اگر برگ تر کہیں
اتنا ہی چاہتا ہوں کہ میں اور عندلیب | آپس میں درد دل کہیں اک بیٹھکر کہیں

راجہ جسونت سنگھ پروانہ ان کے باپ راجہ بینی بہادر نواب شجاع الدولہ کے معتمد تھے کبھی کبھی اپنے اشعار اصلاح کی غرض سے پاس میر حسن کے دیوانہ کو دیا کرتے تھے - چنانچہ مصحفی لکھتے ہیں :-

"راجہ جسونت سنگھ پروانہ تخلص عرف کاکاجی پسر راجہ بینی بہادر دکن رکین نواب شجاع الدولہ مرحوم بود - جوان خلیق و ذی شعور است پیش ازیں شعر فارسی میگفت و از شعر سرب سنگھ بہادر دیوانہ میگذرانید چنانچہ اشعار فارسی اش ہمیں تذکرہ شعرائے جہاں آباد بوساطت مرزا قتیل رسیدہ بودند .... درہمان ایام عطف عنان فکر شعر فارسی لیعز شعر ریختہ کردہ شب و روز در گفتن شعر ہندی مصروف داشت ..... در گفتن قصیدہ و غزل طور مرزا رفیع مسلم میدارد [2]

فرماتے ہیں :-

کہا شیخ نے جب ترے کوچے میں کو غش آیا | گیا وہ دم نزع میں بسمل کو غش آیا
کیا کیجئے ہمدم کو اسے دیکھ کے ہم تو | ہر چند سنبھالے رہے پر دل کو غش آیا

---

[1] تذکرہ گلشن ہند صفحہ ۱۰۲ - [2] تذکرہ مصحفی ہمدانی قلمی کتب خانہ ندوۃ العلماء۔

حکومتوں کے زوال کے ساتھ فارسی ادب کا مذاق ہندوستان سے بالکل اٹھ گیا۔ وہاں دہلی لکھنؤ اور لاہور اور بنارس کے گرد و نواح میں دو چار آدمی
اس کا سلیقہ نظر آ جاتے ہیں۔ یہ بات بالکل مسلم ہے کہ دنیا میں جتنی تعلیم یافتہ اقوام گزری ہیں وہ مفتوح قوم میں اپنی ہی لٹریچر اپنے ہی علوم و فنون اور اپنے
ہی مقاصد کی اشاعت کرتی رہی ہیں مسلمانوں نے بھی اس کلیہ کو نظر انداز نہیں کیا لیکن علمی حیثیت سے ہندوؤں کو جو مفید اور نئی شے حاصل ہوئی ہے
وہ مسلمانوں سے فن تاریخی لٹریچر کا استفادہ ہے۔ قدیم ہندو عہد میں فن تاریخ و سیر کی کوئی ایسی کتاب موجود نہ تھی جس سے عہد عتیق کے تمدن اور طرز
معاشرت پر کچھ روشنی پڑتی ہو البتہ وید سرائن اور مہابھارت وغیرہ مذہبی کتابوں کا ایک انبار تھا جس سے بدقت تمام ان کے قدیمی خصائل عادات
اور ہندوؤں کے بسر کرنے کے اطوار کسیقدر حال معلوم ہوتا ہے۔ اور یہاں کی گذشتہ عظمت و شوکت کے سارے کارنامے ان کتابوں میں افسانہ کیطرح
مخفی ہوکر رہ جاتے ہیں۔

لیکن مسلمانوں کے عہد زریں میں فن تاریخ کی سیکڑوں ایسی کتابیں تصنیف کی گئیں جن سے سارے واقعات تاریخ کی روشنی میں آ گئے اور انسانی
ذخیرہ معلومات میں کافی حد تک وسعت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ سلطان زین العابدین کشمیری کی کوشش سے راج ترنگنی کے نام سے سنسکرت
زبان میں گذشتہ شاہان کشمیر کی ایک مکمل تاریخ لکھی گئی اور اکبر کے عہد میں جاکر عبدالقادر بدایونی نے اسکو فارسی کا جامہ پہنایا۔ اسیطرح شاہجہان
خلجی۔ تغلق۔ لودھی۔ اکبر شاہجہان اور جہانگیر کے دوران حکومت میں آئین اکبری۔ اکبر نامہ تاریخ فرشتہ۔ منتخب التواریخ۔ عبدالحمید لاہوری
آثر رحیمی۔ اور سیر المتاخرین جیسی نادر بیش بہا اور مفید عام کتابیں تصنیف ہوئیں جو اپنی معنی خیز عبارت سلاست اور روانی کے لحاظ سے اپنی نظیر ہیں

"بیرونی دنیا سے تعلقات کا قائم کرنا"

قدیم ہندو عہد میں اشوک اعظم۔ چندر گپت۔ اور کنشک وغیرہ نے بیرونی دنیا سے گہرے تعلقات قائم کئے تھے۔ یونان۔ ایشیائے کوچک
اور مصر کے امراء و سلاطین سے صلحنامے بھی کئے مگر زمانہ بدھ کے بعد ایشیائی ممالک سے ہندوستان کے سارے تعلقات منقطع ہو گئے اور تبادلہ
خیالات امداد و نصرت اور تجارت جیسی سود مند چیزوں سے ہندو بالکل محروم ہو چکے تھے مگر مسلمانوں نے اپنی حکومت میں ان قدیمی تعلقات کو از سر نو
قائم کیا۔ تجارت کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ چنانچہ اکبر۔ ہمایوں اور طہماسپ شاہ ایران کے مابین ہمیشہ دوستانہ تعلقات قائم رہے اور غلام خلجی و
لودھی وغیرہ ہر دور میں بیرونی دنیا کے خلفائے اسلام سے مسلمان سلاطین کے نامہ و پیام کا سلسلہ برابر قائم رہا۔

اسلامی حکومت کے مختلف دور میں غیر اقوام کے جو مذہبی حریت و آزادی اور مکمل حقوق عطا کئے گئے ان کی تفصیل کی گئی ہے ہندوؤں کے ساتھ سلاطین ہند
کے جو کارنامے دلکش اور باعث افتخار قرار دئے جاتے ہیں ان کی کما حقہ تحقیق کی گئی اور یہ دکھلایا گیا کہ اسلامی تمدن و شائستگی نے ہندوستان کے
اہل ہنود کے مزاج ان کی طرز معاشرت ان کے اخلاق و عادات اور ان کے علمی مذاق پر جو مفید و خوشگوار اثر ڈالا ہے اس سے وہ کہانتک متاثر
و مستفید ہوتے ہیں۔ ان واقعات کے دیکھنے کے بعد ہر شخص خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ نصف صدی کی بد اعتقادی و بیجا شکایتیں اور مورخین کی دیدہ و دانستہ غلط
بیانی اگر تنگ دلی اور کوتہ نظری اور تعصب مذہبی کی بنا پر نہیں تو اور کیا ہے۔

محمد یوسف اعظمی
متعلم ندوہ لکھنؤ۔

احمد علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کے کارخانہ کا منیجر وہی ہے جو ۴۰ سال پیشتر تھا۔

حضرت شیخ کمال الدین علامہ چشتی رحمۃ اللہ علیہ

کمال الدین نام علامہ لقب ہے والد کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ حضرت شیخ نصیر الدین رح کے عزیز ہیں فطرتاً ذہین و طباع تھے۔ شیخ نے ان کی تربیت اپنے آغوشِ عاطفت میں محبت و شفقت سے پالا۔ سولہ برس میں دستار بندی کا جلسہ ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ مسند درس و افتا پر متمکن تھے۔ [1]

مرآت جہاں نما میں لکھا ہے کہ آپ حضرت شیخ نصیر الدین کے پاس تکمیل تعلیم کے لئے فیض آباد سے دہلی آئے تھے لیکن چند روز تعلیمی مشغولیتوں کے بعد کچھ پڑھنے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ایک روز خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوں اور وہ مجھے تعلیم دے رہے ہیں۔ حضرت سلطان المشائخ کو دیکھ چکے تھے۔ صبح اٹھتے ہی غیاث پور پہونچے اور بیعت ہو گئے [2] اور چند ماہ خانقاہ کے ایک حجرہ میں معتکف رہے۔ اس زمانہ میں کھانا پینا قریب قریب ترک ہو گیا تھا۔ ملنے جلنے کی اجازت نہ تھی مگر حضرت محمود جا سکتے تھے تاکہ اعتکاف سے متعلق تمام ضروری ہدایات دیتے رہیں کچھ عرصہ تو آپ نہایت شوق کے ساتھ تمام امور کے پابند رہے لیکن دل ابھی بہلاوں میں گرفتار تھا۔ طبیعت پوری طرح یکسو نہیں ہوا تھا ضبط نفس کی توفیق کمزور یقین کو تنگ خلوت و انزوا کی شکستہ پائی سے گھبرا اٹھے بغیر کسی سے کچھ کہے حجرے سے نکل آئے اور فیض آباد ہوتے ہوئے حجاز روانہ ہو گئے۔ مدینہ منورہ پہونچ کر حسب دستور علما و فضلا سے ملے اور تعلیم تمام کرنے کی غرض سے شیخ عبداللہ بن یحییٰ عراقی اس عہد کے ممتاز محدث تھے ان کے پاس پہونچ کر حدیث کی دوبارہ سماعت کی۔ لکھا ہے کہ انھیں ۹۰ شیوخ سے روایت کی اجازت تھی [3] اس سے فارغ ہو کر تفسیر، فقہ، ادب، معانی اور کلام کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوئے اور سند تکمیل حاصل کر کے وطن واپس ہوئے یہاں حاجیوں کی زبانی تحصیل علم کی داستانیں پہلے ہی پہونچ کر مشہور ہو چکی تھیں۔ فیض آباد پہونچتے ہی دور دور مشہور ہو گیا۔ ہر طرف سے طالب علم آنے لگے خود بھی اپنے علم و فن پر مغرور رہتے تھے اور لوگوں کی طرف سے پذیرائی کے منتظر تھے۔ یہ رنگ دیکھتے ہی سجادہ ورع بچھا دیا [4] مگر اس طائر صد آشیان کو اب بھی ایک حالت پر قرار نہ تھا۔ تلون کا یہ عالم تھا کہ ہر دم ایک نیا تغیر پیدا کر دیتا تھا یہ طریقہ اگرچہ بڑے ہی چاؤ سے اختیار کیا تھا اور اس کے ذریعہ اپنی شہرت کے بہت سامان پاتے تھے لیکن ساڑھے تین برس سے زیادہ یہ سجادہ دائی قائم نہ رہ سکی طبیعت کی بے چینیوں نے پھر آوارۂ دشت و غربت کیا فیض آباد سے نکل کر چند روز صحرا نوردی میں گزارے کبھی کسی گاؤں میں رہے کبھی کسی شہر میں چلے گئے اور کبھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ جنگل کی ویرانیوں کی سیاحت میں بسر کیا۔ یہ حالت قریب قریب دس گیارہ مہینے طاری رہی مگر اب پھر حالت بدلی طبیعت نے یکا یک پلٹا کھایا اور جسم و لباس سے ننگ چھوٹ دہلی کو دوبارہ آ پہونچے۔ یہاں پھر ہوس جاہ نے سر اٹھایا۔ عزت و حرمت کی پابوسیاں دیکھتے ہی عالمانہ شان و شوکت کا شوق جوان ہو گیا۔ وعظ و درس کا سلسلہ جاری کیا۔ اہل دول سے ملنے لگے ارباب حکومت سے راہ و رسم پیدا کی اور اپنے دل میں اسی پر قائم رہنے کا تہیہ کر لیا مگر یہ بھی قائم رہنے والی چیز نہ تھی اور قدرت کو کچھ اور کام لینا ان سے مقصود تھا۔

---

۱ اخبار الاولیا۔ ۲ سلسلۂ نظامیہ
۳ مرآۃ جہاں نما۔ ۴ اخبار الاولیا ۵ مرآۃ جہاں نما۔ ۶ اخبار الاولیا

حضرت نصیر الدین کو آپ سے بہت الفت تھی وہ ابتدا سے ان باتوں کے مخالف تھے اور آپکو ہمیشہ سمجھاتے رہتے تھے لیکن نفس کی لذت نفسانیاں اور دل کی جاہ پرستیاں جب پہلے ہی اس سے بیزار ہو چکی تھیں تو اب سمجھانے سے کیا ہو سکتا تھا وہ کچھ کہتے تھے آپ باتوں باتوں میں ٹال جاتے آخر کار وہ پتھر میں جونک لگانے سے تھک گئے اور مجبوری کا آخری حربہ نکالا۔ ایک رات پچھلے پہر کے سناٹے میں با چشم گریاں درگاہ رب العزت میں دعا کی کہ "خدایا! کمال الدین کو راہ راست دکھا وہ علوم و معارف کا شناور ہے مگر اپنے دل قلب سے موتی نہیں نکالتا وہ دوسروں کے لئے پابندی شریعت کی تبلیغ پناہ ہے مگر اپنے اندر کوئی لمحہ حقیقی نہیں رکھتا۔ وہ حسن کلام کا بادشاہ ہے مگر حسن عمل تہی دامن فقیر ہے وہ دوسروں کو اصلاح و تزکیہ کی دعوت دیتا ہے مگر اپنی اصلاح و تزکیہ کی طرف سے غافل ہے۔ کئی بار کہا کہ "عشق لب ان دو نوستن سے روحش کی تجارت کر کے گردہ امان میں سنتا اور ابھی خرید و فروخت کرتا ہے۔ جو عشق عارضی ہے۔ میں جانتا ہوں وہ پروانہ صفت ہے۔ شمع پر جان دیتا ہے مگر افسوس وہ شمع یا شمع حقیقت نہیں شمع خود پرستی ہے۔ اے تیری رحیمی کے صدقے! کمال الدین کی دست گیری کر۔ اسے اپنے عشق کی تڑپ عطا دے۔ اسے اپنی محبت میں مرنا سکھا۔ اسے اپنے آئین معرفت کا بنا دے اور دوسروں کی صدائے مضطر کو سننے والے میں تجھ سے بھیک مانگتا ہوں۔ میری مانگ پوری کر۔ تو ہر دعا کرنے والے کی دعا کو پہنچتا ہے۔ میری بھی دعا کو پہنچ۔ میرے دوست کی دوا کر اور میرے عزیز گمراہ کو راہ راست دکھلا۔ وہ تجھے بھول گیا ہے اس کے دل سے یہ بھول نکال دے۔ اور اپنے کرم حق کا سچا پرستار بنا دے "[1]

یہ دعا قبول ہوئی۔ ہاتف غیبی نے اسی وقت قبولیت کا مژدہ سنا دیا۔ اور یکایک کچھ ایسا ہوا کہ پہلو میں جو بت کی قاش تھی فتیلہ بن گئی۔ سب باتوں سے بے پروا ہو گئے دوست و احباب سے ملنا جلنا ترک کر دیا خود پرستی سے بیزار ہو گئے دنیا پر جان دینے سے نفرت کرنے لگے اور ایک گوشہ میں بیٹھ گئے[2]۔ سچ ہے ؎

ہیچ کارے گرچہ جاں بے تامل خوب نیست ‏ ‏ ‏ ‏ بے تامل آستیں افشاندن از دنیا خوش است

دنیا سے بے نیاز ہوتے ہی آنکھیں کھل گئیں دل کی پژمردہ کلی تر و تازہ ہو گئی۔ قلب سکون اور شادمانی سے لبریز ہو گیا۔ روز بروز کیفیت بدلنے لگی اور سب کچھ چھوڑ کر صرف ایک کی یاد باقی رہ گئی وہی دل کو بھاتی اسی میں انجمن آرائی کی لطف آتے اسی میں سرود کامرانی کے ہنگامے پیدا ہوتے تھے۔ اس حال میں جتنا جتنا زمانہ گزرتا گیا جذب شوق اور بڑھتا گیا۔ آخر ایک دن شیخ کے پاس آئے اور بولے ؎

بہر صورت رخ دلدار دیدن آرزو دارم ‏ ‏ ‏ ‏ ز ہر سوئے صدائے او شنیدن آرزو دارم
دریں عالم خانۂ کثرت چرا باشم چرا باشم ‏ ‏ ‏ ‏ کہ من در گلشن وحدت چمیدن آرزو دارم
بہر جائے کہ گم سیرے نہ بیند چشم من غیرے ‏ ‏ ‏ ‏ کہ من در انجمن خلوت گزیدن آرزو دارم
نہ یاد مدح سرو کارم نہ صحبت را طلبگارم ‏ ‏ ‏ ‏ بجان سوز محبت را خریدن آرزو دارم
نہ با عطر ست پروایم نہ با نافہ سرے دارم ‏ ‏ ‏ ‏ کہ بوئے طرۂ جاناں شمیدن آرزو دارم

---

[1] سلسلۂ نظامیہ [2] سلسلۂ نظامیہ و اخبار الاولیا۔

شیخ نے ذیشکر پیش کیا اور اٹھا کر دیکھا اور سلطان کی خدمت میں بیجا کر کل کیفیت عرض کی فرمایا۔ کچھ دن مدینہ طیبہ میں جاکر تصفیہ کرنا چاہیے عجب کیا ہے
ان کی توجہ سے خیال حال ہو گی کامیابی یقینی ہو سکتی۔ اللہ تعالی کا فضل و کرم مختلف نشانوں سے جلوہ گر ہوتا ہے تمہارے ساتھ اس صورت میں لطف کرے
آپ یہ سنتے ہی چلنے کے لئے تیار ہو گئے سامان سفر بھی کچھ ساتھ نہ لیا احرام عشق کی چادر باندھلی اور محبت کے ولولوں سے بھر کر منزل جانان کی طرف روانہ
ہو گئے اکثر منزلیں پیادہ پا طے کیں اور مہینوں کا سفر ہفتوں میں طے کر کے سرزمین حجاز میں داخل ہو گئے حج کا زمانہ قریب آگیا تھا کچھ دن کو مین میں حج سے
اور مناسک حج سے فارغ ہوتے ہی بلا انتظار معیت نازنین مدینہ کی راہ لی روضہ اقدس پر حاضر ہوئے تو لکھا ہے کہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے ساتھ ہی
حبیب کو چاہا دیکھ کر اوقت چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور غل مچایا کہ کیا دیوانگی ہے مسلمان کا سر تو صرف خدا کے آگے جھکنے کے لئے ہے یہ پیر
یہ کون ہے جو بندوں کے آگے سر بسجود ہے۔ آپ نے سر اٹھایا اور ان کی چیخ پکار سنکر کہا۔ مگر مجنون نا عقل کو اسکے حال پر چھوڑ دو۔ وہ جس جگہ
کا محبوب رہتا ہے اسکی دہلیز پر جھکے۔ وہ مہاراج لب ہیں کہ اس کی راہ میں روک نہ۔ یہ باتیں تمہارے رسم و آئین سے مختلف ہیں تو مجھے اپنی
برادری سے خارج سمجھو۔"

ان عاشقانہ وارفتگیوں اور صوفیانہ سرشاریوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ ہی کے قیام سے حالت میں نمایاں تغیر ہو گیا پانچ مہینہ کر
واپس ہوئے خیال کیا کہ دہلی پہونچکر سلطان سے تجدید بیعت کر لینگے۔ لیکن کیا خبر تھی کہ آرزو حسرت بنکر دل ہی میں رہیگی آپ اس ذوق شوق میں
خوش خوش روانہ ہوئے اور تین مہینہ میں ہندوستان پہونچ گئے مگر ابھی راستہ ہی میں تھے کہ سلطان کے انتقال کی خبر تمام اطراف و اکناف
میں پھیل گئی آپ یہ خبر سنتے ہی از خود رفتہ ہو گئے دامن و گریبان چاک کر ڈالا۔ اور مسلسل کئی مہینہ اسی رنج و غم اور اندوہ و دلگیری میں سرگردان رہے
حضرت نصیر الدین کو آپکی اس کیفیت کی اطلاع ہوئی تو فاتحہ پڑھا۔ وہ مہینہ کی مسلسل تلاش کے بعد پتہ ملا کہ اجمیر کے پہاڑوں میں سوگ لئے بیٹھے ہیں تو آمد
وہاں پہونچا آپ صورت دیکھتے ہی پہچان گئے اور بے تاب ساتھ ہوئے حضرت محمود نے شہر سے نکل کر استقبال کیا آستانہ پر آئے اور آتے
ہی بیہوش ہو کر گر پڑے۔ تین دن بعد ہوش آیا انکر خلوت گزین ہوئے۔ دن بھر حجرے میں دروازے بند کر کے بیٹھ جاتے اور رات
کو قبر پر شب زندہ دار رہتے۔ لوگوں نے پوچھا حضرت یہ گوارا کیوں ہو جو ہوتے تعجب تماشہ ہے کہ ایک شخص تو لٹ جائے اور دنیا پوچھے تو ہو گیا
کیوں ہے انہوں نے کہا " جو چیز جانے والی تھی وہ چلی گئی۔ ہمیشہ رہنے والی نہ تھی آہ ماتم سے واپس نہیں آسکتی پھر رنج بے حاصل سے کیا فائدہ؟
بولے ہاں جانتا ہوں جو موتی بادشاہ کے خزانہ میں داخل ہوتا ہے جوہری کی دکان میں نہیں رہ سکتا مجھے۔ رنج اسکا نہیں ہے کہ ایسا کیوں ہو گیا
بلکہ اسکا ہے کہ میں غافل کیوں رہا۔ لیکن یہ آنسو بھی ضائع نہیں جا رہے ان سے مزرع دل افگاری کی آبیاری ہو رہی ہے[3]"

غرض اس حال میں تھا زمانہ گزرنا تھا گزر گیا۔ رات کی تنہائی اور دن کی دھوپ آپکے لئے یکساں تھی اور ہر وقت ایک استغراق و بیخودی کی
ہستی تھی نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا نہ اہل و عیال کی پروا تھی نہ عزیز و اقارب کی دوست و دشمن نظروں میں ایک ہو گئے تھے زر و جواہر کی
خس و خاشاک کے ڈھیروں سے زیادہ وقعت نہ تھی خواہش و تمنا سے دل کا گوشہ بالکل خالی کر لیا تھا و کاروبار حیات سے اتنا ہی تعلق رکھتے تھے

---

[1] اخبار الاولیاء [2] مرآۃ ضیائی۔ [3] سلسلہ نظامیہ۔

جتنا ضروری ہے۔ اس کیفیت میں جب پوری پختگی ہوگئی اور کسی قسم کا تزلزل باقی نہ رہا تو خلعت ارجمندی ارزانی کیا گیا۔ اور علم و فضل کے جوہر سے سلوک طریقت کی دعائیں بھی جاری ہوگئیں ؎

ہیچ اکسیر بتاثیر محبت نرسد — کفر آوردم و در عشق تو ایمان بردم

شیخ کو یہ راز حال معلوم تھا یہاں جو کچھ گزرتا تھا وہاں پہلے ہی ظاہر ہو جاتا تھا۔ ایک رات آئے اور کہا "رات پا لیا ہے منزل مقصود اب گوشہ نشینی ترک کرکے اپنے اشغال و وظائف کو زندہ کرو۔" بولے "ہنوز اپنے اندر اس کی قابلیت نہیں دیکھتا" فرمایا "نا قابلیت کی درماندگی کا زمانہ جا چکا اور خاک نشینی کی ننگ تیاری کو دو دن پیچھے چھوڑ چکے ہو جو کچھ ہے غلط روی کا ثمرہ ہے۔ عرض کیا پھر کیا کروں۔ بولے "اسی لئے آیا ہوں جب اللہ کی نظر ثانی سے بہانہ ساز ہو پہنچے تو دی ایک دوسری صورت میں تمہارے سامنے ہے۔" آپ نے بیخودی شوق میں ہاتھ بڑھایا اور اسی رات کو خلوت میں اسم عشق کی تکمیل ہوئی ؎

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبی — آن شب قدر کہ این تازہ براتم دادند

صبح ہوتے ہی حجرے سے باہر آئے تعلیم کو معلوم ہوا تو سب نے ہجوم لیا اور ہاتھ پاؤں چومنے لگے لیکن آپ انکی بھیڑ سے گھبرا گئے۔ ایک چیخ ماری ؎

ای ہم نفسان آتشم از من بگریزید — ہر کس کہ خود آمد سوی او دشمن خویش است

کچھ دن کی آمد و رفت اور میل جول سے مزاج اعتدال پر آیا تو شیخ کے اشارہ سے درس و تعلیم کا سلسلہ شروع کیا گو حالت بالکل بدلی ہوئی تھی لیکن مسند درس پر بیٹھتے تو وہی پرانا رنگ رہتا تھا چنانچہ لکھا ہے طالبان حدیث کو ڈھنگ محدثانہ اور طلباء عقلیات کو طرز فلسفیانہ پڑھاتے تھے۔ مخدوم جہانیان جہاں گشت حج سے واپس آکر آپکے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔ پہلے مشارق پڑھی بعض کو دوسری کتابوں کا درس لیا۔

اسی زمانہ میں حضرت گنج شکر کے دربار سے ولایت گجرات کی حکومت تفویض ہوئی۔ سیر العارفین میں لکھا ہے کہ آپ جب گجرات کی سرحد میں داخل ہوئے تو ہر مقام پر استقبال کیا گیا۔ احمد آباد میں بہت شاندار جلوس نکلا بازاروں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی زائرین کا اندازہ کیا گیا تو ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ۔ چھتے بالاخانوں سے عورتوں اور بچوں نے پھولوں کے ہار پھینکے۔

اس زمانہ میں یہ عام رواج تھا کہ اہل طریقت شریعت کا درس بھی دیتے تھے خرقۂ خلافت کا شرف اکثر اسی کی قسمت ہوتا تھا جو کتاب و سنت کا عالم متبحر اور فصیح کا درس ہوتا تھا کہ وہ اپنے ہر مرید کو تحصیل یقین کے ساتھ پابندی شریعت کی بھی ہدایت کرے۔ اس معاملہ میں بعض اکابر شیوخ تو اس حد تک جاتے تھے کہ جب تک کسی مرید کے متعلق اس بات کا یقین نہیں کر لیتے تھے اس وقت تک خرقۂ خلافت نہیں دیتے تھے اور اگر اس طرف سے غفلت کرتا تو مسند ارشاد سے معزول کر دیئے جاتے تھے کہ اولین فرض علم دین سے واقفیت اور پابندی شریعت ہے جو اس سے ناواقف ہو طریقت میں آنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

جب آپ دہلی سے چلے تو حضرت گنج شکر نے سب سے زیادہ آپکو ان ہی باتوں کی ہدایت کی اور آپ نے بھی عمر بھر اسکی پابندی کی۔ احمد آباد پہونچکر زیادہ

سلہ اخبار الاولیا۔ سلہ صفحہ ۱۰۱۔ سلہ مکتوبات مولوی ادریس سلہ سیر السالکین سلہ مسند خطابیہ سلہ مسند خطابیہ

طریقت کا سجادہ بچھایا اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی مسند بھی ساتھ تھی جس میں اہلیت ہوتی اسے صوری تعلیم وہدایت کے بعد بیعت کر لیتے جو شخص ہوتا اسکی تربیت کرتے جنکے اخلاق ناشائستہ ہوتے اسکی اصلاح فرماتے اور جو جہالت ونادانی میں مبتلا ہوتا اسکو سب سے پہلے علم وواقفیت کی روشنی میں لاتے اور پھر حسب قدر صلاحیت نعمت باطنی سے سرفراز کرتے تھے[1]

ان باتوں کی اسلئے اور زیادہ ضرورت تھی کہ مفاسد وفتن پیدا ہوتے جاتے تھے بدعات ومنکرات کا عام رواج ہو رہا تھا ہر شخص کی زندگی خود سری کا نمونہ بنی ہوئی تھی اور ملک میں ہر طرف اعراض عن السنت کی گرم بازاری تھی۔ اس لئے انہوں نے سب سے زیادہ اسی کام کو ضروری سمجھا اور اپنی پوری قوت امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے قیام واحیاء میں صرف کردی یہ ان ہی مقدس بزرگوں کا دم تھا جنہوں نے ایسے پر آشوب زمانہ میں کلمۂ حق کی غمخواری کی اور عشق حق و وصف میں ایسے سرشار ہوئے کہ نہ عالم کی پرواہ کی نہ بادشاہ کی نہ علماء کے فتووں کا خوف کیا نہ فقہا کی تیغ وقلم کا۔ بلکہ نہایت بیباکی سے کلمۃ الحق کا اعلان کیا اور جب تک سانس جاری رہا اسی کا اعلان کرتے رہے۔

ہر چند خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی تھی لیکن اسی نسبت سے اہل حق کے فرائض بھی بڑھ گئے تھے یعنی جیسا اہل تھا ویسا ہی رد عمل بھی ہونا چاہئے تھا یہ دیکھنا ہو کہ ان خانقاہ نشینوں نے کیا کیا اور کس بے جگری سے دنیا کے بڑھتے ہوئے فتنوں کا مقابلہ کیا و ملفوظات کے مطالعہ سے تمہیں معلوم ہوگا کہ سلسلۂ نظامیہ کے شیوخ کرام نے اس بارہ میں کتنی جرأت اور بیباکی اور جوش وفداکاری سے دعوت صداقت کا جواب دیا تھا۔

حضرت شیخ نصیر الدین کے زمانہ تک درس وارشاد کا کوئی مستقل اور باقاعدہ انتظام نہ تھا لیکن انہوں نے حالات کو دیکھ کر اور کاموں سے زیادہ اسطرف توجہ کی اور اپنے تمام خلفاء وتلامذہ کو انہیں باتوں کی ہدایت کی۔ علامہ ان کے محبوب ترین خلیفہ اور عزیز ترین شاگرد تھے اور وہ تو فیض صحبت اٹھایا تھا اس لئے بالکل ان ہی کا سنت تھے اور بیعت کے مروجہ اعلان وارشاد کی جگہ علم القرآن وعمل بالحدیث کا درس دیتے تھے چنانچہ جب حضرت نے دہلی کو مستقر خلافت بنایا تو سب سے پہلے یہی کام کیا سلسلۂ نظامیہ میں غالباً یہ علامہ نے یہاں ایک خانقاہ تعمیر کرائی تھی۔ اسمیں ایک جانب مدرسہ تھا دوسری طرف مسجد تھی وسط میں دار الارشاد اور کتب خانہ تھا باقی دار الطالبین کے لئے دار الاقامہ اور مریدوں کے قیام وتربیت کے لئے حجرے تھے روزانہ صبح کو حدیث تفسیر فقہ منطق ادب۔ کلام کا درس ہوتا تھا ... کو دعاۃ ومبلغین کی جماعت بیٹھتی تھی اور رات کو بعد نماز عشا تشنگان ہدایت وبصیرت کا حلقہ بیٹھتا تھا عموم فیضان کا یہ عالم تھا کہ جاہے کسی کو حقیقت کی طلب ہو یا نہ ہو حسب قدر صلاحیت ہر شخص کو مل جاتی تھی اور علوم ظاہر کی دولت سے ہر کاسہ لبریز ہوتا تھا۔ اخیر عمر تک آپکا یہی طریقہ رہا یہاں تک کہ جس جگہ بیٹھے تعلیم وتلقین اور درس وارشاد سے غافل نہ رہے بہر مرید وطلبت کثیر اور ہر جانشین وصاحب سجادہ کو یہی ہدایت کی چنانچہ درس وتعلیم کا یہ طریقہ تقریباً تین صدی تک جاری رہا اور جو سر پرآ اسنے خلافت سے اس نے اپنی زندگی کو طرز سلف وعمل بالسنت کے لئے وقف کردیا[2]

آپ کے تین فرزند تھے جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی راہ میں کامل تھا۔ نظام الدین علم وفضل کے تاجدار تھے خصوصاً علوم عقلیہ میں بڑی دستگاہ

[1] سلسلۂ نظامیہ [2] سلسلۂ نظامیہ

رکھتے تھے۔ نصیر الدین سے تفقہ و طریقت کو سنبھالا اور سید گیسو دراز کے خلیفہ ہوئے۔ سراج الدین دونوں کے جامع اور زبدۃ الریاضتین تھے والد نے ابتدا ہی سے ان کو اپنی جانشینی کے لئے منتخب کر لیا تھا۔

آخر حیات میں شیخ سے ملنے کے لئے دہلی کا قصد کیا۔ حضرت سراج الدین کو بیعت کر ہی چکے تھے اور سلوک و طریقت کی قریب قریب تکمیل بھی کر لی تھی چلتے وقت خرقۂ خلافت دیدیا اتفاق سے راستہ میں بیمار پڑ گئے۔ وہاں دو دن دہلی پہونچے شیخ نے بنفس نفیس خود ہی تیمارداری کی راتوں کو جاگے اپنے ہاتھ سے دوائیں بنا بنا کر پلائیں لیکن وقت آخر آ چکا تھا کسی کا کچھ بس نہ چل سکا جسقدر علاج کیا مرض اور بڑھا اور ۲ ذیقعدہ سنہ ۷۵۶ھ کو چار مہینہ بیمار رہکر انتقال کر گئے۔ یہ خبر بجلی کی طرح غیاث پور سے نکل کر تمام اطراف و جوانب میں پھیل گئی شہر میں کہرام مچ گیا مدرسے حضرت محمود کی حالت بھی نزار تھی۔ فاتحہ سیوم میں شریک ہوئے تو آنکھیں نمناک تھیں۔ مزار شیخ کے سرہانے ہے۔ (ناظر دہلوی)

غزل

چشم تر طلب طلبان سینہ خروشان دارم — سردی درد فراق تو سامان دارم

وہ چہ از برق نگاہش سر و سامان دارم — اشک در دیدہ و آتش بگریبان دارم

من بدرد تو اگر خدمت ناچیز کنم — باید تیر نگاہت برگ جان دارم

بے جہت اشک نیاید دیدہ ساز بر شود — بجز غم الفراق تو بطوفان دارم

ہیچ از سوز درون فائدہ گیرد نہ غم — شاہد بے اثری اشک پشیمان دارم

حق زخون قدم ریش براہ عشقش — گلستانے سر ہر خار بیابان دارم

رنگ بشکستہ زدست شرح حقیقت نہ کہ — بے وفا از تو ہزاران غم پنہان دارم

مرحمت پیشہ کن انصاف بدہ حرف مگیر — بجز وی خود کہ ہر نالہ و افغان دارم

من اگر بر طرف عشق شہادت بدہم — لخت لخت چند ز دل ہم سر مژگان دارم

بین دران نقش کہ جنبان ز رم ریختہ اند — بوفا راز خفایت سر و سامان دارم

نقش امید ز خون دل خستہ ریزم — کلک خود را بسر ناوک جانان دارم

ہادیا پس در آئین محبت کفر است — درد سے ہر زخم بدل صحن گلستان دارم

(ہادی مچھلی شہری)

ادب اور اس کے شرائط مطالعہ

(مختار از ولیم ہنری ہڈسن)

قبل اس کے کہ ہم مطالعۂ ادب کے اصول بیان کریں ان سوالات کا جواب دینا ہمارے لیے لازم ہے کہ "ادب کیا چیز ہے" ؟ [illegible] کے حدود کہاں ختم ہوتے ہیں ؟" مگر حد کیونکر مقرر کی جائے ؟ اس پر غور کرتے ہی ہماری مشکلات شروع ہو جاتی ہیں تاہم ہمیں تجارتی [illegible] خلاف مصلحت [illegible] ۔ ہر رنگ خیال کے لیے کسی نہ کسی جگہ کا تعین ضروری ہے ۔ اور اسی تعین کے وقت اختلافات کی ابتدا ہوتی ہے [illegible] آیا ہم اُس نظریہ کو تسلیم کریں جس کے ماتحت شبلی و حالی کو بھی دائرہ ادبیات سے خارج کرنا پڑتا ہے ۔ یا اُس نظریہ کو مانیں جس کے ماتحت ادب بے انتہا وسیع ہو جاتا ہے ۔ اور قانون، دینیات، اور طب بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں ۔

یا اگر یہ دونوں نظریے افراط و تفریط کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں تو ہمیں معتدل نقطہ کہاں دستیاب ہو سکتا ہے ؟ خوش قسمتی سے اس سوال کا آخری جواب آج تک نہیں دیا گیا ۔ اس لیے ہم اپنے عملی مقاصد کے لیے صرف دو باتوں کو مدنظر رکھ کر کافی معتدل راستہ [illegible] ہیں ۔ ادب اُن کتابوں اور صرف ان کتابوں کے مجموعہ کا نام ہے جو اوّلاً اپنے مضامین اور طرز بیان کے لحاظ سے عام انسانی [illegible] ہوں اور جن میں ثانیاً شکل و صورت کا خاص خیال رکھا گیا ہو ۔ ادب کی ایک کتاب فلکیات و اقتصادیات یا فلسفہ و تاریخ [illegible] سے بھی کچھ اس سبب سے مختلف ہوتی ہے کہ ادب کا مقصد عام مردوں اور عورتوں کو بحیثیت مردوں اور عورتوں کے خطاب کرنا ہوتا ہے [illegible] خاص طبقہ کو اور کچھ اس سبب سے بھی کہ ایک علمی مضمون کا مقصد پڑھنے والے کو تعلیم دینا ہوتا ہے ۔ اور ادب کا مقصد اپنے طرز بیان [illegible] سے پڑھنے والوں کی دلچسپی قائم رکھنا ہوتا ہے عام اس سے کہ خود ادب کے ذریعہ سے پڑھنے والے کی تعلیم ہوتی ہے یا نہیں ۔

زندگی اور ادب

اکثر خیال ہوتا ہے کہ ہم ادب کی قدر کیوں کرتے ہیں ؟ اور اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہم ادب کی قدر [illegible] اس کی عمیق اور مستقل انسانی اہمیت کے سبب سے کرتے ہیں ۔ یہ بیان بعض لوگوں کے لیے ظاہراً دقیق [illegible] ہوگا ۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ایک بڑی کتاب بلا واسطہ زندگی سے پیدا ہوتی ہے ۔ اور اس بڑی کتاب کے مطالعہ سے ہم زندگی سے [illegible] اور تازہ تعلقات قائم کرتے ہیں ۔ اور زندگی کی بابت ہماری واقفیت بڑھتی ہے اسی حقیقت میں ادب کی بڑائی کا راز مخفی ہے ۔ انسانوں نے زندگی میں جو دیکھا ہے جو تجربات حاصل کیے ہیں ۔ اور اس کی مختلف صورتوں کے بابت جو کچھ خیال اور محسوس کیا ہے ۔ اس کی ضروری یاد [illegible] کا نام ادب ہے ۔ اس طرح بنیادی طور پر یہ زبان کے ذریعہ سے زندگی کا اظہار ہے جو علم و ادب کی مختلف شکلوں میں منتقل کر دیا گیا ہے ۔ آگے چل کر معلوم ہوں گے ۔ لیکن [illegible] یہ سمجھ لینا بہت ہی اہم ہے کہ ادب اس زندگی کے باعث جس پر یہ حاوی ہوتا ہے عالم وجود میں آتا ہے اور باقی رہتا ہے ۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینے سے ہم بہت سی گمراہ کن غلطیوں سے محفوظ رہیں گے یعنی مطالعۂ ادب کو [illegible] یا ادبی صنعت یا فصاحت کے ساتھ خلط ملط کر دیں گے ۔

محرکاتِ ادب

یہ کہنا کہ ادب زندگی سے پیدا ہوتا ہے ۔ درحقیقت یہ کہنا ہے کہ ادب کے محارج یا دیگر الفاظ میں وہ محرکات جن کے سبب سے ادب کا وجود ہوتا ہے ۔ زندگی ہی میں دستیاب ہو سکتے ہیں ۔ اس لئے اگر ہم یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ ادبیات کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور ہمارے لیے کیا معنی اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں ۔ تو ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ جس شئے کو ادب کی مختلف شکلیں کہتے ہیں اسکا ترجمہ زندگی کے اصطلاحات میں کریں ۔

عملی مقاصد کی غرض سے میرے خیال میں محرکاتِ ادب چار سرخیوں میں صحت کے ساتھ تقسیم کیے جا سکتے ہیں (۱) ہماری خواہش اظہار (۲) عامۃ الناس اور ان کے افعال سے ہماری دلچسپی (۳) دنیائے حقیقت اور دنیائے تخیل سے ہماری دلچسپی (۴) حسن اور وضع سے ہماری محبت ۔ یعنی جو کچھ ہم دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں ۔ اس کو بیان کرنے کی خواہش ہم میں زبردست ہوتی ہے اس لیے اس ادب میں جو ہمارے خیالات جذبات کا اظہار کرتا ہے ہمیں مردوں اور عورتوں کے سوانح ان کے افعال و اقوال و تعلقات سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے اور جس میں انسانی زندگی اور اس کے عنصر و مضمون کو بیان کیا جاتا ہے ۔ ہم اسے دوسروں کو سنانے کے لیے مشتاق ہوتے ہیں اس لیے خود ادب کا وجود ہنر کی حیثیت رکھتا ہے

انسان ایک معاشرتی حیوان ہے ۔ اس لیے وہ فطری طور پر کوئی تجربہ کوئی مشاہدہ ، نظریہ ، جذبہ یا تخیل اپنے دل میں رکھنے پر قادر نہیں ہے ۔ اس لئے ادب کی مختلف شکلیں گویا وہ مختلف ذرائع ہیں جنھیں اس نے اپنے خیالات کو خوبصورت طور پر ظاہر کرنے کے لیے وضع کیا ہے ۔ علاوہ ازیں یہ محرکات نہ صرف ادب کے ارتقا کا بلکہ اپنے اندر ہماری دلچسپی کا بھی اظہار کرتے ہیں یعنی جس طرح ہم دوسروں کو اپنے خیالات و محسوسات تجربات و مشاہدات اور تصورات کا راز دار بنانے پر مجبور ہیں اسی طرح ہم دوسروں سے بھی وہ باتیں سننے میں مسرت حاصل کرتے ہیں ۔ خصوصاً اس وقت جب ہمیں ان کی زندگی کے تجربات کی حد نظر کی گہرائی ، قوت بیان یا اس امر کا علم ہو کہ یہ سب مل کر ان کے بیان کو غیر معمولی دلچسپی اور قدر کے لائق بنا دیں گے ۔

مگر ان چار محرکات میں سے اظہر محرک تمام اقسام ادب میں مشترک ہے ۔ اس لیے فی الحال اس کو نظرانداز کیے دیتے ہیں ۔ اس طرح ادب کی تقسیم کے مقصد کے لیے صرف تین ہی شمار میں آتے ہیں ۔ یہ امر واضح رہے کہ یہ سہ محرکات زندگی میں ہمیشہ ملے ہوئے رہتے ہیں ۔ مثلاً اگر ہم کسی دیکھی ہوئی یا خیالی چیز کا حال بیان کر رہے ہیں ۔ تو یہ تقریباً یقینی ہے کہ ہم اپنے محسوسات کو بھی اس میں شامل کر دیتے ہیں اور بیان کرتے وقت ع بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے ۔ اور چونکہ یہ زندگی میں مشترک ہیں اس لیے لازم ہے کہ ادب میں بھی مشترک ہوں جسکا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف اقسام ادب بھی ایک دوسرے سے بالکل الگ نہیں ہیں ۔ البتہ ہم ایک دوسرے کو اسی طرح ممتاز کر سکتے ہیں جس طرح ایک انسان کو دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں ۔ مثلاً تغزل کو رزمیہ سے ، ڈرامہ کو ایک بیانیہ مضمون سے اور اسی طرح گو ہم نے ادب کی تقسیم کا ایک بنیادی اصول دریافت کر لیا ہے ۔

مضامینِ ادب

اپنی پیمائش کو زیادہ مکمل کرنے کے لیے ہمارے لیے لازم ہے کہ محرکات کی دریافت پر قناعت نہ کریں بلکہ ان مضامین کو بھی دریافت کریں جو ادب میں بیان کیے جاتے ہیں ۔ یہ مضامین اسی قدر مختلف ہیں جس طرح ایک زندگی دوسری زندگی سے ۔ اور شاید ہی کوئی زندگی ایسی ہو جو ادب میں نہ بیان کی جاتی ہو ۔ اس لئے ان کو کسی اصولی بیان میں ظاہر کرنے کی کوشش بادی النظر میں ناممکن معلوم ہوگی لیکن عملی مقاصد کو مدنظر رکھکر ہم اسکو پانچ وسیع مجموعوں میں منضبط کرنے کی جراءت کرتے ہیں (۱) ہر شخص کے ذاتی تجربات شخصی حیثیت سے (۲) انسان کے تجربات انسانی حیثیت سے ۔ یعنی موت و حیات گناہ ، قسمت ، خدا ، اور انسان کے تعلقات اس کے ساتھ دنیا و عاقبت کی امیدیں اور ایسی باتیں جو شخصی حد سے

تجاویز یہ کہ قوم کے ساتھ بحیثیت قوم کے تعلق رکھتے ہیں (۳) اشخاص کے تعلقات اپنے احباب کے ساتھ یا معاشرتی دنیا اور اُس کی مصروفیتیں (۴) فطرت کے ساتھ ہمارے تعلقات (۵) تخیل۔ اس تشریح کی روشنی میں صرف مضامین کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم ادب کو حسب ذیل پانچ اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں یعنی شخصی تجربات کا ادب، انسانوں کی مشترکہ زندگی کا ادب، معاشرتی دنیا اور اس کی مصروفیتوں کا ادب، کیفیات فطرت کے بیان کا ادب اور وہ ادب جس میں تخیل کا بیان ہنر کی صورت میں کیا گیا ہو۔

ادب کی تقسیم تشریح کی ان دو سطروں کو پیش نظر رکھ کر ہم ایک عام فہم لائحہ تقسیم تیار کر سکتے ہیں اور وہ بھی ایسا لائحہ جس کی بنیاد فطری اصولوں پر ہے۔ سب سے پہلے ہمارے پاس ذاتی خیالات کے اظہار کا ادب ہے۔ جس میں نغمہ، مرثیہ اور غور و فکر کے قسم کی نظمیں، وہ مضامین جو ذاتی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہوں اور صنعتی و ادبی تنقید شامل ہیں۔ ہمارے پاس دوسرے قسم کا وہ ادب ہے جس میں مصنف اپنے خیالات کے اظہار کے بجائے انسان کی بیرونی زندگی اور کشمکش کا حال بیان کرتا ہے۔ اس میں تاریخ و سوانح، گیت اور رزمیہ نظم یا نثر میں افسانہ اور داستان، ناول اور ڈراما شامل ہیں۔ تیسرے ہمارے پاس ادب بیان ہے جو بجائے خود زیادہ وسیع یا اہم نہیں کیونکہ یہ بیان عموماً پہلی یا دوسری صنف میں شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن سفرنامہ، بیانیہ نظم، نثر پر حاوی ہوتا ہے۔ جو ادب کے چھوٹے گرغات سمجھے جاتے ہیں۔

اس طرح ادب کے مختلف اقسام و اصناف عام انسانی تجربات کے ذریعے جو باقاعدہ کام کر رہے ہیں۔ اپنے فطری مقامات پر آجاتے ہیں اور جب ہم اس بڑے اصول کو یاد کرتے ہیں کہ ادب کا ایک ٹکڑا ہم کو موثر طور پر اسی وقت خطاب کر سکتا ہے جب وہ ہم میں بھی جذبات اور تخیل پیدا کر دے جو اس کی تیاری کا باعث ہوئے۔ تو یہ اصناف ہمارے لیے جو دلچسپیاں پنہاں رکھتے ہیں وہ بھی واضح ہو جاتی ہیں۔

اجزائے ادب مطالعہ کی ابتدا میں ہمیں یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ان تمام اصناف میں صنعت ادبی کے چند خاص اجزا موجود رہتے ہیں۔ سب سے اول یقیناً وہ اجزا ہیں جو زندگی میں مہیا ہوتے ہیں۔ اور ادب کے ہر صنعت کے لیے خواہ وہ نظم ہو یا مضمون، ڈراما ہو یا ناول، سامان خام کا کام دیتے ہیں۔ پھر وہ اجزا ہیں جن کو مصنف ادب کے ایک یا دوسرے صنف میں ڈھالنے کے لیے کام میں لاتا ہے۔ یہ اجزا چار اقسام میں منضبط کیے جا سکتے ہیں۔ اول ذہنی جزو یعنی وہ خیالات جو مصنف کے ذہن میں آتے ہیں اور جن کو وہ اپنی تصنیف میں ظاہر کرتا ہے۔ دوئم جذبی جزو یعنی کسی قسم کا جذبہ جو اس کا مضمون اس کے دل میں پیدا کرتا ہے اور جس کو وہ خود ہم میں اُبھارنا چاہتا ہے۔ سوئم تخیلی جزو جو درحقیقت تیز اور قوت آمیز تصور کا نام ہے۔ اور جس کو کام میں لا کر وہ خود ہم میں وہی تصوریت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اجزا متحد ہو کر ادب کو وجود میں لانے اور اس کے لیے مواد مہیا کرتے ہیں۔ لیکن تجربہ سے حاصل کیا ہوا مواد کتنا ہی کافی کیوں نہ ہو۔ مصنف کے خیالات، احساسات اور تصوریت اچھی طرح بیان کرنے کے لیے کتنے ہی تازہ کیوں نہ ہوں۔ لیکن اس کام کی تکمیل کے لیے ایک اور جزو کی ضرورت ہے یعنی مہیا شدہ مواد کو منضبط کرنا، اور حسن اور تاثیر کے اصول کے موافق متشکل کرنا۔ یہ چوتھا جزو ہے جسے صنعت کہہ سکتے ہیں۔

جس راستہ کو ہم عنقریب اختیار کرنے والے ہیں اس کو صاف کرنے کے لئے ان چند دقیق مسائل پر غور کرنا ضروری تھا۔ اب ہم پھر تو عملی معاملات کی طرف رجوع کر سکتے ہیں، جو طالب علم کے لیے زیادہ اہم ہیں، کیونکہ اس کو خود ادب سے کام ہے نہ کہ ادب کی نظریات سے۔

ادب اظہار شخصیت کے طور پر

اگر اصولاً ادب نام ہے زندگی کے بیان کا، تو اس کی دلچسپی کا راز اس کے لازمی ذاتی کیرکٹر کو تلاش کرنا چاہیے۔ ایک مشہور مصنف کے قول کے مطابق ادب زندگی پر تنقید کا نام ہے لیکن اس کے معنی صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ یہ زندگی کی وہ تشریح ہے، جو شارح کے دماغ پر منکشف ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے شاعر یا ناقد سے کام ہے۔ کیونکہ جو آئینہ ماہر فن دنیا کو دکھلاتا ہے، وہ لازمی طور پر اُس کی شخصیت کا آئینہ ہے۔

ایک کتاب اپنے مصنف کے دل و دماغ کا نتیجہ ہے۔ اس نے خود کو صفحات پر رکھ دیا ہے جو اُس کی ہستی کے اجزا ہر لا ینفک ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنا راستہ دریافت کرنے کے لیے ابتداءً "کتابی انسان" کی جانب رجوع کرنا چاہیے۔ یعنی اپنی کتابوں کے ساتھ سیدھے سادے آدمی کے طور پر مکالمہ کا سلسلہ جاری کرنا ہمارا پہلا مقصد ہونا چاہیے۔ ہمیں سب سے پہلے اچھا عالم نہیں بلکہ اچھا مطالعہ کنندہ بننا چاہیے۔ لیکن ہم اچھے پڑھنے والے اور مطالعہ کنندہ صرف اس حالت میں ہو سکتے ہیں جب ہم اپنے مطالعہ کو نہایت قریب سے اور ہمدردی کے ساتھ شروع کریں۔ کسی نے بالکل درست کہا ہے کہ "شخصی تجربہ تمام اچھے ادب کی بنیاد ہے" اور ایسے شخصی تجربہ میں داخل ہو کر حصہ لینا ہی حقیقی ادبی تربیت کی بنیاد ہے۔ کسی بڑی کتاب کی عظمت کا باعث اُس ہستی کی عظمت ہے جو اس کتاب کو وجود میں لایا۔ اس لیے کہ جس شے کو ہم نابالغہ (genius) کے نام سے پکارتے ہیں وہ صرف دنیا پر تازہ اور اوریجنل تبصرہ و خیال کی گہرائی کا دوسرا نام ہے۔ کسی بڑی کتاب کی عظمت کی نشانی یہ ہے کہ اُسے دنیا کے سامنے کوئی نیا اور اوریجنل نظریہ پیش کرنا ہے اور وہ اس نظریہ کو کسی نئے اور اوریجنل طرز میں پیش کرتی ہے۔ یہ اُس شخص کی صدا ہے، جو بذات خود ان شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھتا ہے جن کا ذکر کتاب میں کیا گیا ہے جس نے اپنی آنکھوں سے اُن کو دیکھا ہے، جس نے اپنے نظر کی تیزی کے باعث تمام اشیاء پر عام لوگوں سے زیادہ گہری نظر ڈالی ہے، جس نے اپنی قوت ذہن سے اُن اشیاء کے معنی عام انسانوں سے زیادہ بہتر طور پر سمجھے ہیں۔ جس کو علاوہ ازیں ماہر فن کی سی صنعت طرز بیان حاصل ہے۔ الغرض مصنف کے خیالات و احساسات کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرنا اور اس کے جذبات سے اچھی طرح آپ کو واقف بنانا ادبی تربیت کی جانب پہلا قدم ہے اور اچھے پڑھنے کا آخری راز۔

اس کے بعد ایک اور اہم امر یہ ہے کہ ہم کو اُن کتابوں کے درمیان، جن میں کارلائل "حقیقی صدائیں" اور "محض گونج" کہہ کر تفریق کرتا ہے امتیاز کرنا چاہیے۔ یا دیگر الفاظ میں اُن انسانوں کے درمیان امتیاز کرنا چاہیے جو خود اپنے خیالات بیان کرتے ہیں اور جو صرف دوسروں کی باتوں پر اعتماد کر کے لکھتے ہیں۔ ہمارا مقصد اس بیان سے ترجموں اور ملخصات کی تحقیر نہیں، خصوصاً اس وقت جبکہ خود ہمارا مضمون محض تلخیص ہے، کیوں کہ اگر وہ اچھے ہوں تو اُن کے لیے ادب کے دربار میں الگ جگہ ہے۔ مگر غلطی سے محفوظ رہنے کے لیے ان ادبیات کے فرق کو جو ذاتی تجربہ و شخصیت پر مبنی ہوتے ہیں اور جو محض دوسروں کے تجربہ و شخصیت کے بناء پر وجود میں آتے ہیں بخوبی ذہن نشین کر لینا ہے، جس ادب میں صرف ادب کی خوشبو ہے، وہ یقیناً اس ادب سے کم درجے پر رکھا جائیگا، جس میں خود زندگی کی خوشبو ہے، اور جو براہ راست زندگی سے پیدا ہوا ہے۔ ہم اپنے مقاصد کے لیے صرف اُن کتابوں کو شمار کریں گے جن میں مکمل طور پر اوریجنلٹی ہے اور جو اصلی کتابیں ہیں۔

اصول خود اعتباری

اسی سے متعلق ادب کا ایک اور بڑا اصول ہے جس کو اب سے قبل افلاطون نے بیان کیا تھا، وہ اصول یہ

بر اپنے اوپر زندگی کے ذاتی تجربہ پر اور چیزوں کی ماہیت کی بابت اپنے ذاتی مشاہدہ پر بھروسہ و اعتبار کرنا تمام اچھے اور دائمی ادبیات کی بنیاد ہے۔ ایک مصنف نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "ادب کے ذریعہ سے جو معلومات ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہیں، ان کی حقیقت کا اندازہ صرف ان کی صحت کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے ..... ہم کسی شخص کو نظر کی گہرائی یا غیر معمولی تجربہ حاصل کرنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے" لیکن ہم اس سے مطالبہ ضرور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے بہترین معلومات ہمارے سامنے پیش کرے اور اس کے بہترین معلومات وہ سب کے سب نہیں ہو سکتے، قدرتی ہے کہ جو لوگ اپنے تجربات بیان کرتے ہیں ان کو ان لوگوں کی بہ نسبت جو خواہ فطری طور سے کسی قدر قابل اور جید عالم کیوں نہ ہوں مگر ذاتی مشاہدہ بیان کرنے کا مادہ نہیں رکھتے اور اس طرح جلد فراموش کر دیے جاتے ہیں، اس امر کے زیادہ مواقع حاصل ہیں کہ ان کے مشاہدہ پر غیر معمولی توجہ دی جائے، اور جب اور جہاں لکھنے والوں کو یہ فوقیت نہیں دی جاتی تو لازمی طور پر اس ترجیح نہ دینے والی قوم یا عہد کے ادبی تنزل کی نشانی ہے، بغیر اس خود اعتباری کے ادب میں کوئی اچھی تصنیف کرنا ناممکن ہے۔ ایک واقعہ مشہور ہے کہ جب ایک ہوشیار جندی شاعر نے [illegible] کے واقعات کو نظم کیا تو ایک بڑے شاعر نے ایک روز جب کہ بلا کی سردی پڑ رہی تھی، اور غربا زبان حال سے بیکسی کا رونا رو رہے تھے، اس کو لندن کی غریب گلیوں کی سیر کرائی اور کہا "اگر تجھ کو نظم لکھنی ہے تو ان غریبوں کی حالت دیکھ" الغرض یہ اصول ایسا ہے جس کو ادبیات کا کوئی طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتا، ہر شخص کو خواہ اس کی قوت بیانیہ کسی قدر کم ہو، اس کو چاہیے کہ جن بلاؤں کا وہ مشاہدہ کرتا ہے، جن کا اسے ذاتی تجربہ حاصل ہے، اور جن چیزوں کو وہ خود دیکھ کر متاثر ہوا ہے، ان کو تحریر کرے۔ اکثر ان کتابوں کی کامیابی جو محض دوسروں سے نقل کی گئی ہیں، ادیبوں کو راہ راست سے گمراہ کر دیتی ہیں لیکن یہ بہرحال سچ ہے، اور ادب کی اصلی قیمت اس کی صحت و واقعیت میں پوشیدہ ہے۔

انسان در کتاب

بہرحال، اس طرح ہمارا ادبی مطالعہ ایک نہایت منکسرانہ اور آسان طریقہ سے شروع ہوتا ہے، یعنی ہم اپنے زیر مطالعہ کتاب کے مصنف کی شخصیت کا اچھی طرح مطالعہ کرتے ہیں، اور اپنے اور اس کے درمیان حقیقی رابطہ قائم کرتے ہیں۔ جو کچھ وہ کہتا ہے ہم اس کو دوستانہ طور پر کان دھر کر سنتے ہیں، اور اس پر غور کرتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اس امر کو بخوبی ذہن نشین کر لیتے ہیں کہ آیا اس نے زندگی میں کس طرح اپنے فرائض انجام دیے، اس کا طرز عمل کیا تھا، اس نے اس دنیا میں کیا تلاش کیا، کیا پایا، کیا لے کر باہر نکلا۔ ہم اچھی طرح مشاہدہ کرتے ہیں کہ زندگی کے تجربات نے اس کو کس طرح متاثر کیا، اور اس نے زندگی کی تشریح اپنی شخصیت کے ذریعہ سے کس طرح کی۔ ہم اس کے کیرکٹر، اس کے نظریوں، اس کی کمزوریوں اور خصوصیتوں، اور اس کے طرز کلام کے ساتھ اسی طرح شناسائی حاصل کرتے ہیں جیسے ہم اپنے کسی دوست سے۔ ہم مصنف کو اس رنگ میں پہچاننا چاہتے ہیں جس رنگ میں اس نے اپنی ہستی کو کتاب میں ظاہر کیا ہے، وہ کتاب ہمارے لیے اس کی تمام خصوصیتوں کا مکمل مظہر ہے۔

اس خیال کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم ایک اور نقطۂ نظر سے زندگی اور ادب کے بنیادی تعلق کو سمجھ سکتے ہیں۔ جارج ایلیٹ نے تمام فن کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ ادب پر پوری طرح صادق آتا ہے کہ "یہ زندگی سے قریب ترین شے ہے۔ اور اپنے تجربہ کو وسیع کرنے اور اپنے ابنائے جنس کے ساتھ جو ہماری ہستی سے باہر ہیں، تعلقات قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے" اس طرح ادب کے ذریعہ سے ہم ایک وسیع تر، خوب تر، اور زیادہ متنوع

زندگی کے حصہ دار ہو جاتے ہیں۔ ادب صرف اس طرح نہیں ہوتا کہ یہ ہمارے لیے تجربات کے نئے میدان کھول دیتا ہے، اور نئے تخیل دا احساس سے آشنا بنا تا ہے بلکہ اس طرح بھی کہ یہ ہم کو ہمارے گرد کی ذلیل اور محدود انسانیت سے اٹھا کر نفسیاتی شخصیتوں سے تعارف کراتا ہے اور داخلی زندگی سے آشنا۔

پڑھنا اور مطالعہ

ہم اوپر جو کچھ لکھ چکے ہیں وہ ہمارے نوجوانوں کو فرق ظاہر کر دینے کے لیے بہت کافی ہے جن کا مقصد کتابیں پڑھنے سے محض وقت کاٹنا ہے اور جو باوجود جنہیں کتب کے مطالعہ کنندہ ہونے کے اُن سے کچھ فائدہ اٹھانا تو در کنار نقصان اٹھاتے ہیں۔ اور اپنی دماغی قوتوں کو کام میں نہ لا کر بالکل تباہ کر دیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں ایک معمولی کتاب پڑھنے والے اور مطالعہ کنندہ میں صرف یہ فرق ہے کہ پہلا اپنے مطالعہ کتاب کا لطف اٹھاتا ہے اور دوسرا نہیں۔ مگر اصل فرق یہ ہے کہ پہلا جلدی جلدی ادھر اودھر کی کتابیں جو بھی اس کے ہاتھ لگ جائیں ختم کرنا ضروری سمجھتا ہے، اور دوسرا ایک سینہ لائحہ عمل کے مطابق مطالعہ کرتا ہے جس وقت ہم اپنے نظام کو بھی داخل کر دیتے ہیں اس وقت ہم صحیح طور پر مطالعہ کنندہ کہے جا سکتے ہیں۔

مطالعہ کتب و مطالعہ مصنفین

چونکہ ہمارا مقصد جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں مصنف کتاب کے ساتھ ذاتی تعلقات پیدا کرنا ہے بعض ہم ابتدا یوں کرتے ہیں کہ اس کی کسی ایک تصنیف کو جو ہمارے لیے خاص دلچسپی رکھ انتخاب کر کے، اس پر اپنی پوری توجہ صرف کرتے ہیں، مصنف کی فطرت کو اچھی طرح پہچاننا چاہتے ہیں لیکن اس میں ہم اس کی کتابوں کو علیحدہ علیحدہ مطالعہ کر کے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ہمیں اس طرح مطالعہ کرنا چاہیے کہ اُن کا رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ بخوبی نمایاں یعنی خود مصنف کے ساتھ کتاب کا رشتہ، اس کا ارتقاء، دماغی، تبدیلی خیالات و مزاج، اور سیر دنیا کے تجربات کا اثر ایک سلسلہ کے ساتھ علم میں آ جائے۔ مثلاً ہم شبلی کی تصانیف کو بغیر کسی ترتیب کے مطالعہ کرتے ہیں، اور المامون سے سیرۃ النبی پر، الکلام سے موازنہ انیس پر اُچکتے پھرتے ہیں۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ بے ربط مطالعہ سے بھی بہت کچھ فائدے پڑھنے والے کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگ سیرۃ النبی کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہو سکتی، بعض لوگ موازنہ ہی پر اکتفا کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔ مگر طالب علم کو اس بے ربط مطالعہ سے بچنا ہو گا۔ وہ جس مطمح نظر کے حصول کی خواہش رکھتا ہے، وہ اس بے ربط سلسلہ مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ گو ان تصانیف سے شبلی کی کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل ہو جاتی ہے، لیکن بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جن سے وہ بالکل واقف نہیں ہوتا۔

اس ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے ہم نصاب مطالعہ کا سوال اٹھاتے ہیں جس کا جواب زیادہ مشکل نہیں۔ ظاہر ہے کہ تمام طریقوں سے زیادہ فطری طریقہ یہی ہے کہ تصانیف کو سنہ تصنیف کی ترتیب سے مطالعہ کیا جائے۔ ایک فرانسیسی نقاد، فرانس کے زبردست ناول نگار بلزاک کو لکھتا ہے " بلزاک کو جاننے اور اس کی قدر و قیمت پہچاننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس کی تصانیف کا اسی ترتیب کے ساتھ مطالعہ کریں جس سے وہ تصنیف کی گئی۔

اس ترتیب کے ساتھ مطالعہ کرنے میں ہم مصنف کا موازنہ و مقابلہ خود اسی کے ساتھ بار بار کرتے رہیں گے۔ ہمارا دوسرا قدم اس کی شخصیت کو اپنے دماغ پر بخوبی نمایاں بنانے کے لیے یہ ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ اس کا موازنہ کرتے رہیں۔ یعنی اُن لوگوں کے ساتھ جنہوں نے اس کے

انھی میدان میں کام کیا ہے۔ انھیں مضامین کو بیان کیا ہے اور انھیں جذبات کے زیر اثر تصنیفات کی ہیں۔ جب ہم شبلی و حالی کا انیس و دبیر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک دوسرے پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم نے یہ اصول قائم کر لیا ہے کہ ہم کو سب سے پہلے مصنف کی روح اور اس کی شخصیت کو بخوبی پہچاننا چاہیے۔

سوانح عمری

مصنف کی ذاتی زندگی کے مطالعہ میں یقیناً ہم کو اس کی اچھی سوانح عمری سے بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ کسی شخص مصنف کی تصنیفات میں جب ہم ایک دفعہ دلچسپی لینے لگیں گے تو لازماً ہم میں یہ خواہش پیدا ہو جائے گی کہ ہمیں اسکی بحیثیت انسان کے کچھ جاننا چاہیے۔ ہم اس کو معاشرتی دنیا میں اپنی روزانہ زندگی بسر کرتے ہوئے اور اپنے احباب کے ساتھ مکالمہ کرتے ہوئے دیکھنے کے مشتاق ہوں گے اور اس کی ہر قسم زندگی کے واقعات اس کے ارادوں کی شکستوں، ناکامیابیوں، کامیابیوں ان طریقوں اور ان حالات کو جن کے ماتحت اسکی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ اس کے ذہنی عادات اور اس کے طرز عمل کے جاننے کے خواہشمند ہوں گے کہ اس قسم کی باتوں کی بابت اشتیاق فطری ہے اور ہمیں اس پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ہمیں اس معاملے میں سخت مایوسی ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اردو مصنفین کی سوانح عمریاں ہمارے یہاں کس قدر کم تعداد میں ہیں۔ معدودے چند تصانیف کو چھوڑ کر ہمارے پاس کسی مصنف اردو کے مکمل سوانح موجود نہیں اور جو ہیں ان میں بھی زیادہ تر مشہور ہیں۔ ان میں صرف سرسید، نذیر احمد اور غالب کے حالات ہم جان سکتے ہیں۔

اسکا برا استعمال

بہرحال چونکہ ہم اس وقت ایک عام اصول جو تمام زبانوں کے مطالعہ پر منطبق ہو سکتا ہے، بیان کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ کہنا لازم ہے کہ جب ہمیں کسی مصنف کی اچھی سوانح عمری ملے تو ہمیں اسی مصنف کی تصنیفات کے ساتھ ہی ساتھ الماری میں جگہ دینی ضروری ہے پھر ہمیں سوانح عمریوں کی بابت دو باتوں پر زور دینا ضروری ہے۔ اولاً یہ کہ صرف اچھی سوانح عمری ہمارے کام آسکتی ہے اور ثانیاً ان کا درست استعمال۔ آج کل بہت سی باتیں ایسی ہیں جو لکھی تو جاتی ہیں "لائف" کے عنوان سے لیکن ان میں مصنفین کی خانگی زندگی کے حالات کو اس تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے کہ ان سے عامۃ الناس کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی مجھ پر یہ اعتراض کرے کہ کیا تم کسی مصنف کے تمام حالات نہیں جاننا چاہتے؟ تو میں یہ کہوں گا کہ میں ان سب باتوں کو جاننا چاہتا ہوں لیکن میری یہ خواہش کسی مصنف کی امید پر مبنی نہیں بلکہ صرف اشتیاق کی بنا پر ہے اور ادبی مطالعہ میں میں بغیر کسی نقصان کے ان کو نظر انداز کر سکتا ہوں۔

علاوہ ازیں سوانح کے مصنف کو اس امر کا کوئی اختیار نہیں کہ وہ ہم کو یہ بتائے کہ ہم کو پہلے یہ کتاب، یا اس مصنف کا مطالعہ کرنا چاہیے اور بعد میں اس مصنف کا۔ بہت ممکن ہے کہ کوئی ایسا مصنف جس کے ساتھ سوانح نگار کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی، ہمارے لیے دلچسپ ثابت ہو یا جس مصنف کو وہ دلچسپ خیال کرتا ہے وہ ہمارے نزدیک قابل نفرین ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی چند حقائق باتیں بھی ہیں۔ ہمیں یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ بعض اوقات ہمیں ایسے مصنفین بھی دلچسپی کا سامان مہیا کر سکتے ہیں جو اخلاقی اور ذہنی طور پر ہم سے بالکل مختلف ہیں۔ ہمیں یہ بھی نہ فراموش کرنا چاہیے کہ اکثر ایسے ہی مصنفین جو ہم سے بالکل مختلف ہیں، ہمارے دماغ کو روشنی، نظر کو وسعت

اور قوتِ فیصلہ کو مضبوطی بخشتے ہیں۔ ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ جو مصنفین ابتداءً ہمارے لیے دلچسپ ہونے کے بجائے ناقابلِ مطالعہ معلوم ہوتے ہیں اُن کے ساتھ معاملہ کرنے میں ایک حد تک صبر کی ضرورت ہے۔ بہت ممکن ہے کہ سارا قصور ہمارا ہی ہو۔ بہرحال ہمیں یہ یقین کر لینا چاہیے کہ جبتک ہم ہمدردی کے ساتھ مصنف کے خیالات کو نہ سنیں گے ہم کبھی اس مصنف کے حقیقی کیرکٹر کو سمجھنے کے قابل نہ ہو سکیں گے ادب کے بہترین حصوں تک رسائی کے لیے زندگی کی طرح، ہمدردی پہلی شرط ہے صرف ہمدردی کے ذریعہ سے ہم کسی دوسری روح کے ساتھ پیوستہ ہو سکتے ہیں۔

اندازِ مخصوص تمہیدِ شخصیت کے طور پر

ادب کے شخصی پہلو کے ساتھ ہی طرزِ تحریر پر غور کرنا بھی ہمارے لیے اہم ہو جاتا ہے۔ اکثر ہوتا ہے کہ ہم کسی فقرے کو دیکھکر جو بغیر حوالہ کے نقل کیا گیا ہو یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ یقیناً فلاں شخص نے اس کو لکھا ہوگا۔ کیونکہ وہ فقرہ ایک انداز مخصوص رکھتا ہے ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی معروف آواز ہمارے کانوں میں پڑے۔ خیال خواہ کسیقدر عام ہو لیکن ہم کو یقین ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس فقرہ کو اس طرح نہیں لکھ سکتا۔ لفظوں کا انتخاب فقروں کی ترتیب، جملے کی بناوٹ، ان کا مخصوص طرزِ بیان، یہ سب چیزیں تعجب خیز طور پر مصنف کی شخصیت کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں۔

اندازِ مخصوص کی حقیقت

طرزِ تحریر (میں اس لفظ کو وسیع ترین معنوں میں استعمال کر رہا ہوں) لازمی طور پر ایک شخصی صفت ہے۔ پوپ نے یہ لکھنے میں سخت غلطی کی کہ "طرزِ تحریر خیالات کا لباس ہے" کیونکہ اُس نے یہ خیال کیا کہ طرزِ تحریر انسان سے کوئی الگ چیز ہے جس کو وہ جب چاہے پہنا سکتا ہے، جب چاہے اتار سکتا ہے۔ کارلائل نے اپنے مضامین میں بالکل درست لکھا ہے کہ طرزِ تحریر مصنف کا عبا نہیں بلکہ اس کی جلد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے بھی مصنفین ہیں جنھوں نے اپنے طرز کی بنیاد زیادہ بہتر لوگوں کے طرز پر قائم کی ہے، اور ادبی طالب علم کو اکثر وہ استاد جنھیں بہتر علم نہیں کسی بڑے مصنف کے طرزِ تحریر کو نمونہ بنانے کا مشورہ دیا کرتے ہیں۔ لیکن جس طرح خود اعتباری تمام حقیقی ادبیات کی بنیاد ہے۔ اسی طرح یہ تمام حقیقی طرزِ تحریر کی بھی بنیاد ہے جو شخص کوئی اوریجنل شے کہنا چاہتا ہے، وہ کبھی ایک اوریجنل طرزِ بیان معلوم کرنے میں ناکام نہ ہوگا۔ جو خیالات خود اس کے ہیں وہ دوسروں کے طرز میں شاذ ہی بخوبی ظاہر ہو سکیں۔ دوسروں کی نقل کرنا اس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ وہ زندگی کے بابت محض ثانوی باتیں کہہ رہا ہے۔ الغرض ایک غیر مبصر مطالعہ کنندہ کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ طرزِ تحریر ایک شخصی صفت ہے اور چونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جسکی بابت ہم جس قدر زیادہ خیال کریں، زیادہ نمایاں پائیں گے، اس لیے طالب علم کو فطرتاً یہ معلوم کرنا ہوگا یہ طرز کن باتوں سے مختص ہے اور یہ کہ مصنف کے کیرکٹر اس کے خیالات اور اندازِ خاص میں جس کو اُس نے اپنی مرضی کے موافق ڈھال لیا ہے، کیا رشتہ ہے۔ طرزِ تحریر کا مطالعہ اس طرح پر کرنے سے نہ صرف یہ معلوم ہوگا کہ مصنف کی زندہ پیداوار ہے بلکہ اس میں اس کے ذہنی، روحانی اور صناعانہ ارتقا کی بہترین یادداشت نظر پڑیگی۔ غور سے دیکھنے پر ہمیں اسکی تعلیم سے، ان اثرات جنھوں نے اس کی فطرت کی تشکیل میں حصہ لیا، اُن ماہرین سے جن سے تلمذ کا اُن کو فخر حاصل ہے اور جنھوں نے اس کو خود اپنی ہستی کے دریافت میں مدد دی، ان کتابوں سے جو اُس کی رفیق رہیں، دوسرے آدمیوں کے ساتھ اس کی مکالمات، اس کے خیالات کے ارتقاء و تشکیل سے، دنیا اور اس کے مسائل کی بابت اس کی رائے کے

وحشیانہ قسم کی تبدیلی ہے ان اصولوں سے جنہوں نے اس کے زندگی کے مختلف زمینوں پر اس کی رہنمائی کی پوری طرح واقفیت

ادب کا تاریخی مطالعہ

جب تک ہم یہ سمجھ نہ لیں کہ ادب کی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے ہم مطالعۂ ادب کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ ایک بڑا مصنف کوئی الگ حقیقت نہیں ہے بلکہ ماضی و مستقبل سے تعلقات رکھتا ہے۔ اس کی بنا پر وہ لازماً ہم کو اپنے معاصرین و متقدمین کی جانب اور اس طرح آخرکار ایک قومی ادب کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ تاریخ ادب کے مطالعہ میں ہم کو دو باتوں کی جانب توجہ کرنی ہوگی۔ اولاً دائمی زندگی یا اس کی قومی روح اور ثانیاً اس دائمی زندگی کے مختلف اظہار یعنی جن سے یہ مختلف زمانوں کی روح پر مشتمل ہوتی اور اس کا اظہار کرتی ہے۔

قومی ادب کیا شے ہے؟

اولاً جب ہم کسی قومی ادب کا نام لیتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے (مثلاً یا عربی ادب یا انگریزی و فرانسیسی ادب کی تاریخ) عام طور پر ہم اس سے صرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان زمانوں میں تصنیفات لکھیں اس کے ساتھ ہی ہیں ان کی خصوصیات و نقائص اور ادبی اسکولوں کی تاریخ و طریقوں کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت اس کے معنی اس سے بہت جدا ہیں۔ کوئی قومی ادب صرف ان کتابوں کا مجموعہ نہیں جو کسی جغرافی دائرہ یا اسی زبان میں لکھی گئی ہوں یہ اس قوم کے عہد بہ عہد ذہنی ارتقا کا بیان ہے جس کے تمام مصنفین میں ایک خاص روح یکسانی کی مثلاً جب ہم فارسی روح و عربی روح کا حال بیان کرتے ہیں تو ہمارا مقصود وہ بنیادی عنصر ہوتا ہے جو ایرانیوں میں بحیثیت ایرانیوں کے اور عربوں میں بحیثیت عربوں کے مشترک ہے۔ یہ مراد لیکر ہم زندگی کے بابت عربی و فارسی نقاط نظر کا حال بیان کرتے ہیں۔ اور ان کا ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ و موازنہ کرتے ہیں چونکہ فارسی ادب ایرانی قوم کے اخلاق و ذہنیت کا پورا مظہر ہے اور عربی ادب اخلاق و ذہنیت کا۔ اس لئے صرف ان کے ادب کے ذریعہ سے ہم حقیقی طور پر ان قوموں کو ان کے مضبوطیوں و کمزوریوں کو جان سکتے ہیں اور مکمل طور پر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ انہوں نے دنیا کے ذہنی و روحانی سرمایہ میں کتنا اضافہ کیا ہے۔

(باقی) احسن الظفر

فریب خیال

(بہ سلسلۂ ما سبق)

(۴)

مئی کا زمانہ ہے اور کشمیر کا موسم بہار جسے وہاں "عہد شگوفہ" کے حسین نام سے موسوم کرتے ہیں، اُبل پڑنے والے شباب ہے۔ سارا عالم نباتات گل فروشی نظر آ رہا ہے اور ہر ہر ذرہ تبسم بدوش۔ پہاڑوں کی برف پگھل پگھل کر دریائے جہلم اور ڈل جھیل کی امواج کی خنک عناصروں میں گرمی خرام پیدا کر رہی ہے اور ہوا کا ہر جھونکا گویا "موج خرام یار" ہے جو ہر جنبش پر گل کترکر گزر جاتا ہے۔

سیاحوں نے آ آ کر کشتیوں، باغوں، اور شہروں میں چہل پہل کر رکھی ہے اور سری نگر کے ہر ہر گوشہ سے آثار حیات و نشاط استغنا سروانی کے ساتھ رونما ہو رہے ہیں۔ گویا اس سرزمین کے بسنے والوں کو خبر ہی نہیں کہ فکر و تردد، رنج و الم کسے کہتے ہیں اور انسان صرف اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ رات دن سرور و انبساط کے عالم میں زندگی بسر کرے۔ یہاں جو چہرہ ہے تبسم ہے، جو قلب ہے مسرت سے دھڑک رہا ہے۔ اور جو نبض ہے خون صحیح لیے ہوئے تڑپ رہی ہے، شباب کی حکومت ہے، حسن کی مملکت ہے اور دولت کی بکھیر۔ رشید و نسیم بھی آئے اور اسی ہنگامہ رنگ و بو کا ایک جزو ہو کر رہ گئے۔

کشمیر کی سرزمین، بہار کا موسم، حسن کی صحبت، خلوت کی آزادی، جوانی کا جوش! اس سے زیادہ اور کیا تکمیل لطف کے لئے چاہیے کہ رشید کسی کمی کو محسوس کرتا، شراب کو رشید نے اسوقت تک استعمال نہ کیا تھا، لیکن چونکہ یہاں ہر گناہ کے لئے فتوائے صواب موجود ہے اس لیے نسیم کی خواہش و اصرار پر اس نے اس آگ کو بھی اپنی رگوں میں دوڑا دیا اور اس کے شب و روز اب یکسر مخمور و مدہوشی ہو گئے۔ اگر کبھی کبھی خمار کی حالت میں یہ خلش رشید کو بے چین بنا دیتی تھی کہ دولت کی طرف سے وہ مطمئن نہیں ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہے وہ بھی مکان ہاتھ سے دیکر فراہم کی گئی ہے، تو پھر نسیم کے نازک ہاتھ پر چھلکنے والے جام کے ذریعہ سے اس نامسعود خیال کو مغلوب کر لیتا اور ماضی و مستقبل دونوں طرف ایک پردہ ڈال کر صرف حال کو فردوس بنانے میں مصروف ہو جاتا تھا۔

ان کے آنے کے بعد پہلا اتوار تھا اور نسیم باغ جو عہد مغلیہ کے شباب کی شگفتہ ترین یادگار ہے حسن و شباب کی متحرک تصویروں سے فانوس خیال بنا ہوا تھا۔ نسیم و رشید بھی ایک طرف چنار کے بلند بالا درختوں کے نیچے سبزہ کی مخمل کاشانی پر آہستہ آہستہ ٹہل رہے تھے اور ہوا کے سرد و معطر جھونکے ان آسودگان شراب کو اور زیادہ تر دماغ بنا رہے تھے۔

گزشتہ ایک ہفتہ کے قیام کشمیر میں کوئی گفتگو اصل معاملہ کی نسبت نہیں آئی تھی اور ہر چند رشید بھی چاہتا تھا کہ جس طرح ممکن ہو جلد سے جلد یہ مسئلہ طے ہو جاتے لیکن چونکہ نسیم نے اس کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ اس کو بے انتہا لطیف الخیال شاعر سمجھتی ہے۔ اس لئے رشید ڈرتا تھا کہ مبادا اس باب میں عجلت کرنا یا خود اپنی طرف سے ابتدا کرنا لطافت و نزاکت کے خلاف ہو اور اس کی غیر معمولی شاعرانہ فطرت کی طرف سے نسیم بدظن ہو جائے۔

آج نسیم سے باغ میں بیٹھکر جو گفتگو ہوئی اس کی ابتدا ہر چند جہانگیر و نورجہان کی حیات عشق سے ہوئی تھی لیکن رفتہ رفتہ اس نے

ایسی صورت اختیار کی کہ خود ہی تسنیم کو اپنے نکاح کے متعلق اظہار خیال کرنا پڑا۔ اس نے دوبارہ کلکتہ کے واقعات اور صوبہ بہار کے اُس
ہیجان کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور ساتھ ہی ساتھ رشید کے ساتھ اپنی والہانہ محبت کا ذکر کرتے ہوئے اصولی گفتگو تعلقات زن و مرد اور
مسئلہ ازدواج کے متعلق چھیڑ دی۔ اس نے کہا کہ "نکاح پر دو پہلوؤں سے گفتگو ہو سکتی ہے، ایک مذہب، دوسرے محبت۔ ان میں اول
حیثیت تو قابل اعتنا نہیں معلوم ہوتی کہ اس میں کوئی ندرت پیدا نہیں ہوتا اور اس صورت میں نکاح کا خیال ایک بار نظر آتا ہے۔ مذہب صرف
درستی اخلاق کے لئے وضع کیا گیا تھا اور اب جبکہ دنیا اس قدر ترقی کر چکی ہے اور ہر ملک و قوم کا انسان اخلاق کی اہمیت کو سمجھنے لگا ہے، مذہب کی
ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے بحث صرف محبت کے نقطۂ نظر سے کرنی چاہیئے کہ اس کا اقتضا کیا ہے۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے،
اس نتیجہ پر پہونچی ہوں کہ محبت گو بجائے خود ایک مجبوری ہو لیکن ہے وہ نہایت نازک و آزاد، چونکہ محبت کی اصل روح غیر مادی غرض کے
کسی سے وابستہ ہو جانا ہے، اس لئے نکاح کی پابندی اس کو پژمردہ کر دیتی ہے اور وہ ایک دنیاوی کاروبار کی صورت اختیار کر لیتی ہے
جو یکسر نزاکت کے خلاف ہے۔ ایک مرد کا یہ سمجھ لینا کہ وہ کسی عورت کے ساتھ نباہنے پر مجبور ہے یا ایک عورت کا یہ یقین کر لینا کہ کسی مرد کے
ساتھ اس کا وفادار رہنا لازم ہے، بالکل آرٹ کے خلاف ہے اور محبت سے آرٹ کا جدا ہو جانا اس کی موت ہے۔ یہاں آرٹ سے مراد تصنع
و آورد نہیں ہے بلکہ وہ فطری اقتضا مقصود ہے جس سے ایک چیز عالم وجود میں آ کر نشوونما پاتی ہے اور تکمیل تک پہونچتی ہے۔ آپ تو شاعر
ہیں ادیب ہیں اور شاعر و ادیب بھی ایسے کہ زمانہ کم اُس جیسی دوسری مثال پیش کر سکتا ہے، اس لئے آپ یقیناً اس مسئلے کو مجھ سے زیادہ
بہتر سمجھتے ہوں گے۔" رشید کے لئے یہ بالکل پہلا موقع تھا کہ اس نے تسنیم سے ایسی گفتگو سنی، اس وقت تک اس کا ذہن جس خیال سے معمور تھا
وہ صرف "تسنیم اور نکاح" تھا، اس لئے اس وقت تسنیم کا یہ خیال معلوم کر کے اس کا نشہ ہرن ہو گیا اور چونک کر بولا کہ "آپ کے خیال کی
یہ تبدیلی کشمیر میں آنے کے بعد ہوئی ہے یا ہمیشہ سے آپ اس فلسفہ کی قائل تھیں؟"

تسنیم "میں ہمیشہ سے یہی سمجھتی ہوں اور یہ کوئی جدید تبدیلی نہیں ہے، لیکن آپ گھبرا کیوں گئے؟"

رشید۔ اس لئے کہ کہیں آپ مجھے اس نظریہ کا شہید نہ بنا دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس زندگی کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ بہترین
زندگی ہے لیکن چونکہ موجودہ معاشرت و تمدن میں اس کا حاصل ہونا دشوار ہے، اس لئے اس کے بعد جو چیز بہتر ہو سکتی ہے اس کو
ٹھکرانا دیدہ و دانستہ دانشمندی کے خلاف ہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ ذرا صاف الفاظ میں عرض کروں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے
والدین زیادہ عرصہ تک آپ کو آزاد نہیں رکھ سکتے اور اگر آپ یہاں نہ آ جاتیں تو شاید اس وقت آپ بہار کے کسی امیرانہ قصر میں جلوہ افروز
ہوتیں۔ پھر جب حالت یہ ہے اور اخلاق و تمدن کے سامنے آپ اس قدر مجبور ہیں تو آپ کو چاہیئے کہ انہیں مجبوریوں کے حدود میں
رہ کر اپنی زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کریں۔"

تسنیم "میرا مدعا اس وقت مخصوص طور پر اپنے مستقبل سے گفتگو کرنا نہ تھا۔ کیونکہ اس کے متعلق تو میں فیصلہ کر چکی ہوں جو آپ کو بھی معلوم ہے
بلکہ میں نے یونہی ایک عام گفتگو کی تھی اور اس مسئلہ کی نسبت آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتی تھی۔ لیکن چونکہ آپ کا فرض سے زیادہ خیر خواہانہ
احساس بدگمانیاں پیدا کرتا ہے اس لئے میں اب اس بحث کو اس جگہ ختم کئے دیتی ہوں۔ آپ تو آئندہ کا پروگرام بنائیے۔ سنا ہے کہ آپ کل ہی

کشمیر کی بہترین وادی ہے اس لیے وہاں کے لیے کم از کم پندرہ دن رکھیے گا۔

رشید: یہ وسب ہو جائے گا اور جہاں آپ فرمائیں گی وہاں پندرہ دن کیا معنے اپنی زندگی کے سارے دن صرف کر دوں گا، لیکن خدا کے لئے اب زیادہ امتحان و آزمائش میں مبتلا نہ کیجئے اور یہ بتائیے کہ بری حیات کی وہ کونسی ساعت ہوگی۔ جب میرے لئے جینا محال ہو جائے گا۔"

نسیم: رشید صاحب! آپ کا یہی طرز انشا رہے جس نے مجھے ہلاک کیا ہے۔ وہ کونسی ساعت ہوگی جب آپ کے لیے جینا محال ہو جائیگا خدا کے لیے ان صحبتوں اور ان پاکیزہ جذبات کا لطف چند دن تو اور اٹھا لینے دیجئے کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کا جینا محال کر دینے والا ساعت دیکھنے کے بعد جو زندگی ہماری آپ کی بسر ہوگی وہ صرف ممکنات کی حدود میں محصور ہوگی جہاں ایک انسان کی انتہائی پرواز خیال اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتی کہ دو اور دو کا مجموعہ چار ہوا کرتا ہے۔ تاہم میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ہماری آپ کی کشمیر سے واپسی رشید و نسیم کی حیثیت سے نہ ہوگی۔ آپ ملول نہ ہوں۔ سمجھ لیجئے کہ جو آپ چاہتے ہیں ہو چکا۔ رہا اعلان سو اس قدر ضروری اہم نہیں، روانگی کے دن یا اس سے ہفتہ دو ہفتہ قبل وہ بھی ہو جائیگا۔"

رشید اس جواب سے پھر مطمئن ہو گیا اور اسی جوش و ولولہ کے ساتھ اس نے پھر اپنے قصر امید کی تزئین و آرائش شروع کر دی۔

....

....

اگست شروع ہو گیا ہے اور کشمیر کے شگوفوں نے پھلوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ رشید اور نسیم تمام مضافات سرینگر کی سیاحت کر کے چنار باغ کے پاس اپنی کشتی میں آ کر پھر مقیم ہو گئے ہیں۔ واپسی کا زمانہ قریب آتا جا رہا ہے اور اسی نسبت سے رشید کے جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا جاتا ہے۔ ایک شام جب کہ رشید کچھ تحائف لئے ہوئے بازار سے واپس آ رہا تھا اس کا ملازم راستہ میں ملا۔ رشید نے سواری روک لی اور اس سے پوچھا کہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ تار دینے جا رہا ہوں۔ رشید نے پہلے تو تامل کیا کیونکہ وہ نسیم کی پرائیویٹ خط و کتابت کی جستجو نہیں کرتا تھا۔ لیکن بعد کو اس نے ایک خاص جذبہ سے متاثر ہو کر تار کا مسودہ دیکھا تو اس میں صرف یہ لکھا تھا کہ Time in come (وقت آ گیا ہے) اور ایک شخص امام الدین کے نام چیمبرلین روڈ کے پتہ سے بھیجا جا رہا تھا۔ پہلے تو اُسے کچھ شک ہوا کیونکہ نسیم کے گھر کا پتہ یہ نہ تھا لیکن تار کے مضمون نے اس کے تمام شکوک کو دور کر دیا کیونکہ "وقت آ گیا" سے مراد (اس کی سمجھ کے مطابق) وقت نکاح تھا اور شاید نسیم اپنے کسی عزیز کو طلب کر رہی تھی تاکہ شادی زیادہ موثق ہو جائے۔

رشید نے آدمی کو وہ تار واپس دیکر حکم دیا کہ ڈاک خانہ سے جلد واپس آئے اور اس کو ہدایت کر دی کہ نسیم سے اس کا ذکر نہ کرنا کہ میں نے یہ مسودہ دیکھ لیا ہے۔ جس وقت رشید کشتی میں پہونچا تو نسیم بہت مسرور تھی لیکن رشید اس سے زیادہ خوش تھا اس نے مختلف تحائف اس کے سامنے پیش کئے لیکن سب سے زیادہ جو چیز ان میں پسند کی گئی وہ ایک کشمیری شال تھا

جسے رشید نے پانچسو روپیہ میں خرید کیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد نسیم نے دریافت کیا کہ آج کیا دن ہے اور اس کا جواب ملنے کے بعد اس نے کہا کہ آیندہ جمعہ کو نکاح کا انتظام کیجئے اور اس کے دوسرے دن روانگی کا۔ اس خبر سے رشید پر جو کیفیت طاری ہوئی اس کا اندازہ مشکل ہے۔ کیونکہ اس سے زیادہ یقینی صورت تکمیل آرزو کی اور کیا ہو سکتی تھی لیکن وہ اس سے بے خبر تھا کہ ہاتھ سے لبوں تک جا کے پہونچنے میں بھی بہت سی صورتیں ناکامیوں کی پیدا ہو سکتی ہیں اور آخر یہی ہوا۔ کیونکہ عین شادی کے دن صبح کو کلکتہ سے نسیم کا تار آیا جس میں اس کے باپ کی خطرناک بیماری کی اطلاع درج تھی اور اولین فرصت میں اس کو طلب کیا تھا۔

جس وقت یہ تار آیا رشید موجود نہ تھا بلکہ تحایف عروسی لینے کے لیے بازار گیا ہوا تھا' واپس آیا تو دیکھا کہ نسیم صدمہ سے افسردہ و مضمحل بیٹھی ہوئی ہے اور اس کا سارا سامان بندھا ہوا رکھا ہے۔ دوسرے ہی لمحہ میں رشید کو بھی حقیقت کا علم ہو گیا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے رشید کیلیے بالکل پہلا صدمہ تھا۔ وہ اس صورت میں نسیم سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا اور سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ خود بھی اپنا سامان سفر درست کرے۔ لیکن چونکہ اس کے لیے یہ صدمہ حد درجہ غیر متحمل و شدید تھا اس لیے راولپنڈی پہونچتے پہونچتے اس کو بھی تپ آگئی اور لکھنؤ پہونچنے کے بعد وہ بالکل صاحب فراش ہو گیا۔

۵

ادھر ڈاکٹروں نے یہ تجویز کر کے کہ رشید تپ میعادی میں مبتلا ہے' دوسری طرف امریکہ کے ایجنٹوں نے یہ خبر دیکر کہ مدت نامعلوم تک خریداری چمڑے کی بند کر دیجائے۔ اس کی جسمانی و دماغی صحت دونوں کو بالکل بیکار کر دیا۔ اس نے مکان رہن رکھنے کے بعد جو دس ہزار روپیہ حاصل کیے تھے ان میں سے ۲۰۰۰ ہنڈی کے ادا کیے' پانچہزار مال کی خریداری کے لئے اپنے آدمیوں کو دیے اور تین ہزار کشمیر میں صرف ہوئے' خیال تھا کہ اس کی واپسی تک یہ ۵۰۰۰ کم از کم سات ہزار ضرور ہو جائیں گے لیکن وہاں امریکہ کے مال روک لینے نے اس رقم کو نصف سے بھی کم کر دیا اور جن لوگوں سے روپیہ وصول ہونا تھا انھوں نے اور زیادہ تساہل سے کام لینا شروع کیا کیونکہ کاروبار کے بند ہو جانے کی وجہ سے وہ رشید کی طرف سے کچھ بے غرض سے ہو گئے تھے اور بازار خراب ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنا بھی پھیلا ہوا روپیہ فراہم نہ کر سکتے تھے۔

تیسرے ہفتہ رشید کے جب ہوش و حواس کچھ برجا ہوئے تو اس نے ایک تار نسیم کو دیا کہ اپنے والد کی خیریت سے اطلاع دے کیونکہ کشمیر سے روانہ ہونے کے بعد کوئی خبر اس کو نہ معلوم ہوئی تھی لیکن اس کے دوسرے ہی دن ایک مفصل خط اس کا آیا جس میں بہت کچھ اپنی بدقسمتی' حسرت و ناکامی کا ذکر کیا تھا اور پریشانیوں کی وجہ سے خط نہ لکھنے پر معذرت چاہی گئی تھی' اس کے ساتھ یہ بھی تحریر تھا کہ والد کا مزاج اب رو باصلاح ہے اور میں بہت جلد خود لکھنؤ آ کر اپنے عہد کو پورا کر دوں گی' میں آپ کو یہاں طلب کرنا بعض اسباب کی بنا پر مناسب نہیں سمجھتی' ورنہ میرے لئے اسی میں زیادہ آسانی تھی۔

جس وقت یہ تحریر آئی عباس بھی موجود تھا۔ رشید نے یہ تحریر اس کو دیدی اور خود کروٹ لیکر رونے لگا۔ عباس نے اس

پڑھا اور اس کے سرہانے رکھ کر باہر جانے لگا‘ رشید نے اس کو روکا‘ لیکن اُس نے جواب دیا کہ ” اب میں ٹھہر کے کیا کروں جب کہ آپ پر نزول وحی پھر شروع ہو گیا ہے اور آپ اس کے خلاف کسی انسانی آواز کو سننا پسند نہیں کر سکتے “

رشید۔ ” عباس خدا کے لیے بتاؤ میں کیا کروں‘ اب تو جس طرف نظر جاتی ہے سوائے تباہی و بربادی کے کچھ نظر ہی نہیں آتا‘ کاروبار کا یہ حال‘ عسرت کی وہ شدت کہ آج تک کبھی نہ ہوئی تھی‘ بیماری کا سلسلہ ایسا طویل کہ اس کی بھی کوئی میعاد مقرر نہیں ہو سکتی‘ ایک تنہا سہارا زندگی کا‘ اگر کوئی ہے تو صرف یہ امید کہ شاید تسنیم کو رحم آ جائے اور وہ حیات اپنی معیت سے قابل برداشت بنا دے “

عباس ” آپ مطمئن رہیے اُسے کبھی آپ پر رحم نہیں آئے گا اور جہاں تک اس کے امکان میں ہے وہ آپ کی زندگی کو ہمیشہ اسی طرح ناقابل برداشت بنائے رکھے گی‘ کیونکہ آپ سے عقلمند لوگ تو اتفاقیہ کبھی مل جاتے ہیں۔ اگر وہ اپنا وعدہ پورا کر دے‘ تو اس سے زیادہ احمق کوئی نہیں ہو سکتا‘ کیونکہ اس کا مدعا حاصل ہو چکا ہے اور وہ جان چکی ہے کہ اب آپ کے بدن میں زیادہ خون باقی نہیں رہا ہے کہ وہ چوسنے کے لیے پھر آ جائے۔ اس کی یہ تحریر بالکل آخری تحریر ہے اور اس کے بعد انشاء اللہ آپ کو کبھی نہ معلوم ہو سکے گا کہ واقعی اس نام کی کوئی عورت دنیا میں تھی بھی یا نہیں۔ آپ نہیں مانتے لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ کشمیر سے اس کا کلکتہ تار دینا صرف اس بات کی ہدایت تھی کہ دہلی سے باپ کی بیماری کا تار دیدیا جائے جس کی پہلے قرارداد ہو چکی ہو گی اور ایک لمحہ کے لیے بھی وہ آپ سے شادی کرنے کے لئے آمادہ نہ تھی یہ سب اس کا فریب تھا جس سے کام لیکر اُس نے ایک معقول رقم آپ سے وصول کر لی۔

آج کل کی متمدن عورتوں میں اس قسم کا مکر و فریب نہایت معمولی بات ہے اور یہی ہے جدید تعلیم کا وہ تاریک پہلو جس نے یورپ کے نظام تمدن کو بھی درہم برہم کر رکھا ہے اور جو مختلف صورتوں سے دنیائے اخلاق میں اپنے سم آلود جراثیم پھیلا رہا ہے۔ مغرب میں تو ایسی عورتیں جو اس طرح اپنی ذہانت پر زندگی بسر کرتی ہیں کثرت سے نظر آتی ہیں‘ لیکن مشرق اور علی الخصوص ہندوستان میں یہ فن ایک خاص طبقہ میں محدود ہے۔ مجھے آپ کے ان تمام سلسلہ تجربات میں اگر حیرت ہے تو صرف اس امر پر کہ تسنیم میں یہ قابلیت کیونکر پیدا ہو گئی اور یہ حقیقتاً کس طبقہ سے متعلق ہے۔ افسوس ہے کہ آپ نے بہت جلد اپنے آپ کو اس جنگ میں مغلوب حریف ثابت کر دیا ورنہ اس میں شک نہیں کہ یہ مشغلہ تھا نہایت دلچسپ اگر آپ بھی کم از کم اتنے ہی ذہین ہوتے۔

اب تو آپ مہربانی فرما کر ماضی کی حماقتوں پر تاسف چھوڑیے اور مستقبل کی امیدوں کو خاک بسر سمجھیے‘ صرف حال کی طرف توجہ کیجیے اور اپنی مالی حالت کو درست کیجئے “

رشید۔ ” یہ آپ نے جو کچھ کہا اس سے پہلے بھی سن چکا ہوں کوئی نئی بات نہیں‘ لیکن میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ کوئی ایسی تعلیم یافتہ‘ اس قدر مہذب‘ اس درجہ صحیح الاخلاق کیونکر ایسی ذلیل ہو سکتی ہے۔ آپ نے جن حالات کو دیکھ کر یہ حکم لگایا ہے‘ وہ دوسرے اسباب کی بنا پر بھی رونما ہو سکتے ہیں‘ اس لیے میں تو اس قدر جلد نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا‘ آج کی تحریر بہت صاف ہے اگر اب اس کو یہ سلسلہ منظور نہ ہوتا۔ تو اس کو ایسا لکھنے کی ضرورت نہ تھی‘ خاموش رہتی “

عباس۔ صرف اس لیے کہ آپ ہنوز فریب میں مبتلا رہیں اور اس کے اخلاق کی طرف سے کوئی برا خیال اس وقت تک قائم نہ کر سکیں

اتفاق سے کبھی مستقبل میں ہماری شہادت دل جائے۔"

رشید: "اس ذکر کو چھوڑیے، میری قسمت ملازمت ہے اور کچھ نہیں۔ کاروبار کے متعلق بھی مجھے اب کوئی امید نہیں، خدا کرے یہ بیماری ہی پیام موت ثابت ہو اور میرے مصائب کی انتہا اس کے ساتھ ختم ہو جائے۔"

....

....

پورے اکتالیس دن کے بعد تپ نے مفارقت کی اور اس کے احباب کو فی الجملہ اطمینان ہوا لیکن ضعف کا یہ عالم تھا کہ جنبش دشوار تھی۔ تاہم چونکہ مرض کا ازالہ ہو چکا تھا اس لیے رفتہ رفتہ اس میں توانائی پیدا ہونی شروع ہوئی اور اس کی صحت اعتدال پر آنے لگی۔

رشید نے اپنی والدہ وغیرہ کو اطلاع نہیں دی تھی کیونکہ اول تو اسے گھر سے کوئی خاص تعلق نہ تھا اور دوسرے وہ ڈرتا تھا کہ کہیں بیوی بھی نہ آ جائے اور دوسرا سوہان روح پیدا ہو جائے، لیکن اب جبکہ لکھنؤ میں قیام کرنا بالکل بیکار تھا اور مصارف بڑھتے ہوئے تھے۔ اس کے احباب نے اصرار کیا کہ اگر آگرہ جا کر رہنا مناسب نہیں خیال کرتے تو موجودہ مکان کو بدل کر کوئی مختصر سا مکان تلاش کرنا چاہیے اور غیر ضروری سامان و ملازمین کو علیحدہ کر دینا چاہیے۔ رشید کی غیور طبیعت اس کو گوارا نہ کرتی تھی کہ جہاں اس نے اتنا زمانہ ایک خاص شان سے بسر کیا ہے وہاں وہ ذلت کے ساتھ زندگی گزارے اس لیے اس نے غیر ضروری ملازموں کو تو علیحدہ کر دیا لیکن مکان نہیں چھوڑا اور صرف اس امید پر کہ شاید پھر کاروبار چل جائے کسی نہ کسی طرح یہیں دن گزارنا مناسب خیال کیا۔

....

موسم سرما آیا اور گزر گیا، گرمی شروع ہوئی اور ختم ہو گئی، لیکن نہ نسیم ہی کی پھر کوئی خبر آئی اور نہ رشید ہی کو ہمت ہوئی کہ اس سے خط و کتابت کرتا۔ وہ بالکل مایوس ہو چکا ہے اور افکار و آلام نے اس کے ذہنی و جسمانی صحت کے توازن کو بالکل غارت کر دیا ہے، اس کی زندگی بالکل سکوت و انزوا میں بسر ہوتی ہے اور وہ عزم کر چکا ہے کہ کسی جگہ دور جا کر بقیہ ایام حیات گمنامی کی حالت میں گزار دے لیکن عباس وغیرہ اس کے احباب ہمت دلاتے رہتے ہیں۔

ایک دن یہی گفتگو ہو رہی تھی اور رشید اس پر اصرار کر رہا تھا کہ اس کو چلا جانا چاہیے۔ آخر کار عباس نے کہا کہ چند دن تبدیل آب و ہوا کے لیے باہر چلے جانے میں تو کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا لیکن راہبانہ زندگی اختیار کرنا سخت نامردی ہے۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ڈاک سے اس کے ایک عزیز دوست سیٹھ محمد یوسف کی تحریر بمبئی سے آئی جس میں نہایت شدید اصرار کیا گیا تھا کہ جس طرح ممکن ہو رشید سے جلد بمبئی پہونچ جائے۔

رشید یہ تحریر دیکھ کر اس لحاظ سے مزید متعجب ہوا کہ عرصہ [illegible] سے اس کے اور سیٹھ محمد یوسف کے درمیان کوئی خط و کتابت نہ تھی لیکن ایک زمانہ میں یہ دونوں اسکول میں ساتھ ہی پڑھے تھے اور دونوں میں توافق مزاج کی وجہ سے بہت محبت تھی، علاوہ اس کے کاروبار کے سلسلہ میں بھی دونوں کو اس کے بعد بارہا ملنے کا اتفاق ہوا تھا، اس لیے اس نے سمجھا کہ شاید کوئی ضرورت ہوگی اور وہ اس خیال سے

کچھ مسرور بھی تھا کیونکہ اول تو لکھنؤ چھوڑنے کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا اور دوسرے یہ کہ ممکن ہے سیٹھ محمد یوسف کا وہاں کے متعلق کوئی خاص منصوبہ ہو ...

(۶)

محمد یوسف اصل میں علاقۂ ہریانہ کا رہنے والا تھا اور ابتداً اس کے آبا و اجداد آگرہ ہی میں کاروبار کرتے تھے، لیکن اُس نے ہوش سنبھالا تو بمبئی چلا گیا اور وہاں رفتہ رفتہ اس نے اس قدر ترقی کی کہ اس کا شمار وہاں کے کروڑپتی لوگوں میں ہونے لگا اور بازار میں اس کا نام نہایت عزت و احترام سے لیا جانے لگا۔ یہ بھی رشید کا ہم عمر تھا اور ذوق کے لحاظ سے بالکل اس کا چربہ۔ بدقسمتی سے جو مصیبت رشید پر نازل ہوئی تھی، اسی کا شکار یوسف بھی ہوا تھا اور اس کی شادی بھی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ دونوں باہم اس مسئلہ پر گفتگو کیا کرتے تھے اور رشید کی طرح وہ بھی موقع کا منتظر تھا کہ کوئی عورت اس کے مغربیت پسند دماغ کو مطمئن کرنے والی مل جائے لیکن اس کو بھی ابتک کامیابی نہ ہوئی تھی۔

جس وقت رشید صبح ۹ بجے تاہم اسٹیشن پر اُترا تو محمد یوسف نے جو اس کی پذیرائی کے لیے موجود تھا، نہایت شوق سے اسکو گلے لگایا اور موٹر پر بٹھا کر اپنی کوٹھی پر لے گیا جو سمندر کے کنارے نہایت دلفریب جگہ واقع تھی، رشید اس سے قبل کئی دفعہ یہاں آچکا تھا اس لئے کوٹھی، اس کا حُسن اور اس کی جائے وقوع اس کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی، لیکن یوسف کے چہرہ کا غیر معمولی انبساط، بات بات پر اس کا ہنس پڑنا، ہر ہر حرکت اس کے غیر معمولی جوش کا ظاہر ہونا ضرور نئی بات تھی، جس کے سمجھنے کی رشید نے بہت کوشش کی اور کئی مرتبہ سوال بھی کیا کہ تم نے مجھے کیوں بلایا ہے، لیکن نہ رشید سمجھ سکا اور نہ یوسف نے سوائے ہنس پڑنے کے کوئی جواب دیا۔ جب کوٹھی پر پہونچ کر وہ اطمینان سے بیٹھا اور اصرار کیا تو یوسف نے جواب دیا کہ :-

رشید، غالباً تمھیں وہ زمانہ یاد ہوگا جب ہم تم دونوں اسکول میں ساتھ پڑھتے تھے اور حیرت کرتے تھے کہ کیوں دونوں کو ہمیشہ ایک ہی چیز پسند آتی ہے، اس کے بعد ازدواجی زندگی کے لحاظ سے ہم تم دونوں جیسے بدنصیب نکلے وہ بھی تم سے پوشیدہ نہیں، لیکن اس مسئلہ میں بھی ہم تم دونوں جدا نہ ہوسکے۔

بعد کو تمھیں بھی تلاش رہی کہ کوئی خاتون ایسی ملجائے جو زندگی کو خوشگوار بنا دے، اور مجھے بھی معلوم نہیں کہ تم اس میں کامیاب ہوئے یا نہیں لیکن الحمدللہ میں کامیاب ہوگیا ہوں اور اس کامیابی میں شریک کرنے کے لیے تمھیں یاد کیا ہے۔ تمام گفتگو ہوگئی ہے لیکن میں اس وقت تک یہاں سے جانے نہ دوں گا جب تک اس کی تکمیل نہ ہو جائے کیونکہ میں نے ہمیشہ اس کو محسوس کیا ہے کہ بغیر تمھارے میری کوئی ایسی مسرت مکمل نہیں ہوسکتی جس کا تعلق روحانی مسرت سے ہے۔

وہ خاتون آجکل یہیں ہیں اور میں نے قلابہ پر اُن کے قیام کا انتظام کردیا ہے مجھے یقین ہے کہ تم اُن سے مل کر بہت خوش ہوگے۔ ہیں تو وہ عیسائی لیکن اس درجہ خوش ذوق اور اس درجہ ذہین و قابل کہ مشکل سے کوئی نظیر ویسی مل سکتی ہے۔ اردو پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ سخت تعجب ہوتا ہے۔ رہی صورت سو تم خود دیکھ کر فیصلہ کر لوگے کہ کس قدر دلفریب و دلکش ہے۔ اچھا تو اب تیار ہو جاؤ وہاں چلنے کا وقت آگیا ہے۔

رشید نے یوسف کا یہ قصہ سننے کو تو سن لیا لیکن اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی کیونکہ اس ذکر نے اس کو نسیم کی یاد پھر دلادی اور اس کی تمام ناکامیاں ایک ایک کرکے اس کے سامنے آگئیں تاہم اس نے ظاہرداری سے کام لیکر اظہار مسرت کیا۔ اور کپڑے پہنکر یوسف کے ساتھ ہولیا۔

....

....

ساحل مالابار کی ایک عالیشان کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں رشید اور یوسف بیٹھے ہوئے مس لوسی (یوسف کی معمان خاتون) کا انتظار کر رہے ہیں اور انتظار کی تکلیف کو مختلف قسم کی گفتگو سے دور کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں کہ دفعۃً ایک طرف کا پردہ جنبش میں آیا اور یوسف و رشید دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن قبل اس کے کہ مس لوسی پردہ ہٹا کر آگے بڑھیں، رشید کے منھ سے نسیم کا لفظ نکلا اور تیورا کر وہیں فرش پر گر پڑا۔

(۷)

رشید ایک ماہ سے آگرہ میں بیمار پڑا ہوا ہے اور اختلاج کے مسلسل دوروں نے اس کی حالت کو بہت تشویشناک بنا دیا ہے غذا ترک ہے، بعض دن چھ چھ گھنٹے تک بیہوش پڑا رہتا ہے اور غلط ضعف سے کروٹ لینی دشوار ہے، لیکن باایں ہمہ وہ مطمئن ہے اور جس وقت آنکھ کھول کر وہ اپنی اس حامل بیوی کو مصروف خدمت گزاری دیکھتا ہے تو ایک خاص قسم کی روحانی مسرت کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ شاید اب اس مرض سے جانبر نہ ہو سکے گا، لیکن اُسے مطلق کوئی اضطراب نہیں ہے، کیونکہ وہ اس امر کو اچھی طرح محسوس کر رہا ہے کہ وفا کا وجود دنیا سے ابتک محو نہیں ہوا ہے اور اگر اتنی تکالیف برداشت کرنے کے بعد بھی کوئی شخص اس کی لذت سے آشنا ہو سکے تو سودا بُرا نہیں ہے۔

جسوقت اسکے چہرہ پر مایوسی کے آثار نظر آتے ہیں تو اس کی وہی بیوی جس کو اس نے عمر بھر کبھی نہ پوچھا تھا۔ آنچل منھ پر رکھکر بے اختیار رونے لگتی ہے اور اسکے آنسو سے ایک ایسا گہرا نقش خلوص اس کے قلب پر چھوڑ جاتی ہے کہ رشید پھر ایک مرتبہ جینے کی آرزو کرنے لگتا ہے۔

نیاز فتحپوری

اعلیٰ تعلیم اور مسئلہ بیکاری

لارڈ مکالے آنجہانی نے معلوم نہیں کون سی نیک ساعت میں تعلیم انگریزی کے متعلق اپنی مشہور و معروف یادداشت لکھی تھی کہ اس کی تخم پاشی ہوتے ہی پودے نے زمین سے سر نکالا اور دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگا۔ یہانتک کہ غدر سے ایک سال قبل یعنی ۱۸۵۶ء میں اسمیں پھول پھل بھی لگنے شروع ہوئے اور کلکتہ یونیورسٹی کی بنیاد پڑ گئی اس کے بعد ہی فوراً بمبئی مدراس میں بھی اسکی تقلید ہوئی اور کچھ دنوں بعد الہ آباد و لاہور میں بھی مسلمانوں نے اول اول اس کی طرف اعتنا نہیں کیا لیکن سرسید نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ محمڈن کالج کی بنیاد رکھکر اس کفر کو بھی خدا خدا کر کے توڑا۔ بی۔ اے کے دو حرف خدا جانے کیا کشش رکھتے تھے کہ جسکو دیکھو اسی کے لیے تگ و دو میں مصروف تھا اور واقعی اس زمانے میں گریجویٹ ہونا بڑی عزت تھی۔ ۱۸۹۰ء میں لکھنؤ کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا وہ سماں بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا جب یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ علی گڑھ میں ایک صنعتی و حرفتی اسکول کھولا جائے اور اسپر چاروں طرف سے یہ آواز بلند ہوئی تھی کہ ہمکو لوہار و بڑھئی درکار نہیں ہیں ہمیں تو گریجویٹ چاہیے۔ ریزولیوشن بانی علی گڑھ کے اس قول کی تائید میں خارج ہوا کہ ہمیں اسقدر بی اے چاہئیں کہ زمین سے اگر ایک مٹی کا ڈھیلا بھی اٹھایا جائے تو وہ بھی گریجویٹ ہو۔

گورنمنٹ کا مقصد

اول اول تو گورنمنٹ کا صرف یہ مقصد تھا کہ انگریزی داں ملازموں کی معقول تعداد دفتری اور انتظامی امور کے لیے ملجائے اور سلطنت کے کاروبار میں حکومت کو آسانیاں ہوں اور جب یہ ضرورت چند ہی سال میں پوری ہو تو تعلیم کو مغربی تمدن و تہذیب کی اشاعت کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ دراصل سب سے بڑی اصولی غلطی جو حکومت نے کی وہ ڈگریوں کے ساتھ عہدوں کی قید جس نے تو ایک طرف تعلیم کا مقصد صرف نوکری قرار دیدیا اور دوسری طرف نوکری محدود ہونے کی وجہ سے آخر کار بیکاری بڑھ گئی۔

یونیورسٹی بل

جب لارڈ کرزن ہندوستان آیا اور ہند میں سیاسی بے چینی پیدا ہوئی تو اس نے محسوس کیا کہ اس شورش کا بانی تعلیم یافتہ ہے اور اس لیے اس نے ایک مسودہ قانون پیش کر کے اعلیٰ تعلیم کو اگر بند نہیں تو ایک حد تک کم ضرور کرنا چاہا مگر یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اور تعلیم یونا فیوناً ترقی کرتی رہی یہانتک کہ اس ۱۹۳۵ء تک کم و بیش پندرہ یونیورسٹیاں بن چکی ہیں اور ان میں اور اضافہ ہونے والا ہے۔

طرزِ معاشرت

چونکہ تعلیمی ترقی کے ساتھ تمدنی حالات بھی بدلجاتے ہیں اس لیے تعلیم یافتہ گروہ کے مصارف زندگی بھی بڑھ جاتے ہیں اور بیٹے کے اخراجات باپ سے تقریباً دو چند ہو گئے ہیں۔ مشرقی سادہ زندگی ملک سے کافور ہو چکی ہے۔ ہر شے میں یورپ کی تقلید ہے جس میں ضروری غیر ضروری کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اور اس نکتہ کو بالکل بھلا دیا گیا ہے کہ جنکی تقلید پر روپیہ صرف کیا جاتا ہے انھیں کی طرح روپیہ کمانا بھی چاہیے۔

اس نامرادی کا ایک بڑا سبب پیشہ کا غلط انتخاب بھی ہے دوران تعلیم میں اکثر تو اپنا منتہائے نظر صرف ڈگری لینا قرار دیتے ہیں جو بھولکر بھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کا مستقبل کیا ہے۔ اور جو سوچتے بھی ہیں اس میں اکثر تقلیدی غلطی ہوتی ہے اور انتخاب بالکل نامناسب

اس کے ساتھ دوسری خرابی یہ بھی ہے کہ ملک کے رسم و رواج کی بنا پر اکثر لوگ ختم تعلیم کے قبل یا بعد ہی متاہل ہو جاتے ہین اور قبل از وقت فکر مین مبتلا ہو کر مجبور ہو جاتے ہین کہ جلد سے جلد کسب معاش کے ذرائع پیدا کرین اور اس عجلت و اضطراب مین کوئی صحیح فیصلہ نہین کر سکتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس کو وکیل ہونا چاہیے وہ ڈاکٹر بنجاتا ہے جس کو ڈاکٹر ہونا چاہیے وہ انجینیر ہوجاتا ہے اور پھر یکے سب ناکامیاب ثابت ہوتے ہین یہان یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یورپ جو اسقدر اعلیٰ تعلیم مین ترقی کر گیا ہے وہان بھی ایسی ہی مشکلات درپیش ہین۔ یا نہین لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہان یہ بات نہین ہے مثال کے طور پر ملک جرمنی کو لیجئے جہان یونیورسٹیون کی سب سے بڑی تعداد ہے لیکن وہان بھی اس قسم کی کوئی شکایت نہین معلوم ہوتی اس کا سبب یہ ہے کہ یورپ کی تعلیم یافتہ جماعت ملازمت کی خواہشمند نہین ہے بلکہ آزاد پیشہ کو اختیار کرتی ہے۔ چنانچہ وہان ہر پیشہ مین اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ پائے جاتے ہین جو اپنی قابلیت کی بدولت اس کو ترقی دیتے رہے ہین۔

کلکتہ یونیورسٹی

حالات بالا پر نظر کرتے ہوئے اسوقت رہنمایان ملک کے روبرو جو مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے وہ تعلیم یافتہ لوگون کے لیے روزگار کا مہیا کرنا ہے اسی بنا پر جامعۂ کلکتہ جسنے گرگو یجویٹون کی سب سے بڑی تعداد ملک مین پیدا کر دی ہے فی الحال اس باب مین کچھ کوشش کرنے پر تیار ہے۔ بنگال کے چند محب وطن حضرات نے ایک کمیٹی بنائی ہے جسکے سرپرست اعلیٰ اس جامعہ کے سابق وائس چانسلر تھے۔ اسکا مقصد یہ ہے کہ یونیورسٹی کے گرد کچھ اراضی خرید کر اسمین سابق طلبہ کے لیے زراعت و صنعت کی آسانیان پیدا کی جائین۔ طریق کار یہ ہوگا کہ ہر نوجوان شخص کو کچھ زمین کاشت کیلئے دیجائیگی۔ وہ اس مین وہ چند لڑکون کی مدد سے جنکو وہ تعلیم دے گا اپنا کاروبار چلائیگا (۲) صورت مین طلبہ بھی کچھ نہ کچھ پیدا کرتے رہین گے۔ اس مین ان نوجوانون کو ترجیح ہوگی جنکے سرپرست کوئی رقم بھی بطور زر ضمانت دینے پر تیار ہون گے۔ رفتہ رفتہ اس نوآبادی کو ترقی دیکر متعدد گروہ آباد کرتے جائین گے اور ایک بڑے پیمانہ پر کام ہوسکے گا۔ چھوٹے چھوٹے پیمانے پر کچھ صنعتین بھی کھولی جائینگی اور ہر ایک مدرسے مین صناعون کو راغب کرکے کارخانے قائم کرائے جائینگے اور جو کچھ اسطرح پر طلبہ کو سکھانے پر خرچ ہوگا اس کا ایک حصہ مدارس برداشت کرین گے اس سارے کام مین انجمن ہائے اتحادی سے کام لیا جائیگا اور دراصل یہی اسکی صحیح رواں ہوگی کیونکہ کسی صنعت کو بغیر اصل کے خواہ وہ کتنی ہی مختصر ہو ہرگز نہین چلایا جاسکتا۔ ان نوآبادیون کو چندے کے ذریعہ ہرگز نہین چلایا جاسکتا بلکہ بالکل کاروباری اصولون پر یہ کام کرینگی۔ رفتہ رفتہ مدارس کے ساتھ اس قسم کی جرمنی تعلیم کو ترقی دیجائیگی کہ آیندہ چلکر کوئی شخص بھی ایسا نہ نکلے جو تعلیم کے ساتھ کچھ کمانے کی بھی صلاحیت نہ رکھتا ہو نواحی باغات اور خانہ باغ مین بھی تعلیم یافتہ گروہ ایک مدت تک کام کرے گا۔

امریکہ مین جرمنی تعلیم

مسٹر اسمتھ نے جو امریکہ کے ادارۂ تعلیمی مین کام کرتے ہین انھون نے ایک کتاب ان کاشتکارون کے لڑکون کے لیے لکھی ہے جو گھرون سے دور رہکر مین تعلیم باہر نہین جاسکتے۔ موصوف کی تجویز یہ ہے کہ بچے اولاً ۱۴ سال کی عمر تک مدرسے مین رکھے جائین اسکے بعد چونکہ وہ اپنے والدین کو کھیتون مین مدد دینے کے قابل ہو جاتے ہین اسی وقت انکی تعلیم اس نئی اسکیم کے تحت شروع ہوجانی چاہیے۔ دیہاتی مدارس صرف اس لیے بنائے گئے ہین کہ لڑکے اور لڑکیان بطور خود کاشتکاری کے کام چلانے کے قابل ہو جائین اور اپنی پوری پیداوار و نیز مصنوعات کو فائدہ کے ساتھ فروخت کرسکین اور اپنی قوم اور طبقہ کے لیے مفید ثابت ہون۔

(۱) اگر کوئی لڑکا اس بات پر رضامند ہوجاتا ہے کہ وہ اتنے ایکڑ زمین کی کاشت کریگا۔ یا اسقدر تعداد میوہ کے درختون کی یا اسی تعداد

مویشیوں اور مرغیوں وغیرہ کی نگہداشت کریگا - تو مدرس ہفتہ وار یا اس سے زائد مرتبہ کھیتوں کا معائنہ کرتا ہے اور طالب علم سے [illegible] جو ہوشیاری مرحلکی ہے اسکا تخمینہ کرتا ہے ہفتہ وار معائنہ کھیت کی حالت درختوں اور جانوروں کی حالت کے متعلق ہوتا ہے - اس دوران میں شعبہ کے کھانے پینے کی ضروریات خود اسکی آمدنی سے پوری ہوتی ہیں -

معلم ایسا شخص ہوتا ہے جسنے علمی اور اصولی طور پر زراعت سے کافی واقفیت حاصل کی ہو جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کی معلومات ایک ماہر فن استاد کی نگرانی میں پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہو جاتی ہیں اور کاشتکار جب اپنے لڑکے کے زیر کاشت رقبہ میں اسقدر ترقی دیکھتا ہے تو وہ خود اس طریقہ کو اختیار کر لیتا ہے - ان ایام میں لڑکا مدرسہ میں بھی کام کرتا رہتا ہے اور اسوقت جو تعلیم اس کو دیجاتی ہے وہ انھیں گھریلو دھندوں کے متعلق ہوتی ہے مثلاً اگر وہ اپنے خانہ باغ میں صرف سبزی ترکاری کی کاشت کرتا ہے تو اسکی تعلیم بھی انھیں ترکاریوں کے متعلق ہوگی یعنی اس کو بتایا جائے گا کہ بہترین اراضی کا انتخاب کیونکر ہوتا ہے باغ کا ڈھال کس رُخ پر ہونا چاہیے - درختوں کو گرمی سردی کی کن طریقوں سے بچایا جاوے کھاد کیونکر دیجائے - پودا کسطرح ڈالا جاوے - پودھوں کا علاج کیونکر ہو - باری باری سے مختلف چیزیں کیونکر بوئی جائیں - کن آلات سے کیونکر کام لیا جائے کھاد کیونکر جمع کیا جائے وغیرہ وغیرہ -

مسٹر اسمتھ نے اپنی کتاب میں مدرسین کے لیے خاص طور پر ہدایات دی ہیں - اور طلبہ و نیز ان کے والدین میں دلچسپی پیدا کرنے کے متعدد طریقے تجویز کیے ہیں - انھوں نے خانگی دھندوں کی مختلف شکلیں اور جو طلبہ ان میں مصروف ہوں ان کی تعلیم کے طریقے متعدد ابواب میں بیان کیے ہیں انھوں نے ان نتائج کا بھی بیان کیا ہے جو وہاں کے مدارس میں حاصل ہوئے ہیں -

چنانچہ سنہ ۱۹۱۶ء میں ۵۰۰ طلبہ کو گھریلو دھندوں کے ذریعہ تعلیم سے ۷،۵،۶۶ ڈالر آمدنی ہوئی جو تخمیناً ۳۰۰ پونڈ ہوئی -

ہندوستان میں اسکی تقلید

یہ ملک بھی ممالک متحدہ امریکہ کی طرح ایک زرعی ملک ہے اگر ممالک آئرلینڈ - آسٹریلیا - اور نیوزیلینڈ میں طریق بالا کے تجربے کیے جارہے ہیں تو ہندوستان میں کون سا امر مانع ہے -

اس ملک کا کاشتکار سب سے زیادہ قدامت پسند ہے - زمانۂ حال کی زرعی ترقیات - علمی سائنس کیمیا - حیاتیات - مکروبیات وغیرہ کے ناموں سے اس کے کان آشنا نہیں - اسکے طریق کاشت بالکل دقیانوسی ہیں - ہر نئی شئے کو آسانی سے وہ اختیار نہیں کرسکتا کیونکہ اس کے اجداد ہمیشہ سے لکیر کے فقیر رہے ہیں - اس قسم کی عملی تعلیم اگر اسکی اولاد کو دیجاوے بشرطیکہ تجربہ بھی اسکو مفید ثابت کردے تو شاید کچھ اسکے عمل میں تبدیلی پیدا کیجاسکے - اسکی عام جہالت اگرچہ ہر طرح سدراہ ہوگی لیکن عملی مشاہدہ اسکے رویہ میں تبدیلی پیدا کیے بغیر نہ رہیگا وہ مویشی پالتا ہے لیکن مکروبیات سے اسکی ناواقفیت دودھ مکھن کو مضر صحت بنا دیتی ہے - ہمارا تعلیم یافتہ گروہ اس باب میں ان کی معلم کا کام بخوبی انجام دے سکتا ہے -

مسئلہ ہذا کا حل

ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ گروہ میں ہزاروں نفوس ایسے ہیں جنکا مستقل ذریعہ معاش نہیں لیکن اگر وہ لوگ اپنے فرائض کا بخوبی احساس کریں تو ملک کی زراعتی صنعتی - مالی حالات سدھار سکتے ہیں - زراعت کے ہر صوبہ میں فارم اور کالج کھلے ہوئے ہیں مگر ملک کے صرف چند نوجوان سرکاری ملازمتوں کے لیے ان میں داخل ہوتے ہیں - نہ خود ان

اختیار کرتے ہوئے نہ جھجکیں وہ کاشتکاروں کے مفید مطلب ہیں۔ حالانکہ یورپ میں بڑے بڑے ماہرین فن اور تعلیم یافتہ اشخاص زراعت کو بطور پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ یہاں اس وقت بالکل جاہلوں کے ہاتھوں میں ہے لیکن اگر تعلیم یافتہ حضرات متوجہ ہوں تو اسکی بڑی ترقی ہو سکتی ہے اسی طرح مویشیوں کی پرداخت شہروں میں دودھ مکھن کے کارخانے کھولے جا سکتے ہیں۔ اور جنگل سے بھی بیحد فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس صورت سے فن دباغت۔ کاغذ سازی۔ شیشہ گری وغیرہ تمام شعبے صنعت کے تعلیم یافتہ جماعت کیلئے کھلے ہوئے ہیں۔ یورپ و امریکہ میں مدارس کے طلبہ اسٹیشنوں پر حمالی کرتے ہیں مگر ہندوستان کے تعلیم یافتہ خود اپنا اسباب قلیوں سے اٹھواتے ہیں۔ کسی چھوٹی دوکان پر بیٹھنا انکو ناگوار ہے محنت مزدوری کے کاموں سے شرم آتی ہے عزت و ذلت کا ایک نیا معیار قائم کر لیا ہے اور تباہ ہو رہے ہیں۔

احمد حسین قدوائی

ہنری فورڈ

بسا اوقات دنیا میں ایسے واقعات گزرتے ہیں جو خیالی قصوں سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہیں چنانچہ ہنری فورڈ کی حکایت بھی اسی ذیل میں داخل ہے
بیسویں صدی کی ابتدا میں فورڈ اڈیسن کے برقی کارخانہ میں ملازم تھا اب تک لوگوں کو اسکا ایک ٹوٹی پھوٹی موٹر میں پھرنا یاد ہے۔ یہ موٹر بجائے ایک
مفید سواری کے کھلونا کہلائے جانے کا زیادہ مستحق تھا۔ چوتھائی صدی کا عرصہ نہیں گزرنے پایا کہ وہی ہنری فورڈ دنیا کا سب سے دولتمند انسان ہے جس
کی سالانہ آمدنی ۴۵ کروڑ روپیہ سے کم نہیں ہے اس کے تمام چھوٹے بڑے کارخانوں میں جو دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں ایک لاکھ اسی ہزار مزدور کام
کرتے ہیں اور کسی مزدور کی روزانہ اجرت ۶ ڈالر یا ۲۵ پونڈ ماہوار سے کم نہیں ہے۔ فورڈ کے کارخانوں میں سالانہ ۲۰ لاکھ یعنی روزانہ سات ہزار موٹر
تیار ہوتے ہیں اور یہ تعداد فورڈ ٹریکٹر (ہل) اور فورڈ لاریوں وغیرہ کے علاوہ ہے۔

بظاہر مسٹر فورڈ دنیا کے عظیم ترین دولتمند ہونے کے علاوہ کوئی دوسری حیثیت نہیں رکھتا لیکن حقیقت میں وہ دولتمند، تجربہ کار، مصلح،
وہ ایک اجتماعی انسان ہے اور ایسا عظیم شخص ہے کہ لوگ اسکی قوت عمل سے مستفید ہو رہے ہیں اور ایک کروڑ موٹروں سے زیادہ جنکی طاقت ۲۰ کروڑ
۹۰ لاکھ گھوڑوں کی ہے اس وقت دنیا کے ہر حصہ میں حمل و نقل سواری اور زراعتی ضرورتوں میں استعمال کی جا رہی ہیں۔ کیا اتنا بڑا عظیم الشان کارنامہ
۲۵ برس کے عرصہ میں کوئی دوسرا شخص پیش کر سکتا ہے۔ فورڈ جس نقطہ عروج پر پہونچا ہے وہ اسکی ساٹھ سالہ زندگی کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے
باوجودیکہ اسکے کارخانوں نے انتہائی ترقی اور وسعت حاصل کر لی ہے لیکن فورڈ کے نزدیک ابھی وہ ابتدائی حالت میں ہے اور ان کارخانوں کو ابھی
فورڈ کے نقطہ نظر سے بہت کچھ ترقی کرنا ہے۔ پچھلے سالوں میں فورڈ کے کارخانوں نے جس سرعت سے ترقی کی ہے اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے
کہ گزشتہ بیس برس میں جسقدر موٹریں تیار ہوتی تھیں ان کا نصف حصہ پچھلے دو برس کی مدت میں تیار کیا گیا ہے۔ فورڈ کو اپنے خاص صنعتی اور مالی اصول
کی بنا پر امید ہے کہ ابھی اسکی مصنوعات کو اور بھی زیادہ کثرت اور ترقی حاصل ہوگی اور اسکی گاڑیاں اسقدر ارزاں ہو جائینگی کہ ہر متوسط شخص ان پر سواری
کر سکیگا۔ فورڈ نے بڑی دانشمندی یہ کی تھی کہ خطرہ بالشوزم اور روسی انقلاب سے پہلے اپنے مزدوروں کو نفع کے حصے میں شریک
کر لیا تھا اور ہر مزدور کی یومیہ اجرت ۶ ڈالر سے کم نہیں رکھی تھی مزدوروں کو اس طرح خوش کر دینے کے بعد اس کو ان کی جانب سے کوئی خطرہ باقی
نہیں رہا تھا۔ حالانکہ تمام صنعتی ممالک میں جنگ عظیم کے بعد سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان بہت کچھ مشکلات پیش آئیں اور آرہی ہیں۔

ہنری فورڈ ۳۰ جولائی ۱۸۶۳ء کو ممالک متحدہ کی ولایت مشیگن میں شہر ڈیٹرائٹ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ اسکا باپ
ایک کاشتکار تھا اور سوسائٹی میں ایک قابل عزت جگہ رکھتا تھا۔ ہنری کو عہد طفولیت ہی سے میکانک سے دلچسپی تھی۔ اس نے عہد کمسنی
میں جو کچھ کام کئے ہیں وہ اسکے شباب اور بڑھاپے میں حد کمال تک پہونچنے کا واضح ترین مقدمہ ہیں۔ اس نے سب سے پہلے اپنے ہاتھ سے ایک
رہٹ قائم کیا تھا جو پانی سے حرکت کرتا تھا اور اس مدرسہ کے پاس نصب کیا تھا جس میں وہ تعلیم پاتا تھا۔ پھر اس نے ایک چھوٹا آلہ گیہوں پھٹکنے
کا ایجاد کیا۔ ایک روز وہ شہر ڈیٹرائٹ کی طرف جا رہا تھا اس نے ایک اسٹیم انجن راستہ میں دیکھا اس نے ٹھہر کر انجینیر سے اس کے

پرزون کی ترکیب اور تفصیل دریافت کی پھر اسکو اتفاقاً ایک گھڑی مل گئی جس کے باریک پرزون اور اسکی دقیق صنعت سے وہ بہت متعجب ہوا
سبب اور تعجب کے گھر میں رکھنے کے کوٹھے میں اس نے گھڑی کو کھول ڈالا اور پھر اس کے پرزون کو اسی طرح اپنی جگہ پر لگا دیا حالانکہ اس سے پہلے
اس نے کبھی کسی گھڑی کو نہیں کھولا تھا۔ چونکہ قدرتاً اسکا دماغ مشنری سے مناسبت رکھتا تھا اسلئے اسکو باوجود اس کام کو نہ سیکھے ہونے کے
درست کر دیا۔

جب اسکی عمر ۱۳ سال کی ہوئی تو اس نے یہ سوچنا شروع کیا کہ کسی طرح ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جائے جو بائیسکل کے پہیون میں لگا دیا جائے اور چلانے والے
پاؤن سے کِک دینے کی ضرورت نہو۔

وہ ہمیشہ مشنری کے متعلق غور کیا کرتا تھا۔ زراعت سے اسکو قطعاً دلچسپی نہ تھی حالانکہ اسکے باپ نے کئی مرتبہ چاہا کہ وہ اس کام کو سیکھے۔

۱۷ سال کی عمر تک ہنری فورڈ نے اسکولون اور کالجون مین تعلیم پائی اسکے بعد ایک کارخانہ مین اس غرض سے داخل ہوا کہ انجینیرنگ کے
متعلق عملی تعلیم حاصل کرے۔ تھوڑے ہی عرصہ مین اس نے اس کام مین غیر معمولی مہارت حاصل کر لی اور مدت معینہ گزرنے سے پہلے کامیابی کا سرٹیفکیٹ
اسکو مل گیا۔ اب اسکا تعلیمی سلسلہ منقطع ہوا اور کسب معاش کی غرض سے اس نے گھڑی سازی کا پیشہ شروع کیا لیکن اس نے سوچا کہ گھڑی
ایک ایسی چیز نہیں ہے کہ تمام آدمیون کو اسکی ضرورت ہو چنانچہ اس نے اس کام کو چھوڑ دیا اور ایک کارخانہ مین ملازمت اختیار کی جہان مختلف
قسم کی مشینون سے کام کیا جاتا تھا۔ فورڈ اپنی خداداد قابلیت کی بدولت بہت جلد ترقی کرتا گیا یہان تک کہ ایک روز ایڈیسن کی برقی کمپنی
کا صدر مقرر ہو گیا وہ چاہتا تھا کہ ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جائے جو بجائے معمولی ہل کے کھیتون مین کام مین لایا جائے جس سے کسانون کی محنت
اور وقت کی بچت ہو۔

۱۸۹۳ء مین اس نے اپنی پہلی موٹر بنائی جو اسکے پاس اب اس وقت تک موجود ہے۔ پھر ۱۸۹۶ء مین ایک دوسری موٹر تیار کی اس کے بعد کئی
سال تک فورڈ نے کوئی نئی گاڑی نہین بنائی بلکہ اس نے اسی کی تکمیل و تہذیب مین کئی سال صرف کر دیئے جس کارخانہ مین وہ اپنے تجربات
کیا کرتا تھا وہان کا چیف ڈائرکٹر اسکا ہم خیال نہ تھا اس کے خیال مین مستقبل صرف قوت کہربائی کے حصہ مین تھا لیکن فورڈ یہ کہتا تھا کہ متمدن
دنیا مین تو یہ ممکن ہے کہ ہر ایک چھوٹا بڑا کام کہربائی قوت سے لیا جائے لیکن ان بعید ممالک کے لئے جہان تمدن کے اثرات نہین پہونچے ہین ایک
ایسی گاڑی نہایت ضروری ہے جو خفیف الوزن اور سریع السیر ہو اور پیٹرول کی طاقت سے چلائی جائے۔ ایڈیسن کی کمپنی نے اسکو
اپنے تمام کارخانون کا صدر اعلیٰ مقرر کرنا چاہا مگر اس شرط پر کہ وہ موٹر کے متعلق اپنے تجربات چھوڑ دے اور اپنا پورا وقت کمپنی کے کام مین صرف
کرے۔ اب اسوقت فورڈ کے لئے دو صورتین باقی رہگئی تھین۔ یا تو وہ ایک بڑے عہدے کو قبول کرے جسمین اسے بڑی تنخواہ ملتی تھی یا ایک ایسے
نئے تجربہ مین اپنا وقت صرف کرے جسکی کامیابی یا ناکامی کے متعلق اسوقت کوئی رائے قائم نہین کیجا سکتی تھی لیکن فورڈ نے اس عہدے کے مقابلہ
مین موٹر کے متعلق اپنے تجربات کو جاری رکھنا بہتر خیال کیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ کامیابی کے بعد دنیا اسکی ایجاد سے بہت کچھ فائدہ اٹھائیگی چنانچہ
اس نے ۱۸۹۹ء مین ایڈیسن کی کمپنی سے اپنا تعلق قطع کر لیا۔

فورڈ کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ وہ اپنے تجربات کے لئے تمام ضروریات فراہم کرے اور نہ اس زمانہ مین موٹرون کی طرف

لوگوں کو اتنی رغبت تھی کہ وہ اسکی مالی امداد کرتے۔ وہ موٹر کو ایک آلۂ تفریح سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے لیکن فورڈ کی کوششوں سے ایک چھوٹی سی کمپنی کی بنیاد پڑی اور کمپنی نے اس کو اپنا صدر مقرر کیا لیکن اب ایک مشکل یہ واقع ہوئی کہ جب کبھی وہ موٹر کے متعلق کوئی اصلاح پیش کرتا تھا تو کمپنی کی طرف سے اکثر مخالفت ہوتی تھی اور اسکی رائے مسترد کر دی جاتی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ آزادی سے اپنے مقاصد کی تکمیل نہیں کر سکتا اور اسکی حیثیت ایک کارخانہ کے انجنیر سے زیادہ نہیں ہے تو اس نے ۱۹۰۲ء میں کمپنی کی صدارت سے استعفیٰ پیش کر دیا اور آئندہ کے لئے یہ قطعی ارادہ کر لیا کہ وہ ہرگز کسی کی ملازمت نہ کریگا اور اس نے اپنے نفس پر اعتماد کرکے کام شروع کیا۔

ایک سال کے مسلسل تجربات کے بعد اسے معلوم ہوا کہ لوگ موٹر کی طرف اس وقت تک متوجہ نہیں ہو سکتے جب تک کہ اسکی رفتار میں اور زیادہ سرعت نہ پیدا کی جائے۔ لہذا اس نے چار سلنڈر والی ایک گاڑی بنائی اس سے پہلے صرف دو سلنڈر کی گاڑیاں ہوتی تھیں۔ اس نئی گاڑی میں سے بہت کچھ کامیابی حاصل ہوئی اور میدان مسابقت میں اس کی گاڑی دوسرے نمبر کی گاڑی سے نصف میل آگے بڑھ گئی۔ اس غیر معمولی کامیابی کی بدولت اسے بہت شہرت حاصل ہوئی۔

۱۹۰۳ء میں اس نے اپنی مشہور کمپنی کی بنیاد ڈالی اور وہ کمپنی کے چیف ڈائرکٹر کا نائب مینیجنگ ڈائرکٹر، ورک مینیجر اور انجنیر مقرر ہوا۔ کمپنی کا راس المال ایک لاکھ ڈالر تھا جس میں صرف ۲۸ ہزار جمع ہوئے۔ فورڈ کے حصے اس سرمایہ میں ۲۵ فیصدی تھے۔ تین سال کے تجربات اور امتحانات کے بعد اس نے موٹر کی صنعت میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کی ۱۹۰۶ء میں وہ ۵۱ فیصدی حصوں کا مالک ہو گیا۔ اب چونکہ زیادہ حصے اسکی ملکیت تھے لہذا اب کارخانہ کے پورے اختیارات مسٹر فورڈ کے سپرد کر دئے گئے اس کے بعد اس نے اور حصے خریدے یہانتک کہ مسٹر فورڈ اور اسکا بیٹا ۱۹۱۹ء میں کمپنی کے تمام حصوں کا مالک بن گیا پھر نئے سرے سے ایک دوسری کمپنی قائم کی گئی اور دس کروڑ ڈالر اسکا سرمایہ مقرر کیا گیا۔

اس مختصر مضمون میں ہم فورڈ کے تمام کارخانوں کے تفصیلی حال درج نہیں کر سکتے تاہم ناظرین کیلئے ان کارخانوں سے متعلق بعض مفید معلومات پیش کرتے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے فورڈ کے کارخانے دنیا کے تمام کارخانوں سے بڑے ہیں۔ مواد خام۔ کوئلہ لوہے اور تانبے کی کانیں شیشہ سازی اور چمڑا پکانے کے کارخانوں سے لیکر بڑے بڑے جہاز اور ریلیں تک فورڈ کمپنی کی ملکیت ہیں۔ کارخانوں کی وسعت اور عظمت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ موٹر کے ہر چھوٹے اور بڑے پرزے کے لئے ایک علیحدہ کارخانہ ہے جس میں اسی پرزہ کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں بنتی۔ اور ان تمام کارخانوں کا نظام ایسے اصول پر قائم کیا گیا ہے کہ ہر ایک کارخانہ دوسرے سے بالکل آزاد اور مستقل ہونے کے باوجود اجتماعی حیثیت سے برابر کام کرتا چلا جاتا ہے اور کوئی باہمی خرابی اور کشمکش واقع نہیں ہوتی۔ مزدوروں کے متعلق فورڈ نے ایسے اصول وضع کئے ہیں کہ دنیا میں چاہے کتنا ہی بڑا تجارتی اور صنعتی انقلاب ہو مگر فورڈ کے کارخانوں پر اسکی وجہ سے کوئی خراب اثر نہیں پڑ سکتا فورڈ نے اپنے کارخانوں کی تنظیم اور مصنوعات کی ترویج ایسے اصول پر کی ہے کہ مال کی نکاسی لوگوں کی توجہ و عدم توجہ کی محتاج نہیں ہے بلکہ سال بھر تک یکساں طریقہ پر مال برآمد ہوتا رہتا ہے اور ہر سال

بمقابلہ سال گذشتہ کے ترقی ہوتی رہتی ہے۔
کمپنی کے تمول نے اسے اس قابل بھی بنا دیا ہے کہ وہ اپنے علمی شعبہ پر سالانہ ایک رقم کثیر صرف کرتی ہے۔ اس شعبہ کا کام صرف نئے نئے تجربات سے موٹر کی صنعت میں نئے نئے اضافے کرنا ہے۔

فورڈ کا مشہور ترین کارخانہ ہیلنڈ پارک اور ایک دوسرا کارخانہ جو ریاست مشیگن میں واقع ہے اسکو ریور روج کہتے ہیں ہیلنڈ پارک کا کارخانہ ایک وسیع رقبہ زمین کو گھیرے ہوئے ہے جو ۲۰۰ ایکڑ پر مشتمل ہے جس میں سے ۱۰۵ ایکڑ مسقف ہے۔ اس محل میں ۶۵ ہزار مزدور کام کرتے ہیں اور اس میں ایک برابر قی پاور ہاؤس ہے جو ۵۳ ہزار گھوڑوں کی طاقت سے کارخانہ کی تمام مشینری کو حرکت دیتا ہے ریور روج دنیا کی عظیم ترین فونڈری ہے جو ایک ہزار ایک سو ایکڑ زمین کو گھیرے ہوئے ہے اس میں جو عمارات واقع ہیں ان کی بنیادی پیمائش ۴۰ لاکھ ۵۰ ہزار مربع فیٹ ہے۔ راستے جو اس میں واقع ہیں ان کی درازی ۹۰ میل اور زمین جو اس رقبہ میں نقل و حرکت اور حمل کے لئے کام میں لائی جاتی ہیں ان کا طول ۷۰ میل ہے یہ کارخانہ ہر روز ۱۲۰۰۰ من کوک اور ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ فیٹ مکعب گیس اور ۲۲ ہزار گیلن بنزول اور ۵۰ ہزار من سلفیٹ آف امونیا اور ایک ہزار من لوہا سکوت اور دو ہزار من حدید الز ہر اور ۵ سو پل (ٹریکٹر) اور ۷ ہزار کار و سری باڈی موٹر کار اور اسکے علاوہ اور بہت سی چیزیں تیار کر سکتا ہے۔ اس کارخانہ میں مزدوروں کی تعداد ۴۰ ہزار ہے۔

مسٹر فورڈ نے اپنے تمام کارخانوں کے انتظام اور ان کی ترقی کیلئے تین اصول قائم کئے ہیں۔ اور ابتدا سے لیکر اسوقت تک انہیں اصولوں کی اس نے نہایت شدت سے پابندی کی ہے اور یہی اسکی کامیابی کا راز ہے۔

پہلا اصول صنعت اشیاء سے تعلق رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی شے کے بنانے میں ابتداءً اس امر کا مطلق لحاظ نہ کیا جائے کہ لوگ اسکی طرف متوجہ ہیں یا نہیں بلکہ سب سے پہلی کوشش اس شے کو ہر حیثیت سے مکمل کرنے میں صرف کرنی چاہئے اور اسوقت اسوقت یہ خیال میں نہ لانا چاہئے کہ کس طرح لوگ اس شے کو پسند کریں گے۔ دیکھنے میں [illegible] اور اسے عام مقبولیت ہو جائے کیونکہ جب انسان کسی صنعتی چیز کو ہر حیثیت سے مکمل صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر دے تو اس کی تکمیل کے بعد یہ ہوگا کہ بالکل آسان ہو جائیگا کہ حتی الامکان اسکے مصارف کو کم اور نرخ کو زیادہ کرکے اسے بازار میں لائے جب ایک شے کے مصارف کم اور منافع زیادہ ہونگے تو قدرتی طور پر لوگ بآسانی اسکے خریدنے کی طرف مائل ہو جائینگے ایسی صورت میں صانع کو نفع بھی زیادہ ہوگا اور لوگ بھی اسکی صنعت سے مستفید ہونگے۔ اور فورڈ کی رائے میں زیادتی نفع اور کثرت انتفاع ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہیں اور نہ علیحدہ ہونا چاہئے۔

مشقت مزدوروں کے اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے فورڈ نے اپنے کارخانوں میں تمام اعمال کو ممکن حد تک تقسیم کر دیا ہے یہانتک کہ مراتب عمل نہایت سہل اور سادہ ہو گئے ہیں جسے ہر معمولی انسان تکمیل تک پہونچا سکتا ہے اور کام کے سیکھنے اور اس میں مہارت پیدا کرنے میں بھی زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا وقت کے بچانے کیلئے فورڈ نے ایک خاص نظام حمل و نقل جاری کیا ہے اور وہ یہ کہ ہر ایک مزدور کے سامنے ایک دائم الحرکت لوہے کا تار لگا رہتا ہے اور تمام مزدور اسی ترتیب سے بیٹھے رہتے ہیں جس ترتیب سے کوئی پرزہ درجہ بدرجہ بنتا ہوا درجہ تکمیل تک پہونچتا ہے ہر ایک مزدور پرزہ میں اپنا کام کرکے تار میں لگا دیتا ہے تار اسے لئے ہوئے دوسرے مزدور کے سامنے پہونچ جاتا ہے وہ اسے لیکر اپنا متعلقہ کام کر کے اسی تار کے ذریعہ سے آگے بڑھا دیتا ہے اسی طرح وہ پرزہ بلا انسانی حمل و نقل اور زیادہ وقت صرف ہونیکے دست بدست پہونچتا ہوا مکمل ہو جاتا ہے اسی طرح اس نے کل پرزوں کی موٹر ترتیب دینے کے لئے بھی ایک

آسانیاں بہم پہنچائی ہیں جنکی تفصیل ہم یہاں بیان نہیں کر سکتے کیونکہ یہ تفصیلات دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں جو شخص ہائی لینڈ پارک کے کارخانہ کو دیکھے گا کہ کسطرح متفرق پرزے ملکر دم کے دم میں موٹر تیار ہو جاتی ہے تو اسکی حیرت کی کوئی حد باقی نہ رہیگی یہ کہ وہ دیکھیگا کہ وہ متفرق اجزا جو ایک منٹ پہلے متفرق صورت میں رکھے تھے ایک منٹ کے عرصہ میں موٹر کی صورت میں سامنے آ جاتے ہیں وقت بچانے کے جس اصول پر مسٹر فورڈ نے عمل کیا ہے اسکی وجہ سے مزدوروں کا ایک سکنڈ بھی بیکار نہیں ضایع ہوتا ۱۹۱۳ء میں پرانے طریقہ پر انجن کے پرزوں کو مرتب کرکے انجن کی صورت میں لانے کیلئے ۹ گھنٹہ ۵۴ منٹ صرف ہوتے تھے لیکن جب سے جدید نظام حمل و نقل جاری کیا ہے اسوقت سے انجن صرف ۵ گھنٹہ ۵۶ منٹ میں مرتب ہو جاتا ہے یہ قیمت بمقابلہ پہلے کے تقریباً نصف ہے لہذا کمپنی اس سے یہ فائدہ اٹھا سکتی ہے کہ یا تو وہ نصف مزدوروں کو کم کردے جو انجن کو ترکیب دیا کرتے تھے یا ان سے دوسرے چند کام لے فورڈ کا ایک صنعتی اصول یہ بھی ہے کہ مشنری کے تمام پرزے اس طرح بنائے جائیں کہ جو وضع انکے لئے اختیار کر لیگئی ہے اسمیں حتی الامکان تغیر و تبدیل نہو اس اصول پر کاربند ہونے سے خریداروں کیلئے ایک بڑی آسانی یہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی خراب شدہ گاڑی کے نئے پرزے لگا کر نہایت آسانی کیساتھ پھر درست کر سکتے ہیں خواہ موٹر کو خریدے ہوئے کتنا ہی عرصہ ہو گیا ہو۔

موٹر بنانے کے متعلق اسکا ایک اصول یہ بھی ہے کہ ایک ہی کارخانہ میں تمام اجزا تیار نہونے چاہئیں بلکہ ہر جز کیلئے ایک مخصوص کارخانہ ہو ایسی صورت میں مصارف کی بہت کمی ہو سکتی ہے چنانچہ اسی اصول کی بنا پر فورڈ کے مختلف کارخانوں میں خاص خاص پرزے بنتے ہیں اور پھر تمام تیار شدہ اجزا اس جگہ بھیجدیے جاتے ہیں جہاں انہیں ترکیب دیکر موٹر بنائی جاتی

فورڈ کا دوسرا اصول معاشیات سے متعلق ہے اسکی رائے ہے کہ تمام سرمایہ داروں سے علیحدہ رہے کمپنی کو ہرگز بنک سے قرض لینا چاہئے کیونکہ جب بنک کا تسلط صنعتی نظام پر ہو جاتا ہے تو وہ لوگ اپنے سرمایہ کی حفاظت کیلئے ہر قسم کا دخل دینے لگتے ہیں ایسی صورت میں مصنوعات کی تکمیل اور انکو مفید اور ارزان کرنیکا خیال پس پشت ڈالدیا جاتا ہے اور کمپنی کی تمام تر توجہ اسطرف منعطف ہو جاتی ہے کہ نفع زیادہ ہو لہذا اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صنعت کو ترقی حاصل نہیں ہوتی مصنوعات ارزان نہیں ہوتے اور خواستگار کم ہو جاتے ہیں۔

فورڈ کے خیال میں بنک روپیہ جمع کرنے کیلئے ایک عمدہ مقام ہے لیکن کسی کارخانہ پر اسکا تسلط کسیطرح مفید نہیں کیونکہ بنک کے سرمایہ دار صنعت و حرفت کو نہیں جانتے اور سب سے بڑی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ صاحب کارخانہ جسکیلئے یہ ضروری تھا کہ اتنا نفع حاصل کرے جو اسکی ضروریات کیلئے بدرجہ اتم کفایت کر سکے وہ قرض لینے کا آسان راستہ اختیار کر لیتا ہے تاکہ کارخانہ چلتا رہے اور اسکی بدانتظامیوں اور فضول خرچیوں پر پردہ پڑ جائے اسکا یہ عمل بالکل قانون فطرت کے خلاف ہے کیونکہ بدانتظامی مال سے نفع نہیں ہو سکتا بلکہ حسن انتظام اور فضول خرچی کو روکنے سے ورنہ نہیں ہو سکتی بلکہ کفایت شعاری اور بیمار روپیہ قرض لینے والا منتظم کارخانہ اپنی بدانتظامیوں کو قرض لیکر کارخانہ جاری رکھنے سے چھپاتا ہے اور قرض پر قرض لیتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک روز اسکا کارخانہ ڈوب جاتا ہے اور اگر ڈوبتا نہیں تو خاطر خواہ نفع نہیں دیتا۔

مسٹر فورڈ باوجود ایک انتظامی شخص ہونیکے ضروری مصارف میں کمی نہیں کرتا بلکہ اسکا فرائض عمل کی توسیع اور اسلوب صنعت کی اصلاح مصنوعات کی ارزانی اور مزدوروں کی اجرت بڑھانے کیلئے بالکل کھلا ہوا ہے اور وہ ان مقاصد کیلئے روپیہ قرض لینے کا بھی مخالف نہیں ہے بلکہ اسنے جو کچھ مخالفت کی ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ کمپنی کے اعلی عہدہ دار اس حقیقت کو ہرگز فراموش نہ کریں کہ قرض لئے ہوئے مال سے جو کام چلایا جائے وہ ہرگز اس سعی و عمل کا مقابلہ نہیں کرسکتا جسکے ذریعہ سے انسان مصنوعات کو مکمل کرکے ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے مسٹر فورڈ کا تیسرا اصول مزدوروں اور انکی اجرت کے متعلق ہے مسٹر فورڈ کہتا ہے کہ مزدوروں کی اجرت ایک مقدس شے ہے کیونکہ اسکے ذریعہ سے بیچارے مزدور پلتے ہیں گھر آباد ہوتے ہیں اور خاندان اپنا گزارا کرتے ہیں اس بات میں ہرگز ہرگز کوئی کمی نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ انکی اور انکے خاندان کی حیات کا مسئلہ ہے مزدوروں کی اجرت کی تنخواہ رجسٹروں میں چند ہندسوں کی صورت میں نظر آتی ہے لیکن وہ حقیقت میں انکی غذا لباس اور ضروریات تعلیم سے عبارت ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں غذا انکی تمام ضروریات اور انکی خوشحالی ہے جس شخص کا یہ مقولہ ہو اور مقولہ کو بھی اس نے عملی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہو وہ کیوں نہ کامیاب ہو۔ فورڈ اپنے مزدوروں کو اپنا شریک سمجھتا ہو علاوہ ان کی اجرت مقررہ کے ایک کثیر رقم ان پر تقسیم کرتا رہتا ہے جنگ سے پہلے دس سال تک کروڑ ڈالر فی مزدوروں پر تقسیم کرتا تھا اور کسی مزدور کی یومیہ اجرت

ڈالر یا ۶ ڈالر ہے کہ ۱۹۱۴ء میں اس نے یومیہ اجرت کم سے کم ۵ ڈالر مقرر کی۔ اجرت کو اسقدر زیادہ بڑھا دینے سے لوگوں نے یہ خیال کیا کہ فورڈ موجودہ اجتماعی اور اقتصادی نظام کا دشمن ہے اور بہت جلد اسکا یہ طرز عمل کمپنی کو تباہ و برباد کر دیگا لیکن اس خیال کے برعکس اسے بہت زیادہ منافع حاصل ہوئے اور کثرت سے اسکی موٹریں فروخت ہوئیں اور اس نے یومیہ اجرت میں ایک ڈالر کا اور اضافہ کر دیا۔ فورڈ کہتا ہے کہ مصنوعات کی اجرت کمپنی نہیں دیتی بلکہ خود مصنوعات ادا کرتی ہیں۔ کارخانہ کا یہ فرض ہے کہ مصنوعات سے زیادہ نفع اٹھانے کی کوشش کرے تاکہ مزدوروں کو آسانی سے اسقدر اجرت دی جا سکے جو ان کی ضروریات کیلئے پوری طرح کفیل ہو۔

مسٹر ہنری فورڈ جو اس وقت دنیا کا عظیم ترین دولتمند ہے احسان کے متعلق ایک خاص رائے رکھتا ہے اور اسی بنا پر اسکا نام ارباب سخاوکرم کی اس فہرست میں نہیں ملتا جس میں دنیا کے بڑے بڑے دولتمندوں کا نام لکھا ہوا ہے وہ کہتا ہے کہ انسان کا جذبۂ احسان ضرور ایک شریف جذبہ ہے اور انسان کے جذبات ہمدردی کا بھی تقاضہ ہونا چاہئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسکا صحیح استعمال نہیں کیا جاتا اگر ہمکو یہ جذبہ بھوکے کو غذا دینے پر مجبور کرتا ہے تو ہم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ بھوکوں کا وجود ہی دنیا میں نہ رہے بظاہر ایک محتاج کو کچھ دیدینے سے اسکی ضرورت رفع ہو جاتی ہے لیکن یہ ایک عارضی علاج ہے۔ سخاوکرم نہایت اچھی چیزیں ہیں لیکن ان سب سے اچھی وہ چیز ہے جو سخاوکرم کی نوبت ہی نہ آنے دے ہمکو چاہئے کہ بھوکے اور مفلس کے بھوک اور افلاس کے سبب کو دور کریں انہیں خیالات کی بنا پر فورڈ ان لوگوں کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے جنکا پیشہ بلا کام کئے ہوئے دوسروں سے دولت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں پر خواہ وہ کتنے ہی بھوکے ہوں اسے بالکل رحم نہیں آتا۔ وہ کہتا ہے کہ افلاس کا وجود سخاء ایک فنی علاج کر دینے سے نہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ افلاس کے اسباب کو دور کیا جائے فورڈ کے نزدیک اگر صنعت و حرفت کا نظام جیسا کہ وہ چاہتا ہے ترقی حاصل کرے تو دنیا میں فقر و فاقہ کا وجود بالکل نہیں رہ سکتا کیونکہ اکثر لوگ جو اپاہج اور معذور ہونے کے باعث اپنے کو سخاوکرم کا مستحق سمجھتے ہیں ان سے بھی کام لیا جا سکتا ہے فورڈ نے اپنے کارخانوں میں عملی طریقہ پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اعمال کی تقسیم کر دینے اور مصنوعات کے اجزاء کو علٰحدہ علٰحدہ بنانے سے یہ بالکل آسان ہو گیا ہے کہ بالکل اپاہج اور معذور اشخاص سے بھی کام لیا جائے کیونکہ بعض آلات ایسے ہیں جنکو اندھا بھی استعمال کر سکتا ہے بعض ایسے ہیں جنکو لنگڑے کام میں لا سکتے ہیں چنانچہ ہیلینڈ پارک کے کارخانہ میں ۶۷۰ ایسے شخص ہیں جنکے دونوں پاؤں کٹے ہوئے ہیں کام کرتے ہیں اور ۲۶۳۷ کام ایسے ہیں جنکو ایک پاؤں والا انسان بخوبی انجام دے سکتا ہے اور ۲ کام ایسے ہیں جنہیں دونوں ہاتھ کٹا ہوا آدمی پورا کرتا ہے اور ۷۱۵ کام ایک ہاتھ کٹے ہوئے انسان پورا کر رہے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی اجرت ۶ ڈالر روزانہ یعنی ۲۵ پونڈ ماہانہ سے زیادہ ہے۔ یہ اجرت ٹھیک ٹھیک ان کے لیے معمولی طریقہ پر اچھی طرح کفالت کرتی ہے۔ اپاہج اور معذور اشخاص سے اسطرح کام لیکر انہیں اجرت دینے کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ جو کچھ وہ حاصل کرتے ہیں اسے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سمجھکر ضائع نہیں کرتے اور بھیک مانگ کر اپنی عزت و شرافت کو بھی کم نہیں کرتے۔

مسٹر فورڈ کو اپنے مزدوروں کی جسمانی حالت اور ان کی صحت کو قائم رکھنے کا بھی بڑا خیال ہے چنانچہ کمپنی کی طرف سے دو انسپکٹر خاص اس غرض سے ملازم ہیں کہ مزدوروں کے گھروں کا دورہ کرتے رہتے ہیں اور اگر کسی کے گھر کی حالت اصول حفظ صحت کے خلاف ہو تو مالک مکان کو سزا دی جاتی ہے اور اسکے لئے خاص قواعد مقرر ہیں فورڈ کی زندگی ہر ایک انسان کے لئے بہترین سبق آموز ہے۔ ۲۵ سال کی قلیل مدت میں فورڈ نے محض اپنی سعی و اجتہاد اور با اصول ہونے کے سبب سے اسقدر ترقی حاصل کی کہ ایک معمولی انسان سے گزر کر آج وہ دنیا کا سب سے بڑا دولتمند انسان بن گیا ہے۔ دو لاکھ انسان محض اسکی بدولت کسب معاش کرتے ہیں اور دنیا اسکے مصنوعات سے لا محدود فوائد حاصل کر رہی ہے۔

شاعر

جس طرح دنیا مین انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا فخر حاصل ہے اسیطرح اگر یہ کہا جائے کہ انسانی ہستیون مین سب سے زیادہ مقدس اور متبرک شاعر کی ہستی ہے تو کچھ بیجا نہ ہوگا ۔ ہے اور ضرور ہے اسکی ایک دو نہین بلکہ ہزارون دلیلین بیان کی جا سکتی ہین ۔

قسام ازل نے ۔ دل ۔ دماغ ۔ حواس خمسہ ۔ ہر انسان کو دیے ہین مگر ان سے کام لینے کی استعداد جو شاعر کو ملی ہے وہ کسی مین بھی نہین ہے ۔

شاعر کا دل ایک عجیب آلہ ہے جس پر دنیا کے ذرہ ذرہ کا عکس پڑتا ہے اور وہ اُن اثرات سے جو ہر وقت اُس کے دل پر پڑتے رہتے ہین اسقدر زبردست فائدے اٹھاتا ہے کہ کوئی ہستی اُسکا مقابلہ نہین کر سکتی ۔ وہ گویا رموز فطرت کا ایک ایسا رازدان ہے جسپر کائنات کی ہر چیز کی ماہیت کا انکشاف ہوتا ہے اور اُس کے اندر اون اثرات کو جو اُسپر پڑتے ہین دوسرون کے دل مین ڈالنے کی قدرت ہوتی ہے ۔

اُس کے دل مین ایک جوش اٹھتا ہے اور وہ جوش لبون کی مہر سکوت کو توڑ کر بہت سے ایسے رازون کا اظہار کرتا ہے جس سے سننے والے اسقدر متحیر ہوتے ہین کہ اُن کے دل مین کبھی اُن باتون کا وہم و گمان بھی نہین ہوتا ۔

یہ جوش فطرتی ہوتا ہے کوئی اگر چاہے کہ اس کو سیکھ کر حاصل کرے تو یہ محال اور غیر ممکن ہے دراصل شاعر کا کوئی استاد نہین ہوتا ۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اُسکے خیالات کو کوئی شخص اصلاح کے زیور سے آراستہ کر دے ۔ مگر ایسی کوئی ہستی دنیا کے پردہ پر نہین ہے جو کسی مین شعر کہنے کی قدرت پیدا کر دے یا اُس قدرت کی ہر بات سے سبق لینے کا سبق دے ۔

دنیا مین سب سے پہلی مسلم ہستی ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کی ہے ۔ اُن سے پہلے کوئی آدمی نہ تھا کہ اُن کو کسی علم کی تلقین کرتا اُنھون نے غم ہابیل مین مرثیہ فرمایا ۔ یہ مرثیہ وہی ایک جوش غم تھا جسکا ہم نے ذکر کیا ہے سچے جذبات کا اثر یہ ہے کہ آجتک اُس کو پڑھنے والے آٹھ آٹھ آنسو روتے ہین ۔ یہ مرثیہ زبان سریانی ۔ یا عبرانی مین بتایا جاتا ہے ۔

انسان کی روحی قند مرتب کرنے والون مین سب سے پہلی ہستی شاعر کی ہستی ہے ۔ جو ایک لفظ مین وہ جادو بھر دیتا ہے جسکو سن کر بسا اوقات لوگ خوشی سے جان دینے پر آمادہ ہو جاتے ہین اور بسا اوقات اُن کے دلون کو ایسی تقویت پہونچتی ہے کہ سالہا سال کے مرض ۔ اور ہجوم افکار و غم اُن کو چھوڑ کر چلے جاتے ہین ۔

شاعر دنیا کی تمام چیزون سے مستغنی ہوتا ہے ۔ اسکو نہ قصر شاہی کی تمنا ہوتی ہے نہ لباس شاہانہ درکار ہے اُس کو ایک تنہائی کا گوشہ ایک سبزہ زار ۔ ایک کنار دریا ۔ ان سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے ۔ اس کو دولت کی تمنا ہوتی ہے وہ ایک اچھا شعر کہکر اتنا خوش ہوتا ہے کہ بادشاہ ہفت اقلیم کو ساتون ولایتون کے ملجانے سے خوشی ہوتی ہے تو اُس سے زیادہ نہین ہوتی ۔

گھر کے ایک کونے مین پڑا پڑا وہ دنیا کے حالات کو دیکھتا ہے اسکا ہر خیال ایک جام جہان نما ہوتا ہے جس مین ایک نہین دونون جہان کی کیفیات نظر آتی ہین ۔

اسکو سبزہ زار ۔ ویرانہ اور گھر کے کونے کی بھی احتیاج نہین ہے وہ جہان بیٹھ گیا ویسا ہی ہے جیسا وہ ہے ۔

انسان کی ضبط و حیرت سے اُسکی نگاہیں پار ہو جاتی ہیں اور وہ اس عالم قدس کی خبریں لاتی ہیں جسے نہ کسی نے دیکھا نہ سُنا۔
شاعر کی دنیا ایسی عجیب دنیا ہے کہ اُس کو ہر جلسہ میں تنہائی اور ہر تنہائی میں ایک جلسہ دکھائی دیتا ہے ۔
دنیا میں کوئی ہستی اگر خیالات۔ اور غیر مرئی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتی ہے تو وہ شاعر کی ہستی ہے دنیا کا کوئی مصور اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا۔
دن بھر کام دھندا کرنے کے بعد اہل دنیا تھک کر سو جاتے ہیں اور ہر غم و اندوہ سے نجات پا جاتے ہیں مگر غریب شاعر ایک عاشق مجنون کی طرح ایک شاہد شب زندہ دار کے مانند اپنی فکر سے اسوقت بھی نجات نہیں پاتا۔ دنیا میں تاریکی کا گہرا پردہ پڑا ہوتا ہے۔ زمانہ میں سنسان اندھیری چھائی ہوتی ہے ظاہری روشنی کا کہیں نام نہیں ہوتا مگر شاعر کے دل کا کنول روشن رہکر رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ وہ دنیا کے تمام علائق سے بے نیاز ہوتا ہے اسی واسطے مبدء فیاض سے اسکو حیات ابدی کا خلعت ملتا ہے اور وہ جو یاد ہو۔ دنیا احترام کے ساتھ ہمیشہ اسکو یاد کرتی رہتی ہے۔
شاعروں کو تلامیذ الرحمٰن کہا گیا ہے۔ یہ کیوں۔ اسواسطے کہ اسکو براہ راست منجانب اللہ وہ نفیس اور پاکیزہ جذبات عنایت ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے عاشقان خدا کے دل پر ایک خاص عالم میں وہ کیفیتیں طاری ہوتی ہیں جو ہر وقت میں نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان کی حالت سے شاعر کی حالت ملتی جلتی ہوتی ہے ؎ گہے برطارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم۔
دنیا کی گردش پر جو فرشتہ مقرر ہے جب وہ رات کی گہری اندھیری کو ہلکا کرتا ہے ہواؤں کا غول جب صبح کے وقت ہلکی ہلکی سنسناتی ہوا چلاتا ہے۔ مسجدوں میں جب اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ پھول جب کھلتے ہیں۔ تکبیر اینڈ کر سونے والوں کی خواب غفلت جب بار گراں ہو جاتی ہے اُسوقت کوئی زبردست ہوا چلتی ہے اور شاعر کے دل کی کلی کو کھلا دیتی ہے۔ جس کی ہر پتی سے سو سو رنگ نمایاں ہوتے ہیں۔ اُسوقت وہ جو کچھ کہتا ہے اُسمیں ایک عجیب جذبہ ہوتا ہے۔ اس کے کلام سے فیضان الٰہی کی بو آتی ہے۔ وہ ایسی بو ہے جسکا کوئی عطر کوئی خوشبو کوئی چیز مقابلہ نہیں کرتا۔ اُسوقت اُسکی طبیعت میں گو ایک کاوش ہوتی ہے مگر ایسے اس لذت انگیز کاوش اور طرب آمیز غم کا مزا کوئی کیا جانے۔ سچ ہے ؎ درد ا سبب۔ دل بلا جانے جسپہ گزری نہ ہو وہ کیا جانے ۔ کہنے والوں نے یہ بھی کہا ہے کہ شاعر مجنون ہوتا ہے۔
اسکی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ دل دماغ آنکھ کان ناک سبھی کو ملے ہیں فہم و ادراک احساسات میں سب برابر ہیں۔ الغرض جسمانی اور روحانی سب کے لیے یکساں پیدا کی گئی ہیں۔ اور سب اس سے فائدہ اُٹھانے کے مقدار یکساں ہیں۔ فیاض حقیقی کا سب کو شاکر ہونا چاہیئے کہ اس نے ہمارے واسطے ایسی ایسی روحانی و جسمانی نعمتیں پیدا کی ہیں مگر شاعر اُسکی پروا نہیں کرتا معلوم ہوا کہ اُس کے اندر حس کم ہے اُسکا دماغ خراب ہے۔ اس کے حواس خمسہ اُسکی مدد نہیں کرتے۔ وہ بیوجہ ہر وقت فکر میں منہمک ہوتا ہے اور بیکار جانکاہی میں ہر وقت مصروف و مشغول رہتا ہے ۔
دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ بسا اوقات شاعر کوئی بات کہنی چاہتا ہے کوئی خیالی تصویر کاغذ پر کھینچکر لوگوں کو دکھانے کا آرزو مند ہوتا ہے مگر وہ نہیں دکھا سکتا۔ لہٰذا وہ مجنون ہے کیونکہ دنیا کی کوئی نادان سے نادان ہستی بھی ایسی نہیں ہے جس میں اگر عقل ہے جس کے منہ میں اگر زبان ہے اور وہ کوئی بات کہنے کا قصد کرے پھر بھی نہ کہہ سکے یہ اعتراض بھی بالکل بیجا ہیں اگرچہ کہنے والوں کے نزدیک وہ شاعر دیوانہ ہی ہونا چاہیے۔ بعض کہتے ہیں کہ شاعر کے خیالات ایسے انمل بے جوڑ ہوتے ہیں کہ ان کو بسا اوقات وہ خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ کیا یہ جنون نہیں اگر جنون نہیں تو کیا ہے۔ مگر پہلے اعتراض کا جواب اُسی اعتراض سے پیدا ہوتا ہے۔ سُنیے ۔

شاعر خود مجنون نہین ہے - اور وہ دوسرے لوگون کا مورد الزام نہین ٹھہر سکتا بلکہ یہی اعتراض کرنے کا وہ خود حقدار ہے - جیسے لوگ اُسکو یہ سمجھتے ہین کہ اس مین حسیات کم ہین اسی صورت سے وہ خیال کرتا ہے کہ دنیا مین سب سے تمام ناواقف اور معقول لوگ باقی ہین وہ مناظر فطرت کو معمولی نظر سے دیکھنے کا روادار نہین ہے وہ چاہتا ہے کہ دنیا کی جس چیز کو دیکھو پوری طرح دیکھو اور دیکھتے دیکھتے محو ہو جاؤ - چلتے ہو تو کھڑے ہو جاؤ - اور کھڑے ہو تو وہین بیہوش ہو کر گر پڑو - وہ کسی چیز کے دیکھنے مین یہان تک محو ہوتا ہے کہ اُس کے دل مین اثرات کا ایک طوفان اُمنڈ آتا ہے اور وہ اس کے اظہار پر مجبور ہو جاتا ہے - متاثر ہونے کی یہ انتہا ہے کہ وہ اسی اظہار سے دوسرون کو اپنا سا بنانا چاہتا ہے - لہذا اُس کو مجنون کہنا نہ صرف نا منصفی بلکہ ظلم ہے -

رہے وہ لوگ جو کچھ کہنا چاہتے ہین یا کسی جذبہ اور واقعہ کی تصویر کھینچنا چاہتے ہین مگر کھینچ نہین سکتے وہ اصل مین شاعر نہین ہین - کیونکہ شاعر کے لئیے ضرورت نہین ہے کہ وہ کسی بات کے سوچنے مین تکلف کرے اور نہایت تکلیف کے ساتھ کسی بات کو ادا کر سکے - بلکہ حقیقتاً شاعر وہی ہے کہ دیکھی ہوئی چیز کے اثر کو دل یہان تک قبول کرے کہ لب بغیر کسی رکاوٹ کے اسکو ادا کر سکین

ع - "شاعری جزویست از پیغمبری"

اسکے صحیح معنی یہی ہو سکتے ہین کہ شاعر کا دل ایک ایسا آئینہ ہے جس مین پرتو معارف حقیقت نظر آتا ہے اور اُس کا دل ایک ایسی فضا ہے جہان ہر وقت نور کی بجلیان گرتی رہتی ہین - وہ بلا واسطہ فیاض حقیقی سے ایسے ایسے رموز سیکھتا ہے جسکو وہ خود بھی نہین جان سکتا - فطرت اسکی استاد ہے اور ذوق سلیم اُس کا رہبر ہے - دنیا کی بعض چیزون مین بُرائی کا اس کے نزدیک وجود ہی نہین ہے وہ جو کچھ دیکھتا ہے اسکو اچھا ہی سمجھتا ہے -

یجوز للشاعر ما لا یجوز لغیرہ

اس کے معنی یہ ہین کہ وہ استعارات اور تشبیہات کے پردے مین وہ باتین کہہ سکتا ہے جس کے کہنے کا دوسرا مجاز نہین ہے -

وہ ایسے الفاظ استعمال کرنے کے لیے مختار ہے جو غلط ہین - مگر دوسرون کے لیے اُن کے لکھنے کی مجال نہین ہے - دونوں باتون کی سیکڑون مثالین مل جائنگی - آپ روز دیکھتے ہین کہ ایک شاعر ایک امیر - ایک بادشاہ کو اپنی نظم مین تو کے خطاب سے مخاطب کر لیتا ہے بجائے ناراض ہونے کے سننے والا اُس سے خوش ہوتا ہے اسکو انعام دیتا ہے اگر کوئی دوسرا ایسا کہے - تو میرے خیال مین اُسکو قتل کرانا کیسا زندہ دفن کر دیا جائے مگر شاعر کے لیے کوئی عیب یا جرم نہین ہے

شیخ پر آوازے کسنا علانیہ برا بھلا کہنا - مسجد کو چھوڑ کر میخانہ کا گوشہ قبول کرنا اسلام سے بیزاری - کفر سے رغبت - یقیناً یہ سب ایسے جرائم ہین جن کی سزا بعض اوقات موت تک ہو سکتی ہے - مگر شاعر کے لیے یہ سب باتین ایسی ہین جیسے اس نے کچھ کیا ہی نہین -

اس قانون معانی کے مقرر کرنے والون نے دو باتین دیکھکر یہ قانون مقرر کیا ہے - اول تو یہ کہ شاعر جو کچھ کہتا ہے اسکا مقصد حقیقتاً وہ نہین ہوتا وہ ایک اور ہی جذبہ مین ڈوب کر یہ سب باتین ادا کرتا ہے اس کے استعارات خاص ہین جن کو اکثر اوقات وہ خود ہی خوب سمجھتا ہے بسا اوقات مجذوب کی بڑ کا پتا لگانا آسان ہے - مگر شاعر کے معمہ کی تہ کو پہونچنا دشوار ہے -

دنیا کا کوئی ذبردست سے زبردست فلسفی شاعر کا مقابلہ نہین کر سکتا ۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے ۔ کہ شاعر کیطرح فلسفی کا دل و دماغ بھی کام کرتا ہے اور وہ بھی دنیا کی ہر ایک شے کو نہایت غائر نظر سے دیکھتا ہے جیسے شاعر مضامین رنگا رنگ ادا کرتا ہے ایسے ہی فلسفی بھی نئی نئی انکشافات سے کام لیتا ہے فرق یہ ہے کہ شاعر کو صرف تخیل سے کام پڑتا ہے اور فلسفی کو عقل سے ۔ فلسفی کی مراد ذہن کی تکمیل ہوتی اور شاعر کی مراد تخیل کو خوش کرنا ۔ فلسفہ تحقیق کی طرف سے بہرہ ور ہوتا ہے مگر شعر کو اس مین آزادی ہے کبھی وہ حد تحقیق تک لیجاتا ہے اور کبھی صرف کسی ذریعہ سے سننے والے کو خوش کر کے چھوڑتا ہے ۔ جھوٹ اور سچ کی پروا نہین ۔ مگر پھر بھی شاعری کو فلسفہ پر افضلیت ہے کیون ۔ اس لئے کہ فلسفہ کو ہر چیز کی ماہیت دریافت کرنے کے لیے قصد اور غور و خوض کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے پھر بھی غلطی ہونا بہت ممکن ہے اس کے لیے کسی چیز کے جاننے کے لیے کچھ دیر کچھ عرصہ درکار ہے ۔ دوسرے برعکس اس کے شاعر کے واسطے نہ مہلت کی ضرورت نہ فرصت کی ۔ اُسنے فوراً کسی شے کو دیکھا اور اسکی ذری نگاہین خاصیت کی خبر لے آئین ۔ زبان سے کچھ الفاظ نکلے اور دنیا کیا جانورون تک پر اُن کا اثر پڑا ۔

دوسرے یہ کہ ہر شاعر فلسفی ہوتا ہے ۔ اور ہر فلسفی شاعر نہین ہوتا حقیقتاً یہ بہت بڑا شرف ہے ۔

فلسفہ اکتسابی ہے شاعری اکتسابی نہین ہے اور جب تک فیاض حقیقی کسی کو یہ دولت نہ بخشے اکتساب اور جبر کچھ کام نہین کرتا ۔

فلسفی ایک شے کی ماہیت کو بیان کر سکتا ہے لیکن اپنی زبان اور اپنے ہی جذبات کے ساتھ برعکس اس کے شاعر کو دیکھئے تو وہ دوسرون کے جذبات کا صحیح ترجمان ہے ۔ وہ ہر فرقہ ہر طبقہ کی بول چال اس کے حالات ان کے واقعات اُن کی واردات قلبی اسطرح بیان کر دیگا جیسے یہ ماجرا خود اُسپر گزرا ہے ۔ شاعر کی زبان مین ایسی خاصیت ہوتی ہے جو دوسرون پر ترجیح دی جا سکے ۔ اُسکی زبان ایک تیز تلوار ہے تو اس کی قوت تخیلہ اُس سے کہین زیادہ اپنے کام کرنے مین فرد ہے ۔ وہ اسقدر تیز رو ہے کہ اگر شاعر کی قوت ممیزہ اسکی نگہداشت اور اس کی روک تھام نہ کرے تو وہ کہین سے کہین پہونچ جائے اور خدا معلوم عرش کرسی آسمان کی خبر لائے ۔

سب سے بڑی بات یہ ہے جو شاعر اور فلسفی مین ایک بڑا فرق پیدا کرتی ہے کہ فلسفی ایک بات کو نہایت طویل موثر طریقہ سے دیر مین بیان کرتا ہے اور شاعر بجائے اس کے فوراً کسی شے کو دیکھتا ہے اور اُس کے واسطے کچھ نہ کچھ کہ دیتا ہے جو بہت زیادہ دلکش ہوتا ہے لوگ سنتے ہین اور واہ واہ کرتے چلے جاتے ہین شاعر ایک ایسا فلسفی یا حکیم ہے جو اپنے معاصرین شعراء سے بھی نئے رنگ مین ممتاز ہوتا ہے یعنی ہر ایک کا طرز بیان وغیرہ جدا ہوتا ہے برعکس فلسفی کے کہ وہ سب ایک ہی صورت سے باتون کو بیان کرتے ہین ۔

ایک فلسفی آسمان کی حقیقت بیان کرے گا تو نہ معلوم کیا کیا کہے گا ۔ کبھی اسکو حد نظر قرار دے گا اور کبھی اُس کے مدور ہونے پر مضبوط یا مدار اُس کے اجرام علوی کی تشریح کر کے سننے والون کا دماغ چاٹ جائے گا ایک شاعر سیدھی سی ایک بات کہتا ہے سُنیئے

نگون برین شب زر نگار ۔ کہ عقش بود بے ستون استوار **سعدی**

اسی صورت سے مین چند نمونے فلسفیانہ شاعری کے پیش کرتا ہون جنھین آپ پڑھکر خوش ہون گے نہ صرف شاعری کی داد دین گے بلکہ تماشا یہ انداز آپ کر سکین گے کہ واقعی شاعری فلاسفی سے کہین بڑھی ہوئی ہے ۔

قبل اس کے کہ مین کچھ لکھون یہ کہدینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مین نے جو کچھ لکھا ہے وہ معمولی شعراء کے لیے نہین لکھا ہے شاعر حقیقی اُسی کو

جانتا ہون جس کا بھول کر بھی ان حدود سے باہر قدم نہ پڑے - اور اگر وہ محض ہزل گو اور لغویات کا پابند ہے یا اسکی شاعری کسی خاص صنف مین محدود ہے تو اصل مین نہ وہ شاعر ہے نہ فلسفی بلکہ واقعی اُس کا دماغ خراب ہے اور اسپر مثل صادق ہے کہ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ نہ وہ دنیا ہی کے کامون کو اچھی طرح انجام دے سکتا ہے اور نہ اُس سے دین کچھ ہو سکتا ہے - بقول شخصے کہ

"نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے"

عبدالباری آسی

مین اور تو

تو عیش کا دلدادہ مین درد کا دیوانہ | تو درد سے بے بہرہ مین عیش سے بیگانہ

تو رنگ کا شیدائی مین بو کا تمنائی | فطرت کے حرم مین مین تو ساکن بتخانہ

معنی مرا آئینہ صورت پہ نظر تیری | عنوانِ حقیقت مین تو سُرخی افسانہ

تو ساز کا مفتون ہے مین سوز پہ مرتا ہون | بھونرے کا مقلد تو مین پیرو پروانہ

تشکیک کے صحرا مین گم کردۂ منزل تو | ایقان کے کوچہ مین مین بردر جانانہ

مخمور مئے عشرت اس بھید کو کیا سمجھے؟ | خمخانۂ عالم ہے پہلو کا یہ پیمانہ

دریوزہ دری مئے کی شیوہ ہے یہ شہدون کا | رندی اسے کہتے ہین پہلو مین ہے خمخانہ

خواہی کہ تو من باشی این نکتہ زمن بشنو | دیوانۂ عاقل شو اے عاقل دیوانہ

امین حزین

میاں کلو کی ایک رات

میاں کلو فیروزہ کے نمبردار کے اکلوتے بیٹے تھے۔ نہایت بیوقوف اور سیدھے۔ وہی حد سے زیادہ بے فکری اور سست اوقات دن بھر چوپال میں ایک بوڑھے پیپل کے پیڑ کے نیچے چارپائی بچھائے پڑے رہتے ہزاروں ہوائی محل صبح سے شام تک دماغ میں تیار کرتے اور توڑ دیتے۔ مکان میں صبح شام کھانا کھانے تو خود جاتے مگر بڑی کسمساہٹ سے اور انگڑائیاں لیتے ہوئے اور اسطرح یہ کہ اگر کوئی کہتا کہ بھائی کھیت پر جاؤ اپنے باپ کی کچھ مدد کرو بیکار بیٹھنے سے کیا فائدہ تو آگ بگولا ہو جاتے اور فرماتے "سنو جی"۔

قدرت نے بنی نوع کی تقسیم دو طبقوں پر کی ہے "طبقۂ ادنیٰ" اور "طبقۂ اعلیٰ"۔ طبقۂ ادنیٰ جسمانی مشقت و محنت کرنیکے لئے ہے اور طبقۂ اعلیٰ دماغی کام کرنے کے واسطے۔ میرے گھرانے کے لئے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ خدا نے طبقۂ ادنیٰ میں ایک فرد طبقۂ اعلیٰ کی خوبیوں کا پیدا کر دیا۔ آپ لوگ طبقۂ ادنیٰ سے تعلق رکھتے ہیں اور اسلئے آپ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ میں کیا کیا کام کرتا ہوں۔ ذرا غور کرو محنت کا نتیجہ ہی کیا ہے آپکے طبقے کے تمام لوگ محنت و مشقت کرتے ہیں مگر ساری زندگی ایک ہی حالت میں رہتے ہیں وہی [illegible] شام کو روکھی سوکھی کھانا مگر طبقۂ اعلیٰ کے لوگ محض اپنے دماغ کی تھوڑی سی ریاضت سے کوئی نہ کوئی ایسی صورت نکال لیتے ہیں کہ عمر بھر عیش سے زندگی بسر کرتے ہیں چنانچہ میں رات دن امیر کبیر بننے کی [illegible] میں منہمک رہتا ہوں بیکار نہیں رہتا بلکہ آپ لوگوں سے زیادہ کام کرتا ہوں کل ہی کی بات ہے میرے دماغ میں ایک ایسی تدبیر آئی [illegible]سے میں تمام فیروزہ کا تنہا مالک بن جاتا۔ کاش میرے باپ کی زمین اس گاؤں میں ہوتی خیر اب کبھی اور گاؤں کے متعلق سوچونگا غرض میاں کلو شیخ چلی سے کم نہ تھے۔

اب سنئے نمبردار کو پانچسو روپیہ کی ایک تحصیل سرکاری مالگزاری کی ادا کرنی تھی اور اس تاریخ سے دو چار یوم پیشتر وہ اپنے کسی خاص مقدمہ کی پیروی کو روانہ ہو گیا اور میاں کلو کی ماں سے کہہ گیا کہ فلاں روز کلو کے ہاتھ کمال پور کی تحصیل میں پانچسو روپیہ بھیج دینا آٹھ دس میل کا تو فاصلہ ہی ہے میں اس روز وہیں آ جاؤنگا ممکن ہے کہ اسوقت تک مجھے اپنی ڈگری کا روپیہ وصول نہ ہو سکے۔

تاریخ معینہ سے ایک یوم پیشتر میاں کلو کی ماں نے کلو کو خوب سمجھا بجھا کر پانچسو روپیہ کی تھیلی دی اور کہا کہ اسے کمر سے باندھ لو اور آج شام تک کمال پور پہنچ جاؤ رات سرائے میں بسر کرنا علی الصباح تمہارا باپ وہیں ملیگا۔ میاں کلو نے تھیلی کمر سے باندھی اور لٹھ ہاتھ میں لئے گھر سے چلے جس وقت چوپال پہنچے چارپائی پر بیٹھ گئے اور لگے گڑگڑی بجانے جو کوئی آتا آپ فرماتے کہ آج ہمارا کوچ ہے رات کمال پور میں بسر ہوگی پانچسو روپیہ کی تھیلی ساتھ ہے زندہ رہے تو کل ملینگے۔ غرض کلو ایسے کہاں تھے کہ آسانی سے اپنی چارپائی چھوڑ دیتے دوپہر کے بارہ بجے کے بیٹھے بیٹھے شام کے چھ بجے گو اسوقت بھی کھڑے ہو کر سوچنے لگے کہ گاؤں کا کوئی فرد ایسا تو نہیں رہا جسے میری روانگی کی خبر نہ ہو بڑی دیر کے بعد خیال آیا کہ نتھو جاٹ اپنے کھیت پر ہے اور وہ رات کو چوپال میں مجھے ضرور ڈھونڈیگا اسکے کھیت پر بھی جانا ضروری ہے گاؤں سے ایک میل کے فاصلہ پر اسے خبر دینے گئے اور سورج غروب ہونیکے گھنٹہ بھر بعد کمال پور کے راستہ پر پڑ لئے۔

گاؤں کی کچی سڑک پر تاریکی اپنی ضیا پاشیوں میں مشغول تھی رات کے سناٹے اور جھینگے ہو گئے۔ لالٹن کے سوا میاں کلو کا کوئی ساتھی نہ تھا

موسم سرما کا آغاز تھا ہوا کچھ کچھ خنک تھی جگی بوڑھے کلو نے اپنی دھوتی کی چادر تمام جسم پر لپیٹ لی تھی ابھی نصف راستہ بھی طے نہ ہوا تھا کہ ایک قوی ہیکل نوجوان نمودار ہوا اور اس نے پھرتی سے دیا سلائی جلا کر میاں کلو کا چہرہ دیکھا وہ ایک سیاہ اور مضبوط جسم جس کا چہرہ تیز چوڑے کی نقاب میں چھپا ہوا تھا اور جس کی موٹی موٹی سڈول رانوں پر سرخ جانگیا سا ہوا تھا دیکھتے ہی سہم گیا اور جس وقت روپیوں کی تھیلی کی طلب کا سوال ہوا تو بہت ست پٹایا اور کہنے لگا کہ میرے پاس تو ایک روپیہ بھی نہیں اس کا جواب ایک زبردست گھونسے سے دیا گیا اور اسی ضرب کو ناکافی سمجھ کر چار پانچ چپت غریب کلو کے رخساروں پر ایسے رسید کئے کہ نشہ ہرن ہو گیا چپکے سے تھیلی کرتے سے کھول کر پھینک دی مگر اپنی رنہ نہیں ہوئے۔ چلے کمال پور ہی کو آگے قدم بڑھاتے جاتے تھے اور سوچتے جاتے تھے کہ یہ شخص ایسا تھا جسے کوئی پہچان نہ سکے کالا جسم اور سرخ جانگیا ناک منہ کان سب غائب محض دو آنکھوں کا آدمی ہے اگر کبھی نمبردار کے سامنے نظر پڑ گئی تو چاہی بنا کر چھوڑونگا۔

غرض اس قسم کے خیالات کلو کے دماغ میں گھوم رہے تھے کہ کمال پور کی سرائے کا دروازہ آ پہنچا گیارہ بجے کا وقت تھا دروازہ بند ہو چکا تھا سرائے والے سرائے والے کہکر تمام قصبہ کو سر پر اٹھا لیا بھٹیارہ دوڑا ہوا آیا۔ دروازہ کھولا۔ میاں کلو کوئی گمنام آدمی نہ تھے جنہیں کوئی نہ پہچانتا بھٹیارہ فوراً پہچان گیا بڑی خاطر سے سرائے کے اندر لایا اور جو کچھ موجود تھا کھانے کے لئے پیش کر دیا۔ جب کلو کے پیٹ میں کچھ پڑا تسکین ہوئی سردی میں چارپائی ڈلوا دی گئی جس پر میاں کلو لیٹ گئے اب سب سے زیادہ خوف دلانے والی چیز نمبردار کا غصہ تھا مگر کیونکر جنی نوع کے طبقۂ اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے لگے خیالی گھوڑے دوڑانے۔

بیسوں تدبیریں دماغ میں آئیں جنہیں بہتر یہ تھی کہ اپنی جگہ واپس جانا چاہئے اور جنگل میں اسکا گھر تلاش کرنا چاہئے اُسکے مکان میں دو آہٹ بھی نہ سن سکیگا اسے مدد نہیں وہ کچھ دعا بھی نہ ہوگا اور اُسکی تمام عمر کی کمائی کسی جھونپڑی یا غار میں محفوظ ہوگی جو غالباً فیروزہ کے قریب ایک گاؤں خریدنے سکے لئے کافی ہوگی۔ اسے پیچھے جا کے ایک لٹھ ....

بیانک سو جاتا تھا کہ خفیف آہٹ ہوئی اور سامنے دو آنکھوں والا سیاہ جسم سرخ جانگیا کے گھونسا کھاتا ہوا نظر آیا اب کیا تھا ہوش اُڑ گئے "سونے والو دوڑیو بچائیو" کا غل ہوا چاروں طرف سے لوگ دوڑے ہوئے آئے جنہیں میاں کلو نے بتایا کہ سامنے کی کوٹھری میں دو آنکھوں والا کچھ چرانے آیا ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ایک چوہے کے سوا جو برتنوں میں کھڑکھڑاہٹ کر رہا ہے اور کچھ بھی نہیں۔

تمام سرا دیکھا گیا مگر وہاں کیا تھا لوگ اپنی اپنی چارپائیوں پر واپس چلے گئے اور پھر محو خواب ہو گئے مگر میاں کلو کے خیالات بدستور دوڑتے رہے۔

رات کے تین بجے تھے ایک آہٹ سرائے کے باہر معلوم ہوئی پھر دروازہ کھٹکھٹانے اور کھلنے کی آواز میاں کلو کے کان میں آئی ذرا سر اٹھا کے سرا کی دیوار پر نظر ڈالی تو دو آنکھوں والا دیوار سے اترتا ہوا اور کلو کی چارپائی کی طرف آتا ہوا معلوم ہوا پھر "دوڑیو بچائیو" کے شور نے سونے والوں کو بیدار کر دیا اس مرتبہ معلوم ہوا کہ کوئی چور نہیں بلکہ ایک مسافر آیا ہے جو رات کو کچھ گھنٹے سرائے میں بسر کریگا۔

لوگ میاں کلو کا مذاق اڑاتے ہوئے پھر اپنی اپنی جگہ پڑ کر سو گئے اور اس خیال سے کہ کلو کو ڈر نہ معلوم ہو اس آنے والے مسافر کی چارپائی کلو کی چارپائی کے قریب ہی بچھا دی گئی مسافر نے اپنی کمر سے روپیوں کی ایک تھیلی اور کچھ کا نقد کھول کر اپنے سرہانے رکھے اور محو خواب ہو گیا۔

اب کلو کے دماغ نے ایک نیا راستہ پیدا کیا سوچا کہ اگر اس مسافر کی تھیلی چرالی جائے تو نمبردار کے عتاب سے رہائی نصیب ہو سکتی ہے یہ تھیلی کچھ پانچ سے

بیانہ ہی کی معلوم ہوتی ہے پر ترکیب میاں کلو کو سب سے زیادہ پسند آئی اور اسپر کاربند ہونیکے لئے فوراً تیار ہو گئے۔

تھکا ماندہ مسافر نیند کے غلبہ میں تھا مگر اسقدر غافل نہ تھا کہ تھیلی اسکے سرہانے سے نکال لی جاتی اور اسے خبر نہوتی جیسے ہی کلو نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تھیلی نکالنی چاہی مسافر نے فوراً انکا ہاتھ پکڑ لیا اور بھٹیارے کو آواز دی کہ چراغ لائے۔ اب تو اور مسافر بھی دوڑے اور جو پہنچے تو کلو کا ذاتی نگاہ نے نہیں غلطی پر ہے بس دری میں ضرور کوئی چور تھا جو پکڑ لیا۔

کلو کی اسوقت بری حالت تھی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں جس ہاتھ میں تھیلی تھی وہی ہاتھ مسافر نے پکڑ رکھا تھا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا تھا آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلک رہے تھے جو رخ اپنی سمت آتا ہوا دیکھکر دوسرا ہاتھ شرم سے منہ پر رکھ لیا۔

مسافر نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسکے منہ پر سے ایک ہاتھ ہٹایا اور تعجب سے کہا "کون؟ کلو":

کلو۔ "نمبردار میں یہ روپیہ مالگزاری داخل کرنے کے واسطے آپکے حکم کے بموجب لایا ہوں"۔

قمر (میرٹھی)

غزل

خدا معلوم اس پردے میں کس نے ساز چھیڑا ہے
صدائے نغمہ پیہم آرہی ہے جنبش دل سے

اٹھایا آپ نے اٹھا بٹھایا آپ نے بیٹھا
نہ اٹھا میں کبھی دل سے نہ بیٹھا میں کبھی دل سے

مراحل تیری منزل میری آنکھیں ترا منظر ہیں
ترا جلوہ نظر آتا ہے میرے دیدہ و دل سے

یہی تو خار حسرت ہیں جو رہ رہ کر کھٹکتے ہیں
یہی چبھتے ہوئے کانٹے ہیں جو نکلتے ہوئے دل سے

کوئی محمل نشین ممکن ہے اس رستہ سے گزرا ہو
مرے احباب تم پوچھ دیتے گرد منزل سے

اثر جذب محبت کا بھی اپنے قیس کچھ دیکھا
رکا ناقہ۔ اٹھا پردہ۔ وہ نکلا کوئی محمل سے

ہوا کیا وصل میں روٹھے ہو کیوں ناراض ہو کس سے
شکایت باغ سے ہے یا گلہ ہے باغ کے دل سے

سید کاظم علی۔ باغ

غزل

ذوق جنون کے واسطے ساماں نکالئے
یعنی برہنگی میں گریباں نکالئے ہاں ہاں

نالے وہ کھینچئے کہ ابھر آئیں دل کے داغ
ہر گوشۂ قفس سے گلستاں نکالئے

اب حسرتوں کے سوگ میں دل خون ہی سہی
کچھ تو علاج گردش دوراں نکالئے

ملتی ہیں کوئی شوق شہادت کی کاوشیں
رگ رگ سے آپ لا کے رگ جاں نکالئے

مجنوں۔

ولیم ورڈسورتھ

ولیم ورڈسورتھ ۷ اپریل ۱۷۷۰ء کو کمبرلینڈ کے ایک قصبہ کاکرسمتھ میں پیدا ہوا۔ اسکا باپ لارڈ لاؤنسڈیل کا گماشتہ تھا۔ ورڈسورتھ کے والدین اسکو
بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ اسکی تعلیم کا سلسلہ نواح کے ایک مقام ہاکس ہیڈ میں شروع ہوا جہاں اس نے طالب علمی کی زندگی سے پورا لطف اٹھایا۔ ۱۷۸۷ء
میں سینٹ جان کالج کیمبرج میں داخل ہوا۔ لیکن وہاں وہ کوئی ممتاز حیثیت نہ حاصل کر سکا۔ اپنے اکثر معاصرین کی طرح ورڈسورتھ بھی انقلاب فرانس
کا ایک سرگرم حامی تھا۔ چنانچہ کالج سے اپنی ڈگری لیکر وہ فرانس چلا گیا تھا۔ مگر "عہد مظالم" (Reign of Terror) کی بدنظمیوں نے
اسکو انگلستان بھاگ آنے پر مجبور کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ورڈسورتھ کو اپنی زندگی غیر مستقل نظر آتی تھی۔ ۱۷۹۵ء میں وہ ڈارسٹ شائر میں مقیم رہا اور پھر الفاکسڈن
جہاں اسکی کولرج (S. T. Coleridge) سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ۱۷۹۳ء میں وہ اپنی نظموں کا ایک مجموعہ شائع
کرا چکا تھا۔ اب ۱۷۹۸ء میں برسٹل سے ایک دوسرا مجموعہ نکلا جس میں ورڈسورتھ کی نظموں کے علاوہ کولرج کی "معمر جہازی" (Ancient Mariner) اور
دو ایک دیگر مختصر نظمیں بھی شامل تھیں۔ ۱۷۹۸ء کے آخر میں یہ دونوں دوست ہمراہ جرمنی گئے اور ورڈسورتھ نے جاڑے کا پورا موسم گاسلر میں
بہن کی صحبت میں صرف کیا۔ انگلستان واپس آنے کے بعد اس نے ہمیشہ کے لیے اپنے قدیم کوہسار وطن اور گریسمیر میں بود و باش اختیار کر لی۔ یہاں تیسرے
اپنی بہن کے ساتھ رہنے لگا اور شاعری کو اپنا وظیفۂ زندگی بنا لیا۔ ۱۸۰۰ء میں اسکی نظموں کا ایک نیا مجموعہ شائع ہوا۔ ۱۸۰۲ء اس نے میری
(Mary Hutchinson) سے شادی کر لی اور جھیلوں کے کنارے اپنا مستقل مسکن بنا لیا۔ اس صدی کے
آغاز میں وہ بہت مشغول رہا۔ چھوٹی چھوٹی نظموں کے علاوہ جن کے محرک موسمی اور وقتی جذبات ہوا کرتے تھے ورڈسورتھ ۱۷۹۹ء سے ۱۸۰۵ء تک ایک
طویل نظم کے تیار کرنے میں منہمک تھا جسکا عنوان "تمہید" (The Prelude) رکھا گیا ہے۔ اس بیش بہا نظم میں اس نے اپنے
کی نشو و نما اور اسکی مفصل تاریخ بیان کی ہے۔ در اصل وہ "تمہید" کو ایک اور گراں مایہ اور فلسفیانہ نظم کا مقدمہ بنانا چاہتا تھا جسکو وہ "عزلت گزین"[1]
کے عنوان سے لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن جو کسی نہ کسی وجہ سے معرض اظہار میں نہیں آنے پائی۔ "عزلت گزین" کے کچھ حالات اسکی ایک دوسری
نظم "تفریح"[2] میں مل سکتے ہیں جو ۱۸۱۴ء میں طبع ہوئی۔ ورڈسورتھ کی شاعری جذبات عالیہ اور لطیف محسوسات کی تحت میں ہوا کرتی
چنانچہ وہ برابر نظمیں لکھتا رہا۔ وائل عمر میں صرف ایک بار اس نے ایک ڈرامہ "ساکنان سرحد"[3] کے نام سے لکھنے کی کوشش کی تھی جس میں کامیابی
نہیں ہوئی۔ ورڈسورتھ سیاسی اور اجتماعی مسائل میں بے حد دلچسپی رکھتا تھا اور وہ ایک زبردست ذی اثر نثار بھی تھا۔ اسکی زندگی مسلسل فراغت
میں گزری اور مسرت و انبساط کے ساتھ گزری۔ ۱۸۴۳ء میں وہ لاریٹ (Laureate) یعنی "تاج الشعرا" مقرر ہوا اور ۱۸۵۰ء
میں بمقام رائڈل ماؤنٹ (Rydall mount) سپرد خاک ہوا۔

قبل اسکے کہ کسی کی شخصیت پر تنقید کیجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس سے موانست پیدا کریں۔ موانست
سے مراد یہ ہے کہ ہم بھی اسی فضا میں سانس لینے لگیں اور ورڈسورتھ کا سمجھنا تو اسوقت تک محالات سے ہے جبتک کہ ا

[3] Borderers [2] The Excursion [1] The Recluse

اصول کو اپنی زندگی کے مسلمات و بنا سکیں بے اکثر تعلیم یافتہ اور ذی تمیز احباب یہ پوچھنے کی ہمت کر بیٹھے ہیں کہ "خدا کے لیے بتاؤ ورڈزورتھ
میں کیا دھرا ہے؟" میں ان کی دقتوں کو خوب سمجھتا ہوں مگر اس کا جواب دو ایک جملوں میں نہیں دیا جا سکتا۔
قدر دانان ادبیات کا ایک ایسا گروہ بھی ہے جو ورڈزورتھ کی شاعری کو بچپن کے معصومانہ جذبات سے زیادہ اہمیت دینے کیلئے
تیار نہیں۔ اسی بنا پر معترضین نے اس کا خاکہ بھی اڑایا اور اس وقت مجھے لارڈ بائرن کی مشہور رائے یاد آتی ہے جو اس نے ورڈزورتھ
کی نظم "تفریح" (The Excursion) کی بابت ظاہر کی تھی۔
ایک نو سو صفحے کی نظم جس کا عنوان "تفریح" ہے ایسی طرز پر لکھی گئی ہے جو بیرے سے بے معاہرہ ہے۔
اس وقت میرا خطاب اسی گروہ سے ہے جس کا علم بردار بائرن تھا۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شاعری۔ اور خصوصاً ورڈزورتھ کی
شاعری کی قدر کرنے کے لیے کن خصوصیات کی ضرورت ہے۔ پہلی خصوصیت جو اس کے لیے لازمی ہے وہ یہ ہے کہ آپ میں "ظاہر پرستی"
جسے میں "دنیا پرستی" کہوں گا نہ ہو۔ "دنیا پرستی" کے معنی یہ ہیں کہ آپ محض کائنات کے ظاہری اور فانی رخ میں اسطرح محو ہو کر
رہ جائیں کہ اشیا کی ماہیت تک پہونچنے کا حوصلہ بھی باقی نہ رہے۔ ممکن ہے کوئی میری اس بحث کو فرسودہ یا مہمل سمجھ کر ہنسی میں اڑا دے
لیکن میں تماشا کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہی "دنیا پرستی" ہے جو انسان میں جاہ و جلال شان و شوکت اور دیگر لذات نفسانی کی ہوس
کر کے اس کی نگاہوں کو سطحی اور اسکی لوحِ شاعرہ کو تنگ بنا دیتی ہے۔ حواس ظاہری ہی کو وہ سب کچھ سمجھنے لگتا ہے۔ وحبیت اور وجدانیت جیسی
دولتیں اس سے چھن جاتی ہیں اور مادیت اس پر اسطرح غالب آتی ہے کہ ماورائے مادیت یا "عالم باطن" کے سمجھنے سے وہ بالکل معذور
ہو جاتا ہے۔ مگر دنیا میں جتنے علوم عالیہ مثلاً ریاضیات۔ الٰہیات اور مابعد الطبیعات یا فنون لطیفہ مثلاً شاعری۔ مصوری اور موسیقی۔ ہیں
ان کو مادیت سے کوئی مناسبت نہیں اور آجتک ان علوم و فنون کے جتنے ماہرین گزرے ہیں سب اپنی زندگی میں مادیت سے گریز کرتے رہے ہیں
یہ ریاضیات کا ایک مسئلہ یاد آ گیا جو بیان کرتا ہے کہ "جب میں نے ریاضیاتِ عالیہ کا مطالعہ شروع کیا تو میرے ذہن میں ایک عجیب کیفیت پیدا
ہو گئی جس نے مجھے ایک دائم الوجود اور قائم بالذات ہستی کو تسلیم کر لینے پر مجبور کر دیا"۔ ورڈزورتھ کو سمجھنے کے لیے بھی ایسے ہی دل و دماغ کی ضرورت ہے۔
ورڈزورتھ انگریزی زبان کا پہلا شاعر ہے جس نے فلسفہ کو موضوع شاعری بنایا اور اس نقطۂ نظر سے ایک ممتاز مرتبہ حاصل کیا۔ اس نے
اپنی زندگی کا نصب العین یہ بنا رکھا تھا کہ ان مسائل پر غور و فکر کرے جو حیات انسانی اور فطرت سے متعلق ہیں۔ وہ شاعر تھا اور شاعری کا عنصر اس
میں اسطرح ودیعت ہوا تھا کہ وہ اسکو عمل میں لانے سے کسی حالت میں باز نہیں رہ سکتا تھا۔ اسکا خیال تھا کہ ہستی کی حقیقت یا (اصطلاحی الفاظ میں)
مظاہر و حوادث کے پس پشت ذوات و اعیان تک اور پھر گزر کر اس حقیقت اعلیٰ تک جو تمام حقیقتوں کی جان ہے جسے مذاہب عالم نے علت العلل
مانا ہے۔ پہونچنے کا بہترین ذریعہ شاعری ہے۔ وہ شاعری کی وساطت سے اس حقیقت کو عوام الناس کے دلوں میں جاگزیں بنانا چاہتا ہے۔ وہ خود
کہتا ہے "ہر بڑا شاعر ایک معلم ہوا کرتا ہے میں یا تو معلم ہونا چاہتا ہوں یا کچھ نہیں" اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک کامیاب معلم ہو کر رہا۔ اسکی
وہ فطرت تھی جو اپنے نت نئے کرشموں کے ذریعے سے اس کو ہر لمحہ ایک نیا سبق دیا کرتی تھی۔ اور وہ اس سبق کو اپنی شاعری کے وسیلے سے دنیا والوں تک
پہونچا دیتا تھا۔ لیکن دنیا والے ایسے عطیہ کو جلد قبول نہیں کیا کرتے۔ ان کا شعور حواس ظاہری کے ہاتھوں اندھا ہو چکتا ہے اور وہ ماسوائے محسوسات کے

کوئی چیز نہیں سمجھتے سے جان و دل را طاقت آن جوش نیست بلکہ گر یم در جہان یک گوش نیست ورڈسورتھ خدا کی دنیا سے بھاگ گیا ہو ۔۔ ہم اپنی قوتوں کو حاصل کرتے ہوئے اور (بے تامل) صرف کرتے ہوئے برباد کر ڈالتے ہیں ہم فطرت کے اندر ان چیزوں کو بہت کم دیکھتے ہیں جو ہماری ہیں ۔"

ورڈسورتھ اور شاعروں کی طرح صرف لوگوں کو خوش کرنے کے لیے نہیں لکھا کرتا تھا وہ لقریطیس (Lucretius) اور پوپ (Pope) کی طرح دوسروں کے خیالات و جذبات کو اپنی رنگین اور چست زبان میں ادا کر کے نقالی کا حق نہیں ادا کرتا تھا۔ ہومر (Homer) شکسپیر یا ملٹن کی طرح اپنی دنیائے شاعری کے احساس سے بیگانہ نہ تھا۔ یا شیلی (Shelly.) کی طرح فلسفیانہ خیالات سے پُر ہونے کے باوجود فلسفیانہ انضباط و استحکام سے عاری نہ تھا۔ عام شعرا کی طرح صرف حسن پرستی اور اپنے انقباض والم کے دردناک احساسات کے اظہار پر اکتفا نہیں کرتا تھا اپنی امید و رجا اور مایوسیوں کی داستانیں سُنا کر سننے والوں میں خوانخواہ جذبات ہمدردی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ وہ اپنے تمام جذبات و احساسات کے باوجود۔ انتہائی جوش کیفیات اور وجد کے عالم میں بھی اپنے اس فرض کے عملی رخ سے غافل نہیں ہوتا جو وہ سمجھتا ہے کہ اس کے سپرد ہوا ہے ۔ اس بارے میں ایک نبی سے کم خلوص و صداقت اس کے اندر نہیں۔ وہ اپنے فرائض کی تکمیل کے لیے اسی طرح ذمہ داری محسوس کرتا ہے جس طرح کہ ایک نبی۔

اس نے ۱۸۰۷ء میں لیڈی بیومانٹ (Lady Beaumont.) کو ایک خط لکھا تھا جس میں شاعری کے اغراض و مقاصد سے بحث کی گئی ہے ۔ وہ لکھتا ہے " مسرت کی دھندلی کرنوں میں تنویر کا اضافہ کرنا ۔ دردمند کی تسکین کرنا ۔ مسرور کو نشاط زیادہ مسرور بنانا ۔ ہر زمانہ کے پیر و جوان میں دیکھنے ۔ سمجھنے اور غور کرنے کی قابلیت اور مستحکم اور موثر فضائل پیدا کرنا ۔ یہ ہے شاعری کی غرض و غایت "

ورڈسورتھ اور انگریزی زبان کے دوسرے شعرا میں مابالامتیاز کیا ہے اس کو کولرج نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جس کا خلاصہ سُن لیجئے ۔ اس کے خیال میں شاعری کا تقاضہ یہ ہے کہ مشاہدات کی واقفیت اور اپنی قوت متخیلہ میں جس کے ذریعہ اس واقعیت کو ظاہری جامہ سے آراستہ کرتا ہے اشاعر ایک لطیف توازن قائم کرلے ۔ قدیم اور جدید میں کوئی تضاد یا مخالفت نہ محسوس کرے ۔ عہد طفولیت کے احساسات کو شباب اور مابعد شباب کی قوتوں میں تبدیل کر دے ۔ طفلانہ استعجاب و تحیر اور زندگی کے اُن حادثات کے درمیان جن کا چالیس برس تک انسان تجربہ کرتا ہو کوئی لازمی ربط ڈھونڈھ نکالے ۔ ورڈسورتھ میں یہ خوبیاں بدرجہ اکمل موجود تھیں اور اس نقطہ نگاہ سے کوئی دوسرا شاعر اس سے ہم سطح نہیں ہو سکتا۔

شاعر کا ایک خاص امتیاز یہ یقین بھی ہے کہ جن چیزوں کا ہماری آنکھیں مشاہدہ کرتی ہیں جن سے ہمارے حواس متاثر ہوتے رہتے ہیں جسے "دنیا و مافیہا" کہتے ہیں بیگانۂ اصلیت ہیں اور جن چیزوں کا ہمکو کوئی احساسی علم نہیں ہو سکتا جو ہمارے دائرۂ ادراک و تعقل سے باہر ہیں انھیں میں اصلیت ہے اور وہی حقیقی وجود رکھتی ہیں ۔ شاعر اسی واجب الوجود حقیقت کو اسی قائم و دائم اصلیت کو اسی حُسن ازل کو "جس کو نہ آنکھوں نے دیکھا ہے نہ کانوں نے سنا ہو اور نہ کسی کے دل میں اسکا کوئی تصور گزرا ہے" عالم صورت میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ میں اس جگہ میکائیل انجیلو کی ایک نظم کا کچھ حصہ سناتا ہوں جسکا خود ورڈسورتھ نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے :-

---

لہ لقریطیس اپیقورس کا پیرو اور "ابتہاجیت" (Hedonism) کا زبردست حامی ایک رومی شاعر تھا اور ۵۵ قبل مسیح میں مر گیا تھا۔

" طرح جس شخص کی پرورش پانی سے فردوس ہی کی طرف مائل پرواز رہیگی۔ وہ عالم ظاہری کے حدود سے باہر ایک تخیلی چیز کی جستجو
لیے قالب کی جستجو میں اڑتی پھرتی ہے۔ کیونکہ جو چیزیں ہمارے حواس ظاہری کو محظوظ کرتی ہیں وہ یکسر فریب ہیں اور ناپائدار مجھے یقین ہے کہ کوئی
بھی کسی ایسی چیز سے سکون حاصل نہیں کر سکتا جو فنا ہونیوالی ہے اور وہ اپنے دل کو کسی ایسی چیز سے وابستہ کر سکتا ہے جو قیود زمانی کی محتاج نہ ہو"
یہ ہے صنعت عالیہ کا صحیح نظریہ۔ وہ اس حیثیت سے شاعری دیگر صنعتوں اور مذہب کی طرح اپنے پرستاروں کو ایسی دنیا میں پہونچادیتی ہے جہاں کہ
مادی دولت حاصل نہیں ہوتی اس لیے میں بلا خوف تردید اعادہ کروں گا کہ تاوقتیکہ کہ انسان کی آنکھوں کو اس خاص قوت سے منور کرکے ایک
بصیرت عطا ہو جو ہمکو " مرئیات " کی چہار دیواری سے باہر دیکھنے کے قابل بناتی ہے۔ شاعری اور وہ بھی ورڈسورتھ کی شاعری کا سمجھنا ناممکن ہے
اس باب میں خود ورڈسورتھ کی رائے سننے کے قابل ہے۔ اسکا عقیدہ ہے کہ دنیوی ثروت و امارت جاہ و اقبال انسان کو روحانی زندگی
کے کمالات سے محروم کردیتے ہیں۔ ستمبر گذشتہ ء میں اس نے ایک نظم لکھی تھی جسکا ایک ٹکڑا میں یہاں درج کرتا ہوں۔ اس میں انھیں خیالات کا اظہار
کیا ہے۔ جمالیاتی نظم کو کسی کو مخاطب کرتی ہے۔

" اے میرے رفیق مجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے سکون کے لیے کہاں جاؤں ایسے عالم میں کہ میں اس خیال سے آزردہ ہو رہا ہوں کہ ہماری
زندگی صرف نمائش کے لیے ملبوسات کی مرہون (اور) صنعت گروں۔ باورچیوں اور سائیسوں کا ایک ذلیل نمونہ دستکاری ہو کر رہ گئی ہے!
ہم کو ایک چمکتے ہوئے دریا کے مانند آفتاب کی شعاعوں میں رواں دواں رہنا چاہیئے ورنہ ہم منحوس ہیں جو ہم میں سب سے بڑھکر صاحب ثروت
ہو وہ سب سے زیادہ اچھا سمجھا جاتا ہے۔ قدرت اور کتابوں کی عظمت اب ہم کو آسودہ نہیں کرتی " اس سے پڑھنے والوں کو بہت کچھ اندازہ ہو سکتا ہے
ورڈسورتھ کیا چاہتا تھا اور اسکی شاعری کی قدر کرنے کے لیے " ظاہر پرست " نہ ہونا کس حد تک لازمی ہے۔

دوسری خصوصیت جو ایک بلند شاعر اور اسکے سمجھنے والے میں ہونی چاہیے وہ جذبات کی گہرائی اور حسیات کی لطافت ہے۔ شاعری کی ہر صنف
کے لیے یہ خصوصیت لازمی نہیں۔ رزمیہ شاعری سے ہر شخص لطف اندوز ہو سکتا ہے وہ ایسی چیزوں کا بیان کرتا ہے جس کا تعلق ہر فرد بشر سے ہے
ڈرامہ ولیم شاعری سے ہر کوئی لذت یاب ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ کبھی کبھی ایسے نرالے قماش کی ہستیوں سے ہمکو روشناس کراتا ہے جن کو سمجھنا عوام
کے لیے آسان نہیں ہوا کرتا تاہم اکثر کیرکٹر نمونہ معمولی ہوتے ہیں اور جماعت انسانی اس سے متاثر ہو سکتی ہے۔ یا کوئی ایسا شاعر جو ہمارے
سطحی جذبات عامہ کی ترجمانی کرتا ہے ہر کس و ناکس کو یکساں محظوظ کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ جذبات کم و بیش تمام بنی نوع انسان میں مشترک
پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹامس مور یا اسکاٹلینڈ کے مشہور شاعر برنس کو لے لیجیے۔ ان کی قدرشناسی کے لیے عمیق جذبات اور نازک
حسیات کی چنداں ضرورت نہیں۔ مگر ان کے علاوہ کچھ ایسے شاعر بھی ہوتے ہیں جو ہمکو پوشیدہ حقائق سے آشنا کرتے ہیں ان کی قدر کچھ وہی
کر سکتا ہے جو یہ غور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو کہ ہمارے " نفسیات " کی ترتیب کیا ہے اور ہمارے اندر مختلف کیفیات یکے بعد دیگرے
کیونکر پیدا ہوتی رہتی ہیں؟ انکی اصلیت کیا ہے اور انکی ابتدا و انتہا کہاں ہوتی ہے؟ اور جو ورڈسورتھ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اسکے لیے
جسقدر اس غائر قوت تخیل کی ضرورت ہے اتنی کسی اور کے لیے نہیں ہے۔ کیونکہ ورڈسورتھ نفس انسانی کی ایک سادہ مگر نہایت نازک اور لطیف
ترکیب سے ہمکو آگاہ کر دیتا ہے جسکو ہماری عقل بغیر تجزیہ کیے ہوئے نہیں سمجھ سکتی۔ اور تجزیہ ترکیب کا خون کر ڈالتا ہے اور فطرت کا آہنگ برباد ہو جاتا ہے

عقل در کار عشق نابیناست عاقلی کار بو علی سیناست

ورڈسورتھ کی شاعری ہمکو اس قابل بنادیتی ہے کہ ہم اپنی حیات باطنی کی سبک رفتار کو محسوس کرسکین سوہ ہماری انفرادی روح کو کائنات کی روح سے ملو کردیتا ہے ۔ مین مثالین پیش کرنا چاہتا ہون ۔ لیکن مجھے ان دقتون کا پورا علم ہے جو اس راستہ مین حائل ہوسکتی ہین اول تو ورڈسورتھ کے افکار مین جسقدر بلندی اور لطافت ہے اسیقدر وہ عوام کی سمجھ سے بالاتر ہین ۔ دوسرے ترجمہ مین اندیشہ ہے کہ اس کے خیالات کا اصلی رنگ مدہم نہ پڑجائے ۔ تاہم کوشش کرکے کچھ ایسی مثالین جابجا دیتا رہون گا جو عام فہم ہین ۔ اسوقت آپ لوگون کو مین "تمہید" کے اس حصہ کی طرف متوجہ کرتا ہون جو میرے متذکرۂ بالا دعوے کی تصدیق کرے گا ۔ اسمین طلوع سحر کے وہ روح افزا اثرات بیان کیے گئے ہین جو ایک بیگانۂ چون وچرا بچہ کے دل مین پیدا ہوتے ہین :-

"اسکی اسوقت بھی کیا روح تھی جبکہ وہ کسی بہتہ سے "راس" کے کنارے آفتاب کو نکلتا ہوا اور کائنات کو نور مین نہلاتا ہوا دیکھتا ۔ وہ دیکھتا ہوتا (اور) سمندر اور زمین ۔ ٹھوس زمین اور سیال سمندر اس کے قدمون کے نیچے غیر متناہی انبساط و مسرات مین محو ہوتے بادل تاثیرات قبول کرتے اور اُن کے خاموش بشرے مین وہ ایک ناقابل اظہار جوش محبت پاتا ۔ نہ کوئی چیز محتاج اصوات تھی اور نہ کوئی مسرت پابند اظہار ۔ اس کی روح اس منظر سے سیراب ہورہی تھی ۔ احساس ۔ صورت اور روح ۔ یہ سب گویا اسی کی ہستی مین حل ہورہے تھے ۔ اور اس کے حیوانی وجود کو نگل رہے ۔ وہ انھین مین جی رہا تھا .... یہی سب اس کی زندگی تھے اس عروج ذہنی کے عالم مین اس ساعت سعید مین جبکہ "حیّ القیومؐ" اسکو اپنے دیدار سے مشرف کرتا ہوتا ۔ وہ نہ کوئی شکریہ ادا کرتا اور نہ کوئی التجا پیش کرتا وہ ایک ایسے عالم مین ہوتا جو شنا و دعا کے ناقص فرائض سے بالاتر ہے ۔ اسکا نفس بجائے خود ایک تشکر نامہ تھا اس "قوت" کے نام جس نے اسکو بنایا ۔ وہ سراپا سعادت اور محبت تھا"۔ اگر کوئی مفقود الحس اس عالم کیف کے حقیقی وجود سے بے تامل انکار کردے تو مجھے اسکا فرنہین تو بدنصیب کہہ لینے کی اجازت دیجیے ۔ ہر وہ شخص جو سحر خیزی کا عادی ہو اور سریع قوت حاسہ رکھتا ہو "ان لک فی النہار سبحاً طویلا" کے راز کو بخوبی سمجھ سکتا ہے وہ کرشمہائے قدرت کے آگے حق عبودیت ادا کرنے پر مجبور ہے ۔ (سبحاً طویلا" سے خواہ مخواہ مین تہجد و اشراق یا لمبی چوڑی نمازین مراد نہین لینا اور میری رائے مین اس آیت کا صحیح مفہوم وہی ہو سکتا ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے)

ورڈسورتھ کی بابت بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اس معیار متانت ۔ اس "شیرین طمانیت" تک رسائی حاصل کرلی تھی جس کو اہل یونان نے اسقدر اہمیت دے رکھی اور جسکا ایک تخیلی نمونہ سوفوقلیس تھا ۔ اس کے علاوہ میتھو آرنلڈ (Methew Arnold.) کے اس قول کو بھی دیکھیے کہ ورڈسورتھ کی شاعری مین ایک قوت مسیحائی ایک سکون آفرینی ہے جو ہماری افسردگی کو حوصلہ سے ہماری الناکی کو مسرت سے اور ہمارے انتشار کو دلجمعی سے بدل دیتی ہے ۔ یہ بات شیلی ۔ بائرن ۔ براؤننگ ۔ ٹینی سن کسی کو نصیب نہین ۔ ورڈسورتھ کی اس قوت کو جان اسٹورٹ مل (John Stuart Mill) سے پوچھیے ۔ مل پر افسردگی اور اضطراب کا عالم یکے بعد دیگرے طاری ہوا کرتا تھا ۔ اس نے برابر کوششین کین کہ اسکو ان آفتون سے نجات ملے ۔ اس نے بائرن کا مطالعہ کیا لیکن اس سے اس کے انقباض قلب

ترجمہ مین جابجا تصرف کرنا پڑا تاکہ مفہوم صاف ظاہر ہوسکے ۔ (Living God) کے لیے اس سے زیادہ موزون لفظ میرے ذہن مین نہین آیا ۔

ت کچھ اور اضافہ ہوا اور اسکی دہشت میں سرمو فرق نہ ہوا - آخرکار اس نے ورڈسورتھ کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور اسکی جان کا بیان نہ ہو گئیں ساری کا
اِت اس نے اپنی "حیات خود نوشتہ" میں بیان کیا ہے - "میں نے ورڈسورتھ کی "تفریح" کا مطالعہ کیا اور اس سے مستفید نہ ہو سکا - لیکن جب
ہ نے اس کے متفرقات کو پڑھا جو ۱۸۱۵ء میں دو جلدوں میں شایع ہوئی تھی تو معلوم ہوا کہ مجھے اپنی دماغی ضروریات کیلئے ایسے نازک وقت میں
س چیز کی تلاش تھی وہ یہی ہے ....

....

یہ ورڈسورتھ بھی مجھ پر کوئی خاص اثر نہ کر سکتا اگر وہ میرے سامنے محض مناظر قدرت کی حسین تصویریں پیش کرتا - کیونکہ اسکا تو اس کام کو ورڈسورتھ
مصوّرین زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتا ہے اور ایک دو مجھ کی تصویر اس باب میں بہ نسبت شاعر کے زیادہ کامیاب ہو سکتی ہے - اصل چیز جس نے
ڈسورتھ کی نظموں کو ایسی دماغی حالت میں میرے لیے دلدوز تسکین ثابت کیا یہ تھی کہ وہ محض حسن صوری سے بحث نہیں کرتا بلکہ ان جذبات و تصورات کا اظہار
ہے جو حسن کی تحریک سے پیدا ہوتے ہیں ....

یہ وہ اس شخص کی راے تھی جو افادیت (Utilitarianism.) اور اثباتیت[۵] (Positivism.) کا قائل ہوا
سلسلہ جو اپنی "دہریت" کے ہاتھوں "نفس مطمئنہ" سے محروم ہو چکا تھا۔

کل نے اسی سلسلہ میں ورڈسورتھ کو "غیر شاعروں کا شاعر" کہا ہے یعنی وہ ان لوگوں میں جو ذوق شعری سے یکسر عاری ہیں ایک سنجیدہ اور مہذب
ہموار نہ مذاق پیدا کر دیتا ہے - فی الحقیقت اسی کی ضرورت ہے اور میری راے میں شاعرانہ عظمت کا معیار بھی یہی ہونا چاہیے -
کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ورڈسورتھ ہم میں سکون و آسودگی اس وجہ سے پیدا کر دیتا ہے کہ وہ معاش کی دقتوں سے ایک حد تک زد
ر افکار روزی سے آزاد تھا یعنی وہ خود آسودہ تھا - اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ورڈسورتھ ایک خوش حال گھر کا مالک تھا لیکن یہ کہنا
ے انصافی ہے کہ اسی وجہ سے اسکی شاعری ہمکو دلجمعی اور اطمینان بھی بخشتی ہے - اسکی یہ صفت خداداد تھی - فطرۃً اسمیں ودیعت ہو چکی تھی
ی سلسلہ میں یہ بھی واضح ہو جانا چاہیے کہ ورڈسورتھ کی "شیرین طمانیت" جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ایک فلسفیانہ طمانیت تھی -
ظ "فلسفیانہ" سے بھڑکنا نہیں چاہیے - زندگی کے جن خاص اصول و مبادی کو کوئی شخص بمنزلہ ایمان مان لیتا ہے اسی کو ہم اسکا
ی فلسفہ کر سکتے ہیں - یہ دوسری بات ہے کہ وہ ان اصول مسلمہ کو مصوری کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے یا موسیقی کے کسی شعر میں بیان کرتا ہے
کانٹ کی طرح "نقاد عقل کل[۶]" میں اور برگسان کیطرح "ارتقاے تخلیقی[۷]" میں -
ورڈسورتھ کے نظریات شاعری جو اس نے نظم و نثر میں کاوش کے ساتھ مرتب کیے تھے اب اسقدر کہنہ سمجھے جانے لگے اور لوگ ان کو
تہ رفتہ بھول رہے ہیں - مگر اس کے پڑھنے والوں میں سے کوئی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس نے اپنی نظموں میں نہایت واضح
یقین اصول زندگی بیان کیے ہیں وہ غور و فکر کی زندگی کو کاروبار کی زندگی پر ترجیح دیتا ہے - لیکن اسکی لغت میں غور و فکر سے مراد کچھ

[۵] یہ وہ مسلک ہے جس کے پیرو صرف مشاہدات عینی کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں اور مظاہر حوادث کے حدود سے آگے نہیں بڑھتے [۶] کانٹ (Kant) (مشہور
بن فلسفی ہو گذرا ہے) کی ایک معروف تصنیف مابعد الطبیعیات پر [۷] برگسان (Bergson) فرانس کا مشہور فلسفی جو ابھی زندہ ہے (The Critique of Pure Reason)
[۷] برگسان کی مشہور الآرا تصنیف جسمیں عقل انسانی کی بے اعتباری نہایت کامیابی کے ساتھ ثابت کی گئی ہے - (Creative Evolution)

اور جمود نہیں ہے۔ پیشانی کے پسینہ کی طرح دل و دماغ کا پسینہ بھی ایک چیز ہوا کرتا ہے ورڈسورتھ کے یہاں غور و فکر کا یہ مفہوم ہے کہ اپنی زندگی دماغی محنت اور روحانی مشقت کے لیے وقف کردو۔ اسی طرح روحانی ترقی ممکن ہے وہ دنیا کے عام معاملات سے اس لیے کنارہ کش ہونا چاہتا ہے کہ روح اپنے کام کو انجام دینے کے لیے بہترین موقع پا سکے گویا وہ فی الحقیقت "روحانی عملیت[1]" (Spiritual activism) کا مبلغ ہے۔

اب تھوڑی دیر کے لیے یہ دیکھنا ہے کہ خود ورڈسورتھ کے دماغ میں امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ کیا کیا انقلاب ہوتے رہے اس نے "تمہید" میں بسط شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس پر فطرت اور تعلیم کے کیا اثرات پڑے۔ لیکن اسکی دوسری نظمیں بھی اسبات پر کافی اور شاید "تمہید" سے زیادہ روشنی ڈالتی ہیں۔ اس لیے کہ ان نظموں میں وہ شعوری طور پر نہیں بلکہ غیر شعوری طور پر اپنی ہستی کو بے نقاب کرتا ہے اسکے کلیات کے مجموعی مطالعہ کے بعد ہمکو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ فطرت اور حیات انسانی کے متعلق اس کے جو عقائد تھے ان میں رفتہ رفتہ کیا کیا ترقیاں ہوتی رہی ہیں۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ اسکی عمر کا ابتدائی زمانہ

"انسان کے ذلیل اور مبتذل مصنوعات کے ساتھ نہیں بلکہ اعلیٰ مناظر اور پائدار چیزوں کے ساتھ گزرا ہے"

وہ کوہستانی کسان جن کے درمیان وہ اپنی زندگی بسر کرتا تھا اور جنکی بابت بعد کو اتنا کچھ لکھ گیا اسکی نگاہ میں اور لوگوں سے برتر اور برگزیدہ تھے اس لیے کہ وہ ہر موسم میں اپنے گرد ایسی قوتوں کو محسوس کرتے رہتے تھے جو اُن کے اختیار سے باہر تھیں اور جو کبھی مثلاً بہار کے ایام میں ان پر مہربان ہوتی تھیں اور کبھی مثلاً برف و باران کے دنوں میں انسان کی محنت و مشقت اور اسکی زندگی کی پیچیدگیوں کا لحاظ کیے ہوئے بغیر بلا کسی ظاہری سبب کے برہم ہو جایا کرتی تھیں انسان کو وہ سمجھ چکے تھے کہ خوفناک قوتوں اور ہستیوں کے درمیان جد و جہد کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔

بچپن میں بھی ورڈسورتھ کے حساس دماغ میں دو طرح کے تاثرات اپنا نقش جما رہے تھے۔ وہ اپنے گرد ایک ایسی روح حیات محسوس کر رہا تھا جو اسکی اپنی نہ تھی۔ بحر و بر اور شجر و حجر بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکو کوئی پیغام سنانا چاہتے ہیں پہاڑ کی سربلند چوٹی "گویا اپنے سر کو ایک اختیاری قوت کے ساتھ اٹھائے ہوئے تھی"۔

اسوقت تک اسکو ہستی کی غیر معلوم اور فوق الادراک صورتوں کا محض ایک مبہم اور غیر متعین احساس تھا۔ مگر کچھ نہ کچھ احساس تھا ضرور۔ وہ کبھی خیال ہی نہیں کر سکتا تھا فطرت میں جمود یا بے ربطی ہو سکتی ہے۔ اسکا ایمان یہ تھا کہ فطرت کی نیرنگیاں کتابوں سے کہیں زیادہ مفید سبق ہمکو دے سکتی ہیں جیسا کہ اسنے ایک جگہ کی نظم میں لکھا بھی ہے۔

"کہ ایسی قوتیں بھی ہیں جو خود بخود ہمارے ذہن میں اپنے نقوش قائم کر لیتی ہیں۔ ہم اپنے ذہن کو ایک دانشمندانہ مجہولیت میں پرورش دے سکتے ہیں"

مجھے بیدل کا ایک شعر یاد آگیا جس کا فلسفہ بھی یہی ہے۔

سر بسر چون مہر زستان نیست   خیرہ آئینہ پرداز ش و حیران باش

بیدل کی "حیرانی" اور ورڈسورتھ کی "دانشمندانہ مجہولیت" دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔

---

[1] عہد حاضرہ کے ایک وسیع فلسفی یوکن (Rudolph Eucken) کے فلسفہ کا یہی نام ہے ۔۔۔ ایک فرضی ۔۔۔ فلسفہ کا پیرو ہے۔

لیکن اس احساس کے علاوہ جو آگے چل کر اس کو فطرۃ کا پرستار اور ترجمان بنانے والا تھا ورڈسورتھ میں اسی زمانہ سے ایک خاص سنجیدگی کے
ساتھ قلب میں پرورش پا رہا تھا جو بعد کو اسکا طرۂ امتیاز ہو کر رہا۔
افلاطون مدتوں پیشتر اس بات پر غور کر چکا ہے کہ خوشنما مناظر اور دلکش نغمات نوجوانوں کے ذہن میں حسن تخیل پیدا کرنے اور ان کے جسم کو پرکشش بنانے
میں کہاں تک حصہ لے سکتی ہے۔ ورڈسورتھ نے بھی لوسی (Lucy.) پر جو نظم لکھی ہے اسمیں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔
"استقبال جو کہ انسان کے تمام روحانی امن و مسرت کا ذریعہ خلوت ہی ہے" وہ (فطرۃ) ہمارے نفس کو اسطرح خودار کر سکتی ہے۔ اس طرح
حسن اور طمانیت سے متاثر کر سکتی ہے اور خیالات سے اسطرح مملو کر سکتی ہے کہ بدزبانیاں۔ وحشیانہ فیصلے خود غرض لوگوں کے تمسخرات جیسا تپاک
جس میں خلوص کا کوئی شائبہ نہ ہو بار و نانہ زندگی کے خوفناک ربط و ضبط نہ تو ہمارے خلاف کامیاب ہو سکتے ہیں اور نہ ہمارے اس پرسکون اعتقاد میں
خلل ہو سکتے ہیں کہ جو کچھ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے وہ برکتوں سے معمور ہے۔
لیکن فطرۃ ایک مجمل سی اصطلاح ہے اور ورڈسورتھ کے نقطۂ نظر سے اسکی تفصیل ضروری ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم اسکے ذہن کیساتھ
اسکو سمجھنے کی بہترین صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان تمام منازل پر جنکو وہ رفتہ رفتہ طے کرتا رہا ہے ایک تبصرہ کیا جائے۔ اوائل عمر میں وہ شغلی
مسرتوں میں مصروف رہا اور اپنے ایام "وحشیانہ جذبات" کو آسودہ کرنے میں گزارے۔ مثلاً مچھلی کا شکار کرنا۔ پہاڑیوں کے درمیان ندیوں میں
غسل کرنا۔ موسم بہار میں صبح کے وقت پھول چننا۔ ہرے بھرے جنگلوں میں چڑیوں کے انڈوں کی تلاش کرتے رہنا۔ یقیناً اسکی تسکین جو اسوقت وہ
فطرۃ سے حاصل کر سکتا تھا۔ یا پھر شدید سردی کے موسم میں برف پوش جھیلوں پر پھسلتے وقت یا سر شام دریاؤں کی سیر کرتے ہوئے بھی وہ غافل
رہتا کہ کوئی چیز اسکی توجہ کی منتظر ہے جو اس سے محض ایک خوش باش اور غیر ذمہ دارانہ زندگی کے علاوہ کچھ اور بھی مطالبہ کر رہی ہے۔
اس کے بعد سے ورڈسورتھ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ فطرۃ ابھی تک اسکی ذاتی دلچسپیوں کے لیے ایک بازی گاہ سے
زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن اب اسکی نگاہ میں فطرۃ ہی سب کچھ تھے۔ اسکو یقین ہو گیا کہ عالم ظاہری صرف نقاب ہے ایک دوسرے
عالم کا جو غیر مادی ہے اور انسانی فہم و ادراک کی گرفت سے باہر ہے وہ اس زندگی کو ایک حیات اعلیٰ کے لیے حجاب سمجھنے لگا۔ حسن صوری آج تک
سب سند دیتے آئے ہیں اور کیٹس (Keats) کا معیار زندگی یہی ہے کہ حسن کی پرستش سے اپنے کو مکمل بناؤ۔ اپنے دلوں میں ایک
"الناک مسرت" ایک "پرمسرت الناکی" پیدا کرو۔ اہل یونان کی شاعری اور "ملفوظات افلاطون" میں آپکو اس موضوع پر کافی
مواد مل سکتا ہے۔ لیکن ورڈسورتھ پہلا شاعر ہے جس نے یہ سمجھنے کی کوشش کی اور خوب بھی لیا کہ حسن کا فلسفہ کیا ہے۔ مابعد الطبیعات
اور علم الٰہیات کی رو سے حسن کی کیا اہمیت ہے۔ وہ اس قوت سے واقف ہو چکا تھا جو انسان اور فطرۃ دونوں میں یکساں کام کر رہی ہے لیکن جو
دونوں سے برتر ہے۔ وہ اس بھید سے خبردار تھا کہ تخلیق حسن سے اس قوت کا مقصد یہ ہے کہ انسان میں جذبات عبودیت پیدا کر کے اس کو اپنا
مقرب بنالے۔ عبودیت سے مراد نماز یا "سجدہ" نہیں بلکہ اپنے معبود میں جذب ہو کر رہجانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اہل تصوف کی
اصطلاح "فنا فی اللہ" کا سنگ بنیاد یہی جذبہ ہے (اس جگہ میں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا کہ مروجہ تصوف کہاں تک حقیقت پر مبنی ہے

[1] ایک فرضی دوشیزہ جو ورڈسورتھ کی ایک نظم کی ہیروئن ہے ۱۲

اور اس میں نام و نمود اور مکر و احتیال کا شائبہ کسقدر رہے)۔ تیسرا دور وہ ہے جبکہ وہ "شاعر فطرۃ" ہونے کے قابل ہو گیا اور جو وجوہ ہیں ان کا لازمی نتیجہ معلوم ہوتا ہے اس دور میں دو اسباب نے ورڈ سورتھ پر خاص اثر ڈالے۔ پہلا سبب جیسا کہ اوپر کہیں بیان کیا جا چکا ہے انقلاب فرانس تھا جس نے عام طور پر لوگوں کے دلوں میں رسم و قیود کی طرف سے بیزاری پیدا کر رکھی تھی اور تحقیق و تدقیق غور و فکر کی جانب انسانی دماغ کو مائل کر دیا تھا۔ ورڈ سورتھ پر اس ہنگامۂ بیداری کا نسبتاً گہرا اثر پڑا۔ "انسان" جو پوپ (Pope) کے خیال میں صرف ایک بہترین مطالعہ کی چیز تھا ورڈ سورتھ کے لیے کہیں زیادہ مہتم بالشان ثابت ہوا۔ اس وقت کی وہ ادبی اخلاقی اور سیاسی دنیا جس کے لیے پوپ لکھا کرتا تھا ورڈ سورتھ کی نگاہ میں مذاق شعری سے قطعاً عاری تھی اور اس لیے اس قابل نہ تھی کہ اسکا شاعری میں ذکر کیا جائے۔ خود اپنی شاعری کے لیے اس نے کاشتکاروں اور دہقانیوں کی زندگی کو منتخب کر لیا تھا کیونکہ اس طرح انسان کے فطری جذبات اپنی پرورش کے لیے بہتر زمین پاتے ہیں۔ ان کے پھیلنے کے مواقع کم ہو جاتے ہیں اور وہ سادہ مگر زیادہ زوردار الفاظ میں ظاہر کیے جا سکتے ہیں۔ ہمارے جذبات اپنی قدرتی سادگی اختیار کر لیتے ہیں ان کا صحیح مفہوم ہمارے ذہن میں آ جاتا ہے اور اس وجہ سے ان میں اثر آفرینی کی قوت بھی بڑھ جاتی ہے۔ دیہات کی زندگی کے اجزاء ترکیبی ایسے ہی جذبات و احساسات ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دیہات کی زندگی زیادہ پائدار اور قابل تقلید ہے۔ اس لیے کہ اس زندگی میں انسانی فطرت کے حسین اور دائم البقا رشتوں کے ساتھ اتحاد عمل رکھتے ہیں۔ یہ ورڈ سورتھ کے خیالات کا خلاصہ ہے۔ روسو (Rousseau) کی تعلیم سے اگر ان خیالات کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ انقلاب فرانس نے لوگوں کے دماغ میں کیا تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔

دوسرا سبب جس نے ورڈ سورتھ کو اس کے ارتقاء دماغی کے تیسرے دور میں متاثر کیا وہ کولرج تھا جس کے وسیلے سے وہ جرمن اور یونانی متصوفین "(Idealists) سے آشنا ہوا۔

ورڈ سورتھ اس فلسفۂ "ہمہ اوست" کا قائل تھا جس کے لیے کرائوز (Krause) (ایک جرمن فلسفی) نے (Pan-Theism) کا لفظ استعمال کیا ہے اور جس کو انگریزی میں (Divine Immanence.) کہتے ہیں یعنی وہ یہ مانتا تھا کہ ایک روح یا حرکت ہے جو ہر جگہ اپنا کام کر رہی ہے خارجی حیثیت سے نہیں بلکہ داخلی حیثیت سے۔ اس قوت حیات کا مکمل مظہر انسان ہے" وجود کائنات کے ذرہ ذرہ میں ہے۔ لہذا دنیا کی حقیر ترین چیزیں بھی قابل احترام ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ خدا اور فطرۃ یا روح اور روح مطلق ایک ہی چیزیں ہیں۔ ورڈ سورتھ کی وحدانیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ رڈالف یوکن نے جو کچھ گیٹے (Goethe.) کے متعلق لکھا ہے اسکا یہاں حوالہ دیا جائے "گیٹے کی کل ہستی کی بنیاد خدا کو فطرۃ میں اور فطرۃ کو خدا میں دیکھنے کی خصوصیت تھی دنیا ایک حیات باطنی بھی رکھتی ہے......... ایک واحد قوت متحرکہ تمام کثرت میں مصروف کار ہے اور اسکو باہم مربوط کئے ہوئے ہے فطرۃ اپنے مختلف مظاہر میں صرف ایک خدا کو بے نقاب کرتی ہے۔ خدا دنیا سے علحدہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ وہ کسی خارجی قوت کی طرح دنیا پر مسلط ہے۔ اسکی قوت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ وہ باہر سے دنیا میں خلل اندازی کرے۔" یہ ہے گیٹے کے معتقدات مفصل اور اسی کو ورڈ سورتھ کا مسلک بھی سمجھنا چاہیے۔

ورڈ سورتھ کا علم مشاہدات باطنی کا نتیجہ تھا یعنی اشیاء کے علم کا اسمیں "ملکہ" تھا۔ یوں تو ہر شاعر صاحب باطن ہو

ولیم ورڈسورتھ اس لحاظ سے تمام انگریزی شعرا میں ممتاز نظر آتا ہے۔ وہ ایک نظم میں ایک ایسے "مبارک کیف ذہنی" کا ذکر کرتا ہے جس میں اس ناقابل فہم دنیا کا بھاری اور تھکا دینے والا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے:-

"سنجیدہ اور مبارک کیف ذہنی جس میں تاثیرات ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس قالب مادی کی سانس اور انسانی خون کی حرکت قریب قریب رک جاتی ہے۔ ہم اپنے جسم میں (بے خبر) سو جاتے ہیں اور ایک زندہ روح بن جاتے ہیں[1] - اور ایک ایسی قوت جو ہم آہنگی کی قوت اور عمیق جذبۂ مسرت سے ساکن ہو جاتی ہے ہم چیزوں کی ماہیت دیکھنے لگتے ہیں"

یہی عالم وجد ہے جسکا ذکر صوفیہ کرتے ہیں اور ہندوستان میں تو ذہنی اور جسمانی ریاضت کا ایک ایسا مستقل نظام ہی موجود ہے۔ اس "رکاوٹ" کو جسکا ورڈسورتھ اسقدر حامی ہے۔ اس وجدانیت کو جس کے توسط سے حقیقی علم ممکن ہے پیدا کر سکتا ہے۔ حوالت ذہنی اگرچہ کمیاب ہیں لیکن ورڈسورتھ انھیں کو مبادی علم انسانی کی بنیاد سمجھتا ہے۔ اور اسی لیے وہ سائنس اور منطقی قیاس و استدلال کو حقارت کے ساتھ رد کر دیتا ہے۔ عہد حاضرہ کے ممتاز حکما جن مسائل کو آج حل کر رہے ہیں ورڈسورتھ اُن کو کب کا حل کر چکا ہے۔ چنانچہ برگساں (Bergson.) کے "ارتقاء تخلیقی" کے اساسی خیالات اسکی شاعری میں موجود ہیں۔ مثلاً اسکی ایک معمولی نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو "فطرۃ جو سبق دیتی ہے وہ شیریں ہوتا ہے (مگر) ہماری خلل انداز عقل اشیا کی حسین صورتوں کو بگاڑ دیتی ہے۔ ہم تشریح الابدان کی غرض سے قتل کرتے ہیں" اب یہ دیکھیے کہ برگساں کیا کہتا ہے "عقل کی امتیازی خصوصیت ہے کہ ہستی کو سمجھنے سے قاصر ہے" "عقل کی بنا پر کام کرتے ہوئے ہم "عدم ارتباط جمود یعنی موت میں پناہ لیتے ہیں" "عقل انسانی حیات کو جمود کے ذریعہ سے سمجھتی ہے" بہ الفاظ دیگر "ہم تشریح کے لیے قتل کرتے ہیں" جب برگساں "بداہت" (Intuition.) کا ذکر کرتا ہے تب آپ "ملکہ" کہہ لیجیے تو ہمکو ورڈسورتھ کی "دانشمندانہ مجہولیت" یاد آجاتی ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ ہمارے ذہن کی پرورش ہو سکتی ہے یہی "دانشمندانہ مجہولیت" یا "بداہت" حقیقی علم کا ذریعہ ہو سکتی ہے اور ایسے ہی علم کو "معرفت" کہہ سکتے ہیں جو استدلال پر نہیں بلکہ براہ راست احساس باطنی پر مبنی ہو۔

ایک ماہر نباتیات (Botanist.) اور ایک شاعر دونوں گلزار میں جاتے ہیں اور دونوں پھول کی حقیقت دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ ماہر نباتیات پھول کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے اس کے اعضائے تناسل اور طریق تکاثر (Multiplication.) میں کھو جاتا۔ اسکی ترکیب کیمیاوی پر غور کرتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے مطالعہ سے فارغ ہوتا ہے تو ذرا اس سے پوچھیے کہ تمھارے علم میں کیا اضافہ ہوا اور تمکو اپنے علم سے کچھ سکون بھی ملا یا نہیں "کیوں؟" اور "کیا؟" اب بھی باقی ہے۔ برخلاف اس کے شاعر پھول کو دیکھتا ہے اور ایک نگاہ میں یہ معلوم کر کے مطمئن ہو جاتا ہے کہ۔

"در عدم ہم ز عشق شورے ہست　　　گل گریباں دریدہ می آید"

شاعر کا علم بدیہی ہوتا ہے اور ماہر نباتیات کا استقرائی یہی سبب ہے کہ موخرالذکر اس راز تک نہیں پہونچتا کہ ۔

ریاض ہستی کے ذرہ ذرہ سے محبت کا جلوہ پیدا　　　حقیقت گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیمان ہے رنگ و بو کا

[1] کبیر کہتا ہے کہ "میں نے اس (خدا) سے بغیر پاؤں کے چلنا بغیر آنکھوں کے دیکھنا بغیر کانوں کے سننا بغیر منہ کے کھانا اور بغیر پروں کے اڑنا سیکھا ہے"

وہ رنگ کو "کلور وفل" سے زیادہ کوئی چیز نہین سمجھ سکتا۔

افلاطون نے علم کی تعریف یہ کی ہے کہ چیزون کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھر از سر نو ان کی تعمیر نہ کی جائے بلکہ ابتدا ہی مین ان کو بیک نگاہ بحیثیت مجموعی سمجھنے کی کوشش کیجائے۔ تجزیہ سے ترکیب کا استنباط نہین بلکہ ترکیب سے تجزیہ کا استخراج ہونا چاہیئے۔ فلسفی کا فرض یہی ہے۔ یورپ کے وسیع ترین دماغ آجکل "تشریح" کے لیے زندہ جانورون کو ہلاک کرنے کے خلاف ہو رہے ہین اور ان مین برنارڈ شا اور ایڈورڈ کارپنٹر خاص طور پر قابل ذکر ہین۔

ہم اپنے بحث سے کسیقدر ہٹ گیا تھا۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ورڈسورتھ عقلی استدلال کے ذریعہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے اسکو حقیر تصور کرتا ہے۔ مولانا ے روم نے ایک جگہ "استدلالیون" کی ملامت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

فلسفی گفتی و آگہ نیستی — از کجا و با کجا ذکیستی

این حکیمان چون سبب آموختند — چشم از آیات قدرت دوختند

عقل را گر نیست قسمے از جنون — استعذ باللہ مما یفترون

گر باستدلال کار دین بدے — فخر رازی راز دار دین بدے

پاے استدلالیان چوبین بود — پائے چوبین سخت بے تمکین بود

اسی لیے ورڈسورتھ کہتا ہے۔

"ایک ہرے بھرے جنگل سے جو جذبہ تم مین پیدا ہوتا ہے وہ تمام حکماء سے کہین زیادہ تمکو انسان اور اخلاقی خیر و شر کے بارے مین سکھا سکتا ہے" کون کافر اس سے خلوص و صداقت کے ساتھ انکار کر سکتا ہے کہ

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار — ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

یہ تھا ورڈسورتھ کا فلسفہ کائنات جسمین افلاطون کے "نظریہ تصورات" (Theory of Ideas [illegible]) ارسطاطالیس کے کاشفات، فلوطینوس[1] اور شیلنگ (Schelling.) کے فلسفہ وحدت الوجود کی صدا ہائے بازگشت بھی شامل ہین اور سچ پوچھیئے تو کوئی فلسفہ کبھی نیا ہوتا ہی اور نہ ہو سکتا ہی مگر اس بحث سے قطع نظر کر کے ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہین کہ ورڈسورتھ کی شاعری اپنا فرض نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیتی ہے یعنی "وہ اندھی تسکین تھکی صبح کی دھندلی کرن مین تنویر کا اضافہ کرتی ہے اور مسرور کو اُسکا زیادہ مسرور بناتی ہے۔

مگر اس مضمون مین وارڈز (Words.) اور ایس جی ڈن (S. G. Dunn.) سے زیادہ مدد لی گئی ہے جن کا حوالہ دینا مین نے ضروری سمجھا۔

مجنوں گورکھپوری

---

[1] ورڈسورتھ پر مین نیون تو اکثر مبصرین کے تذکرے پڑھے ۱۲ سلہ فلوطنوس (Plotinus.) (سنہ ۲۰۵ء سے سنہ ۲۶۹ء تک) حکمت الاشراق یا "فلاطونیت جدید" (Neo-Platonismy.) کا بانی تھا۔

تازیانہ

(۱)

اس واقعہ ۱۳۲۵ء سے آج سے دو سو سال قبل جب سلطان غیاث الدین تغلق اپنے بڑے بیٹے محمد کے لیے اپنا تخت و تاج دے کر رخصت ہو گیا تو دہلی والوں کی خوشی انتہا کو پہونچ گئی کیونکہ غیاث الدین کا جانشین نہایت ہی بہادر، علم دوست اور فیاض شہزادہ تھا۔ ابتدائے سرما کا زمانہ ہے، جمنا گنگا سے ہم آغوش ہونے کے لیے جو بمشرق کی طرف اٹکھیلیاں کرتی ہوئی جا رہی ہے، اس کے کنارے پر بے شمار دلی والوں کا مجمع ہے۔ ہندو اشنان اور پوجا پاٹ کے لیے اور مسلمان سیر و تفریح کی خاطر جوق در جوق آئے ہوئے ہیں۔

دریا کے کنارے لوگ ابھی سیر و تفریح ہی میں محو تھے کہ ایک حیرت خیز خبر بڑی سرعت کے ساتھ چاروں طرف پھیل جاتی ہے اور سب لوگ وحشیانہ حالت میں شہر کی گلی کوچوں اور اپنے اپنے مکانوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔

محمد تغلق نے حکم نافذ کیا ہے کہ دہلی والوں کو اپنا اپنا گھر چھوڑ کر دیوگڑھی کی طرف نکل جانا چاہیے کیونکہ بعض مصلحتوں کی بنا پر پایۂ تخت دہلی سے دیوگڑھی منتقل کر دیا گیا ہے۔ دہلی سے دیوگڑھی تک راستہ صاف کرنے کے لیے شاہی فوج روانہ ہو چکی ہے، راہرووں کو ہر طرح آرام پہونچانے کا انتظام کیا جا چکا ہے۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کے لیے سواری کا انتظام خاص طور پر کیا گیا ہے۔ ہر مسافر کو سفری سامان کے علاوہ اچھا خاصہ اخراجات بھی دیا جانے والا ہے۔

چند ہی دنوں میں دلی کی بیشتر آبادی دیوگڑھی کی طرف نکل پڑتی ہے لوگ جوق در جوق بندھیاچل کے کوہستانی راستے عبور کر کے دکن کے میدانوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور شاہی فوج ان کو ہر طرح آرام و آسایش پہونچاتی ہے۔

دلی کا دکن کی طرف منتقل ہونا گو دلی اور دلی والوں کے لیے سخت صدمہ کی بات ہے لیکن اسی سے دکن کی تاریخ ایک زبردست پلٹا کھاتی ہے۔ سیاسی اور معاشی انقلاب کے علاوہ اس واقعہ نے دکن کے مذہب اور اس کی روحانیت پر جو اثر ڈالا وہ بہت مستحکم بالشان ہے۔ محمد تغلق کے زمانہ تک دلی کا شہر اسلام اور روحانیت کا ایک بحر مواج بن چکا تھا۔ لیکن پایۂ تخت بدلنے کے بعد اس کی روحانیت کی موجیں تیز و تند سیلاب کی شکل میں دکن کے عالیشان میدانوں کی طرف بڑھنے لگیں اور کچھ ہی عرصہ میں جملہ اطراف میں پھیل گئیں، چنانچہ اسوقت چودہ سو اولیا کی پالکیاں دہلی سے نکلتی ہیں اور دکن کی کوہستانی گھاٹیوں، گھنے جنگلوں اور سبز و شاداب مرغزاروں میں ابر رحمت کی طرح منتشر ہو جاتی ہیں۔

(۲)

دہلی سے جو سڑک نئے پایۂ تخت دیوگڈھی تک بنائی گئی ہے اس پر اب تک مسافروں کا تانتا بندھا ہوا ہے، اسوقت ہمیں ایک گروہ نظر آ رہا ہے جو دریائے تاپتی عبور کرنے کے بعد شاہراہ سے ہٹ کر مشرق کی جانب کوہستانی سلسلوں کی طرف تیزی سے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ شام کے چار بجے ہیں اور اس کی رفتار سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ لوگ آج ہی رات اپنی منزل مقصود پر پہونچنے والے ہیں۔

سڑک سے ہٹ کر سایہ دار درختوں اور گنجان جھاڑیوں میں آنے کے بعد ان کی رفتار میں وہ تیزی باقی نہ رہی جو ابھی شاہراہ پر نظر آ رہی تھی اسوقت سڑک نظروں سے غائب ہے تاپتی کے میدان ختم ہو گئے ہیں اور کوہستان کے سخت و پیچیدہ نشیب و فراز کی ابتدا ہے۔

مغرب ہونے کے لیے شاید چند ہی گھڑیاں باقی ہونگی کہ یہ گروہ دشوار گزار کوہستانی سلسلہ کو عبور کرکے پور ناندی کے سر سبز و ...
داخل ہوتا ہے - ابھی ندی کے قریب نہیں پہونچنے پاتے ہیں کہ سب آدمی رک جاتے ہیں اور "ہمت مردان مدد مولا"
بلند ہوتی ہے -

چالیس پچاس آدمیوں کا گروہ ایک دوسرے پر گرنے لگتا ہے - گویا راستہ میں کوئی خزانہ مل گیا ہے - جسکے لوٹنے کے لیے یہ
ٹوٹ پڑتے ہیں اور یہ کشمکش ابھی جاری تھی کہ "اللہ اکبر اللہ اکبر" کی صدا سے سب لوگ چونک پڑے ان میں سے کچھ ...
دوڑتے ہیں اور پھر جلد جلد واپس آکر ایک سیدھی قطار میں کھڑے ہوجاتے ہیں گویا کسی سے باضابطہ لڑائی ہونے والی ہے -
جب سب جمع ہوجاتے ہیں تو پالکی سے ایک سبز پوش بزرگ برآمد ہوتے ہیں ساری جماعت کو مغرب کی نماز پڑھاتے ہیں اور ...
"پیرو مرشد نے جس مقام کی پیشین گوئی کی تھی وہ یہی مقام ہے - کیونکہ میری لاڈلی تسبیح کا رنگ اسوقت زردی مائل ہوگیا ہے
اور جان نثاران اہل بیت نبی کو لازم ہے کہ یہیں بود و باش اختیار کریں اور جس طرح حضرت قبلہ و کعبہ کا حکم ہوا ہے تبلیغ مذہب میں مشغو...
ایک عالیشان مسجد و ملحق خانقاہ کی تعمیر شروع کردیں"
چنانچہ اکولہ کے مغرب میں ندی کے کنارے جو گڑھی نظر آتی ہے وہ اسی وقت کی یادگار ہے اور سید نگر کی بستی بھی اسی خانوا...
معتقدین نے آباد کی تھی -

(۳)

چودھویں صدی ہجری کو شروع ہوئے تقریباً تیس سال کا زمانہ گزر چکا ہے اسوقت انگریز ہندوستان کے مطلق العنان ...
دہلی میں ہند کے تیسرے قیصر کے دربار تاج پوشی کیجا رہی ہیں دکن کے ہر دلعزیز بادشاہ نے اسی سال انتقال کیا ہے ا...
اور فاضل جانشین کی تخت نشینی کی خوشی میں حیدرآباد رشک فردوس بنا ہوا ہے برار کا ملک برسوں پہلے ہی ریاست حید...
الگ ہوکر انگریزی علاقہ میں شامل ہوچکا ہے -

ریاست اور مدت سے برار کا علحدہ ہونا سید نگر کے لیے سخت تباہی کا باعث ہوا کیونکہ نظام سرکار سے جسطرح ہند...
متفرق درگاہوں کی امداد کی جاتی ہے - حضرت پالکی سوار میاں کی درگاہ کے لیے بھی سالانہ وظیفہ مقرر تھا جو بعض خانگی جھگڑ...
زیر باقی ہوگیا تھا اور جس کے متعلق سید نگر کے سجادہ نشین کچھ کارروائی کرنی چاہتے تھے لیکن اس واقعہ کے بعد سے تو انہیں کسی ...
باقی نہ رہی تاہم موجودہ سجادہ نشین حضرت محبوب میراں علوی نے دکن کے نئے اور فیاض تاجدار کے دربار میں وظیفہ کے اجرا ...
لیے عرضی پیش کی ہے -

حضرت محبوب میراں ایک نابینا طویل العمر اور باخدا بزرگ حضرت پالکی سوار میاں کی تنہا یادگار ہیں - آپ کے خاندا...
خصوصیت آپ پر ختم ہوجاتی ہے یعنی یہ کہ آپکے گھرانے میں حضرت پالکی سوار سے لیکر آپ تک ایک ہی اولاد نرینہ ہوتی رہی جو اپنے
کے بعد جانشین ہوا کرتی تھی محبوب میراں کے ایک لڑکا ضرور پیدا ہوا تھا لیکن وہ چند سال میں اپنی والدہ کی وفات کے بعد ہی

اپ کے گھر مین ایک سترہ سالہ لڑکی محمودہ ہے جسکو فارسی و عربی کی اچھی خاصی تعلیم دی گئی ہے - ایک لڑکا عزیز میان جو سجادہ نشین صاحب کا ہمشیرہ زادہ ہے اکورہ مین تعلیم ختم کرنے کے بعد کلکتہ گیا ہوا ہے تاکہ زراعت کی اعلی تعلیم حاصل کرے محبوب میان اور محمودہ کے علاوہ اسوقت گڑھی مین اور تین آدمی ہین جو آپکے خاندانی مرید ہین اور خدمت گزارون کی اولاد مین سے ہین -

جب سے پیا نظام کے پاس کا وظیفہ خانگی جھگڑون کی باعث و ریاتی ہو گیا ہے سید گڑھ کے سجادہ نشین اور ان کے ساتھیون پر تنگی سے گزرتی ہے -

ابا سے حیثیت نارائن راؤ کو گڑھی کے اطراف کی زمین منافع پر دی گئی ہے وہ ہر سال تین چار سو روپیہ ادا کرتا ہے جو عزیز کی تعلیم کے لیے کلکتہ روانہ کر دیئے جاتے ہین اور سید گڑھ والون کی بسر اوقات کے لیے نارائن راؤ سے آئے دن کچھ نہ کچھ قرض لینے رہنا پڑتا ہے نارائن راؤ اور اسکے آباؤ اجداد سید گڑھی زمینون مین قدیم سے کاشت کرتے آرہے ہین اور اسکا باپ انکو پالکی سوار میان کا معتقد تھا لیکن وہ اپنے مدرسے کے اثر کی وجہ سے سخت متعصب ہو گیا اور مسلمانون سے نفرت کرتا ہے - چنانچہ اب وہ جب بھی گڑھی مین آتا ہے تو اہل گڑھی کے برخلاف سجادہ نشین صاحب کے ادب و احترام کی کچھ پروا نہین کرتا اور قرض دیتے وقت قسم قسم کی پیچیدگیان پیدا کرتا جاتا ہے -

(۴)

اکورہ مین ... دو حویلی کے شاندار کوٹھی جو کئی سال سے بن رہی تھی اب بالکل تیار ہو چکی ہے گرمیون کا موسم ہے شام کے سات بجے ہین اس تقریب مین بیدار خان نے اپنے تمام دوستون کو دعوت دی ہے ہندو مسلمان ہر ایک کی خاص اہتمام سے ضیافت کی جا رہی ہے تمام مہمان جمع ہونے کے بعد خان صاحب دروازہ پر ایک بکرا کاٹتے ہین - چوکھٹ پر ناریل توڑتے ہین اور سب چیزین غریبون مین تقسیم کر دی جاتی ہین اس کے بعد تمام مہمان خان صاحب کو نئے مکان کی مبارکباد دیتے ہین اور کھانا کھا کر اپنے اپنے گھرون کا راستہ لیتے ہین -

اب چند ہی خاص خاص دوست احباب ٹھہرے ہوئے ہین صدر دالان کے سامنے صحن مین ایک چھ گز کا مربع تخت بچھا ہوا ہے جس پر قیمتی قالینون کا فرش ہے ایک طرف پاندان اور اگالدان رکھا ہوا ہے دوسری طرف چند جھالردار پنکھے ہین درمیان مین ایک بڑا سا حقہ ہے - ابھی رات کچھ زیادہ نہین گزری - آپس مین ادھر ادھر کی باتین ہو رہی ہین کوئی ڈیرہ دالان کی تعریف کر رہا ہے کوئی دالانون کی بلندی کا تذکرہ کرتا ہے اور کوئی صحنون کی تنگی کا گلہ کر رہا ہے اس اثنا مین بیدار خان اپنے تمام مہمانون کو رخصت کر کے اس تخت کا رخ کرتے ہین ان کے ساتھ ان کا بیس سالہ اکلوتا بیٹا عشرت خان اور کاروبار کا منتظم نند اختاس خان بھی ہے -

بیدار خان ابھی تخت کے قریب بھی نہین پہونچنے پائے ہین کہ ایک مرہٹہ دوست سے مخاطب ہو کر کہتے ہین :-

"کہیے راؤ صاحب! کئی دن سے آپ نہین ملے سب اچھے تو ہین نا؟"

"خان صاحب! کیا کہین منحوس سجادہ صاحب نے سارا روپیہ قرض کے نام سے لوٹ لیا میرے پاس فصل کے واسطے بیج خریدنے کے لیے بھی

کافی روپیہ نہ تھا چار و ناچار امداد کی جائے سسرال سے کچھ قرض لانا پڑا۔

ہاں جی! نارائن راؤ، کچھ کہو تو کہ سید نگر والوں کی حالت کیا ہے! سنا کہ گڑھی پر بالکل تباہی آگئی ہے۔ سجادہ صاحب کو جو کچھ آمدنی ہوتی ہے وہ اس کو اپنے بھانجے کے تعلیمی اخراجات کے لیے کلکتہ روانہ کر دیتے ہیں اور خود عسرت سے گزارتے ہیں،

ہاں یہ بالکل صحیح ہے مگر وہ کوشش اس بات کی بھی کر رہے ہیں۔ نارائن راؤ! کہ حیدرآباد سے کچھ امداد مل جائے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے، لیکن مجھے امید نہیں! ان غریبوں کی کون پوچھتا ہے، جانتے ہی ہو مفلسی ہے!

"نہیں راؤ صاحب یہ نہ سمجھئے خدا کی دین مشہور ہے جب دینا چاہتا ہے چھپر پھاڑ کر دیتا ہے"

"مگر خانصاحب مجھے امید نہیں میں اسی فکر میں ہوں کہ اپنے قرضہ کی رقم اس سے کس طرح حاصل کروں"

"کیوں کیا کوئی بڑا قرضہ ہے!؟"

"اجی جناب پندرہ ہزار روپیہ ہو گیا ہے"

"نارائن راؤ تم فکر مت کرو تمھاری رقم کہیں جاتی ہے۔

"عشرت" خان میاں! ہم بچپن میں سید نگر گئے تھے کیا ہی جگہ ہے! چاروں طرف گھنی جھاڑیاں اور اُن کے اطراف نارائن راؤ کی سرسبز و شاداب کھیتیاں کیا ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں! سجادہ صاحب کا مکان اور خانقاہ بھی کس قدر شاندار ہے، خصوصاً سماع خانہ ہی کا بڑا پنکھا کتنا بڑا ہے کہ اگر کسی کے سر پر گرے تو فوراً سر چکنا چور ہو جائے"

خدا شناس خان "کہتے ہیں کہ پانچ آدمی مل کر اس پنکھے کی رسی کھینچتے تھے تب کہیں وہ سماع خانہ کے اس سرے سے اس سرے تک ہوا پہونچاتا تھا"

شغف خان "مگر خان میاں! ہم قاسم پور کی زمین خریدنے کی جگہ سید نگر کی گڑھی کیوں نہ خرید لیں"

"ہاں جی نارائن راؤ! اگر ہم گڑھی خرید لیں تو تمھارا قرض بھی ادا ہو جائیگا کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"مگر خان صاحب آپ گڑھی خرید کر کیا کریں گے؟"

"کیوں!! لوگ مکان خرید کر جو کرتے ہیں وہی کریں گے، سامان اور روپیہ پیسہ کے لیے اچھی خاصی محفوظ کوٹھی ہو جائیگی پھر کبھو شہر میں کوئی بلا نازل ہو تو تبدیل آب و ہوا یا تفریح کے خاطر وہاں قیام کر سکتے ہیں تم ذرا دست ہم زمین تمھارے ہی خاندان میں کاشت کے لیے دیا کریں گے"

"نہیں خان صاحب یہ بات نہیں آپ لکھنؤ میں آج کل آئے ہوئے ہیں آپ کو معلوم نہیں کہ سید نگر کے متعلق قدیم زمانے سے آج تک کیا کیا واقعات ہوتے آئے ہیں۔ اگر یہ واقعات آپ کو معلوم ہوتے تو آپ کبھی ایسی جرات نہ کرتے کیوں منتظم صاحب! آپ کہیے"

"جی ہاں خان صاحب! راؤ صاحب کا کہنا بالکل ٹھیک ہے کئی برس گزر چکے مگر مجھے وہ واقعہ ضرور یاد ہے کہ میں نے ایک فرنگی انجینئر کو کتے کی موت مرتے دیکھا تھا واقعہ یہ ہے کہ جب برار انگریزی سرکار کے قبضہ میں آیا تو اُس کے کارندوں نے دوسری زمینوں کی طرح سید نگر کی زمینوں کی

رہ جاؤ ہو۔ اسد ملک ہے۔ دفتر سے سب کے نام احکام جاری ہو گئے ہیں کہ پندرہ ہزار روپے کی رقم اگر دو ہفتہ کے اندر ادا نہ کی گئی تو جائداد وغیرہ نیلام کر کے قرضخواہ کو قرضہ دلایا جائیگا۔"

محمودہ نے دفتری کاغذات اپنے والد سے لیکر پڑھنے شروع کیے اور ابھی ختم نہ کرنے پائی تھی کہ جان نثار شاہ نے حاضر ہو کر ایک لفافہ پیش کیا اور کہا کہ "صاحبزادی یہ خط عزیز میاں کا معلوم ہوتا ہے ابھی ابھی خطوط رسان کوٹھی کے دروازے میں ڈال گیا ہے۔"

محمودہ خوشی سے اچھل پڑی دفتری کاغذات بند کر کے فوراً لفافہ چاک کیا اور دھیرے پڑھنا شروع کیا۔

"عزیزی محمودہ آپ کا خط ملا۔ ادائی رقم کی بدمعاشی روپیوں کی پرسش اور ماموں حضرت کے مزاج کی ناسازی کی خبر سنکر طبیعت پریشان ہو گئی جی تو چاہتا ہے کہ امتحان وغیرہ چھوڑ کر سیدھا سید نگر آ جاؤں لیکن مجبور ہوں امتحان کو تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔ حضرت قبلہ کی خدمت میں میری طرف سے قدمبوسی عرض کر کے کہنا کہ اگر وہ مجھے طلب ہی کرنا چاہتے ہیں تو میں فوراً حاضر ہونے کو تیار ہوں" "ناچیز عزیز"

"ابا جان کیا حکم ہوتا ہے فرمائیے میں جواب میں یہ بھی لکھ دیتی ہوں کہ آپ کے نام دفتر سے حکم جاری ہو گئے ہیں اور سید نگر سرکاری طور پر قرق ہونے والا"

"نہیں نہیں بیٹی ایسا ہرگز نہ لکھنا عزیز فوراً آ نکل پڑیگا اور سالہا سال کی تعلیم ادھوری رہ جائیگی۔ خدا مسبب الاسباب ہے تم خط میں دفتری کارروائی کا ہرگز ذکر نہ کرو۔ خدا امتحان میں کامیاب کرے امتحان کے بعد آنا ہی تو ہے فکر کی ضرورت نہیں۔"

"بہت اچھا ابا جان مگر دفتری کارروائی کے متعلق کیا کیا جائے اگر بھائی جان ہوتے تو کچھ کرتے۔"

"بیٹی فکر مت کرو تم جاؤ عزیز کو فوراً خط لکھ دو وہ جواب کا منتظر ہوگا" محمودہ چلی جاتی ہے اور مجبوب میراں اپنے آپ جی میں کہنے لگتا ہے "اب پالکی سواریاں کو گڑھی چھوڑنا پڑے گی غالباً آج کے پندرھویں دن ہم گڑھی میں نہ ہوں گے۔ خدا معلوم کہاں کہاں کی خاک چھاننا پڑے۔ خیر بہرحال میں آج کے پندرھویں دن گڑھی چھوڑنی پڑے گی میرا کیا ہے میں تو چراغ سحری ہوں مگر عزیز اور محمودہ کا کیا ہوگا۔ ان کی بڑی فکر ہے لیکن فکر یار در کار ما آزار ما"

(۶)

محمودہ کا خط ابھی ملا ہے وہ کشمکش و پیچ میں ہے کہ کیا جواب دیا جائے؟ اسکی زبان سے بار بار یہی جملہ نکل رہا ہے کہ اب کیا کرنا چاہیے اپنے کمرے میں ٹہل رہا ہے بے حد پریشان ہے خط میز پر کھلا رکھا ہے وہ آج صبح کے دس بجے تک بے انتہا خوش تھا اپنے ہم جماعت طلبا سے ڈائننگ ہال میں ناشتہ کے وقت اس نے اپنی خوش قسمتی کا بڑے فخر سے ذکر کیا تھا شوکت نے اس وقت اعتراض بھی کیا تھا کہ عزیز ہم کسی کی کے متعلق بدقت ایک رائے قائم کر سکتے ہیں فطرت انسان کے عمیق جذبات اور قلبی گہرائیوں کے پراسرار کیفیات کا صحیح اندازہ بہت دشوار انسانی زندگی ایک رنگارنگ کائنات ہے جسکے گوناگوں مظہر ہر وقت ایک نیا عالم پیدا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن عزیز کہتا تھا کہ اس رائے سے متفق نہیں کر سکتا میرے نزدیک ہر انسان کو چاہیے کہ اپنی زندگی کا ایک خاص معیار مقرر کرے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی خوش قسمتی اور بدقسمتی کا اندازہ کر سکتا ہے اور وہ زندگی ہی کیا جس میں کسی قسم کی یکسانیت نہ ہو اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مد و جزر نہ ہو بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی کے ہر واقعہ پر ایک خاص انداز سے نظر ڈالے یہ دراصل ایک اصول ہے جس کے ذریعہ سے ہم کسی کے سیرت کے متعلق اندازہ کر

ر حالانکہ میری نظر میں رجائیت کے عالمگیر پہلو کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا کرتی تھی اسلیے اپنے کو خوش قسمت سمجھتا ہوں اور اسپر مجھے فخر بھی ہے
وہ خیالات تھے جن پر مجھے اصرار تھا لیکن اب اسکو معلوم ہو رہا ہے کہ واقعی شوکت راستی پر تھا حیات ایک سمندر ہے جس کا مد و جزر
تک ختم نہیں ہو سکتا جب تک کہ خود حیات ختم نہ ہو جائے اب وہ محسوس کر رہا ہے کہ جس چیز کو وہ مسرت جاودانی سمجھ رہا تھا اب وہ دفعتہً
ارت سے ٹکرا گئی ہے محمودہ وہ محمودہ جس کے لیے عزیز آج تک اپنے محبت کے جذبات کو وقف سمجھتا تھا اور وہی محمودہ جو اس کے لیے
مسرت کا سرچشمہ تھی اس پیکر، وہ جس کی ہر ایک بات سے خوشی کی سینکڑوں سوتوں کو ابلتا ہوا دیکھتا تھا اسوقت ایسا خیال بھی ہے جو پتھر بنکر
آبگینۂ مسرت کو پاش پاش کر دیتا ہے۔

وہ چاہتا ہے کہ اپنی حالت سدھارے پریشانی کو دور کرے لیکن اسمیں کے وہی خیالات جنپر وہ عمل کرنیکی کوشش کیا کرتا تھا اور جن کو
کا سا مادہ مسلم الثبوت سمجھتا تھا اسوقت اس کو بالکل لغو معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ابھی انہیں خیالات میں غرق ہے کہ شوکت جو اسکا عزیز ترین دوست
حل کر کمرہ کے اندر داخل ہوتا ہے۔

"اسی لیے تو میں کہتا تھا کہ تنہا کمرہ مضر ہوتا ہے کچھ خبر بھی ہے کہ کھانے کا وقت ختم ہو رہا ہے۔"

"کیا کھانے کی گھنٹی ہو گئی؟ مجھے تو اب تک آواز سنائی نہیں دی"

"اب ایک بجتا ہے کچھ خبر بھی ہے حضرت! ڈائننگ ہال برخاست ہونے کو ہے ابھی آپ گھنٹی کی فکر میں ہیں"

"اچھا! ایک بجتا ہے!!"

"کیوں عزیز کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہو مگر ہے کوئی وحشتناک خبر تو نہیں آئی یہ میز پر کس کا خط رکھا ہے کیوں سب خیریت سے
ی کی کیا حالت ہے؟"

"شوکت تم نے سچ کہا تھا کہ انسان کی زندگی ایک طوفان خیز سمندر ہے جس کا مد و جزر ہر وقت ایک نیا عالم پیش کرتا رہتا ہے میں
سے اپنی خوش قسمتی پر گھمنڈ کر رہا تھا کہ میرا دل جس قسم کے تصورات کا آشیانہ بننا چاہتا ہے وہ مجھے حاصل ہو گئے ہیں میرے احساسات
کے نغموں کے انتظار میں خوابیدہ ہو جانے کا اندیشہ تھا وہ اب مجھے رہ رہ کے بیدار کر دیا کرتے ہیں اور میرے دماغ کی وسیع فضا
ی رہنے کا خوف افزا خیال مجھے تمنا کا حرمان نصیب بنا دیتا وہ اکثر شگفتہ خیالات سے معمور رہا کرتی ہے اور اس کی وجہ صرف یہی
تھا کہ میں نے ابھی کہا کہ میں اپنی زندگی کو ذوق طلب اور پراز محبت ہی بنانے کی کوشش کرتا ہوں بس شوکت تم ہی کہو کیا میں سرے سے
ی پر تھا؟"

"لیکن عزیز میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کوئی شخص اپنے پراز محبت ہوسکو اپنی زبان یا اپنے قلم سے صحیح طور پر ظاہر کر سکتا ہے میرا تو خیال ہے
ی تم محبت والے انسان ہو تو اسکے اظہار کا [illegible] دیکھا تم اسکو سرے سے سمجھ ہی نہیں سکتے"

"پھر کیا ہوا یہ نظریہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا"

"میرا خیال ہے کہ اگر کوئی سمجھ بھی سکتا ہے تو صرف وہی جس سے محبت کی جائے۔ بھئی عزیز وہ کونسا دل ہے جو اس جذبہ سے خالی ہے

وہ کونسا دماغ ہے جو کسی خیال میں سرمست نہ رہتا ہو لیکن فرق یہ ہے کہ کسی کو اپنی عورت سے محبت ہے کسی کو اپنے ماں باپ سے کسی کو دولت سے محبت ہے کسی کو عزت سے غرض ہر شخص میں وہ مختلف رنگ اختیار کر لیتی ہے "

"میں یہ کب کہتا ہوں کہ محبت کا موضوع ہمیشہ ایک ہو اور ہر شخص کا طریقۂ الفت بھی یکساں ہی ہوتا ہے - لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر کسی کو کسی چیز کی محبت ہے اور وہ چیز اسکو مل جائے تو وہ خوش قسمت ہے پس اسی طرح میں بھی خوش قسمت ہوں "

"ہاں جناب آپ بڑے خوش قسمت ہیں مگر جیسے پہلے کھانا تو کھا لیجیے کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈائننگ ہال برخواست ہو جائے اسوقت پھر آپ کے دل کو ٹھیس لگے گی اور آپ کہیں گے کہ شوکت تم سچ کہتے تھے کہ انسان کی زندگی ایک طوفان خیز سمندر ہے جس کا مدوجزر ہر وقت ایک نیا عالم پیش کرتا ہے" شوکت و عزیز ڈائننگ ہال لیگیا اور کھانا کھاتے ہوئے اصل واقعہ دریافت کیا عزیز نے پورا واقعہ گڑھی کے فردوس بننے اور محمودہ کا تکیہ میں آ بسنے کا بیان کیا شوکت نے سمجھایا کہ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اپنی عادت کے موافق اس واقعہ کی بھی روشن پہلو پر نظر ڈالو ایسا نہ ہو کہ امتحان میں خلل پڑے کل آخری پرچہ ہے اسکو عمدگی سے کرلو میں تمہاری ہر طرح مدد کروں گا" عزیز "تمہیں اپنی محبت کے اظہار کا موقع تو آکثر مل جاتا تھا شاید اب میری باری تم اب کمرے پر چلو تو میں بھی آتا ہوں "

ڈائننگ ہال سے نکلکر عزیز اپنے کمرے میں داخل ہوا ہے - سید نگر کا تصور کر رہا ہے کہ کس طرح وہاں کے کھنڈروں اور گھنے درختوں کے سایہ میں وہ اور محمودہ دونوں اپنے بچپنے میں کھیلا کرتے تھے - اسکو محمودہ کی ایک ایک بات یاد آرہی ہے خصوصاً رخصت کے وقت کا وہ جملہ رہ رہ کے نشتر کی طرح چبھ رہا ہے کہ "اب معلوم نہیں کہ عزیز ہم اور تم کس حالت میں اور کب ملینگے ؟" اسکے ساتھ ہی تکیہ کی بے بس زندگی کا خیال آجاتا ہے اور اس کے آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں

(۷)

سید نگر کے دروازہ پر بڑا جھنڈا نظر نہیں آرہا ہے - دروازہ جو ہمیشہ بند رہا کرتا تھا - اب بالکل کھلا ہے گڑھی کے اندر بھی وہ سکوت باقی نہیں رہا بلکہ ہر طرف چہل پہل نظر آرہی ہے پالکی سوار سیان کی اولاد اور معتقدین دھکے دے دے کر نکال دیے گئے ہیں -

سجادہ صاحب کا گڑھی سے نکلنا تھا کہ وہ ایک مقدس زیارت گاہ کی بجائے ایک بڑی تجارتی کوٹھی بن جاتی ہے بیدار خان نے بہت کچھ سامان اور غلہ گڑھی میں لا رکھا ہے اور اپنے اکلوتے بیٹے عشرت خان کو یہیں چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ اسکی مستقل قیام گاہ بن جائے - اسوقت دن کے دس بجے ہیں سجادہ صاحب کے مکان کے روبرو جو کھرنی کا درخت ہے اس کے نیچے عشرت خان ٹہل رہا ہے نہایت ہشاش بشاش ہے - اطراف کے درختوں اور مکانوں کی دیواروں پر خوشی کے ساتھ نظر دوڑا رہا ہے اسوقت اسکی ہر ایک حرکت ظاہر کر رہی ہے کہ وہ اب خود کو ایک ایسا عظیم الشان فاتح خیال کر رہا ہے جس نے اپنے خوفناک دشمن پر بڑی عمدگی سے فتحمندی حاصل کرلی ہو -

گڑھی سے جو راستہ مکان کی طرف آتا ہے اسپر عشرت خان کو ایک مرشد آتا ہوا دکھائی دیتا ہے جسکی رفتار سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ کسی سے اپنا انتقام لیکر اپنی کامیابی پر ناز کرتا ہے - اور اس وقت کوئی اور دل خوش کن خیال اس کی اس مسرت و شادمانی میں رہ رہ کر اضافہ کر رہا ہے قریب پہونچتے ہی عشرت خان پکارتا ہے -

"آہا نارائن راؤ! کیا خیر ہے! سید نگر کی آب و ہوا اسقدر راس آگئی ہے کہ میں جو اکولہ میں تم کو مریض سمجھتا تھا یہاں آنے کے بعد حالانکہ ابھی چند روز ہوئے ہیں اچھا خاصہ تندرست محسوس کر رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ کسی سے کشتی لڑوں۔ اچھا، بتاؤ کہ تم نے اکولہ مرہٹہ اسکول میں ان کون سے پہلوانی کرتب سیکھے؟"

"عشرت خان صاحب! میں نے پہلے بھی اکولہ ہی میں آپ سے کہا تھا کہ میں مدرسہ میں کچھ زیادہ دن نہیں رہا اگر دو تین سال جم کر رہتا تو آپ دیکھتے کہ اچھے سے اچھے پہلوانوں سے مقابلہ کرتا۔ مدرسہ کا دنگل بہت بڑا ہے اور استاد بھی ہندوستان کے زبردست پہلوانوں میں ہیں۔ نارائن راؤ تم لاکھ ورزش کرو پہلوانی سیکھو لیکن یاد رکھو کہ اصل چیز انسان کا دل ہے اگر اس میں جرأت نہیں تو پہلوانی بیکار ہے۔ ایک مجھ کو دیکھو کہ اگر اکولہ کی ساری آبادی ایک جگہ جمع ہو کر آجائے تو میں تھوڑی ہی دیر میں ان سب کو بھگا دوں گا صرف اس لیے کہ میرا دل زوری ہے۔

اچھا دیکھو اس بنگلہ کی دیوار سے تم سامنے سماع خانہ کی چھت پر کود سکتے ہو؟ دیکھو میں ابھی کودتا ہوں۔

عشرت خان صاحب، کیا کر رہے ہیں!! اس میں جان کا دھوکا ہے اگر آپ صحیح سلامت کود بھی جائیں تو کون کمال کی بات ہوئی۔ میں ایک کام کہتا ہوں اگر وہ کر دکھاؤ تو میں جانوں کہ بڑے جوانمرد ہو۔

"کیوں ایسا کیا کام ہے؟ جو میں نہیں کر سکتا میں نہیں سمجھتا کہ تم نے مجھے کیا سمجھ لیا ہے ابھی تم جو بھی مشکل سے مشکل کام بتاؤ گے میں کر کے دکھا دوں گا۔"

جب تم اسقدر تیار ہو تو لو کہے دیتا ہوں کیا تم نے سجادہ صاحب کی لڑکی محمودہ کو دیکھا ہے؟"

میں نے دیکھا ہے واقعی بیحد خوبصورت ہے۔

جب تمہاری بہادری جانوں کہ اس کو قابو میں لاؤ ورنہ یوں تو شیخی ہر شخص مارتا ہے۔

یہ کونسی بڑی بات ہے! خوب! تم نے بھی بڑی جوانمردی کا کام بتلایا۔ (کچھ سوچ کر) مگر واقعی نارائن راؤ اس لڑکی کو قابو میں لانا بہت دشوار ہے "میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا۔ لائے تو آؤ میں دیکھوں تم کیسے مرد ہو؟"

اچھا راؤ صاحب لیجئے میں ابھی سے اس پری کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کرتا ہوں"

نارائن راؤ واپس ہوتا ہے اور دل ہی دل میں کہتا جاتا ہے کہ

"اب دیکھوں گا کہ سید نگر والے کسطرح اپنی قدیم آبرو اور وقار قائم رکھتے ہیں لیکن اگر گزشتہ کے واقعات سے صحیح ہوں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ پر بھی کوئی بلا نازل ہو لیکن نہیں ایسا کہاں ہوتا ہے۔ آخر عشرت خان دو تین روز سے گدی پر ہے اور اب تک کچھ بھی نہ ہوا۔ فقیروں کی بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ ہوتا ہوا تا کچھ بھی نہیں سب دھوکا ہے۔ میں بھی کیسا احمق ہو رہا ہوں۔ جان نثار شاہ کے ذریعہ سے مجھے دھکے دیکر گدی سے نکال دیا تھا خدا کرے کہ اب محمودہ کسی طرح اس رو سیاہ کے ہاتھ لگ جائے۔ پھر دیکھئے کیا مزا چکھاتا ہوں"

(باقی)

سید محی الدین قادری۔ بی۔ اے۔

اصغر علی محمد علی کی شہرت کا باعث صرف عطر حنا ہے۔

استفسارات

اپریل فول

(جناب محمد اطہر صاحب گنج)

اپریل کی پہلی تاریخ کو جو انگریزوں میں مذاق کا دستور چلا آتا ہے اس کی کیا اصلیت ہے اور اس تاریخ میں جھوٹ بولنا دھوکا دینا کیوں معاف ہے ؟

نگار۔ سولھویں صدی عیسوی کے اول نصف تک یورپ میں سال کی ابتدا اپریل کے مہینہ سے ہوتی تھی اور یکم اپریل کو جو سال کا پہلا دن ہوتا تھا لوگ خوشیاں مناتے تھے اور احباب و اعزہ میں تبادلۂ تحائف و ہدایا ہوا کرتا تھا۔ بعض لوگ لطف کے لیے مذاقاً جھوٹ بھی بولتے تھے جس سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ احباب کو تھوڑی دیر کے لیے غیر مضرت رساں فریب میں مبتلا رکھکر بعد کو اُن کی ہنسی اُڑائیں۔

سولھویں صدی کے دوسرے نصف میں فرانس نے اپنی تقویم بدلکر سال کی ابتدا جنوری کی۔ لیکن چونکہ لوگ پہلے نظام کے عادی تھے اور یکم اپریل ہی کو مذاق کرنے کی رسم قائم ہو چکی تھی، اس لیے یکم جنوری یکم اپریل کی جگہ نہ لے سکی اور جو رواج چلا آرہا تھا بدستور قائم رہا۔

مشتری

(جناب مرزا احمد بیگ صاحب مانچی)

نگار میں اس سے قبل فلکیات کے متعلق متعدد مضامین نکل چکے ہیں اور اگر انھیں یکجا کیا جائے تو ایک اچھا رسالہ اس پر تیار ہو سکتا ہے، لیکن میرے خیال میں مشتری کے متعلق آپ نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا، میں ممنون ہونگا اگر مختصراً اس پر ایک مقالہ سپرد قلم کیا جائے۔

(نگار) اس وقت میں لکھنؤ میں ہوں اور دفتر نگار سے بہت دور اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ نگار کے کسی گزشتہ نمبر میں مشتری کے متعلق کوئی مضمون شائع ہوا ہے یا نہیں، لیکن چونکہ آپ شروع سے رسالہ کا بالاستیعاب مطالعہ کر رہے ہیں اس لیے آپ کا فرمانا درست ہوگا۔ افسوس ہے کہ اپنے مستقر سے دور ہونے کے باعث حسب لخواہ کوئی مضمون اس موضوع پر نہیں لکھ سکتا، تاہم تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔

مشتری نظام شمسی کا سب سے زیادہ بڑا سیارہ شمار ہوتا ہے، کیونکہ اس کا قطر ۸۰ ہزار میل اور اس کا حجم زمین سے ۱۲۵۰ گنا زائد ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کا مادہ بہ نسبت زمین کے صرف ایک چوتھائی کثیف ہے یعنی جتنا مشتری کا حجم ہے اتنا اس کا وزن نہیں ہے اور زمین سے صرف ۳۰۰ گنا وزنی ہے۔

آفتاب سے اس کا بعد اوسط ۴۸۰ ملین میل ہے، یعنی اگر ایک انجن ۶۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رات دن چل کر آفتاب سے مشتری تک پہنچے تو پورے ۹۰۰ سال صرف ہو جائیں گے۔ مشتری کا سال زمین کے سال سے بارہ گنا زیادہ ہے، یعنی وہاں کا ایک سال یہاں کے بارہ سال کے برابر ہوتا ہے۔

زمین جس طرح ۲۴ گھنٹے میں اپنے محور پر ایک گردش کرتی ہے مشتری اس سے نصف مدت میں اپنی گردش پوری کر لیتا ہے، لیکن چونکہ اس کا حجم بہت بڑا ہے اس لیے اس کی سطح اپنے محور پر بہ نسبت زمین کے بہت زیادہ ہے، یعنی اگر زمین ایک سکنڈ میں ۱۷ میل گھومتی ہے تو مشتری اتنی ہی دیر میں ۲۶۰ میل گھوم جاتا ہے۔ زمین اپنا روزانہ دورہ ۲۴ گھنٹے میں پورا کرتی ہے اور مشتری دس گھنٹوں میں اس لیے وہاں کے دن رات دس گھنٹے کے ہوتے ہیں۔ مشتری کی یہ حالت ہے، وہ گیس اور پگھلے ہوئے مواد کا کرہ ہے۔ ابھی تک اتنا کافی زمانہ اس پر نہیں گزرا کہ وہ انجماد کو پہنچ سکے۔ چونکہ ابھی تک اس کی [illegible] اس لیے بعض کا خیال ہے کہ اس کا نور سورج کی طرح اصلی ہے آفتاب سے ماخوذ نہیں ہے۔ دوربین کے ذریعہ سے دیکھا جائے تو اس کی سطح پر کئی منطقے نظر آتے ہیں جو خط استوا کے متوازی ہیں۔ چونکہ مشتری منجمد نہیں ہے بلکہ گیسی اور سیال حالت میں ہے [illegible] حرارت سے اس کے چاروں طرف بادل سا گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی سطح پر ایک بیضوی شکل سرخ داغ ہے جس کو سب سے پہلے مسٹر [illegible] نے ۱۸۷۸ء میں دیکھا تھا، اس کا طول اس وقت ۳۰ ہزار میل اور عرض ۷ ہزار میل تھا۔ اب بھی یہ داغ نظر آتا ہے اور مشتری کے چاروں طرف گردش کر کے اپنے دورہ کو ۹ گھنٹہ ۵۵ منٹ اور ۳۴ سکنڈ میں پورا کر لیتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ وہاں کا کوہ آتش فشاں ہے، لیکن چونکہ اس داغ کا اشتعال ہر جگہ پر قائم نہیں رہتا اس لیے یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ بعض کا گمان ہے کہ یہ سرخ حصہ ایک دن جدا ہو کر مشتری کا قمر بن جائیگا جس طرح زمین کا ایک حصہ جدا ہو کر چاند بن گیا۔

مشتری کے نو چاند ہیں جو اس کے گرد گھومتے ہیں، ان میں سے چار چاند تو گلیلیو کے زمانہ سے مشہور ہیں۔ باقی بعد کو دریافت ہوئے ہیں۔ نواں چاند حال ہی میں دریافت ہوا ہے۔ پہلے اور دوسرے چاند کا قطر زمین کے چاند کے برابر ہے اور آٹھویں نویں کا اس سے نصف۔ ان چاندوں میں سے جو سب سے زیادہ قریب ہے وہ مشتری کے گرد دو دن میں (ہمارے دن کے حساب سے) دوسرا ساڑھے تین دن میں، تیسرا سات دن میں اور چوتھا ساڑھے سولہ دن میں اپنا چکر پورا کر لیتا ہے۔

امریکہ کی دولت

(جناب احمد کریم صاحب۔ سلطان پور)

نگار میں امریکہ کی ترقی کے متعلق اکثر مضامین نکلتے ہیں، لیکن اس وقت تک کوئی ایسا مضمون شائع نہیں ہوا جس میں امریکہ کی ہمہ جہتی ترقی پر تبصرہ ہوا ہو۔ سنا جاتا ہے کہ اس وقت امریکہ دنیا کی تجارت پر قابض ہے اور وہاں دولت کا یہ عالم ہے کہ اس کا مصرف بھی انہیں تلاش سے نظر نہیں آتا۔ کیا یہ صحیح ہے؟ براہ کرم اس سلسلہ میں تحقیقات سے کام لیکر مجھے ممنون فرمائیے۔

نگار - یہ بالکل صحیح ہے کہ اس وقت نیویارک تجارتی و صنعتی دنیا کا مرکز ہے اور اس میں ابھی کوئی کلام نہیں کہ اب وہاں افلاس مفروضہ تقریباً مفقود ہے۔ اس وقت تک نگار میں متعدد مضامین امریکہ کی ترقی کے متعلق نکل چکے ہیں اور اگر آپ ان میں یکجا کرکے مطالعہ کریں تو غالباً آپ کی معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔

امریکہ کی بعد از جنگ ترقی کے متعلق بھی نگار میں دو چار نوٹ شایع ہو چکے ہیں، لیکن زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا گیا حال ہی میں امریکہ کے تجارتی چیمبر کے صدر مسٹر اولیری کا ایک مضمون خصوصیت کے ساتھ اس عنوان پر شایع ہوا ہے جس کا ترجمہ المقتطف میں بھی آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مضمون سے زیادہ قابل استناد ذریعہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ آپ اس کو خود بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ میں یہاں مختصراً اس کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

مسٹر اولیری کا بیان ہے کہ گزشتہ ۵۰ سال کے اندر امریکہ نے جسقدر مادی ترقی کی ہے اس کی مثال کسی زمانہ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس مختصر مدت میں امریکہ کی ثروت چار چند ہو گئی ہے۔ اور صنعت نے اسقدر ترقی کر لی ہے کہ کوئی ملک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا امریکہ کی مشہور صنعتیں، موٹر، صور متحرکہ (سینما) لاسلکی ٹیلیفون اور مواد کیمیاوی ہیں۔ اب سے پہلے امریکہ ۹۰ ملین گنی کا مقروض تھا لیکن اب ۲۲۰۰ ملین گنی خود اس کی دوسروں پر قرض ہیں۔ پھر چونکہ دولت کی زیادتی سے اجرتوں اور مزدوریوں میں بھی بہت اضافہ ہو گیا ہے اس لیے معیشت کا معیار یہاں بلند ہو گیا ہے اور لوازم حیات بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں امریکہ کی ثروت کا اندازہ ۸۸۵۰۰ ملین ڈالر کیا گیا تھا جو ۲۲ سال کے اندر تقریباً چار چند ہو گئی ہے کیونکہ سنہ ۲۲ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۳۲۱۰۰۰ ملین ڈالر ہو گئی ہے۔ اس حساب میں سنہ ۱۲ء تک صنعت و حرفت کی آمدنی کو داخل نہیں کیا جس کی آمدنی کی مقدار اب تیرہ سال کے اندر ۴۵۰۰ ملین ڈالر تک پہونچ گئی ہے۔

وہاں کی دولت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس طرح دوسرے ملکوں میں لکھ پتی بڑی چیز سمجھا جاتا ہے وہاں ارب پتی لکھ اور کروڑ کا تو وہاں کوئی ذکر ہی نہیں کرتا جب بات ہوتی ہے تو ارب سے ابتدا ہونا معمولی گفتگو ہے۔ گزشتہ ۱۵۰ سال کے اندر دنیا نے جسقدر ترقی کی ہے اس کا اندازہ ۱۰۰۰۰۰ ملین ڈالر ہے، لیکن صرف امریکہ نے اور وہ بھی ۵۰ سال کے اندر جو ترقی کی ہے اس کا اندازہ ۲۵۰۰۰۰ ملین ڈالر ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں اس کا خالص نفع ۱۲۰۰۰ ملین ڈالر تھا لیکن اب ۶۰۰۰۰ ملین ڈالر تک پہونچ گیا ہے۔ اسی طرح زراعت کا سرمایہ بھی چار چند ہو گیا ہے اور گیہوں کی پیداوار میں ۶۰ فی صدی، روئی میں ۵۰ فی صدی اور مویشیوں میں ۳۷ فی صدی کا اضافہ ہو گیا ہے۔

اقتصاد کے دوسرے پہلو سے جب غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی بڑی ترقی ہوئی ہے، یعنی اگر ایک متوسط طبقہ کا خاندان پہلے اپنی آمدنی کا ۶۰ فی صدی غذا وغیرہ صرف کرتا تھا تو اب باوجود اشیاء کی گرانی کے بعد نصف سے کم خرچ کرتا ہے اب اگر دوسرے ممالک کی ثروت سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ برطانیہ کی ثروت امریکہ سے ۲۰۰۰۰ ملین کم ہے، فرانس کا کیا ذکر کہ اس کی دولت ۶۰۰۰۰ ملین ڈالر سے زیادہ نہیں ہے، اسی طرح جرمنی کی دولت کہ وہ صرف ۳۵۰۰۰ ملین

ہے جاپان کی ترقی بڑی مشہور ہے لیکن اس کی حقیقت بھی صرف اتنی ہے کہ جاپان کی ساری دولت سے امریکہ کی صرف ایک ہی سال کی آمدنی سے چند ہوتی ہے۔

پھر یہ ترقی صرف تجارت تک محدود نہیں ہے بلکہ وہاں کے مہندسین، معمار اور صناعوں نے بھی اس لحاظ سے ترقی کی ہے۔ ہوائی جہاز کو دیکھیے جو گزشتہ جنگ کے برپا ہونے سے قبل محض کھیل سمجھا جاتا تھا، لیکن اب امریکہ میں ساری ڈاک جہازوں کے ذریعہ لائی جاتی ہے [illegible] کی اشیا بھی اس ذریعہ سے بھیجی جائیں گی۔

[illegible] سال اس طرف واشنگٹن میں کسی بڑی تقریب کے موقعہ پر یہ بھی اہتمام کیا گیا تھا کہ ہر مہمان کے سامنے ایک ٹیلیفون رکھا گیا تھا جس کے ذریعہ سے شکاگو، پٹسبرگ اور سان فرانسسکو کی آوازیں سنائی دیتی تھیں، اس واقعہ کی سارے ملک میں دھوم مچ گئی اور لوگوں کو سخت حیرت ہوئی، لیکن اب یہ عالم ہے کہ امریکہ کے ہر گھر میں ایک چھوٹا سا آلہ نظر آتا ہے جس کا بٹن دبانے سے آسٹریلیا اور فلپائن کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ تار والا ٹیلیفون پچاس سال سے جاری ہے لیکن لاسلکی (بے تار والا) ٹیلیفون ابھی کل ایجاد ہے۔ تاہم اس کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ گزشتہ پانچ سال کے اندر لاسلکی آلات سے جس قدر آمدنی ہوئی ہے وہ تمام سونے کی آمدنی سے دو چند اور جواہرات کی آمدنی سے ۳ زائد ہے۔ اس کے کارخانوں نے ۱۹۲۴ء میں ۲ ملین ڈالر صرف اشتہار میں صرف کیے۔ اب امریکن قوم روزانہ ایک ملین ڈالر ٹیلیفون لاسلکی کے آلات خریدنے میں صرف کر رہی ہے حالانکہ ابھی تک تار والا ٹیلیفون زیادہ رائج ہے اور ہر دس آدمیوں میں سے ایک کے پاس ہے تو تار والا ٹیلیفون ہر آٹھ آدمیوں میں سے ایک کے پاس ہے لیکن لاسلکی ٹیلیفون ہر ۳۰ میں ایک کے پاس ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس کا رواج عام ہو جائیگا تو اس کی آمدنی کس قدر بڑھ جائے گی۔

ہرچند موٹر سازی کی صنعت گزشتہ قرن میں پیدا ہوئی اور بیسویں صدی کی ابتدا میں پانچ ہزار سے زیادہ موٹر امریکہ میں موجود تھے، لیکن اب امریکہ کی آبادی کا دسواں حصہ اس صنعت میں مشغول ہے۔ باوجودیکہ مصارف حیات ۶۰ فی صدی بڑھ گئے ہیں لیکن موٹروں کی قیمت میں ۳۰ فی صدی کا انحطاط ہو گیا ہے اور اتنی کثرت ہو گئی ہے کہ صرف لاریوں کی تعداد ۱۸ ملین ہے۔ امریکہ کی آبادی تمام روئے زمین کی آبادی کے لحاظ سے صرف ۶ فی صدی ہے لیکن موٹروں کی صنعت اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ دنیا کی تمام موٹروں میں ۸۰ فیصدی یہاں کی تیار شدہ ہوتی ہیں۔

یہی حال سینما اور فلم سازی کی صنعت کا ہے کہ بڑے بڑے کارخانے اور بڑی بڑی کمپنیوں نے اس کو شروع کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی آبادی میں سینما موجود ہے اور اب اس سے تعلیم و تربیت کی اشاعت کا کام لیا جا رہا ہے۔

علاوہ ان صنعتوں کے اور تمام صنعتیں بھی بیحد ترقی کر رہی ہیں مثلاً آٹا گوندھنے کی مشین کہ اس کی مدد سے ایک آدمی تیس آدمیوں کا کام کر سکتا ہے، یا سگار لپیٹنے کی مشین کہ ۱۵ آدمیوں کا کام ایک آدمی سے لیا جا رہا ہے، یا جوتہ سازی اور کپڑے کے کارخانے کہ مشین کے ذریعہ سے ایک لڑکی ۲۵ لڑکیوں کا کام انجام دیتی ہے، اسی طرح شیشہ سازی ہے کہ ایک شخص ۴۰ آدمیوں کے برابر کام کر سکتا ہے۔

کوئلہ کی معدنوں میں پہلے جہاں ۲ ہزار ٹن کوئلہ روز نکلتا تھا وہاں اب ۴۴ ہزار ٹن نکلنے لگا ہے اور جس بوجھ کو پہلے ۵۰۰ آدمی اٹھاتے تھے اب صرف ۱۱ آدمیوں کا کام رہ گیا ہے۔ زراعت پیشہ لوگوں کے پاس اسوقت ۴۰۰۰ ملین ڈالر کے آلات موجود ہیں جن سے صرف نصف وقت میں وہ پورا کام کر لیتے ہیں اور باقی وقت میں دوسرا کام کرتے ہیں۔

ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ پیداوار اور صنعت عالم کے مقابلہ میں امریکہ کا کیا مرتبہ ہے:—

کوئلہ کی پیداوار دنیا کی ساری پیداوار کے مقابلہ میں ۴۳ر۵ فی صدی ہے

پٹرول .... ۷۱ر۹ ہے
تانبہ .... ۵۲ر۶ ہے
لوہا .... ۶۰ر۲ ہے
فولاد .... ۵۹ر۸ ہے
گیہوں .... ۲۱ر۳ ہے
روئی .... ۵۵ر۵ ہے
لکڑی .... ۵۲ر۶ ہے
موٹر .... ۸۲ر۶ ہے
تار و ٹیلی فون .... ۵۶ر۸ ہے
ریل .... ۳۳ر۹ ہے

تجارتی کمپنیوں کے حصے عوام میں اسقدر مقبول ہوگئے ہیں کہ تقریباً ہر مزدور انھیں خریدتا ہے چنانچہ ان کی تعداد ۱۵ ملین نفوس تک پہونچ گئی ہے۔ اس کا ایک نمایاں نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان مٹ گئی ہے اور ہر مزدور اپنا کام محنت سے کرتا ہے کیونکہ خود اسکا سرمایہ بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔

الغرض امریکا اسوقت دنیا کا غنی ترین ملک ہے اور وہاں کا ہر طبقہ خوشحال ہے، عسرت و افلاس کا پتہ نہ محنت کرتے ہیں روپیہ کماتے ہیں اور عیش کرتے۔ کاہلی و بیکاری مفقود ہے، نشاط و مسرت ہر شخص کے چہرہ سے ظاہر رنج و غم یا کسی مصیبت پر ماتم کرنے کی انھیں فرصت نہیں۔ انکا قول ہے کہ جب تک زندہ رہو خوش رہنے کی کوشش ہر چیز کے روشن پہلو پر نگاہ رکھو۔

اقتباسات ومعلومات

روشنی سے موسیقی آفتاب کی حرارت و روشنی میں جو قوت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، چنانچہ ہواؤں کا چلنا ، دریاؤں کا دمعدنوں کا مالا مال رہنا اور تمام حیوانات و نباتات کا نشو و نما پانا سب اسی کی بدولت ہے، لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ انسان اسوقت تک قدرت کے اس عطیہ سے پوری طرح کام نہیں لے سکا۔

یورپ کے علماء آفتاب کی حرارت و روشنی سے فائدہ اٹھانے میں پوری طرح سرگرم نظر آتے ہیں چنانچہ حال ہی میں ڈاکٹر سٹیونز نے ایک ایسا آلہ تیار کیا ہے کہ جب اس کے اوپر آفتاب کی شعاعیں پڑتی ہیں تو یہ شعاعیں موسیقی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

فولادی اعصاب ہوائی جہاز چلانا یا اسپر سوار ہونا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے لیے نہایت قوی اعصاب کا انسان ہونا چاہیے جو بلندی پر جانے کے بعد زمین کی طرف دیکھ کر کانپ نہ جائے ورنہ اس کے اعصاب بے کار ہو جائیں۔ چنانچہ اکثر ایسی خبریں دیکھنے میں آئی ہیں کہ بلندی پر پہنچ کر نیچے دیکھنے والے از خود زمین پر گر پڑے اور مر گئے۔ لیکن انسان ایسے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو اپنے اعصاب کے لحاظ سے یقیناً انسان سے بلند تر مرتبہ رکھتے ہیں۔

اگر آپ نے ہوائی جہاز دیکھا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے دو لانبے بازو بھی ہوتے ہیں جو ملکر ایک لمبی سی چھت کا کام دیتے ہیں۔ اچھا فرض کیجیے کہ ایک جہاز ... سو فٹ کی بلندی پر اڑ رہا ہے تو کیا آپ کے نزدیک ممکن ہے کہ کوئی شخص اس حالت میں اس کے بازو پر بغیر کسی سہارے یا آڑ کے کھڑا ہو جائے۔ یقیناً ناممکن معلوم ہوتا ہے لیکن آپ سنکر حیرت کریں گے کہ حال ہی میں دو شخصوں نے بازوؤں کی چھت پر جا کر جب کہ جہاز ... سو فٹ بلند اڑ رہا تھا دیر تک ٹینس کھیلا اور وہ اس کی چھت پر ایسی ہی آزادی سے دوڑتے رہے جیسا کہ معمولاً ایک انسان زمین پر میدان کا دوڑ سکتا ہے۔

سب سے بڑی خوردبین مسٹر لاک مائی نے حال ہی میں ایک ایسی خوردبین تیار کی ہے جس سے زیادہ مکمل و بڑی اس سے قبل تیار نہ ہو سکی تھی۔ اس خوردبین کے ذریعہ سے ایک چیز کا حجم ... ۵ گنا تک بڑھ جاتا ہے۔ یعنی اگر ایک بالِ انسان اس کے ذریعہ سے دیکھا جائے تو وہ تار کے ستون کی طرح نظر آنے لگا۔ اس خوردبین کا وزن صرف چوتھائی ٹن ہے۔

اہل امریکہ کی جلدی اہل امریکہ کی خصوصیت ہے کہ وہ ہر بات کو جلدی سے ختم کر دینا چاہتے ہیں اور یہ صفت شہر و دیہ ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں وہاں ایک ایسا آلہ ایجاد کیا گیا ہے جو ایک وقت میں بیس گایوں بھینسوں کا دودھ نکال سکتا ہے یہ آلہ ایک موٹر کی قسم کا ہے جس کے ہر چہار طرف ربڑ کی نلکیاں لگی ہوئی ہیں ان نلکیوں کے سروں پر برتن بنا ہوا ہے اور اس کا منہ دوہرا کا ہے یہ برتن گائے کے تھن میں جا کر چپک جاتا ہے جب موٹر کو گردش دیجاتی ہے تو نلکیاں دودھ کو کھینچتی ہیں اور برتن بھر جاتا ہے۔ علاوہ جلدی کے یہ فائدہ بھی ہے کہ اس طرح جو دودھ حاصل کیا جاتا ہے وہ بہت صاف ہوتا ہے اور ہاتھ نہ لگنے

کی وجہ سے جراثیم سے پاک تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس آلہ کے ذریعہ سے پانی بھی کھینچا جا سکتا ہے اور گھر میں روشنی بھی ہو سکتی ہے دیہات کے لئے یہ اختراع نہایت مفید

جاپانی مرغ جاپانیوں کو درختوں اور پرندوں کی تربیت میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ وہ شہتوت کے درخت کر دیتے ہیں کہ اس کی بلندی ۲ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اسی طرح انھوں نے ایک عجیب مرغ پیدا کیا ہے جس کی لمبی ہے۔ یہ مرغ صرف زینت کا کام دیتا ہے اور وہ کسی بلند جگہ پر پنجرہ کے اندر رکھا جاتا ہے تاکہ اس کی دم زمین رہے۔ یہ مرغ اپنی دم کی وجہ سے زمین پر چلنے سے بالکل معذور ہے۔

فاقہ کشی کی قوت حشرات میں گھونگے سے زیادہ فاقہ کش کوئی کیڑا نہیں ہے۔ یہ اپنے خول کے اندر بند سال تک بھوکا رہ سکتا ہے۔ بعض حیوانات ایسے ہیں جو سارا جاڑا فاقہ میں بسر کر دیتے ہیں۔ لیکن انسان زیادہ سے ۷۰ دن بھوکا رہ سکتا ہے جیسا کہ آئرلینڈ کے ایک وطن پرست شخص نے ثابت کر دکھایا۔

نقل و حرکت کی آسانی یوروپ کے شہروں میں سڑکوں سے گزرنے کا سوال نہایت اہم ہوا کرتا ہے، آدمیوں، موٹروں اور ریلوں کا ایک ہی ساتھ گزرنا اسقدر کشمکش پیدا کرتا ہے کہ پیادہ چلنے والوں کو بعض اوقات دیر تک ٹھہرا رہنا پڑتا ہے۔ اس کو دور کرنے کے لیے سڑکوں پر جا بجا پل بنائے گئے ہیں تاکہ اوپر سے لوگ گزریں اور نیچے موٹر چلیں۔ لیکن جرمنی میں یہ ترکیب کی گئی کہ پل کے اوپر بنا کر کئی درجے قائم کر دیے ہیں۔ سڑک موٹروں کے لیے وقف ہوتی ہے، اور پہلا پل پیادہ چلنے والوں کے لیے، دوسرا ریل کے لیے اور تیسرا ٹرام کے لیے۔ اسی طرح کسی کا حرج نہیں ہوتا اور نقل و حرکت ہر وقت جاری رہتی ہے۔

سب سے چھوٹا ہوائی جہاز اس وقت مختلف ساخت و حجم کے جہاز تیار کیے جاتے ہیں، لیکن ان سب میں سب سے چھوٹا اور مقبول ہونے والا جہاز وہ ہے جس کا وزن صرف ۳۲۰ پونڈ کا ہے اور جسے ایک آدمی اٹھا سکتا ہے اس کی رفتار ۷۰ میل فی گھنٹہ ہے اور ۳۵ میل میں ایک گیلن پٹرول اس میں صرف ہوتا ہے۔

سیاہ نور جس وقت آفتاب کی روشنی مثلثی شیشہ کے ذریعہ سے گزرتی ہے تو اس میں سات رنگ پیدا ہوتے ہیں نیچے سرخ رنگ نظر آتا ہے اور سب سے اوپر بنفشی۔ لیکن شعاع کی تقسیم صرف اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ بنفشی کے اوپر اور سرخ رنگ سے نیچے بھی بعض رنگ اور ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے۔

ماوراء بنفشی رنگ کی شعاعوں سے تو کام لیا جا رہا ہے لیکن سرخ کے نیچے کی شعاعوں سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا تھا، لیکن اب اس غرض کے لیے ایک آلہ تیار کیا گیا ہے اور سرخ رنگ کے نیچے کی روشنی کا نام "نور اسود" یا سیاہ روشنی رکھا ہے۔

ریڈیو اور ریل اس میں کلام نہیں کہ ریڈیو یا لاسلکی ٹیلی فون نہایت عجیب و غریب چیز ہے کہ ایک انسان گھر بیٹھ کر ساری دنیا کی آوازیں، گانے اور تقریریں سن سکتا ہے۔ چنانچہ یوروپ و امریکہ میں اس کا رواج نہایت تیزی

مفت ۔ ماہوار رسالہ دنیا ۔ لکھنؤ کا نمونہ مفت منگائیے ۔